رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۷ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ایک مدت کیلئے قرآن پاک کے بعد سب سے بڑا سرمایہ فخر آپ کے سوانح کے احوال پاک اور کلمات طیبات تھا جنکے مجموعہ کا نام سیرۃ نبوی ہے، اردو زبان میں اس وقت بالاتفاق سب سے کامل تر اور صحیح تر سیرۃ نبوی میں وہ کتاب ہے جس کو دار المصنفین نے شائع کیا ہے، والحمد للہ،

اب تک اس کتاب کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں، اور تین حصے اور باقی ہیں،

سیرۃ النبی حصہ اول، از ولادت تا ختم سلسلہ غزوات، مع مقدمہ مشتمل بر نقد و فن سیرۃ و تاریخ عرب قبل بعثت، طبع دوم، ضخامت ۷۶۱ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible] و للعمر، تقطیع خورد،

سیرۃ النبی حصہ دوم، از سنہ ۹ھ تا سنہ ۱۱ھ جس میں [illegible] تکمیل خلافت، اشاعت اسلام، انتظامات مذہبی، تکمیل شریعت، حجۃ الوداع، وفات و شمائل، و اخلاق و عادات کی تفصیل اور ازواج و اولاد کا مختصر تبصرہ ہے، طبع اول تقطیع کلان، ضخامت ۵۰۳ صفحے، قیمت قسم اعلیٰ [illegible]، طبع دوم، تقطیع خورد، ضخامت ۷۰۰ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible]

سیرۃ النبی حصہ سوم، جس کے مقدمہ میں نفس معجزہ کی حقیقت اور اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیمہ، علم کلام، فلسفہ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط بحث کی گئی ہے، اور اسکے بعد خصائص نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، رویا، معراج اور شرح صدر کا بیان ہے، پھر وہ آیات و معجزات ہیں جنکا ذکر قرآن مجید میں ہے، بعد ازیں وہ ہیں، جو مستند روایات سے ثابت ہیں، پھر معجزوں کی نامعتبر روایات کی تنقید کا باب ہے، اور اس کے بعد وہ بشارات نبویہ ہیں جو صحف سابقہ میں موجود ہیں اور جنکے حوالے قرآن مجید و حدیث میں مذکور ہیں، اور آخر میں خصائص محمدی کا باب ہے، طبع اول تقطیع کلان، ضخامت ۵۹۶ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible]، طبع دوم تقطیع خورد، ضخامت ۷۹۰ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible]

ایضاً جلد چہارم، منصب نبوت کی تشریح، قبل اسلام عرب کے اخلاقی حالات، صبح سعادت کا طلوع، تعلیمات نبوی کے اصول، رسول اللہ صلعم کا پیغمبرانہ کام، اسلام اور اس کے عقائد پر تفصیلی اور حکیمانہ بحث، ضخامت ۷۰۰ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ [illegible]، تقطیع کلان،

ملنے کا پتہ:-

منیجر دار المصنفین شہر اعظم گڈھ،

مقالات

اردو کیونکر پیدا ہوئی،

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کیلئے لکھا گیا)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب سے ہم کو معلوم ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک مین کبھی ایک بولی نہین بولی گئی، درحقیقت یہ ملک ایک برّ اعظم ہے، جسمین ہر زمانہ مین مختلف قومین، اور مختلف نسلین جو مختلف بولیان بولتی تھین، آباد تھین، آباد ہین، اور آباد رہینگی، دنیا کی زبانون کی تین مشہور اصلین، آریائی، تورانی اور سامی تینون یہان دوش بدوش ملی جلی ملتی ہین، ڈریویڈی زبانون کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبون کی دوسری زبانین آریائی ہین، اور عربی کی شمولیت سامی اثر کا نتیجہ ہے،

چند مشہور راجاؤن کے زمانون کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصہ پر حکمران رہے، اکثر ہندوستان کا یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے مختلف مستقل ریاستون کی صورت مین رہے، ان صوبون کی وسعت راجہ کی قوت اور فتوحات کے دائرہ کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ہر ریاست کی زبان اس کے صوبہ کی مقامی زبان تھی، اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اب جسقدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا، اسی حد تک اس زبان کا جغرافی دائرہ کبھی گھٹ جاتا، اور کبھی بڑھ جاتا،

مثلاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی، برج کی بھاشا، مگدھ کی زبان، اطراف دہلی کی ہریانی یہ چارون ہمسایہ ہین مگر ان کی حدین اپنی سلطنتون کی حدون سے وابستہ نظر آتی ہین، مگدھ (بہار) کی بودھ سلطنت جسکا دار السلطنت

پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا، جب ہندوستان پر چھاگئی، تو اسکی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بنگئی، اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لیکر مہاراشٹر کے کنارون تک ملتے ہین،

ہندوستان مین سندھ سے لیکر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیون اور عربون کے جہازون کا گذرگاہ رہا، اور اسی کا اثر تھا کہ جہازیون کے ساتھ ساتھ انکی زبانون کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے، خصوصاً سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جزبنتا رہا، اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا، سندھ کے آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریہ کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جارہی ہے،

بہرحال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لیکر گجرات تک وسیع تھا، اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمہ کے قریب ساتوین صدی عیسوی مین فتح فارس کے بعد عربون نے بھی، ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے سندھ پر قبضہ کیا، اور ان کے جہازات خلیج فارس کے اُبلہ، سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہون سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملیبار ہوکر چین تک جانے لگے ان جہازون کے چلانے والے، فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہون سے یہ گذرتے ہون وہان انکی زبانون کے کچھ لفظ مستعمل ہوجائین، اور وہان کی مقامی زبانون کے کچھ لفظ ان جہازیون کی زبانون پر چڑھ جائین، چنانچہ اسکی مثالین عرب سیاحون اور ملاحون کی زبانون مین ملتی ہین، چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازون کے ذریعہ ہندوستانی زبان، افریقہ، عرب، عراق اور مصر کے بندرگاہون تک پہنچ گئی ہے، اور خود مجھے عدن، جدہ، پورٹ سعید، مصوّع اور پورٹ سوڈان مین ہندوستانی بولنے والے ملاح اور دوکاندار ملے،

اس موقع پر سب سے پہلا بیان ہمارے سامنے ایک ایرانی آمیز عرب جہازران بزرگ بن شہریار کا ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہازران ابو محمد حسن نے بیان کیا کہ

"مین ۲۸۸ھ مین منصورہ (بھکر) مین تھا، وہان مجھ سے مستند بزرگون نے یہ بیان کیا کہ الرا داور کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا، اور جسکی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیرین کے بیچ مین تھی اور جسکا نام

مہروگ بن رائق (؟) تھا، اُسنے ۲۷۰ھ مین منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اسکو بتائے، تو عبداللہ نے منصورہ مین ایک عراقی کو پایا جو بہت تیز طبع، اور خوش فہم تھا، اور شاعر تھا، اسنے ہندوستان مین نشو ونما پائی تھی، اور جو اہل ہند کی مختلف زبانون سے واقف تھا، اُسنے ایک قصیدہ لکھکر راجہ کو بھیجا، راجہ نے اسکو بلا بھیجا، اور اسکے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی زبان مین ترجمہ کیا[1]"

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کے سواحل مین بھی بہت سی مختلف زبانین تھین، اور وہ لوگ جنکی اصل زبان فارسی اور عربی تھی، وہ یہان کی زبانون کو سیکھتے اور بولتے تھے، اور ان مین یہ لیاقت رکھتے تھے کہ وہ ان مین شاعری کرسکتے تھے، اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کرسکتے تھے،

یہ ہندوستانی اور اسلامی زبانون کے باہمی اختلاط اور میل جول کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفرنامون اور تاریخون مین مذکور ہے، اس واقعہ کا زمانہ ۲۷۰ھ یعنی ۸۸۳ء ہے اور آج سے قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے کی بات ہے،

اس کے ۳۳ برس کے بعد مسعودی ہندوستان آتا ہے، وہ ۳۰۳ھ مین یہان آیا تھا، وہ ہندوستان کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے :-

"اس کے بعد ہند کے لوگون کے خیالات مختلف ہوگئے، اور مختلف گروہ پیدا ہوگئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کرلی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا، اور قنوج پر دوسرا راجہ ہوا، اور کشمیر مین تیسرا راجہ تھا، اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے، (گجرات و کاٹھیاواڑ) بلہرا (ولبھ رے) کی حکومت ہوئی، اور ابتک ہمارے زمانہ تک جو ۳۳۲ھ ہے، یہ راجہ اسی لقب سے ملقب ہے، اور ہند کی زمین بہت وسیع زمین ہے، خشکی، پہاڑ، اور دریا مین پھیلی ہے، ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوہ؟) سے ملتا ہے جو جزیرون کے بادشاہ "مہراج" کا دار المملکت ہے، اور یہ ملک ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہے، لیکن ہندوستان کیطرف منسوب ہے، اور دوسری طرف کوہستان سے متصل

[1] عجائب الہند، بزرگ بن شہریار ص۲ و ص۳ پیرس،

خراسان اور سندھ اور تبت تک ہی، اور ان (ہندوستانی) ریاستون مین باہم اختلاف اور لڑائیان مین اور انکی زبانین الگ الگ ہین، اور ان کے مذہبی خیالات مختلف ہین، زیادہ تر لوگ تناسخ اور آواگون کے قائل ہین، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے[1]۔

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال مین کہتا ہے:-

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے...... اور مانگیر کی زبان جو بلہرا (وبھ رائے) کا دارالسلطنت ہوگیری ہے، اور اس کے ساحلی شہرون جیسے چیمور، سوبارہ، اور تھانہ (موجودہ بمبئی کے پاس) کی زبان لاری ہے[2]"۔

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کوکن کی زبانون کی نسبت قدیم عربی شہادت ہے، اس کے بعد بغدادی سیاح اصطخری کا زمانہ ہے، جو ۳۴۰ھ مین آیا تھا، وہ کہتا ہے:-

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران والون کی زبان فارسی اور مکرانی ہے[3]"۔

بعینہ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفرنامہ مین ملتے ہین، اس کا زمانہ ۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک ہی، وہ کہتا ہی:-

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف مین عربی اور سندھی بولی جاتی ہے[4]"۔

۳۷۵ھ ۹۸۵ع مین بشاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان کے حال مین لکھتا ہے:-

"اور فارسی زبان سمجھی جاتی ہے[5]"۔

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ کے بندرگاہ کے حال مین لکھتا ہے،

"دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چارون طرف سو گاؤن کے قریب ہین،

---

[1] مروج الذھب مسعودی ج اول (پیرس) ص ۱۲۴ [2] ایضاً ص ۳۸۱ [3] سفرنامۂ اصطخری ص ۱۷۷، لائیڈن، [4] سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۳۲ لائیڈن، [5] سفرنامۂ بشاری معروف بہ احسن التقاسیم ص ۴۸۰، لائیڈن،

اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے، یہ سب سوداگر ہیں، اُن کی زبان سندھی اور عربی ہے"[1]

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے، وہ سندھ کی زبانوں کی نسبت جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے :-

"یہ لوگ مختلف زبانوں، اور مختلف مذہب والے ہیں، اور ان کے لکھنے کے کئی خط ہیں، مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ملک میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ اُن کے ہاں دو سو خط کے قریب مستعمل ہیں، میں نے (بغداد کے) قصر حکومت میں ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھے کہا گیا کہ یہ بودھ کی مورت ہے . . . . . اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا"[2]

اب وہ زمانہ آیا جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا، اور ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا، اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنین میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے، آمد و رفت، لڑائی بھڑائی، اور صلح و پیام کے لیے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع آگیا تھا، اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی[3]، اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی افغانستان و ترکستان میں گھر گھر پھیلے تھے، امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری قوموں کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے،

"و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شد، از ہند و خلج و از ہر دستی"[4]۔

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا، جو بچپن میں شیراز پہنچ گیا تھا، اور فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندوؤں کے ساتھ نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی،

"خطی نیکو بہندوی فارسی، و مدتے دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ . . . . . . و اورا دبیری و مترجمی کردی با ہندوان[5]"

---

[1] سفرنامۂ بشاری صفحہ ۴۸۰، [2] کتاب الفہرست مطبوعہ مصر ص ۴۸۴، [3] قابوس نامہ (۳۵۷ھ) باب در رسم بندہ خریدن، [4] تاریخ بیہقی ص ۲۴۲ و ص ۵۰۴ کلکتہ، [5] ایضاً ص ۵۰۳،

ابو الفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سبکتگین مین اپنے زمانہ یعنی سلطان مسعود (۴۲۱ھ تا ۴۳۳ھ) کے عہد مین اسی قسم کے ایک اور ہندو مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہی جسکا تعلق ان کے دفتر انشاء سے تھا،

"ہم چنان بیربل بدیوان ما[1]"،

سلطان محمود کے دربار مین جہان عرب و عجم کے اہل علم تھے، وہان ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے، کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۳ھ مین جب سلطان کی شان مین ہندی مین شعر لکھکر بھیجا، اس موقع پر فرشتہ مین ہی:-

"نندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعری گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آنرا بفضلاے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفرین کردند"،

یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہین ہوا تھا، اس زمانہ مین بھی سلطان کے دربار مین عرب و عجم اور ہند کے فضلا پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے، اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھین اور مزہ لین،

غزنوی بادشاہون کے زمانہ مین جب پنجاب غزنین کا صوبہ تھا، ہزارون لاکھون مسلمان جنکی زبان فارسی تھی، پنجاب مین بس گئے تھے، ظاہر ہے کہ ان مین اور عام اہل ہند مین بول چال اس طرح ہو گی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہون، اور چند روز مین یہ کیفیت ہو گئی کہ مسلمان ہندی مین، یا فارسی آمیز ہندی مین شاعری کرنے لگے، چنانچہ اس عہد کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان، المتوفی ۵۱۵ھ جو لاہور مین پیدا ہوا تھا، اور لاہور ہی مین رہتا تھا، اس نے ایک عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا دیوان یادگار چھوڑا،

"یکے بتازی، و یکے بپارسی، و یکے بہندی" (لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص ۲۴۶، گب)

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا، یہانتک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی مین رہ پڑا تھا، اسمین امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ دان شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی، فارسی، ہندی مین علحدہ علحدہ بھی اور تینون زبانون کے مصرعون کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھون نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ مین اس پر فخر کیا ہے،

---

[1] تاریخ بیہقی ص ۵۰۰، کلکتہ، ص ۵۰۰ مطبوعہ نولکشور ص ۳۱۱، جلد اول،

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیوں کے نام لیے ہیں،

سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (گوڑ بنگالہ کا ایک حصہ) گجراتی، تلنگی، معبری (کرناٹکی جسکو کنڑی کہتے ہیں) دھور سمندی (دھور سمندر کارومنڈل کا پایہ تخت تھا جو اس زمانہ میں نیا فتح ہوا تھا) اودھی، اور دہلوی،

یہی زبانیں تھوڑے تھوڑے فرق سے اب بھی موجود ہیں، امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں، ابو الفضل ہندوستان کی مستقل زبانوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے[1]،

دہلوی، بنگالی، ملتانی، ماڑواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شالی (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے) بلوچستانی، اور کشمیری،

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس ملک میں ہر زمانہ میں صوبہ وار بولیاں بولی جاتی تھیں، اور اسمیں کوئی ایک عام اور مشترکہ بولی نہ تھی، اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدرتی طور سے ایک زبان تیار ہو رہی تھی،

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی، ملک میں زبانوں کے اختلاف کا یہی حال رہا، کہ ایک صوبہ کا رہنے والا، دوسرے صوبہ کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا،

خیال کیا جاسکتا ہو کہ ایسا ملک جسمیں کم از کم تیرہ مستقل زبانیں بولی جاتی ہوں، اس کو ایک مملکت، ایک حکومت اور ایک ملک کیونکر قرار دیا جاسکتا تھا، اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لیے ایک متحدہ و مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی، یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا، اور اس کو ترقی دی،

اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان، سندھ، گجرات، اودھ، دکن پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے ملکر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی جنہیں خصوصیت کیساتھ ذکر کے

[1] آئین اکبری جلد سوم "زبانہا" ص ۵۴ نولکشور،

قابل، سندھی، گجراتی، دکھنی (اردو) بولی ہین، جن صوبون کی بولیون کو الگ وجود نہین بخشا گیا، ان مین بھی یہ ابتک ماننا پڑتا ہے کہ انکی دو قسمین ہین، ایک مسلمانی اور ایک خالص دیسی، چنانچہ بنگالی، مرہٹی، کنڑی، تلنگی، ملیالم، ہر ایک مین مسلمانی بولی خالص بولی سے الگ ہے، مسلمانی بنگالی، مسلمانی مرہٹی، مسلمانی تلنگی، خالص بنگالی، خالص مرہٹی اور خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے، یہ امتیاز بھی ہے کہ مسلمان ان صوبہ دار بولیون مین عربی و فارسی لفظون کو ملا کر بولتے ہین، اور ان صوبون کے اصل باشندے اُن کو خالص اور بے میل بولتے ہین،

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبہ کی مقامی بولیون مین مسلمانون کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی، مسلمانون اور ہندؤن کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے سب سے پہلے ملتان سے لیکر ٹھٹھہ تک سندھ مین اور پھر یہان سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا ہوگا، اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ مین فیروز شاہ تغلق کے عہد مین سندھ مین ملتا ہے، سنہ مذکور مین سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کرکے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والون نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھکر کہا،

"برکت شیخ تھیا، اک مُوا، اک تھا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی، کہ ایک حملہ آور (سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ مین حملہ کیا تھا) مرگیا، اور دوسرا (سلطان فیروز شاہ تغلق) ناکام رہا،

عبارت سے یہ آئینہ ہے کہ اس زمانہ (۷۶۲ھ) مین عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیون کا مجموعہ جس کو آج آپ اردو کہتے ہین پیدا ہو چکا تھا، ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قومون کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا، اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا تھا، اس زبان کی پیدائش کی اور پیدائش کی نہ سہی، تو اس کے قیام، بقا، اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھکر یا کم ایک اور ہے، مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمران ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جسکا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک مین کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترک زبان

موجود نہ تھی، لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ، ناخواندہ اور عوام کے لیے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت اور کاروبار مین کارآمد ہو، اور بعینہ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے،

اردو نام | زبانِ اردو کی تاریخ کے متعلق میرامن اور سرسید اور دوسرے پرانے بزرگون نے جو بیان سنایا تھا، وہ اب پایۂ رفیعہ سمجھا جاتا ہے، اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابین لکھی گئی ہین جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گذار راستہ بہت کچھ صاف ہوگیا ہے، اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے، اور آج سے پانچسو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہین، اور تیموری بادشاہون سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابین مہیا کیگئی ہین، اور اب چہار درویش کے مصنف میرامن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگون کی کہانی سمجھتے ہین،

"حقیقت اردو زبان کی بزرگون کی زبان سے یون سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوون کے نزدیک چوجگی ہے، انھین کے راجا پرجا قدیم سے وہان رہتے تھے، اور اپنی بھاکا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانون کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانون نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے مین اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر مین داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا، . . . . جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چارون طرف کے ملکون سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سنکر حضور مین آکر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکھٹے ہونے سے آپس مین لین دین، سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی،

جب حضرت شاہجہان صاحب قران نے قلعۂ مبارک، اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا . . .

. . . . . تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جدی ہے اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر

کہاجاتا ہے اور وہان کے بازار کو اردوی معلی خطاب دیا؛

لیکن میرے نزدیک ان چند سطرون مین اردو کی جو تاریخ بیان کیگئی ہے، وہ اشخاص کے نامون کو چھوڑکر سرتاپا حقیقت ہے، آجکل بعض فاضلون نے "پنجاب مین اردو" اور بعض اہل دکن نے "دکن مین اردو"، اور بعض عزیزون نے "گجرات مین اردو" کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبہ کی مقامی بولی مین مسلمانون کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے، ان سب کا نام "اردو" رکھا گیا ہے، حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکھنی، یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہئے، جیسا کہ اس عہد کے لوگون نے کہا ہے، یہ تغیرات جب ممتاز صوبون مین ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی مین تو اور زیادہ ہوتے،

امیر خسرو اور ابو الفضل دونون نے "دہلوی زبان" کا الگ نام لیا ہے، عہد شاہجہانی مین جب یہان اردوئے معلّی بنا، تو اُس "زبانِ دہلی" یا زبانِ دہلوی کا نام، "زبانِ اردوئے معلّی" پڑگیا، چنانچہ لفظ اردو زبان کے معنی مین دہلی کے علاوہ کسی صوبہ کی زبان پر اطلاق نہین پایا ہے، میر تقی میر کی تحریری سند مین جب اسکا نام پہلی دفعہ آیا ہے، تو اصطلاح کے طور پر نہین، بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے، یعنی میر نے "اردو زبان" نہین کہا، بلکہ "اردو کی زبان" کہا ہے،

ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبانِ اردوے معلّی بادشاہ ہندوستان " (ذکر میر ص۶۳)

"بادشاہِ ہندوستان کے کیمپ یا پایہ تخت کی زبان"

اس کے بعد عام استعمال مین زبان اردو کے بجاے خود زبان کا نام اردو پڑگیا، اور پھر یہ اردوی معلّی سے نکل کر ملک مین ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی، جس اصول پر ہندوستان مین ہمیشہ راجدھانی کی بھاکا، تمام حدودِ سلطنت مین پھیلتی رہی ہے،

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطرون مین اسکو بار بار "نئی زبان" کہا ہے، مگر کیا حقیقت مین اسکو نئی زبان کہنا چاہیئے؟ ہم جسکو آج اردو کہتے ہین، حقیقت مین وہ دہلی اور اطرافِ دہلی کی وہ پرانی

بولی ہے، جو وہان پہلے سے بولی جارہی تھی، اور جسمین زمانہ کے قاعدہ کے مطابق انقلاب، اتار چڑھاؤ، اور خرابی ہو ہو کر لفظون کی مناسب صورت بنگئی،

ہر زبان تین قسم کے لفظون سے بنتی ہے، اسم، فعل، اور حرف، اس بولی مین جس کو اب اردو کہنے لگے ہین، فعل جتنے ہین وہ دہلوی ہندی کے ہین، حرف جتنے ہین ایک دو کو چھوڑکر وہ ہندی کے ہین، البتہ اسم مین آدھے اس ہندی کے، اور آدھے، عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ ہین، اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہین جن کے مسمّٰی ان باہر کے ملکون سے ہین، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی) پادری، الماری، وغیرہ،

اس لئے اردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) مین صرف دو فرق ہین، دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہگئی، لیکن اسی ہندی مین اس وقت کے نئے ضروریات کے بہت سے عربی، فارسی، اور ترکی کے وہ الفاظ آکر ملے، جنکے معنی اور مسمّٰی ان ملکون سے آئے تھے،

دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط مین، اور یہ اردو فارسی خط مین لکھی جانے لگی،

رفتہ رفتہ ایک اور فرق بھی پیدا ہوا کہ پرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے، زمانہ اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان مین ہلکاپن، خوبصورتی اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کیگئی، اسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظون مین بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیان کین، اردو نے ہندی کے لفظون مین اس قسم کا جو تغیر کیا ہے، اسکی چند مثالین یہ ہین :-

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گنٹر	گُن	جیو	جی
براہمنٹر	برہمن	شکتی	سکت
راونڑ	راون	رکھشا	رکھ
دواہ	بیاہ	پونچا	پہنچا

ہندی	اردو	ہندی	اردو
جیشٹھ	جیٹھ	کِنتو	کیونکہ
ورش	برس (سال)	مائی	مان
پرنتو	پر (دگر)	سمے	سمان
اوچت	اچھا	دیش	دیس
سمبندھی	سمدھی	لکھشن	لچھن
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناس (خراب)
ویچار	بچار	اگنی	آگ
کھشتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلامانُس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا سانچ	سچ
ورشارُت	برسات	کُٹُمب	کٹم (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا
ہستی	ہاتھی	پانین	پانی
بادر	بادل	دودھے	دہی
دُدّھ	دودھ یا دود	گھرت	گھی
نا	نہ	بھِنّ بھِنّ	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا، اور ہمیشہ آمد ورفت لگی رہتی تھی، اسلئے اس دہلوی ہندی مین سینکڑون لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبون کی بولیون سے آکر رفتہ رفتہ رُل مل گئے، خصوصًا پنجابی اور دکھنی لفظون

کی آمیزش زیادہ ہوئی،

کہین یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونون کے ہم معنی لفظون کو ایک جگہ کرکے بولنا شروع کیا، تاکہ دونون زبانون کے الگ الگ جاننے والے، ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لین، جیسے دھن دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق، ہنسی خوشی، بھائی برادر، رشتہ ناتہ، داغ دھبہ، دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رسم، کبھی فارسی لفظ مین ذرا ہندی پن پیدا کر دیتے ہین جیسے جن، مجور یا مزدور (یعنی مزدور، لونڈی باندی (بندی، بندہ بمعنی غلام)

ان دونون کو دونون زبانون کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لئے یہ چاہئے کہ ان دونون کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنالین، جنکو دونون نباہ لیجائین،

تاریخ صقلیہ جلد اول

از مولوی سید ریاست علی ندوی، رفیق دار المصنفین، سب اڈیٹر معارف،

مسلمانون نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی، اور اسپین کیطرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا اور تقریباً پانچ سو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہر کہ اسکی کوئی تاریخ اردو، انگریزی مین کیا عربی مین بھی موجود نہ تھی مصنف نے چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش اور تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدون مین اسکی تاریخ مرتب کی ہر جو اردو کیا مشرقی زبان مین سسلی کی سب سے پہلی اسلامی تاریخ ہو، اسکی پہلی جلد شائع ہوگئی ہو، جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہو، اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی اٹلی اور جزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام عہد بعہد کے دورون کا عروج، اسلامی حکومت کا خاتمہ اور صقلیہ اور جزائر صقلیہ مین مسلمانون کے مصائب اور جلا وطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہو، ضخامت مجموعی ۷۰۰ صفحے، علاوہ متعدد رنگین نقشہ جات، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، قیمت صرف للعہ

"منیجر"

وجودِ روح "روحانیین" کے نقطۂ نگاہ سے[1]

از جناب محمد اصغر صاحب، انصاری، بی اے بھوپال،

ارباب سائنس اپنے حواس اور آلات اور غور وفکر کے ذریعہ سے اشیار کی اصل حقیقت کا پتہ چلانے کی سعی مین مشغول ہین، اور اس نتیجہ پر پہنچے ہین کہ ہماری یہ زمین جسپر ہم بستے ہین اس نظام شمسی مین چندان اہمیت نہین رکھتی ہمارا یہ عالم مشہود اپنے اندر ایک لا انتہائیت رکھتا ہے، ان ارباب علم کو ایسی بیشمار دنیاؤن کا پتہ معلوم ہوگیا ہے جو اس فضائے بسیط مین پھیلی ہوئی ہین، جنکے مقابلہ مین ہمارا کرۂ خاکی یکسر ناقابلِ لحاظ ہے، اجرامِ ساوی کے متعلق یہ تخیل گو نسبتہً ایک جدید خیال ہے، لیکن اس نے انسانی افکار مین ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا ہے، اس لئے یہ چندان تعجب خیز نہین ہے کہ ابتداءً اصحاب غرض نے اس نظریہ کی مخالفت کی جسمین سے بعض کا تعلق مذہبی گروہ سے تھا اور بعض ایسے لوگ بھی شامل تھے جو محض اسلئے مخالف ہوگئے تھے کہ فہم سادہ کے نزدیک یہ بات لائقِ قبول نہ تھی کہ ہماری یہ زمین بھی منجملہ ان دیگر سیارون کے ایک سیارہ ہے جو اس فضا مین گردش کر رہے ہین، اب ہم رفتہ رفتہ اس جدید نظریہ کے عادی ہوگئے ہین لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اب بھی بہت ہی کم نفوس ایسے ہونگے جنپر یہ امر اچھی طرح واضح ہو کہ ہم اس کائناتِ خلقت کے بحرِ زخار مین ایک قطرہ سے زیادہ نہین ہین، اور اس لئے یہ دعوی کسقدر طفلانہ ہے کہ انسان جو چیونٹی کی طرح اس کرۂ ارضی پر رینگتا ہوا نظر آتا ہے، اور جسکی پیدائش کو ہنوز چند ہزار سال سے زیادہ عرصہ نہین گذرا، وہ اصل حقیقت کا شناسا ہے، ہم انسانون کی یہ توقع ہی بیجا ہے کہ ہم اس محدود علم و تجربہ کے باوجود "اس ذات" اور اس "مشیئت" کی بابت کوئی عرفان صحیح رکھ سکتے ہین جو اس "تمام" مین ساری ہے، ہم ہنوز غور کر رہے ہین، تاریکی مین ٹٹول رہے ہین، لیکن ہان یہ امید ضرور رکھتے ہین کہ تدریجاً حقیقت سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے ہے

[1] اس مقالہ کے ابتدائی حصص سر الیور لاج کی کتاب سے ماخوذ ہین،

ہین، غور کرو کہ باوصف فکر و ادراک کی اس نارسائی کے اگر ہم بحث و اختلاف کا غوغا بلند کرین تو یہ کہانتک ہمارے حالات کے مناسب ہوگا، اس کے قطعاً برخلاف ہمارا طرز عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ اس ہنگامۂ اقرار و انکار کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ اس لئے تعاون عمل کرین کہ اصل حقیقت کی بابت ہم سب کا علم وسیع تر ہو جائے اور ہمارا اصل مقام اور ہماری زندگی کا اصل مقصود ہم پر منکشف ہو جائے، لیکن خود اس اعتماد و یقین کے لئے کہ اس کائنات مین ہمارا وجود بھی یک گونہ اہمیت رکھتا ہے ہمکو قوت ایمانیہ کی ضرورت ہے، وہی قوت ایمانیہ جو ہماری تمام قوتون کی اصلی محرک ہے جو تمام علمی اکتشافات کی اصل بنیاد اور فنون لطیفہ کے تمام کارنامون مین قدر و قیمت پیدا کرنے کی موجب ہے اور مذہب کا اصلی مبنیٰ اور اس کے لئے بمنزلۂ قلب و روح ہے،

جب اس کائنات پر خالص سائنس کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی جاتی ہے تو اسمین شک نہین کہ سائنس مین کہین بھی خدا کا لفظ استعمال نہین کیا جاتا بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ ایسے آخری علل و اغراض تک پہنچنے سے اعراض کرتی رہتی ہے جو اس کے موضوع سے باہر ہون لیکن بہرحال اس نے بعض ایسی باتین ضرور بتلا دی ہین جو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اہم و مفید ہین،

پہلی بات جو سائنس نے بلا کسی ادنیٰ شک و ریب کے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا مین زندگی بسر کر رہے ہین جو تمامتر قانون و نظم سے منسلک ہے، یعنی اس عالم کا ہر ذرہ ان مؤثرات کا تابع فرمان ہے جو اس پر عارض ہین، اس فطرت مادی مین کہین بھی کسی طرح کا تلون یا تفاوت نہین پایا جاتا، یہی سبب ہے کہ ہم معلول سے علت کا پتہ چلانے مین کوئی غلطی نہین کرتے، فطرت کا تمام کاروبار قطعاً مستقل اور یقیناً لائق اعتماد ہے، کہین بھی تم کو ادنیٰ ترین تبدل یا انحراف نظر نہ آئے گا، الغرض جہانتک اس کائنات کا مطالعہ سائنس کر چکی ہے اور قوانین فطرت کو معلوم کر سکی ہے اس مین کہین بھی کوئی فتور یا تضاد نہین پایا جاتا، فطرت تمامتر نظم اور سب سے بالاتر ہے،

دوسری بات جو سائنس نے ہم کو بتائی ہے وہ یہ ہے، کہ گو اس کائنات کی بابت ہمارا علم ازمنۂ سابقہ

کے مقابلہ مین بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے تخیل وگمان سے بھی کہین زیادہ بڑھ گیا ہے،
لیکن اس وسعتِ علم کے باوجود بھی ہم اس کائنات کی وسعت کا کوئی اندازہ نہین کر سکتے، اس فضائے بسیط
کا ہر ستارہ کم وبیش ہمارے اس آفتاب ہی کی طرح بڑا ہے، یہ کہکشان جسمین اربون کی تعداد مین ستارے
پائے جاتے ہین، نظام سماوی مین ایک حقیر نقطہ سے زیادہ نہین ہے اور گو بذاتہ اس قدر طویل وعریض ہے کہ
اس کے حجم کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، لیکن ہم کو اس سے زیادہ فاصلہ پر ایسی متعدد کہکشائین نظر آتی ہین جنمین
سے بعض اتنی ہی بڑی ہین جیسی یہ ہماری کہکشان، گویا وہ بذاتِ خود ایک کائنات معلوم ہوتی ہین اور اس ناپیدا
کنار فضا مین اس قدر بعید فاصلہ پر واقع ہین، کہ خود یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ ہم کو ان کا علم کیونکر ہوا، محض بڑی بڑی
دوربینون اور فوٹوگرافی کی انتہائی ترقیون کے باعث ہم کو ان مین سے اکثر کی جھلک معلوم ہوئی ہے، بہرحال ہم انمین
اس کا اندازہ تو کر سکتے ہین کہ سیارات و ثوابت کی ان دنیاؤن سے جو روشنی چلکر بالواسطہ اب ہم تک پہنچ رہی ہے،
اسکو چلے ہوئے بھی کڑوڑون برس ہو گئے ہین، تم تنہا اسی واقعہ سے اس کائنات کی وسعت ولاانتہائیت کا تصور
کرو، کیا محض مادی نقطۂ نظر سے بھی یہ کائنات اور اس کائنات کی یہ پہنائی مرعوب کن نہین ہے؟ لیکن یہ بات
یہین تک ختم نہین ہو جاتی بلکہ حیرت تو یہ ہے کہ کیمیا، اور طبعیات کے وہ قوانین جو اس کرۂ ارضی مین عمل پیرا ہین وہی
قوانین طبعی اس تمام وسیع وعریض فضا مین بھی جس کا ابھی ذکر ہوا پورے پورے عامل ہین، وہی اجزائے
لایتجزی جو یہان پائے جاتے ہین وہی اس تمام کائنات مادی مین پھیلے ہوئے ہین، اور یکسر ایک ہی قانون
کے مطیع ومنقاد ہین، حرارت ونور کے انعکاس واشعاع کا جو عمل ہماری اس دنیا مین جاری ہے وہی عمل بعید ترین
ثوابت اور سیارون مین بھی پایا جاتا ہے، الغرض سائنس کا فتوی یہ ہے کہ جو عمل طبعی یہان جاری ہے وہی
تمام کائنات مین جاری ہے، کہین بھی ادنی ترین تضاد وتخالف نہین ہے، سائنس کا یہ فتوی اگر کسی نتیجہ تک
ہماری رہبری کرتا ہے وہ صرف ایک ہی ہے، یعنی یہ کہ تمام کائنات فی حد ذاتہ ایک ایسی وحدت تامہ ہے،
جس مین باہم کوئی تضاد وتنافر نہین ہے، وہ ایک ہی قانون ہے جو اس کل مین یکسان عامل ہے، پس اگر کوئی

ایسا وجود ہے جسکو ہم خدا کہکر پکارتے ہین، اور اگر وہ کارساز اور علیم ہے تو یقیناً وہ اس تمام کائنات کا علیم و کارساز ہے، ہماری دنیا کا خدا محض اسی دنیا کا خدا نہین ہے بلکہ تمام ارض وسموات کا خدا ہے اور یقیناً اسکی قدرت اس کائنات کے بعید ترین حدود پر بھی یکسان طور پر حاوی ہے، اور باوصف اس وسعت کے چھوٹی سی چھوٹی جزئیات بھی ایسی نہین جو اس کے علم و توجہ سے بے نیاز ہون، اس عظیم المرتبت ذات واحد کی معرفت مین ہم خواہ کتنے ہی ناقص کیون نہ ہون لیکن ہمارا وجود، عالم مادی اور روحانیت کا یہ تمام نظام، الغرض ہر شے اسی سے ہے اور اسی کے لئے ہے، سائنس رفتہ رفتہ ہم کو اسی منزل کی طرف لیجا رہی ہے، مذہب کا منتہائے نظر بھی یہی ہے، اختلاف مقصود کا نہین صرف طریق عمل کا ہے،

"وجودِ روح کے امکانات"

سائنس کا محدود میدان عمل یہ یقین کہ ایک ذات واحد کا وجود اس تمام موجودات کی علت یا مبدا ہے، ہمارے اس یقین مزید کا بھی موجب ہے کہ انسانی روح فناپذیر نہین ہوتی؛ ایک ایسی ذہین وذکی مخلوق کا معرض وجود مین لانا جو "سچائی" کی ساعی اور "خیر" کی آرزومند اور "جمال" کی جویان ہو اور جسمین "یقین" و "امید" اور "محبت" جیسے اعلیٰ صفات ودیعت کئے گئے ہون اور پھر ان تمام خوبیون کے بعد وہ بالآخر فنا کردیجائے، یہ فنا اور یہ اختتام بھی ایسا ہو جس سے آیندہ کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوتا ہو، یہ صورت حال یقیناً قوت تخلیق کی انتہائی اضاعت اور ایک ایسی ستم ظریفی ہے جو ہرگز کسی ایسی ذات کی طرف عقلاً منسوب نہین کیجاسکتی جو لائق عظمت وعبادت قرار دی گئی ہو، چنانچہ مذاہب جو ہمیشہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہین وہ اس پر بھی مجبور تھے کہ بقائے انسانی کے مسئلہ کو بھی حق تسلیم کرین، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا سائنس کے طریق تحقیق کی بنا پر بھی یہ ثابت کیا جاسکتا ہے یا نہین کہ انسان اس ظاہر ظہور کے اختتام کلی یعنی "موت" کے بعد بھی زندہ رہتا ہے یا نہین،

غیر متعین اور مبہم طور پر توحیات بعد الموت کا عقیدہ ہمیشہ سے نسل انسانی کے سامنے رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ یقین ہماری جبلت مین داخل ہوگیا ہے، یہی باعث ہے کہ کسی نہ کسی شکل مین اس عقیدہ

کو ہر ملک و ملت مین تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سائنس مین اب تک کبھی بھی اس خیال نے کوئی جڑ نہین کپڑی بلکہ اسکے برعکس ابتک یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ مسئلہ اپنے اندر ایسی نوعیت رکھتا ہے جس سے وہ آرٹ یا مذہب سے تو متعلق ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے جسمانی تجربات کے ٹھوس واقعات کے مطابق نہین ہو سکتا،

اہل سائنس مین ہمیشہ سے ایک گروہ کا یہ خیال قائم رہا کہ جوہر حیات (یعنی روح) کا تمامتر وجود ہمارے دماغ و قلب اور دیگر اعضا کے صحیح فعل و عمل پر مبنی ہے، یہ اصحاب ہمارے افکار ذہنی اور تخیلات کو حواس ظاہری کا اس درجہ پابند و مقید باور کرتے ہین کہ ان کے نزدیک کسی ایسی حیات بخش قوت (یعنی روح) کا کوئی پتہ نہین ہے، جو اعضا و جوارح سے جداگانہ کوئی مستقل بالذات وجود رکھتی ہو، یہ لوگ قوت شعور و ادراک یا قوت استدلال کے منکر نہین ہین، ان قوا کو وہ خود کام مین لاتے رہتے ہین، لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ شعور، ادراک یا استدلال در اصل اس مستقل بالذات وجود کے باعث ظہور مین نہین آتے، جسکو عوام "روح" سے تعبیر کرتے ہین، بلکہ یہ مظاہر ہمارے جرم دماغ کے جسمانی فعل و انفعال کے سوا اور کچھ نہین ہین، وہ ان حدود سے باہر جانا نہین چاہتے جہان ان کی خوردبینین یا دیگر آلات کام مین نہ آسکین، اسی لئے وہ ان میدانون سے گریزان رہتے ہین جنکا تعلق تصوف یا اسرار مذاہب سے ہے، دوسرے لفظون مین یہ کہنا چاہئے کہ وہ ان مباحث مین نہین پڑنا چاہتے جنکا تعلق مابعد الطبعیات سے ہو جو کبھی بھی مشاہدۂ حواس مین نہین آسکتے، وہ صرف محسوس اور مشہود اور ایسی چیزون سے بحث کرتے ہین جو آنکھون سے دیکھی اور کانون سے سنی اور ہاتھون سے چھوئی جاسکتی ہون، بعبارت مختصر ان کا دائرۂ عمل صرف طبعیات ہے، اور چونکہ خود طبعیات کی دنیا بھی کافی وسیع اور دلچسپ ہے اس لئے ان مین کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا کوئی میلان ہی پیدا نہین ہوتا، ان کا ادعا یہ ہے کہ کوئی روحانی یا نفسی وجود بغیر طبعی و کیمیاوی سلسلۂ اعمال کے بذاتہ کوئی معنی نہین رکھتا، ان آخر الذکر مظاہر کی جزوی تفصیلات کے افہام و تفہیم ہی تک ان کے تمام مساعی محدود رہتے ہین، وہ بزعم خود اجسام مادی کے سالمات ہی کے طریق کار کو کافی و وافی سمجھتے ہین، اور یہ باور کرتے ہین کہ جس چیز کو شعور یا زندگی کہا جاتا ہے وہ محض انھین اجسام

مادی کے عمل کیمیائی کا نتیجہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہین ہے،

بقائے روح یا ایک ایسی ہستی برتر کے وجود کے بارہ مین جو تمام کائنات کی ذمہ دار ہے ان کا خیال یہ ہے کہ یہ مسائل کسی دوسرے ہی شعبہ سے متعلق ہین اور گو وہ ان خیالات کی بھی کچھ نہ کچھ عزت کرتے ہین، کیونکہ بحیثیت انسان ہونے کے وہ اُن جذبات وحسیات سے متأثر ہوئے بغیر نہین رہ سکتے جو پوری انسانی جماعت پر عامل ہین، لیکن ان کے نزدیک اس قسم کے مذہبی تخیلات خالص سائنس کے نقطۂ نظر سے قطعاً بے معنی ہین اور اس کی صاف وجہ یہی ہے کہ یہ امور نہ تو احاطۂ حواس مین آتے ہین اور نہ کسی معمل مین انکی ناپ تول کیجا سکتی ہے، اور چونکہ "الہام" بھی علم طبعی کے حدود مین نہین آتا اس لئے وہ اس سے بھی کوئی تعرض نہین کرتے،

بیشک انھون نے اپنے دائرۂ عمل کو محسوس ومشہود امور تک محدود کرنے مین اپنے کام کو بہت آسان کر لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس خاص صنفِ علم مین بڑی حد تک ترقی کرتے چلے جارہے ہین، مادہ اور مادہ کے مختلف احوال ومظاہر کا ان کو بہت کچھ علم حاصل ہوگیا ہے جو محض غیر عضوی اجسام ہی تک محدود نہین ہے، بلکہ اجسام عضوی کو بھی دائرۂ تحقیق مین لے لیا گیا ہے، اس تمام فضاء کے اجرام سماویہ اور جوہرون کے متعلق ہمارا علم وسیع تر ہوتا جارہا ہے، اور یہ طریق تحقیق واکتشاف اس درجہ کامیاب ہے کہ سائنس نہ صرف رائل سوسائٹی (ROYAL SOCIETY) کے بانیون بلکہ جماعتِ انسانی کی توقع سے بھی کہین زیادہ ترقی کرگئی ہے،

اس مین شک نہین کہ جہانتک مادیات کا تعلق ہے ان محققانِ فن نے انتہائی صبر ومحنت سے کام کیا ہے، اور یہ تمام تر سعی یقیناً دریافتِ حق کے لئے کی گئی ہے، خود یہ میدان اسقدر طویل وعریض اور ایسی بیشمار دلچسپیون کا مرکز ہے کہ ان اصحاب کو دوسری طرف نگاہ اٹھانیکی آرزو ہی پیدا نہین ہوتی، ہماری آیندہ نسلون کی پوری زندگی انھین محدود خطوط پر کائنات کے نوامیس کی جستجو اور دریافت مین صرف ہوجائیگی، دراصل اس عالم کا مادی رخ بھی ہوش ربا ہے، ہمارا علم مسلسل بڑھ رہا ہے اور کہین ختم ہوتا نظر نہین آتا، جس قدر ہم زیادہ جانتے جاتے ہین اتنا ہی زیادہ ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ہنوز بہت کچھ جاننا باقی ہے، گویا یون کہنا

چاہئے کہ اس مادی سمت مین بھی ایک طرح کی لاانتہائیت ہے لیکن دوسری طرف کاروباری اصحاب، ارباب فن وادب، اہل مذہب اور دیگر پیشہ ور جماعتون نے اپنی قابلیتون اور استعدادون کو دوسرے نہج پر تربیت دیا ہے ان کو سائنس کی تحقیقاتون کا بہت ہی کم علم ہے لیکن وہ ایسے عالم مین کام کرتے ہین جہان سائنس کے علاوہ دیگر انسانی اعتبارات مافوق نظر آتے ہین، جہان اس کائنات کا ایک دوسرا ہی رخ نمایان ہوتا ہے، ہماری مراد انسانی زندگی کے اس پہلو سے ہے جہان "یقین" "امید" اور "خیر" جیسے اعلیٰ مقاصد معرضِ بحث مین آتے ہین، لاریب یہ مقاصد اپنے اندر ایسے ہی حقائق اور اسی قدر دلچسپیان رکھتے ہین جیسے کہ سائنس کے مسائل،

بات دراصل یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے ہر شعبہ مین ناپیدا کنار ہے، تم جس طرف بھی جاؤ جس شعبہ کی طرف بھی رخ کرو تمہاری ترقیون کی کوئی انتہا نہین ہے، کشفِ حقائق کا سلسلہ کہین بھی ختم نہین ہوتا مگر ہان نوامیس فطرت ہم پر یکبارگی آشکارا نہین کئے جاتے، اس حسن سرمدی کے چہرہ سے نقاب تدریجاً ہی اٹھ رہی ہے، کہ ہماری استعداد ذوق کی رعایت کا تقاضا یہی ہے، اگر وہ جمالِ محجوب بیک وقت بے نقاب ہو جائے اور یہ جلوۂ ناتمام یکسر تمام ہو جائے تو پھر تفریق و امتیاز کی تمام ہنگامہ آرائیان، عشق و محبت کی تمام سوزشین، تحقیق و کاوش کی تمام تگ و دو ایک تعجب انگیز حیرت مین بدل جائینگی ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ اُن کے جلوہ نے
کرے جو پر تو خورشید عالم شبنمستان کا

لیکن انسان مین ذوق علم و معرفت ودیعت کیا گیا ہے، اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ جہان وہ فطرت کو اس کے مختلف شعبون اور حالات مین دیکھنے کا طالب ہے وہان ایک چھپی ہوئی لیکن بہت زیادہ قوی یہ آرزو بھی کام کر رہی ہے کہ وہ حسنِ فطرت کو اپنے بسیط عالم مین یعنی تعینات کی حدود سے باہر دیکھے، ایک فلسفی بخلاف دیگر محققینِ علم و فن اسی آخر الذکر جذبہ کا مظہر ہے، اسکی تمامتر جد و جہد یہی ہے کہ حقیقت کے جتنے بھی شعبے اور شاخین ہو سکتی ہین ان سب کو یکجا کرے اور ان سب مین باہمی ایک ایسا ربط دریافت کرے جو ان مختلف

علوم و فنون کو بہ اعتبار حقیقت کے ایک بنا دینے والا ہو، ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لیے ہماری سعی کی ابتدا بہت سادگی سے ہوگی اور شروع مین ہم اپنے آپ کو بعض مخصوص نظائر اور بعض ایسے ہی مخصوص واقعات تک ہی محدود رکھنے پر مجبور ہونگے لیکن جون جون ہماری معلومات مین اضافہ ہوتا جائیگا اور ہم علوم و فنون کے باہمی ربط کی کڑیون کا پتہ چلاتے جائین گے تب یہ واضح ہوگا کہ کشف و تحقیق کے یہ مختلف راستے دراصل ایک ہی منزل تک لیجانے والے ہین یا ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہین،

ہم کو اپنے اندر واقعات کے احترام کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے، ایک منفرد واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حقیقت کیون نظر نہ آئے، لیکن یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جب اس نوع کے بہت سے واقعات معلوم ہوجائین گے اور ہم ان کو ایک مناسب ترتیب کیساتھ جمع کرلین گے تو یہی بے حقیقت واقعات ایک مستقل علم و فن بنجائین گے،

عالم ارواح کے وجود کے متعلق جو واقعات اور شہادتین اب فراہم ہوتی جارہی ہین اگوحیثیت علمی نقطۂ نظر سے ہنوز چندان اہم نہ ہون، لیکن ہم کو جلدبازی اور تعصب سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ صبر و تامل کیساتھ ایک فلسفیانہ وسیع النظری سے ان کی تنقیح و تدوین مین مشغول ہوجانا چاہئے، اور پھر ایک کھلے ہوے دل و دماغ کے ساتھ ظہور نتائج کا منتظر رہنا چاہئے،

بعض لوگ اس کے شاکی ہین کہ وہ واقعات جنپر ہم اپنے نتائج مبنی کرتے ہین، بیشتر کم وزن ہین، لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بظاہر بے وزن واقعات مین کیا اہمیت پیدا ہوجائیگی اگر ہم باقاعدہ ان کے مطالعہ مین مشغول ہون اور ان کے سمجھنے کی واقعی سعی کرین، ایک نشان یا پا یا دھوئین کا ایک دھبہ کس قدر بے حقیقت ہے، لیکن یہی چیز پولیس کے سراغرسان کے لیے بہت اہم ہوجاتی ہے،

"انجمن تحقیق روحانیات" ۱۸۸۲ء مین قائم ہوئی تھی تاکہ وہ ان ان گنت شہادتون اور واقعات کی جانچ اور تحقیق کرے جو سننے مین بہت آتے تھے لیکن کبھی ان کی علمی طور پر تحقیقات نہ کی گئی تھی، لیکن جب ان امور کی تنقیح کیگئی اور موانعات اور دقتون کے باوجود صبر و استقامت کیساتھ تجربات کا

سلسلہ جاری رکھا گیا تب ہمکو اپنی نئی قوتون اور نئی استعدادون کا پتہ چلا اور ان واقعات کی سچائی متحقق ہوئی جواب تک تاریکی یا قصہ کہانیون کے گرد و غبار مین چھپے ہوئے تھے، بیشک ہم کو دھوکون اور فریبون سے سابقہ پڑا لیکن ہم اس سے دل شکستہ نہ ہوئے چنانچہ تدریجاً اہل علم مین یہ یقین پیدا ہو رہا ہے کہ وہ عقیدے جو تمام دنیا مین پھیلے ہوئے ہین گو توہمات سے ملوہین لیکن در اصل حقائق پر بھی مبنی ہین، اس اصل حقیقت ہی کا پتہ چلانا ہمارا کام تھا اور جس طرح بہت سے آثار قدیمہ جو زیر زمین مدفون تھے، ہمارے زمانہ مین کھود کر نکال لئے گئے ہین، اسی طرح ان افسانہائے پارینہ کو جب عہد مظلم کے گرد و غبار سے پاک و صاف کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر بھی کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے، آئیے اس جگہ ہم بطور خلاصہ کے اُن نتائج تحقیق کو بیان کردین جو روحانیین کو معلوم ہوئے ہین، ان مین سے ایک بنیادی اور متفق علیہ امر یہ ہے کہ عالم ارواح ایک حقیقت و واقعیت ہے، انسانی ہستی کے مختلف مدارج و مراتب ہین، انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، انسانی وجود کے ان مختلف مراتب و منازل مین باہم کوئی ناقابل گذر حد فاصل نہین ہے، اس لئے بعض شرائط مخصوص کے تحت مین ارواح موتیٰ سے تخاطب و مکالمت ممکن ہے،

وجودِ روح پر ایک تفصیلی بحث

فرانس کے مشہور فلسفی "ڈیکاونس" کے تمام فلسفہ کی بنیاد اس کے اس مشہور قول پر ہے کہ چونکہ "مین غور کرتا ہون اس لیے مین موجود ہون یعنی در اصل غور و فکر ہی کی اہلیت وہ چیز ہے جس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہون کہ "مین" "موجود ہون، لیکن سوال یہ ہے کہ اس "مین" کی اصل حقیقت کیا ہے، کیا میرے ہاتھ پاؤن، آنکھ، ناک، اور میرے جسم کے دیگر اعضا، میرے وجود کی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہین، میرے ہاتھ کٹ جاتے ہین لیکن مین موجود ہون، آنکھون کی بینائی چلی گئی لیکن مین فنا نہین ہوا، پاؤن قطع کر دئے گئے، لیکن میرا وجود باقی ہے، ان امثال سے ظاہر ہے کہ ان اعضا کو منفرداً میرے وجود کی اصل حقیقت

مین کوئی دخل نہین ہے، اس موقع پر اطبار اور اہل سائنس بڑھینگے اور کہینگے کہ تمھارے وجود کی اصل حقیقت دراصل اس نظام عصبی مین پنہان ہے جس کا مرکز دماغ اور نخاع ہے یا پھر قلب مرکزِ حیات ہے، تمھارے دماغ یا قلب کو اگر کوئی سخت اذیت پہنچ جائے تو پھر تم ختم ہو جاتے ہو، نہ تم غور کر سکتے ہو، نہ محبت و نفرت، نہ خدا کا خوف ہی باقی رہتا ہے اور نہ مذہب کا جوش و وارفتگی، یعنی تمھارے بلند سے بلند حسیات وجذبات اور تمھارے تخیل کی وسعت وکارفرمائی، تمھاری ساری حکمت و دانش، تمھارا پورا نظامِ اخلاق وعمل ایک دھوکا ہے اور کچھ نہین، بہ الفاظ دیگر انسان عناصر کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس مین غور وفکر، شرم وحیا، محبت و نفرت، پیش بینی اور حافظہ جیسے اوصاف پیدا ہو گئے ہین، جب یہ ترتیب عناصر بگڑ جاتی ہے تو تم بھی ختم ہو جاتے ہو، نہ کوئی روح ہے جو آسمان پر چلی جائے اور نہ عذاب قبر ہے، نہ سوالِ حشر ؎

زندگی کیا ہے عناصر مین ظہور ترتیب

موت کیا ہے انھین اجزا کا پریشان ہونا

یہ خلاصہ ہے اس نظریہ کا جو انسانی وجود کے بارے مین مادیین پیش کرتے ہین، اس کے بالمقابل ایک دوسری جماعت ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا جسم مادی اور نظام عصبی ہمارے وجود کی اصل حقیقت نہین ہے، بلکہ یہ سب نشیمن اور گہوارہ ہین ایک دوسری اصل کا جس کو ہم روح سے تعبیر کرتے ہین اور اس روح کی نوعیت جیسا کہ مادیین کہتے ہین یہ نہین ہے کہ وہ ہمارے دماغ اور نظام جسمانی کے بعض کیمیائی یا طبعی عمل یا ردّعمل کا نتیجہ ہے، بلکہ وہ ان سے مافوق ایک ایسی جنس ہے جو مادی نہین ہے اور اس سارے نظام جسمانی عصبی پر بطور مدبر اور حکمران کے متصرف ہے،

انسانی وجود کی حقیقت کے بارہ مین یہ دو بالمقابل نظریات ہین جن پر ہمین غور کرنا ہے اور متقابل دلائل کے وزن کی بنا پر یہ دیکھنا ہے کہ کونسا نظریہ اس قابل ہے کہ اسکو تسلیم کیا جائے،

لیکن قبل اس کے ہم مادی نظریہ کو تفصیلاً بیان کرین ان اخلاقی دقتون کو بھی بیان کر دینا ضروری

سمجھتے ہیں، جو اس مادی نظریہ کے بجنسہ تسلیم کر لینے سے لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں، اگر انسان اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض کیمیائی اسباب کی بنا پر رحم مادر میں کچھ عناصر باہم مرتب ہو گئے ہیں اور اوصاف حیات (مثلاً محبت، نفرت، غور و فکر، اخلاقی ذمہ داری کا احساس وغیرہ) نتیجہ ہیں اس کیمیائی عمل اور رد عمل کا جو ہمارے جرم دماغی میں غیر شعوری طور پر واقع ہو رہا ہے تو لازمی طور پر ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ تمامتر تابع ہوتے ہیں اسی کیمیائی یا طبعی عمل کے جو ہمارے دماغ یا نظامِ عصبی میں ابتداءً پیدا ہو چکا ہے، یعنی اس نظریہ کے تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح انسان میں غور و فکر اور حسیات و جذبات بذاتہا خود بخود رونما نہیں ہوئے اسی طرح ہم سے افعال کا ظہور بھی ہمارے اختیار و تصرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تابع ہوتے ہیں ہمارے افکار و حسیات و جذبات کے اور چونکہ خود غور و فکر، حسیات و جذبات بذاتہا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے بلکہ نتیجہ ہوتے ہیں بعض ان لامعلوم کیمیائی اعمال کا جو ہمارے جرم دماغی میں جسم کے بیرونی یا اندرونی مؤثرات کے باعث پیدا ہوتے رہتے ہیں، تو ان مقدمات سے صاف و صریح نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان اپنے افعال پر خود قادر نہیں ہے اسکا ارادہ کوئی مستقل شے نہیں ہے، اور اگر صورت حال یہی ہے جیسا کہ اس نظریۂ مادّی کے بجنسہ قبول کر لینے سے مستنبط ہوتا ہے تو پھر ایک انسان کی اخلاقی ذمہ داری محض بے معنی ہے، تمہاری عدالتوں کا قیام تمہارے جیل اور تادیب گاہیں اور تمہارے وہ مدرسے جنمیں اخلاقی ذمہ داری کا درس دیا جاتا ہے سب بیکار ہو جاتے ہیں۔ تمہارا اصول سزا و جزا اور قانونی احتساب ایک ایسا ظلم ہے جسکو تم ایک ایسی مخلوق پر کرتے ہو جو اپنے اعمال کی مختار نہیں ہے، ایک شخص ایک گرم ملک اور ایک گرم رات میں بعض خاص قسم کی غذائیں استعمال کرتا ہے جس سے اسکے جسم کے اندر کچھ کیمیائی اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں اور یہی اعمال باعث ہوتے ہیں ایک مخصوص قسم کی رائے اور مخصوص قسم کے جذبات پیدا کرنے کا جنکی بنا پر ایک مجبور معذور انسان قتل یا رہزنی کر لیتا ہے تو تم ساری پولیس اور تمام عدالتوں کو اسکے پیچھے لگا دیتے ہو، اسکو خطاکار قرار دیتے ہو، درآنحالیکہ لائق الزام انسان نہیں ہے بلکہ خود اسکا نظام وجود ہے، یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ایک حجت الزامی ہے اور گو بذاتہا بہت باوزن ہے لیکن متشککین روحانیت کی تسکین کا باعث نہیں ہے، اس لئے اب ہم تفصیل کیساتھ انسانی وجود کے مادّی نظریہ کو بیان کرنا چاہتے ہیں،

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اہلِ سائنس اس عالم کی تکوین کا باعث ان ۹۰ یا ۹۲ عناصر کو سمجھتے تھے جو اس وقت تک دریافت ہوئے تھے، ان عناصر کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ کبھی معدوم یا فنا نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ بعض مخصوص خواص اور طبیعتیں رکھتے ہیں، اس دنیا میں جو کچھ بھی بشکل اجسام واشیاء ہم کو نظر آتا ہے وہ انھیں عناصر کی کیمیائی ترکیب کا ماحصل ہے یعنی تمام چیزیں ایک یا دو یا زیادہ عناصر سے مرکب ہیں اور وہ عناصر ان میں ایک خاص نسبت سے ترکیب پائے ہوئے ہیں، جب یہ ترکیب کسی کیمیائی عمل سے ٹوٹ جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ چیز فنا ہوگئی، لیکن دراصل جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ اس چیز کے عناصر ترکیبی نے اپنے باہمی ربط کو چھوڑ دیا ہے، جس کے باعث وہ اپنی ابتدائی شکل وصورت میں باقی نہیں رہی، ورنہ دراصل عناصر ترکیبی معدوم نہیں ہوئے، بلکہ اس فضا میں کسی دوسری ترکیب یا حالت میں ضرور موجود ہیں، یہ بیان اپنی توضیح کے لیے ایک یا دو مثالوں کا محتاج ہے،

سوڈیم اور کلورین دو عناصر ہیں جنمیں سے کلورین (ہرین) ایک گیس (ہوا) ہے جو بذاتہ سم ہے، اگر کافی مقدار میں انسان کے پھیپھڑوں میں پہنچ جائے تو انسان مرجائے، دوسرا عنصر سوڈیم (SODIUM) ایک طرح کی دھات ہے جو اگر جلد پر لگ جائے تو جلا دے، یہ دونوں عنصر جب کیمیائی ترکیب پا جاتے ہیں، تو کھانے کا نمک بنجاتا ہے، اسلئے کھانے کے نمک کی اصلیت یہ ہوئی کہ وہ سوڈیم اور کلورین کا ایک کیمیائی مرکب ہے، جب یہ ترکیب کسی دیگر کیمیائی عمل سے بگڑ جاتی ہے تو پھر نمک باقی نہیں رہتا، لیکن اس کے اجزائے ترکیبی یعنی سوڈیم اور کلورین فنا نہیں ہوتے،

پانی جو ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں خود دو عناصر سے مرکب ہے، ہائیڈروجن (جو معلوم گیسوں میں سب سے ہلکی گیس ہے) اور آکسیجن سے یہ دونوں ہوائیں (GASES) جب کسی بڑے بھاری دباؤ کے باعث کیمیائی طور پر ملجاتی ہیں تو "پانی" بنجاتا ہے، اب پانی کی اصلیت یہ ہوئی کہ وہ دو عناصر مذکورہ سے ترکیب پائی ہوئی ایک چیز ہے،

ماحصل یہ ہوا کہ اہل سائنس کے نزدیک یہ تمام عالم اور اس عالم کی تمام اشیاء انھیں عناصر سے ترکیب

پائی ہوئی ہین، یہ عناصر منفرد حالت مین اپنے مخصوص کیفیات اور طبیعتین رکھتے ہین لیکن ترکیب باہمی کے بعد ایک نئے سلسلۂ خواص کا باعث ہوتے ہین، عناصر کی باہمی ترکیبون مین جسقدر تنوع ہوتا ہے، اسی قدر نئی نئی چیزین نئے نئے خواص کیساتھ ظہور پذیر ہوتی رہتی ہین،

عناصر کی ترکیب باہمی کے متعلق یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا سائنس کے ابتدائی دور کی باتین ہین، جب تحقیق واکتشاف کی راہین کشادہ تر ہوئین تو معلوم ہوا کہ خود عناصر سالمات سے اور سالمات جوہرون سے ترکیب پائے ہوئے ہین، اسلئے تکوینِ عالم اور وجود اشیا کا سبب یہ قرار پایا کہ ہر مادی شے مین، (ATOWS) جوہر ایک خاص نسبت اور ایک خاص نہج سے واقع ہوا ہے، یہی جوہر جب عمل کیمیاوی وغیرہ سے اپنی ترتیب کو بدل لیتا ہے تو وہ چیز بظاہر فنا ہو کر دوسری صورت وشکل اختیار کر لیتی ہے،

عناصر کے غیر فانی ہونے کے ساتھ ہی جو امر اہل سائنس کو دریافت ہوا ہے وہ (ENERGY) توانائی کا وجود ہے، یعنی اس بیجان مادہ مین جو چیز اصل مین عامل ہے وہ توانائی ہے، توانائی کی مقدار اس عالم مین کبھی کم وبیش نہین ہوتی، لیکن یہ اپنی شکل اور مقام بدلتی رہتی ہے، ابھی اگر وہ کیمیائی جذب وکشش مین رونما ہے، تو بار دگر بصورتِ برق ہویدا ہوتی ہے، لیکن اس تبدل وشکل پذیری مین وہ نہ کبھی کم ہوتی ہے اور نہ کبھی زیادہ

لیکن یہ عالم محض عناصر اور توانائی کی بنا پر مختلف شکلین اختیار نہین کر سکتا اور یہ جو اس دنیا مین مشاہدہ ہوتا ہے کہ کبھی پانی برس رہا ہے بادل اٹھ رہے ہین، بخارات مائیت مین اور مائیت ژالہ باری مین بدل رہی ہے زمین نباتی روئیدگی سے یکسر فرش مخملین بنی ہوئی ہے، کبھی گرمی ہے کبھی سردی ہے، الغرض یہ تمام حوادث وتغیرات محض عناصر اور توانائی کی بنا پر ظہور پذیر نہین ہو سکتے تھے جب تک ایک تیسری چیز نہ ہوتی جو ان عناصر کو ایک دوسرے سے ملا دیتی، یا پھر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی، وہ چیز ان علماء کے نزدیک "حرکت" ہے یعنی حرکت کے وجود کے باعث ایک عنصر دوسرے عنصر سے جذب واتصال پاتا ہے، اس جذب واتصال سے عناصر مین باہمی کیمیائی عمل ہوتا ہے، اس کیمیائی عمل سے توانائی اپنی شکل بدلتی ہے اور ایک شے ٹو

کر دوسری شئے مین تبدیل ہوتی ہے اور اس طرح یہ عالم مادّی دائماً ایک حالتِ کون و فساد مین رہتا ہے،

اب اگر ان متذکرہ بالا بیانات کو یکجا کر لیا جائے تو اس عالم کے وجود کا سبب حسب تحقیق علمائے طبعیات کیا قرار پاتا ہے، مختصراً یہ ہے کہ یہ تمام عالم، مادہ اور مادی عناصر اور ذرات و سالمات مین تقسیم ہے، ان عناصر کے باہمی ترکیب و تحلیل سے تغیر کیمیاوی ہوتا ہے اور اس کیمیائی تبدیلی سے مختلف چیزین بنتی اور بگڑتی رہتی ہین ان عناصر مختلفہ مین مخصوص خواص و کیفیات ہین، اور ان کے باہمی اتصال و تحلیل سے جو جدید اشیار ظہور پذیر ہوتی رہتی ہین ان مین بھی خواص پیدا ہوتے اور بدلتے رہتے ہین،

اس نظریہ کے مطابق دنیا مین کوئی چیز یا کوئی کیفیت یا حالت اس وقت تک پیدا نہین ہو سکتی جب تک پہلے عناصر مختلفہ مین کوئی کیمیائی تبدیلی واقع نہ ہو یعنی کسی کیفیت کے ظاہر ہونے سے پہلے عمل کیمیائی کا ہونا ضروری ہے،

علمائے سائنس نے اپنے اس متذکرہ نظریہ کی بنا پر جو اکتشافات کئے ہین اور اس کو جس حد تک کامل و مکمل کر لیا ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہے، علوم طبعی کی رسائی بلاشبہہ اس عالم مادّی کے عمیق ترین رازون تک ہو گئی ہے، اس کامیابی کا ایک قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سعی کیگئی کہ عالم طبعیات کے جملہ مظاہر و احوال کی توجیہ و تشریح سالمات کے اسی باہمی عمل و ردِّ عمل کی بنا پر کیجائے، چنانچہ انیسوین صدی عیسوی کے تمام ترقی یافتہ علوم کی عمارتین انھین بنیادون پر استوار کیگئین اور علمائے علم الحیات نے چار و ناچار انہین خطوط پر اپنا کام شروع کیا اور یہ کوشش کیگئی کہ وہ قانون مادی جو غیر عضوی اجسام پر صادق آچکا ہے اسکو ذی حیات اجسام کی کیفیات و حالات پر منطبق کیا جائے، چنانچہ اسی نظریہ کے تحت مین یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسان کے جمیع نفسی اوصاف (شعور، جذبات و افعال) بھی سالمات کے اس عمل و ردِّ عمل کا نتیجہ ہین جو دماغ کے اندر واقع ہوتا رہتا ہے، علم الحیات اپنی اس سعی مین ایک حد تک کامیاب معلوم ہو رہا ہے، توضیح بیان کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مبحث کو ذرا تفصیل کیساتھ بیان کیا جائے تاکہ فہم مطالب مین آیندہ کوئی الجھن پیدا نہ ہو، اور ہمارے مخالفین کے دلائل کا سارا زور اور وزن قارئین کے سامنے آجائے،

یہ امر تو بہرحال مسلم ہے کہ دماغی اوصاف کا مرکز ہمارا جرم دماغی ہے اور یہ جرم خود لاکھون خلایا CE
LLS سے مرکب ہی، یہ خلایا ہی دراصل تمام نفسی اوصاف کا موجب ہین، خود ان کی ترکیب اور ساخت بیحد
پیچیدہ ہے اور یہ باہم ایک دوسرے سے مربوط ہین، ہمارا دماغ، ہمارے نظام وجود کا ایک مرکزی دفتر ہے،
جہان سے ہمارے سارے کام ہمارے حیات و جذبات اور ہماری فہم وادراک کے جملہ وظائف انجام پاتے
ہین، یہین سے غذا کے ہضم وتقسیم کا عمل ہوتا ہے، ہمارے احساسات کا ذریعہ، ہماری نقل وحرکت کا مبدأ، ہمارے
غور وفکر کا آلہ یہی دماغ ہے، لیکن سب سے زیادہ حیرتناک تو یہ امر ہے کہ علمائے علم الحیات نے ہمارے اس جرم
مین وہ مراکز معلوم کر لئے ہین جو علٰحدہ علٰحدہ ہمارے جملہ نفسی اعمال کا مبدار ومنشا ہین، مثلاً ہم کو یہ معلوم
ہوگیا ہے کہ بصارت کا مرکز سطح دماغی مین کہان واقع ہے، سماعت کا تعلق کس مرکز سے ہے، مختلف حرکات
کی ابتدا کس نقطۂ دماغی سے ہوتی ہو، نطق کا تعلق کہان سے ہے، حیات وفکر کس مرکز سے متعلق ہین، چنانچہ
فتور دماغی کے مختلف حالات واشکال مین یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ متعلقہ مرکز دماغی مین کوئی نہ کوئی فتور
موجود تھا، فتور دماغی کے اسباب کو بالتشریح سمجھنے کے لیے ہم کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہمارا جرم دماغی
بذریعہ اعصاب ہمارے اعضار وجوارح سے مربوط ہے، خود اعصاب دو قسمون پر منقسم ہین، ایک تو وہ اعصاب
جنکو ہم اصطلاحاً اعصاب حرکتی (MOTOR NERVES) کہتے ہین، دوسری قسم کے وہ اعصاب ہین جنھین اعصاب
حسی کہا جاتا ہے، اعصاب حسی کا فعل یہ ہے کہ وہ جملہ تاثرات کو جو ہمارے آلات حواس (آنکھ کان وغیرہ) مین مرتب
ہوتے ہین، ہمارے مرکز دماغی تک پہنچاتے ہین اور اس طرح ہم کو اس مخصوص اثر کا علم وادراک ہوتا ہے، ہم
جو آوازین سنتے ہین تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ ہوا کے تھپیڑون نے ہمارے کان کی اندرونی ساخت کو متاثر
کیا، اور یہ اثر بذریعہ اعصاب اُس مخصوص مرکزِ دماغی تک پہنچا جس کا تعلق سماعت سے ہے اور اگر وہ مرکز
سماعت بیمار یا بیکار نہین ہے تو ہم آواز سنتے ہین، اسی طرح جب ہم ہاتھ یا پاؤن کی کوئی حرکت کرتے ہین
تو یہ عمل اس طرح واقع ہوتا ہے کہ ہمارے اس مرکزِ دماغی مین جسکا تعلق کسی مخصوص حرکت سے ہے ایک تغیر

رونما ہوتا ہے، اور چونکہ یہ مرکز بذریعہ اعصاب اعضائے حرکت سے متعلق ہوتا ہے، اس لیے مرکزِ دماغی کا فرمان بذریعہ اعصاب ہاتھ پاؤں تک پہنچتا ہے اور ہاتھ یا پاؤں حرکت کرنے لگتے ہیں، یہ مراکز باہم ایک دوسرے سے بذریعہ ان مراکز کے جنکا تعلق خیال وغیرہ سے ہے ملے ہوئے ہیں، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ایک تندرست آدمی کے تمام حرکات واحساسات عقل وشعور کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں، لیکن فتورِ دماغی کی صورت میں یا تو کوئی مرکزِ دماغی خراب ہو جاتا ہے، یا باہمی مراکز کا جو ربط ہے، وہ ٹوٹ جاتا ہے جسکی وجہ سے افعال کا صدور صحیح طور پر نہیں ہوتا، ایک مثال اسکی وضاحت کے لیے کافی ہوگی،

ایک دماغی بیماری ہے جس کو اصطلاحًا "بصری فتور نطقی گویائی" (VISUALAPHASIA) کہا جاتا ہے اس مرض میں ایسا شخص جو اس بیماری سے پہلے پڑھا لکھا تھا، کاغذ پر لکھے ہوئے حروف کو دیکھتا ہے لیکن ان کو پہچان نہیں سکتا یعنی کاغذ پر سیاہ نشانات اور انکی کشش کو تو ضرور دیکھتا ہے، لیکن یہ پہچان اسکو نہیں رہتی ہے کہ یہ کیا حروف ہیں، اس مرض کی وجہ یہ ثابت ہوئی ہے کہ مرکزِ بصری کا تعلق اس دماغی مرکز سے منقطع ہو جاتا ہے جسکا تعلق لکھے ہوئے حروف کی فہم و یادداشت سے ہے، یہ ایک مثال تھی، ورنہ فنِ تشریح الاعضاء کی شہادت تو یہی ہے کہ جملہ وظائف دماغی کا تعلق کسی نہ کسی مرکز سے ہے، ادویہ کے اثرات، دیوانگی کے اسباب وعلل وغیرہ تمام شواہد اسی حقیقت کو ثابت کر رہے ہیں اور یہ نظائر اس کثرت سے ہیں کہ بعض علمائے علم الحیات کی تو یہان تک رائے ہے کہ علم النفس بذاتہ کوئی علم وفن ہی نہیں ہے بلکہ وہ علم وظائف الاعضاء ہی کی ایک شاخ ہے،

اسی قسم کے تجربات علمی کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ نفس انسانی اور جرمِ دماغی دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں، ہمارا ہر خیال، ہر خواہش، ہر جذبہ نتیجہ ہوتا ہے ایک طرح کے عملِ دماغی کا، ہماری تمام نفسی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہمارے دماغ میں ایک سلسلہ مادی اعمال کا جاری رہتا ہے جو خلایائے دماغی سے بگڑتے اور بنتے رہتے ہیں،

اس تمام تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی دماغ ایک ایسا ظرف ہے جو مختلف قسم کے مادی عناصر و سالمات سے مرکب ہے اور یہ عناصر و سالمات وہی ہین جو ہمکو بیرونی دنیا مین ملتے ہین اور جذب و اتصال عمل کیمیائی اور حرکت کے انھین قوانین کے تابع ہین جنکا ذکر ہم ابتدا مین کر آئے ہین، جب کبھی ہم سے کوئی وصف نفسی صادر ہوتا ہے اسکے ساتھ ہی ہمارے دماغ کے اندر بھی ایک کیمیائی عمل وقوع ہوتا ہے اور چونکہ اعمال کیمیائی اور اوصاف نفسی بالکل لازم و ملزوم ہین اسلئے یہ نتیجہ نکالنا بظاہر غیر صحیح بھی نہین معلوم ہوتا کہ ہمارے سارے مظاہر حیات کی حقیقت مادی اور محض مادی ہے یہ ہے وہ مادی نظریہ جسکی بنا پر روح کے وجود کا انکار کیا جاتا ہے، اور دراصل اس نظریہ کا تعلق محض انکار روح ہی سے نہین ہے، بلکہ اس کا ماحصل اور مقصد یہ ہے کہ اس کائنات مین سوائے مادہ اور مادہ کے مختلف حرکات و اشکال کے کچھ نہین ہے اور یہ توقع کیجاتی ہے کہ جون جون ہمارا علم "حرکت" اور مادہ کے اوصاف کی بابتہ وسیع ہوتا چلا جائیگا، ہم اس نظریۂ مادی کو ظہور عالم کے ہر شعبہ پر منطبق کر سکینگے،

لیکن پچاس سال ہوئے کہ اس خیال کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا اور تعجب ہے کہ یہ علم ہمکو جن ہاتھون مین نظر آتا ہے وہ خود ان علمائے طبعیات ہی کے مقدس ہاتھ ہین، اب یہ حقیقت اُن پر واضح ہوئی کہ صرف مادہ کے مظاہر و شیون کا مطالعہ اس عالم کی حقیقت کے سمجھنے کیلئے قطعًا ناکافی ہے بلکہ بعض حالتون مین مغالطہ انگیز ہے، اسمین شک نہین کہ ہم کو جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ مادہ ہی کی تغیر پذیری ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مادی مظاہر و احوال خود اپنے اندر اولیت و تقدیم نہین رکھتے بلکہ خود کسی ایسے محرک کے نتائج و معلول ہین جو مادہ کے علاوہ ہے اور ہماری آنکھون اور حواس سے محجوب ہے، ابتدا ہی سے یہ سوال حل کرنے کے لائق ہے کہ اجسام مادی مین باہمی عمل کے وقوع ہونے کا سبب واقعی کیا ہے یعنی یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ اس عالم کے کون و فساد کا سبب سالمات یا جوہرون کا ایسا عمل ہے جس سے وہ اپنی اس ترتیب مکانی کو بدل لیتے ہین جو مختلف اشیار مین عمل کیمیائی سے قبل پائی جاتی تھی، ہم کو از روئے تحقیق یہ بھی معلوم ہے کہ ان سالمات اور جوہرون کے درمیان بھی کچھ نہ کچھ خلا (SPACE) ضرور موجود رہتا ہے اور اس خلا کے متعلق یہ نہین کہا جا سکتا کہ وہ مادہ سے بھرا ہوا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا

چیز ہے جو ان سالمات کو باہم ملاتی اور ان کے تعامل کا باعث ہوتی ہے، خود نیوٹن (NEWTON) کے سامنے بھی یہ سوال تھا جسکا جواب اُس نے یہ دیدیا تھا کہ بعض ایسی غیر معلوم قوتین ہین جو ان اجسام پر علحدہ سے عامل ہوتی ہین، یہ جواب ایک حد تک تسلی بخش تھا، اسلئے اسوقت اس مسئلہ پر مزید توجہ نہین کیگئی، لیکن اس سوال نے قدرتی طور پر ہماری توجہ ایک نئی حقیقت کی طرف منتقل کردی یعنی خلا[1] کے وجود کی طرف، چنانچہ جدید تجربات نے اہل سائنس پر یہ واضح کردیا کہ خلا بھی اپنے اندر خواص طبعی رکھتا ہے اور یہ جو اجسام مادی مین بواسطہ سالمات وجوہر عمل اور ردِ عمل نظر آتا ہے، وہ دراصل نتیجہ و معلول ہے اس حالت یا کیفیت کا جو ان اشیار کے مابین خلا مین اپنا کام کررہی ہے یعنی مادی مظاہر روشیون براہِ راست اس کا نتیجہ نہین ہین کہ مادہ مین ذاتی خواص ہین اور اس کے باعث یہ مظاہر ظہور پذیر ہوئے ہین، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مادہ خود متبع ہے اس چیز یا قوت کا جسکی اصل حقیقت پر ہم مطلع نہین ہین لیکن وہ خلا مین موجود ضرور ہے،

انتقالِ نور اور اشعاعِ حرارت کے مسائل سے بھی اسی اصل کی تائید ہوتی ہے، نور یا روشنی مادہ کے ذریعہ سے منتقل نہین ہوتی ہے بلکہ بذریعہ خلا اپنا کام کرتی ہے، روشنی نہایت سرعت اور نہایت ہی آسانی کے ساتھ اس خالی فضا مین سے گذر جاتی ہے لیکن جونہی وہ اجسام مادی کے بالمقابل آتی ہے اسکی سرعت مین کمی آجاتی ہے، مادہ مین کچھ نہ کچھ کثافت کا ہونا یقینی ہے اور اسی کثافت کے باعث روشنی فنا ہوکر حرارت مین بدل جاتی ہے، حرارت شمسی جو سورج اور سیارون سے لکھو کھا میل کا سفر کرتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے اس فضا یا خلا ہی مین سے گذرتی ہے، اس طویل سفر مین وہ اپنی تمام توانائی (ENERGY) کو قائم رکھتی ہے لیکن ہمکو اسکا احساس وعلم اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اجسام مادی پر اپنا عمل کرتی ہے، جب ہی ہمارے پردۂ چشم پر اسکا اثر ہوتا ہے، ہماری جلد کو متاثر کرتی ہے اور وہ کیمیائی عمل شروع ہوجاتے ہین جنسے ہم شناسا ہین، وہ خصوصاً سبز درختون پر اثر کرتی ہے اور اسی کے باعث یہ ساری نباتی بالیدگی ور دئیدگی ہمکو نظر آتی ہے گویا یون کہا جائے کہ خلا کی اسی غیر معلوم قوت و توانائی نے لباس مادی اختیار کرلیا ہے، ایک درخت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اسی غیر معلوم قوتِ خلا کا ایک مادی مجسمہ ہے، ہم نباتی روئیدگی کو محض اپنے خشک اور تنگ مادی نظریہ کی بنا پر نہین سمجھ سکتے

---

[1] نا انصافی ہوگی اگر اس موقع پر یہ ظاہر نہ کردیا جائے کہ "خلا" کیطرف سب سے پہلے یونانی حکمار ایپکورس (EPICURUS) وغیرہ نے بھی توجہ کی تھی،

جبتک ہم اس قوت کو پیش نظر نہ رکھین جو خلا یا فضا مین پائی جاتی ہے اس قوت کا نام خواہ کچھ ہی کیون نہ رکھ لیا جائے لیکن جو چیز ہمکو محسوس ہوتی ہے وہ یہ قوت، خلا یا فضا نہین ہے بلکہ وہ صرف مادہ اور مادی شیون و مظاہر ہین، ہمارے حواس تو صرف مادہ اور مادی اشیاء ہی کا ادراک کر سکتے ہین،

ماحصل اس تمام گذارش کا یہ ہوا کہ گو ابتداءً اہلِ سائنس بیجان مادہ ہی کو اس تمام کائنات کا اصل اصول سمجھتے تھے لیکن جون جون اس حسن مستور کے چہرے سے نقاب اٹھتی جاتی ہے نئے نئے حقائق جلوہ گر ہو رہے ہین اور اب یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ خود مادہ اور مادہ کے یہ سالمات وجوہر وغیرہ یا انکا باہمی عمل بذاتہ بالکل بے اصل ہین، جبتک ایک تیسری چیز نہ ہو جسکی حقیقت تک تو اہلِ سائنس ابتک نہین پہنچے ہین لیکن اسکے وجود کا انکار بھی نہ کر سکے، اس چیز کو خواہ توانائی ENERGY خواہ حرکت MOTION خواہ قوت FORCE اور خواہ خواص فضائی (SPACE PROPERTIES) کہا جائے یا پھر اسی کو مذہبی اصطلاح مین امر ربی سے تعبیر کیا جائے، الغرض اسکا نام کچھ ہی کیون نہ رکھ لو لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جسکا براہ راست ہم کو کوئی علم نہین ہوتا، نہ تو ہم اسکا کوئی وزن کر سکتے ہین اور نہ اپنے آلات علمی کے ذریعہ اسکی کوئی پیمایش عمل مین لا سکتے ہین اور نہ ہمارے حواس ظاہری پر اسکا کوئی اثر ہوتا ہے لیکن ہان اہل علم اسکے وجود کے تسلیم کرنے پر مجبور ہین اور صرف استدلال و استخراج ہی کی بنا پر اسکے وجود کا اقرار کیا جاتا ہے، کیا اب بھی یہ صحیح نہین کہ علوم طبیعی کی اس فلک بوس عمارت، اہل علم کے کشف و تحقیق کی ناپید اکنار وسعت، رنگا رنگ ہون اور معلومون کی اس ساری ہنگامہ آرائی کے باجود ہم جس نتیجہ پر پہنچے وہ صرف اسقدر ہے کہ اس عالم کی تمام بوقلمونیون کا باعث ایک ایسی قوت ہے جسکا ہم کو کوئی صحیح علم نہین ہے، ع

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اور کیا یہ واقعہ نہین ہے، کہ جتنا ہمارا علم اس کائنات کے بارہ مین وسیع ہوتا جاتا ہے اسیقدر ہمارا عجز بھی بڑھتا جاتا ہے، اور کیا ان حالات مین ہمارے لیے یہ زیبا نہین ہے کہ ہم اس عالم کی اس لامعلوم قوت مدبرہ کے سامنے جسکو خواہ کسی نام سے پکارا جائے و(فلہ الاسماء الحسنیٰ) اور ﴿وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً﴾ پر ایمان لا کر اپنے سر نیاز کو جھکا دین اور اپنے قلب کی تمام گہرائیون کیساتھ ربِّ زدنی علما کی عاجزانہ درخواست مین مشغول ہو جائین،

(باقی)

خسرو باغ کے مقبرے

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی، الٰہ آباد

خسرو باغ (الٰہ آباد) کے پھاٹک مین داخل ہوتے ہی سامنے چار مقبرے نظر آئین گے، مگر ان تک پہنچنے مین تقریباً تین سو قدم کے قریب کا فاصلہ طے کرنا ہوگا،

ان کا منظر مجموعاً نہایت دلکش، دلآویز و نگہ فریب ہے، مسٹر نویل[1] اور اور دیدہ ور اہل قسلم کا قول ہے کہ یہ عمارات انتہا درجہ کی خوبصورت اور مغلون کے عہد مصوری و رنگ آمیزی کا بہترین نمونہ ہین، مسٹر اسٹیل ایک موقع پر لکھتے ہین[2] کہ "یہ مقبرے الٰہ آباد کے علاوہ آثار و صنادید قدیمہ مین بڑے نمود کی چیزین ہین"

اس فن کے ایک نوآموز و کم آشنا کی حیثیت سے مجھے بھی اس بارہ مین غور کرنے اور ان چیزون کو اپنی نظر و استعداد سے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے، ان مبصرین کی راے سے کون اختلاف کر سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ خسرو باغ کا مقبرہ اکبر کے مقبرہ کا مقابلہ نہین کر سکتا، دونون عمارتین ایک ہی شخص کے حکم سے بنی ہین، مگر فرق یہ ہے کہ الٰہ آباد والا گنبد ان فرسودہ اور بوسیدہ ہڈیون کو آغوش مین لیے ہے جو باپ سے بگڑ کر ہمیشہ گرفتار بلا رہنے والے بیٹے، اور بھائی (شاہجہان) کے محسود بھائی کی تھین، جو برہان پور دکن سے اکھاڑ کر یہان لائی، اور دفن کیگئی تھین، سکندرہ کا بے مثل مقبرہ ایک نیک نام و عظیم الشان شہنشاہ کی دائمی دنیوی یادگار کے طور پر ہے جو اُس ہی جیسے اولو العزم و منت شناس شہنشاہ نے بنوایا تھا، دادا اور پوتے مین جو قدرتی فرق ہوتا اور ہوسکتا ہے یہان بھی نمایان ہے،

مغلون[3] کے ابتدائی زمانہ کی تعمیرات مین، جنمین اکبر اور جہانگیر کے عہد کی عمارتین بھی داخل ہین بعض خصوصیات

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹر صفحہ ۲۰۲ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹر سابق صفحہ ۱۴۸ [3] مرکن کی آگرہ ہینڈبک صفحہ ۲۹،

ہوتی تھین جو کچھ نہ کچھ ان مقبرون مین بھی پائی جاتی ہین یعنی بلند او نچے گردنون پر ایرانی وضع کے گنبد، اس طرز کی عمارتین بیشتر کی بنی ہوئی عمارتون سے دو باتون مین بالخصوص ممتاز و متبائن پائی جاتی ہین (۱) اس امر کی صاف وصریح کوشش کہ ہندؤن کے مختلف منتخب طرز تعمیر و نیز مسلمانون کے مخصوص طریقے اور وضعین متحد و یکجا کر دیجائین (۲) زیادہ کھلتے ہوئے رنگ دینا، اس کے لیے عام طور پر سفید سنگ مرمر زیادہ استعمال ہوتا تھا، پھر حسب موقع و ضرورت بیش قیمت رنگین پتھرون کا افراط کے ساتھ خرچ اور کھپت، بے شبہہ بعض عمارتون کے متعلق محض اندرونی ساخت سے یہ تمیز (حاصل) کر لینا دشوار ہوتا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ چیزین جنکے مکانات و محلات مین موجود ہونے یا نہ ہونے سے بعض باتون کا فیصلہ یا امتیاز ہوسکتا ہے مقبرون اور روضون مین اکثر غائب ہوتی ہین، مثلاً لکڑی کا قطعاً استعمال مین نہ آنا، یا سیدھے سادے نمونہ کی محرابین کم بنانا، وغیرہ، مجھے اعتراف ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے بے مثل و بے نظیر نہین ہین، نہ ان مین ہمایون کے مقبرے (متصل دہلی) کی سی شان اور لطافت و نزاکت تعمیر و نقاشی پائی جاتی ہے، نہ مقبرۂ اعتماد الدولہ واقع آگرہ کی سی پرچین سازی اور منبت کاری، مقبرۂ شیخ سلیم چشتی، قصبہ فتحپور سیکری کی طرح سنگ مرمر پر باریک، نازک اور بے نظیر نقاشی و مشجر کاری نظر آتی ہے، نہ کوئی خاص قابلِ ذکر حسن وضع و تعمیر ہے، نہ مقبرۂ اکبر (سکندرہ) کی رفعت و عظمت اور ہیبت و جلالت پیدا کرنے والی شان نمایان ہے، تاہم چار مختلف الوضع عمارتون کا ایک سیدھی لائن مین نہ سہی، مگر ایک ہی محاذ مین بہ یک نظر، نظر آنا، ایک کیفیت خاص پیدا کر دیتا اور عجیب دلکشی رکھتا ہے،

نامور فرگسن نے سلطان التمش کے روضہ واقع پرانی دہلی کو ہندوستان کا سب سے پرانا مقبرہ بتانا اور لکھا ہے کہ یہ مختصر تو ضرور ہے لیکن اسمین ہندؤن کی صنعت کے نفیس و بہترین نمونے جہانتک کہ اسلامی شعائر، خصائص اور شوکت کے مغائر و منافی نہ تھے مناسب حال و شایان شان صرف کر دئے گئے ہین، جن سے یہ نہایت درجہ خوبصورت و دلآویز ہوگیا ہے، راقم سطور بلکہ یقیناً ہر ہوشمند دیکھنے والا بہ یک نگاہ کہہ سکتا ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے

۱؎ ڈنکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۹۰، ۲؎ ہندوستانی اور مشرقی تعمیر کی تاریخ - ۱۸۷۶ء،

بھی، اگرچہ مختصر ہین، لیکن ان کی مجموعی کیفیت، مختلف وضع اور متنوع طرز عمارت ایک خاص قسم کی دلکشی اور جذب نظر اپنے اندر رکھتی ہے، اور ہر ایک مین کمال سادگی کے ساتھ ساتھ کمال فن و ہنر بھی نمودار ہے،

سب سے پہلے جس فرض شناس حکمران نے اپنے صوبہ کی عمارات قدیمہ کی طرف توجہ مبذول فرمائی، وہ ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر سر جان اسٹریچی تھے، اوّل اوّل ۱۸۷۶ء مین روضۂ ممتاز محل پر عنایت کی اور مرمت کرادی، پھر آگرہ اور الٰہ آباد کی دیگر بادشاہی یادگارون پر نگاہ التفات ڈالی، خسرو باغ ان کے دار الحکومت مین ایک ممتاز مقام تھا اور پبلک کے کام کی چیز، بقدر ضرورت اسکی مرمت و درستی بھی کرادی، دلکش باغ اسوقت بھی اپنے گذرے ہوئے دنون کی دستبرد اور امتداد زمانہ کی تاخت و تاراج کو ناقدری و حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، جو اپنی جوئبار شیرین یعنی میٹھے پانی کے حوضون اور بڑے بڑے کنوون اور چشمۂ فیض باؤلی سے سارے شہر کو سیراب کر رہا تھا، جس کے سنہرے انداز چمن بندی و تناسب اجزا کی اسوقت بھی داد مل رہی تھی، جبکا ایک ایک پھول اور ایک ایک پتہ، جس کے مقبرون کا ہر ریختہ و شکستہ پتھر اپنے شاہانہ تکلفات اور نازک ترتیبات کا آئینہ دار تھا، عروس البلاد الٰہ آباد مین گرمی کی شدت و تابش اور بعض اوقات سردی کی افسردگی و انجماد بھی کائنات کی حسین و جمیل چیزون کو مردہ کر دیتی ہے، مگر خسرو باغ کی معطر ہواؤن کے حیات بد امن جھونکے اس وقت بھی تازہ زندگی پھونک دیتے تھے،

دنیا بدل گئی ہے، وہ ہین ہین کہ اب تک   اپنے مقام پر ہین اپنے مکان پر ہین،

اس کے چھبیس ستائیس برس بعد مغل اعظم کے صحیح جانشین اور ان کی عظمت و سطوت رفتہ کے وارث و قابض لارڈ کرزن آنجہانی نے دیرینہ سال عمارات کے ابقار و پرداخت مین وہ سعی مفرط فرمائی جس کے لئے ہندوستان کے باشندے، بالخصوص احسان شناس مسلمان، ہمیشہ زیر بار منت و شکر گذار رہین گے سلطان بہار بیگم کے گنبد کا خالی کرادینا، اور اس کے عوض مین سوپرنٹنڈنٹ باغات الٰہ آباد کے لیے ایک قصر پر تکلف مہیا

۱؎ ہینڈ بک آگرہ و تاج۔ از مسٹر ہیویل، صفحہ ۷۶، ۲؎ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۲۰۳،

کرا دینا اسی بلند حوصلہ امیر کا کام تھا جس کا ذکر مناسب موقع پر عنقریب آئیگا،

تم نے نگاہِ لطف سے رکھ لی ادب کی شرم ۔۔۔ ورنہ لبون تک آہی چکا تھا گلا ابھی

مقبرون کی نگہداشت اور خسرو باغ کی آبیاری و آراستگی اس وقت حکومت کے دستِ کرم کی ممنون ہے[1]،

باغ کے مصارف معقول نفع کے ساتھ خود اسکی پیداوار سے پورے ہوجاتے ہین، پھل پھول، پودون، ہر قسم کے درختون اور قلمون سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے، یہان[2] کے گلاب اور گلاب کی قلمین مشہور اور بڑی قدر کی چیزین ہین، الہ آبادی امرودون کی پودہ اس باغ کی قابل اعتبار اور اچھی سمجھی جاتی ہے، منتظمین نے تین[3] تین ایکڑ کے دو قطعے میوہ کے درختون اور پودہ کی پرورش گاہ اور پھل پھول کی بہار دکھانے کے لئے محفوظ رکھے ہین،

انگریزی پیمائش سے باغ کا کل رقبہ ۴۰ء۶۰ ایکڑ ہوتا ہے، انتظامی ضرورتون اور سہولت کارروائی کے لیے اسکی تقسیم دو حصون مین کردی گئی ہے، ایک قطعہ ۳۰ء۶۰ ایکڑ کا محکمۂ آثار قدیمہ یعنی[4] ارکیالوجی کل ڈیپارٹمنٹ کے نام سے ہے، دوسرا سینتیس[3] ایکڑ زیر اہتمام و انتظام محکمۂ[5] زراعت ہے، عملی طور پر دونون قطعے اور انکی نگرانی محکمۂ زراعت کے ایک ذمہ دار افسر کے ہاتھ مین ہے، اور محکمۂ مذکور کی سالانہ رپورٹون مین دونون کے بقدر ضرورت حالات اور درستی و ترقی کی کیفیت مندرج و شائع ہوتی رہتی ہے، دونون ٹکرون یعنی آرکیالوجی کل اور زراعتی کا تذکرہ جداگانہ حصون مین ہوتا ہے، آرکیالوجی[6] کل حصہ کی ترتیب جدید حال مین عمل مین آئی ہے اور دو ڈھائی سال ہوئے ختم ہوئی ہے، پرانی سڑک جو فاصل تھی دو کردی گئی، نئی سڑک ایک دلکش روش پر ہموار اور سطح کے برابر نئی ترتیب کے مناسب حال بنائی گئی ہے، پائپ کی لائن نئی قائم کی گئی ہے، فوارے لگائے گئے ہین، تاریخی عمارات کے لیے موزون و مناسب ترمیم کی گئی ہے اور نہایت دلکش و دلآویز ماحول مہیا کردیا گیا ہے، پرانی باؤلی کے متصل دیوارون پر بیلین چڑھائی گئی ہین،

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید - صفحہ ۲۰۳،
[2] رپورٹ باغات سرکاری بابتہ ۳۰-۱۹۲۹، صفحہ ۹
[3] " " " ، صفحہ ۹
[4] " " " ، صفحہ ۱۰
[5] " " " ، صفحہ ۹
[6] رپورٹ انتظامی باغات سرکاری، صوبجات متحدہ، بابتہ ۲۹-۱۹۲۸، صفحہ ۱۰،

اس کے لانون کے شکستہ حال ٹکڑون کی مرمت کردی گئی ہے، خسرو کے مرکزی مقبرہ کے گرد جو کبھی پھولون کی کیاریان تھین، ان مین اب سرسبز و شاداب سدابہار پھلواڑی لگادی گئی ہے، باغ کے گلگشت، نظارہ وتفریح سے حکمران اور محکوم جماعتین دونون یکسان متمتع ہوتی ہین، اس محکمہ کی رپورٹ انتظامی[1] مین اس کا اندراج "تاریخی یادگارون کے باغ واقع خسرو باغ" کے نام سے کیا جاتا ہے،

زراعتی حصہ ۳۷۰ ایکڑ کا ہے، اسکا شمار" پراونشیل گارڈنیس[2]" کی مد مین ہوتا ہے، اس کی آراستگی و وسائل آمدنی کا ابھی تذکرہ کرچکا ہون، اس کے لانون پر بھی نئی گھانس نئے قسم کی لگائی گئی ہی،

اس سبزہ زار یا ہرے بھرے گھانس کے لمبے چوڑے قطعات پر پہنچکر مجھ ایسے پریشان خیال سیلانی کا دھیان خود بخود ایک دوسری طرف منعطف ہوجاتا ہے، یہان دو اکبر گذرے ہین، ایک اکبر اعظم، دوسرا اکبر اکبر، اکبر اعظم نے اس شہر کی بنیاد ڈالی، بسایا، اور الہ آباس یا الہ آباد بنایا تھا، یہ تو تونگری وحشمت، دولت کی فراوانی اور شوکت وقوت سلطانی کا کرشمہ تھا، اس کو پونے چار سو برس ہوے، دوسرے یعنی اکبر اکبر نے اپنی سخن سنجی وشیرین کلامی اور ذہنی ودماغی کمال سے اسکی دائمی شہرت وبقا کی ضمانت فرمائی، یہ ہمارے آنکھون کے سامنے کی بات ہے، مرحوم اکبر جب اس جگہ پہنچا ہے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا،

لان ٹنیس کے لیے بن گئے شاہی گلزار ساتھ سبزہ کے ہجوم گل وسوسن نہ رہا

سب سے پہلے جس یورپین سیاح کے قدم یہان آئے اور جس نے کم وبیش یہان کے حالات قلبند کئے وہ پادری پیٹر منڈی[3] ہین، انھون نے ۱۶۳۲ء مین اس مقام کو دیکھا تھا اور شاہزادہ خسرو کے مقبرے اور اسکی ترتیب و تزیین کا ذکر کیا ہی[4]، انکے دوسو برس بعد ۱۸۲۵ء مین بشپ ہیبر تشریف لائے اور وہ باتین صفحات تاریخ پر چھوڑ گئے[5]، جنکا بتانے والا نہ اون سے پہلے کوئی گذرا تھا، نہ اُن کے بعد آیا، مشہور انگریزی صناع اور آرٹسٹ مسٹر ٹامس ڈانیال

[1] رپورٹ انتظامی باغات سرکاری صوبجات متحدہ بابتہ ۲۹، ۱۹۲۸ - صفحہ ۱۱، [2] ایضا بابتہ ۳۰- ۱۹۲۹ صفحہ ۹،

[3] سفرنامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۱، [5] ہندوستان کے بالائی ممالک کلکتہ سے بمبئی تک کا روزنامچہ سیاحت مطبوعہ لندن ۱۸۲۸ء جلد اول صفحہ ۲۴۳،

بھی مستحق صد شکر و ستایش ہین، جنھون نے اپنے دوران سفر و سیاحت مین یہان کی بعض[1] عمارتون کے خریطے اور نقشے تیار کئے، یہ سنہ ۱۸۰۱ء مین یا اس کے قریب خوش رنگ شائع ہوئے تھے، اور آج بھی بڑے بڑے کتب خانون اور امرا کے ایوانات وقصور کی زیب و زینت ہین، ادب و فضل کی دیوی حسین و جمیل اشیار کی شیدا، لفظون مین تصویر کھینچ دینے والی فینی پارکس بھی یہان[2] آئی تھی، اور "واندرنگس آف اے پلگرم"[3] مین بقدر قلیل حال لکھ گئی ہے،

فارسی مین سب سے پہلے جن صاحب نے خسرو باغ کے (مختصر سہی مگر) حالات قلمبند کئے وہ مسٹر بیل مولف مفتاح[4] التواریخ ہین، پھر انگریزی مین جہانگیری سوانح کے سلسلہ مین ذی علم مستشرق بلاک مین صاحب کا دلچسپ آرٹیکل اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو مین نکلا، اس کے بعد مسٹر ایسٹ وک نے کتبون کی طرف بھی توجہ فرمائی، اور ان کا منظوم و منقفٰے ترجمہ کردیا، جو مرے صاحب کی ہینڈ بک صوبہ[5] بنگالہ مین موجود ہے، صاحب موصوف نے تحریر نہین فرمایا کہ ان قطعات کی نقلین ان کو کہان سے دستیاب ہوئی تھین مگر ترجمہ کی حالت اور اصل سے مطابقت کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بیل صاحب کی کتاب سے لئے گئے ہین، سب سے آخر ہمارے زمانہ کے مشہور علم دوست مسٹر ہنری بیوریج نے اس طرف التفات فرمایا اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء[6] مین ایک عالمانہ مقالہ شاہزادہ خسرو اور اس کے مدفن اور متصل کے مقبرون کی نسبت تحریر کیا، یہ لندن مین بیٹھ کر لکھا گیا تھا، اشعار و قطعات کی نقلین ہندوستان سے سر جارج ڈبرن کی معرفت حاصل کیگئی تھین، سرمایہ علم و واقفیت کافی اور ذرائع آگاہی وصحت و قابل اطمینان نہ تھے، اس لئے غلطیون کا رہجانا ناگزیر تھا، خود ان کو اعتراف تھا کہ ان قطعات (تاریخ) کی زبان کسی قدر مشکل ہے، اس وجہ سے اپنے ترجمون پر چندان اعتماد و اعتبار بھی نہ تھا، اطمینان خاطر کے لیے ہمہ دان و ہمہ زبان سر چارلیس لایل کو بھی دکھا لیا تھا، انھون نے پوری توجہ اور قابل قدر اعانت فرمائی تھی، زبان و مفہوم

---

[1] امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ مین شاہ بیگم کے مقبرے، دیوار اور کنوؤن کا رنگین نقشہ وغیرہ، [2] پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفیس صفحہ ۷۰، [3] دو جلدین سنہ ۱۸۲۲ء سے سنہ ۱۸۴۵ء تک [4] مطبوعہ سنہ ۱۸۴۹ء صفحات ۳۳۲ وغیرہ، [5] وغیرہ - مطبوعہ سنہ ۱۸۸۲ء، صفحات ۳۶۳ و ۳۶۴، [6] صفحات ۵۹۷ تا ۶۰۳،

کا جہانتک تعلق تھا، ترجمہ تو درست ہوگیا، مگر بیل صاحب اور سر چارڈ برن کے کاتب کی غلطیون کا ازالہ کیسے ہوتا،
دور حاضر کے عدیم النظیر فاضل اور میرے محسن مسٹر ڈیو ہرسٹ نے جب ممدوح، حسن اتفاق سے، الہ آباد مین قیام گزین تھے ان پر نظر ڈالی اور سوسائٹی مذکور کے رسالہ جولائی ۱۹۰۵ء مین انکی تصحیح اور بحالت ضرورت جابجا توضیح کردی بعض غلطیان فاش تھین، محض ٹائپ کی، مثلاً "سلمیٰ" کی جگہ "معلیٰ"۔ ان کے نقل یا بیان کرنے کی ضرورت نہین،

یاد بخیر، مسٹر طامس ولیم بیل سب سے پہلے مورخ ہین، جنھون نے اپنے زمانہ کی ایک رائج ملک زبان (فارسی) مین خسرو باغ اور اس کے مقابر کا ذکر مفتاح التواریخ مین لکھا اور اس کے بعد ایک اور کارآمد، جامع اور مفید کتاب اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری تحریر فرمائی، جسمین مشاہیر شرق کے ضروری اور پُراز معلومات مآثر انگریزی مین لکھ دیئے ہین، مسٹر بویریج کو اس کمی کا احساس ہوا، کہ مسٹر کین نے بیل صاحب کی کتاب (ڈکشنری) کو ترجمہ اور ایڈٹ تو کیا مگر تاریخون کو چھوڑ دیا ہے، ان کو افسوس ہے کہ بیل صاحب کی کتاب پھر (۱۸۸۱ء کے بعد) طبع نہین ہوئی، مسٹر بویریج کا خیال ہے کہ "مسٹر بیل یورشین رہے ہونگے، اور ضرور فارسی کے بڑے فاضل ہون گے، مسٹر کین لکھتے ہین کہ یہ بہت بڑی عمر پاکر ۱۸۷۵ء کے موسم گرما مین بمقام آگرہ فوت ہوئے، جہان صدر بورڈ مال کے دفتر مین محض ایک کلارک کی حیثیت سے ملازم تھے، لیکن ڈھاکہ کے ٹیلر صاحب، بہار کے کرسچین صاحب اور مانشیر رایان (معروف بہ حاجی مصطفےٰ، مترجم سیر المتاخرین) کی طرح کتنے ایسے زندۂ جاوید نام ملین گے جو بہت سی مستقل اور ہمیشہ رہنے والی کارآمد و مفید تالیفات چھوڑ گئے ہین، ان کے مقابلہ مین بہت سے بلند مرتبہ یورپین افسران کی کیا عزت ہوسکتی ہے، سر ہنری ایلیٹ صاحب کی تاریخ کا اختتام بیل

لہ صفحات ۷۶، فاتحہ ۹۷، ۷ صفحات ۳۲۲ لغایتہ ۳۳۳ سے رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۶۰۳.

کلہ اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، مطبوعہ ۱۸۸۱ء، تمہید صفحہ اول شہ یہ تینون صاحب مخلوط النسل تھے اور کسی بڑے عہدہ تک نہین پہنچے، مگر علمی وادبی سرمایہ کثیر چھوڑ گئے ہین، سیر المتاخرین کے ترجمہ سے زیادہ اسکی تمہید اور شیرین زبان قابل مطالعہ و تحسین ہو، ایک یونانی فرانسیسی اور ایسی پیاری انگریزی،

صاحب کی تاریخ کے ذکر اور انکی قلمی اعانت کے اعتراف پر ہوا اور بالکل بجا ہوا ہے، امید ہے کہ ان کے مدفن کا پتہ اور علم ہوگا، اور اس پر پتھر بھی ہوگا، نامور فاضل (مسٹرای بی) ایسٹ وک (صحابی) نے مرّے کی ہینڈ بک مین کیتھرائن پیل کی قبر کا ذکر کیا ہے، جو اگست ۱۸۵۵ء مین فوت ہوئی تھین ؛

پروفیسر ڈوسن نے بھی اپنی تاریخ ہند کی آٹھوین جلد مین ان کا تذکرہ کیا ہے[۱]،

مسٹر بیل کے اس تذکرہ پر بعض مغرب پرست حضرات چین بہ جبین ہو نگے اور یہان شاید بے محل قرار دینگے، راقم ہیچمدان کے خیال مین کسی علمی یا ریخی تحریر کو محض پٹواری کی کھتونی نہ بنانا چاہئے جسکی خانہ پُری بلا ازدیاد حرف کافی و وافی سمجھی جائے اور خلاف ورزی مستوجب باز پرس متصور ہو، جس شخص نے اپنی جنبش قلم سے خسرو باغ کو صفحات کاغذ پر حیات تازہ بخشی کیا وہ اس قدر اعتنا و التفات کا بھی مستحق نہین ہے جو نہ صرف خسروباغ، نہ صرف الہ آباد، نہ صرف ہندوستان، بلکہ پورے مشرق براعظم ایشیا سے بھی کچھ زیادہ کا محسن و خدمتگذار رہے ؛

افسوس ہے کہ ان مقبرون کے حالات تفصیل کے ساتھ درکنار برائے نام بھی کسی پرانی کتاب مین نہین ملتے، مسٹر بیل نے جس قدر تحریر کئے ہین، اس سے کسی تشنۂ تحقیق و تجسس کی تسکین نہین ہوتی، ان کی مختصر تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہان چار روضے ہین جنپر عالیشان گنبد بنے ہین :-

(۱) چھوٹا سا، پچھم طرف، معلوم نہین کون دفن ہے، بعض کہتے ہین کہ بی بی تمبولن کا روضہ ہے،

(۲) عمارت سنگین، وگنبد، مادر خسرو کا مزار ہے،

(۳) روضہ، وسط باغ مین، بڑے دروازے کے مقابل ہے، سلطان خسرو کی ہمشیر نے ۱۰۳۴ء مین اپنے دفن کے لیے یہ عمارت بنوائی تھی، کہین اور مرین، خالی ہے، شعر بہت سے لکھے ہین،

(۴) روضہ، سمت مشرق، مرقد خسرو،

گزیٹیر سابق کے ذی علم مؤلفین کی جماعت نے جو مسٹر اسٹیل، مسٹر فشر، اور مسٹر (حال سر) جان پرسکوٹ

---

[۱] تاریخ ہند خود اہل ہند مورخین کے قلم سے "، مطبوعہ ۱۸۷۷ء مفتاح التواریخ، صفحات ۴۳۵ تا ۴۳۶،

ہیویٹ پر مشتمل تھی صرف امور ذیل کے لکھنے پر قناعت کی،

(۱) اس راجپوت ملکہ کی قبر[1] مع اسکی بیٹی اور بیٹے خسرو کے مقبرون کے خسرو باغ مین واقع ہے،

(۲) سڑک کی دوسری[2] طرف وہ مکان ہے جسمین سوپرنڈنٹ باغ کی بود و باش ہے، عام روایات کے مطابق تمبولی بیگم کا مکان کہلاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ وہی شاہزادی ہو جو فتحپور سیکری مین اسا مبولی بیگم کے نام سے یاد کیجاتی ہے

جدید گزیٹیر[3] مین کرنیل نیویل نے اسقدر لکھا کہ خسرو کی ماں "رانی" نے افیون کھائی، وہ اس باغ مین دفن ہے، اسی جگہ خسرو اور اسکی بہن کے بھی مقبرے ہین، دوسرے موقع پر[4] اضافہ فرماتے ہین:-

۱- خسرو یہان کے چارون مقبرون مین سے بالکل اخیر یورب کے مقبرہ مین دفن ہے،

۲- دوسرا مقبرہ خسرو کی بہن کا ہے جو ۱۶۲۵ء مین مری تھی، اسمین بہت سے کتبے ہین مگر اکثر اب شکستہ حالت مین ہین،

۳- تیسرا خسرو کی ماں کا ہے،

۴- باغ کے عین وسط مین چوتھا مقبرہ ہے جو تمبولن کا کہلاتا ہے، کچھ عرصہ تک افسر منتظم باغ کا مسکن رہا تھا، ان صاحبون نے اور جو دو ایک باتین کام کی لکھی ہین، وہ ہر مقبرہ کے جداگانہ حالات مین نقل کیجائین گی، ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ڈائرکٹر جنرل امپیریل گزیٹیر آف انڈیا نے بھی صرف چند لفظون مین خسرو باغ کا تذکرہ ختم کر دیا ہے، لکھتے ہین[5] کہ " یہ باغ اور روضہ شاہزادہ خسرو ریلوے اسٹیشن کے متصل ہے، مقبرہ پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہے، اس کے اندر پھولون اور چڑیون کی تصویرین ہین، دو اور چھوٹے چھوٹے مقبرے اسکے متعلق ہین؛ تاج کی نظیر شاید اسکی بے نظیر شہرت و نام کے سبب سے آپنے پیش کی ہے، ورنہ وہ تو سالہا سال بعد بنا ہے

آپنے دیکھا گزیٹیر والون نے کس اختصار سے کام لیا ہے مفتاح التواریخ ہو یا کوئی ہینڈبک یا گزیٹیر، انکی تحریرون مین فرق محض طرز ادا کا ہے، بیل صاحب لکھتے تو اپنے طرف سے اور فارسی مین ہین، مگر مغربی انداز پر

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۳، [2] ایضاً صفحہ ۱۶۵، [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۶۹ [4] ایضاً صفحہ ۲۴۳ [5] مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے صفحہ ۱۹۸، جلد اول، صفحہ ۱۸۳ پر بھی ذکر ہے مطبوعہ ۱۸۸۵ء،

پہلے بائین جانب نظر ڈالتے اور بائین سے شروع کرتے ہین، مسٹر اسٹیل باوجود اپنی مغربی وفرنگی جبلت ووضع کے پہلے داہنی سمت دیکھتے اور اسی طرف سے لکھنے لگتے ہین، کرنل نیویل نے جو قلم اور تلوار دونون پر یکسان قدرت وقوت رکھتے ہین، اس مہم مین جادۂ کہن یعنی اسٹیل صاحب کی مختصر نگاری کی فرسودہ روش سے ہٹنا گوارا نہین فرمایا، ایک متبع یا مقلد کی طرح قدم بہ قدم چلے اور ایک ناقل کے طور پر انھین کے الفاظ کم وبیش دہرا دیے ہین،

ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب "صنادید ہند" مین اتنا ہی لکھ کر خاموش ہوگئے کہ یہان خسرو، اسکی مان اور بہن کے مقبرے اور تمبولن بیگم کا مکان ہے"؛ اس تحریر مین نہ کوئی سلسلہ ہے نہ ترتیب، کوئی کیا کہہ سکیگا!

مسٹر بیوریج، ایسٹ وک صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہین کہ نورجہان کا بھی ایک خالی مقبرہ یا سینوٹاف خسرو باغ مین تھا،

ایک کارآمد وراحت رسان چیز اگلے زمانہ کی اہم اور ضروری تعمیرات مین داخل تھی اور یہان بھی موجود تھی، ایک شاندار "باؤلی" تھی، حال کے مورخین نے وطنی ہون یا مسافر اس کے بارہ مین کچھ نہین لکھا، صرف پیٹر منڈی صاحب نے جو ۱۶۳۲ء مین یہان آئے تھے تحریر فرمایا ہے:-

"خود باغ کے پاس ہی ایک خوبصورت باؤلی یا کنوان ہے، اس مین ایک سو بیس سے زیادہ سیڑھیان ہین، خوشنما شہ نشین اور محرابین ہین، چیونے کے درخت ہین، گرمی مین رہنے کے لئے سردخانے اور ٹھنڈے ٹھنڈے مکان ہین، جو "فریسکو" یعنی ٹھنڈک اور سایہ مین تازہ تازہ ہوا کے پہنچنے کے لئے بنائے گئے ہین، اوپر سے نیچے تک پہنچنے کا راستہ اندر ہی اندر ہے، یہ راستہ، وسیع، کشادہ آسان گزار اور خوب روشن ہے، حتی کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی نیچے چلا جاتا اور اپنے ہاتھ سے پانی پی لیتا ہے، ٹھیک اسی مقام کے اوپر جہان کہ پانی ہے ایک کنوئین کا اچھا سا منہ ہے

---

[1] جلد دوم باتبہ ممالک مغربی وشمالی واودھ، صفحہ ۱۳۰، [2] جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۶۰۷، نوٹ ۲، [3] خالی مقبرہ جو کسی شخص کی یادگار مین جو کہین اور دفن ہو، بنا دیا جائے، [4] سفرنامہ پیٹر منڈی، جلد دوم صفحہ ۱۰۱- اور مرے صاحب کی بنگالہ کی ہینڈبک، صفحہ ۳۶۴، پروفیسر بنی پرشاد، کی تاریخ جہانگیر، صفحہ ۱۴۰،

یہان سے لوگ اپنے برتنون، بیلون اور طریقون سے پانی کھینچ لیتے ہین "

مسٹر ڈائیتل نے اپنے نقشہ[۱] مین ایک موقع رانی یا شاہ بیگم کے مقبرہ کے متصل بھیم کو دکھایا ہے جسمین بلند چبوترہ، اور زینہ وغیرہ بھی صاف نمایان ہین، بہت سے تماشائی، نیز حاجتمند مرد وعورت، پانی لیجانے کے مختلف برتنون اور جانورون کیساتھ، کھڑے، بیٹھے چلتے پھرتے نظر آتے ہین، مگر یہ جگہ باؤلی کی نہین، بلکہ کنوئین کی معلوم ہوتی ہے، باؤلی کا انجام اس کے مقام پر تحریر کیا جائے گا،

پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس مین اس قدر لکھا[۲] ہے کہ "پرانا کنوان اور پانی کی نہرین اور نالیان ایسی خوبصورت ہین کہ انکی تصویرین پیش کیجاتی ہین"

بیوریج صاحب فرماتے ہین[۳] "کہا جاتا ہے کہ خسرو کے دو بیٹے بھی خسرو باغ مین دفن ہین "

سلطان خسرو اور شاہ بیگم کے پہلوؤن مین متعدد چھوٹی بڑی قبرین موجود ہین، کوئی کتاب نہین نہ کسی تاریخ مین تذکرہ ہے، اسلئے ان شاہزادون کے مرقد کا وثوق وصحت کیساتھ تعین کرنا اس وقت دشوار ہے، آجکل کے بعض کم محنت آسان پسند لوگون کا شیوہ بلا تحقیق و تلاش ہر بات مین دخل در معقولات کرنا اور اپنی ہمہ دانی کے اظہار کے لئے کچھ نہ کچھ لکھدینا ہے، میرے نزدیک یہ کوئی مستحسن اور پسندیدہ روش نہین، ورنہ یہ کہدینا سہل نیز قرین قیاس ہوتا کہ خسرو کی قبر کی بغلون مین جو لڑکے دفن ہین یہی شاہزادے ہین، کب مرے اور کس عمر مین، خسرو سے کتنے دن بعد، کیا نام تھا، آج ان سوالات کا جواب شافی کون دیسکتا ہے؟

باغ کے اندر داخل ہونے کے بعد، بلکہ پھاٹک مین قدم رکھنے کے ساتھ ہی، ان عمارات پر میری نگاہ دفعۃً جس سلسلہ و ترتیب سے پڑی تھی حوالہ قلم کرتا ہون اور وہ کرنیل نیویل کی تحریر کے مطابق ہے،

داہنی طرف سے سڑک کے ایک جانب،

پہلا، خسرو کا مقبرہ، گنبد دار، رفیع و وسیع، کواڑ بھی ہین، بغلون مین دو لڑکے، پھر کچھ ہٹ کر، سنگین حوض

---

[۱] موجودہ امیرالدولہ گورنمنٹ لائبریری، لکھنو، [۲] صفحہ ۵۰ [۳] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۷،

ہشت پہل مع فوارہ، ویران وخشک، اُسی لین مین،

دوسرا خسرو کی بی بی کا، بلند گنبد لیلی بیگم کہلاتی ہے، قبر کا نشان اوپر ہے ہشت پہل اور گزیٹیر والے اسکو خسرو کی بہن، سلطان النسا یا سلطان بہار بیگم کا لکھتے ہین، اور یہی قرین قیاس و قابل قبول ہے،

پھر ویسا ہی ہشت پہل رنگین حوض اور فوارہ،

تیسرا شاہ بیگم کا سہ منزلہ مختصر قبہ اوپر ہے، بیگم کے داہنی طرف دو قبرین، بائین جانب دو پہلو کی صحن چوپن مین بھی قبرین، کواڑون سے محفوظ ہے،

ان مقبرون کے پیچھے حوض کی پشت پر قد آدم پردہ کی دیوار، جس سے کبھی پانی کے جھرنے اور آبشار روان رہے ہونگے

دوسرے قطعے مین، پچھم طرف، اس قطار سے علحدہ، تمبولن یا تمبولن بیگم کا،

ان کی تیسری ترتیب تو قدرتی، یعنی تعمیر و زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے یہ ہونا چاہئے تھی،

۱ شاہ بیگم - ۱۰۱۲ھ

۲ خسرو - ۱۰۳۱ھ

۳ سلطان بہار بیگم - ۱۰۴۴ھ

۴ - تمبولن کا - لامعلوم،

پہلی قبر بناتے وقت کس کو خیال ہوگا کہ یہان اور شاہزادے اور بیگمین بھی کبھی دفن ہونگی، بعد کی تعمیرات مین ہی سوء اتفاق سے کوئی سلسلہ و ترتیب ملحوظ نہ رکھا گیا محض گنجایش پر نظر ڈالی گئی، جہان جگہ پائی آباد کردیا،

(باقی)

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے بادشاہت تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین اور انسے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیون حقایق کا انکشاف ہوتا ہے ضخامت: ۔۹۰ صفحات چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب قیمت للعہ

"منیجر"

نواب امیر الممالک آصف الدولہ صلابت جنگ بہادر مرحوم

کے

بعض عنایت نامے

از جناب محمد غوث صاحب (عثمانیہ) حیدر آباد، دکن

حضرت ناصر جنگ شہید کی پیشگاہ سے جو عنایت نامے تنجاور کے راجہ پرتاب سنگھ کے نام صادر ہوئے تھے وہ گذشتہ مہینے مین پیش کئے جا چکے ہین، اس وقت نواب صلابت جنگ مرحوم کے بعض عنایت نامون کے متعلق کچھ لکھنا مقصود ہے،

فی الوقت حضرت مرحوم کے (۷) عنایت نامے پیش نظر ہین، یہ بھی راجہ پرتاب سنگھ ہی کے نام ہین، افسوس ہے کہ ان کے لفافے بھی تلف کر دیئے گئے ہین، البتہ ان کی پشت پر اصل مہر چسپان کر دی گئی ہے، دو عنایت نامون کی پشت پر مرہٹی مین خلاصۂ عنایت نامہ درج ہے، اس سے عنایت نامون کو تنجاور سے متعلق ہونے کی شہادت قوی تر ہو جاتی ہے،

یہ عنایت نامے بھی افشانی کاغذ پر ہین، "بیض خاص" سے بھی مزین ہین، ایک عنایت نامہ پر "شرح دستخط خاص" موجود ہے، "شہامت و جلادت دستگاہ" کے القاب استعمال فرمائے گئے ہین، دو عنایت نامون پر "صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴" کی مہر ثبت ہے اور باقی پر "آصف الدولہ ۱۱۶۵" کی مہرین ہین،

(۱)

تاریخی طور پر معلوم ہے کہ محرم ۱۱۶۴ھ مین قلعہ نصرت گڈہ جینجی پر از سر نو قبضہ کرنے کے لیے حضرت ناصر جنگ

شہید نے ارکاٹ سے کوچ فرمایا، اس کے بعد میدان قیچی مین جو معرکہ درپیش ہوا اسمین اعدای نے حضرت موصوف کو اپنی تفنگ کا نشانہ بنایا اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، اس کے ساتھ ہی نواب مظفر جنگ کی حکمرانی کا پھر اعلان ہوا، نواب مظفر جنگ نے کرناٹک کے انتظامات سے فراغت حاصل کرکے جانب بلدہ فرخندہ نہاد عزم فرمایا، لیکن اثنائے راہ ہی مین ہمت بہادر خان کے ہاتھون سے نواب مظفر جنگ کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا، اب حضرت آصف جاہ اوّل کے ایک دوسرے فرزند نواب صلابت جنگ وارث مسند آصفی قرار پائے، اس زمانہ مین دہلی سے کوئی فرمان صادر ہوا، اس کے ضمن مین ذیل کا عنایت نامہ مرحمت ہوا، اس عنایت نامہ پر "صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴ھ" کی مہر چسپان ہے اور پشت پر خلاصۂ عنایت نامہ مرہٹی مین درج ہے، عنایت نامہ نے اسطرح نگارش پائی ہے:-

"درین زمان مسرت پیرا داوان دولت افزا کہ افضال الٰہی شامل حال و امداد سماوی باعث حصول آمانی و آمال فرمان والاشان مرحمت عنوان مزین بخط اقدس اعلیٰ مرقوم قلم فرنگ بہ کمال تفقد و عنایت باخلعت دوشالہ ملبوس میمنت اختصاص از حضور پرنور شرف ورود بخشیدہ باعث وفور سرور و شکر سپاس حضرت رب غفور رشد، حضرت تعالیٰ و تقدس مراحم خاقانی را کہ فی الحقیقہ پرتو الطاف سبحانی است، بر جمیع فدویان و دولت خواہان مبارک و ہمایون و ظہور این مکارم ذریعہ ترقیات و جمعیت روز افزون سازد، زیادہ چہ نوشتہ شود۔"

(۲)

نواب صلابت جنگ مرحوم بعد مسند نشینی حیدرآباد فرخندہ بنیاد مین رونق افروز ہوئے، بعد ازان جانب اورنگ آباد قصد فرمایا، اس زمانہ مین مرہٹون نے جو قوت پیدا کرلی تھی اس کا تذکرہ موجب تطویل ہے، مختصر یہ کہ بالاجی راؤ پسر باجی راؤ پیشوا نے احمد نگر پر قبضہ کرلیا تھا، اس کی تنبیہ کے لیے نواب صلابت جنگ مرحوم نے لشکر کو کوچ کا حکم فرمایا، سخت معرکون کے بعد لشکر آصفی فتحیاب ہوا، اس تقریب مین جو عنایت نامہ شرف صدور پایا،

وہ ذیل مین نقل کیا جاتا ہے،

واضح ہو کہ یہ عنایت نامہ بھی جس کی پشت پر مرہٹی مین خلاصہ درج ہے بہ مہر" صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴"

جاری ہوا، بہرحال مضمون عنایت نامہ یہ ہے:۔

"الحمد للہ والمنۃ بالاجی از قرار واقع سرجھنگہاے مستوفی یافتہ بہ کمال عجز و الحاح ناہج منہج قویم اطاعت و انقیاد گردید، و غاشیہ اذعان و فرمان برداری را بر دوش کشید لہذا ہم عنانی جنود مجندہ ہدایت الٰہی افواج ظفر امواج پاشنہ کوب متوجہ آن حدود[1] است و عنقریب نزول اجلال فرخندہ قاطبۃ از غبار فتنہ و فساد مفسدان متمردان آن مرز و بوم را صفاے تمام می بخشد با وصف تاکیدات حضور در تقدیم وفاق و اتفاق گورنر[2] ڈر[3] بہادر ظفر جنگ جنرال بندیچری[4] و شمس الدولہ بہادر مبارز جنگ[5] و اجتناب موفور از رفاقت محمد علی خان باغی[6] ظہور اعانت باغی مزبور از ان شہامت پناہ خلاف مرضی و بسیار بد واقع شدہ[7] بہر تقدیر مضی ما مضیٰ الحال بمجرد ورود این پروانہ عاطفت نشانہ ازین حرکت بے برکت احتراز کلی ورزند، و سود و بہبود حال و قال خود را ملحوظ داشتہ ازین معنی محرز باشند، و بحضور معروض دارند و الا ہیچ وجہ نتیجہ نیک نخواہند یافت خیر شرط است. زیادہ چہ نوشتہ شود"۔

(۳)

نواب مظفر جنگ عازم بلدہ فرخندہ بنیاد ہوئے تو نواب حسین دوست خان نے صوبہ داری کرناٹک

---

[1] ملک کرناٹک مراد ہے، ۱۲ [2] لفظ گورنر کو اسیطرح اس زمانہ مین لکھا جاتا تھا، ۱۲ [3] ڈوپلے مراد ہے، [4] نواب حسین دوست خان چندا صاحب مراد ہین، [5] نواب والاجاہ بہادر مراد ہین، چونکہ نواب صلابت جنگ بہادر فرانسیسی اثر سے مسند آرا ہوئے تھے اور تا حال ان پر فرانسیسی اثر کافی طور سے موجود تھا، لہذا نواب والاجاہ بہادر کی مخالفت ظاہر ہے، نواب والاجاہ بہادر فرانسیسی اثر و اقتدار کے بالکلیہ مخالف تھے ۱۲ [6] راجہ پرتاب سنگھ نے کرناٹک کے ان ہنگامون مین جو نواب ناصر جنگ شہید کے بعد ظہور پذیر ہوئے نواب والاجاہ بہادر کا ساتھ دیا تھا بنا بر این یہ عتاب صادر ہوا۔ ۱۲

کے لئے بڑی جد و جہد کی، نواب مظفر جنگ نے ان کو اس خدمت پر مامور کیا تھا، نواب والاجاہ بہادر حسب فرمان وصلی جو نواب ناصر جنگ شہید کی وساطت سے مرحمت ہوا تھا، خود کو اس خدمت کا مستحق خیال کرتے تھے، ان دونوں دعویٰ داروں نے اپنی پوری قوت صرف کی، انجام کار نواب حسین دوست خان کو راجہ پرتاب سنگھ کے ایک جنرل مانا جی راؤ نے دھوکہ دیکر شعبان ۱۱۶۵ھ میں قتل کر ڈالا، اس واقعہ کے بعد نواب صلابت جنگ مرحوم نے جو عنایت نامہ جاری فرمایا وہ یہ ہے:

"فوجداری و متصدی گری ارکاٹ وغیرہ کرناٹک پایان گھاٹ از انتقال شمس الدولہ حسین دوست خان بہ شہامت و بسالت دستگاہ غلام مرتضیٰ خان بہادر[1] مقرر و مفوض شد کہ باتفاق و استصواب مہربان بلند مکان گورنر و بہادر جنرال ظفر جنگ[2] بسرانجام مہام آنجا پردازند آن شہامت دستگاہ بموافقت و مرافقت گورنر و بہادر و غلام مرتضیٰ خان بہادر کوشند کہ موجب . . . . و ذریعہ بہبودان جلادت دستگاہ خواہد بود، زیادہ چہ نوشتہ شود"

متذکرۂ بالا عنایت نامہ بہ مہر "آصف الدولہ ۱۱۶۵" نافذ ہوا"

(۴)

اسی ضمن میں ایک دوسرا عنایت نامہ بھی صادر ہوا، اس پر بھی "آصف الدولہ ۱۱۶۵" مہر چسپاں ہے، عنایت نامہ کے مضمون نے اس طرح نگارش اختیار کی ہے:-

"قبل ازیں عنایت نامجات متواتر متضمن طلب حضور بہ انور الدین خان بہادر[3] ترسیل یافتہ حالا ہم تاکید تشدید نوشتہ شدہ یقین کہ مطابق حکم کاربند خواہد شد، چون خواست جلیل المرتبت ارکاٹ و ترچناپلی بعموصاحب مہربان گورنر و بہادر ظفر جنگ[4] مقرر است درین ولا نیابت عمو صاحب معز الیہ بہ شہامت دستگاہ غلام مرتضیٰ خان[5] تفویض یافتہ باید کہ آن جلادت دستگاہ باتفاق و استصلاح گورنر و بہادر شریک خان

[1] غلام مرتضیٰ خان ویلور کے جاگیردار تھے، اور نواب حسین دوست خان کے خاندان سے ہی تھے، [2] ڈوپلے مراد ہے، [3] نواب والاجاہ بہادر مراد ہیں۔ [4] ڈوپلے مراد ہے، [5] جاگیردار ویلور،

مشارالیہ بودہ حسن خدمت وتردد او فدیہ توجہ خاطر شناسند، زیادہ چہ نوشتہ شود۔"

شرح دستخط خاص :- " تاکید اکید دانند"

نواب صلابت جنگ مرحوم کے مقابلہ مین حضرت آصف جاہ اول کے بڑے فرزند نواب غازی الدین خان فیروز جنگ مرحوم مسند پدری کے آرزومند ہوئے، پیشگاہ حضرت بادشاہ احمد شاہ سے خلعت صوبہ داری دکن عنایت ہوا، ملہار جی ہولکر اور جی آپا سندھیہ نے ساتھ دیا، برہان پور مین پہنچکر بعض انتظامات بھی انجام پائے، قرب وجوار کے قلعدارون وغیرہ نے حکم برداری اختیار کی، وہان سے جانب اورنگ آباد توجہ عمل مین آئی، یہان ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ مین پیغام اجل آگیا، اس واقعہ کے بعد جو عنایت نامہ بہ مہر" آصف الدولہ ۱۱۶۵ھ" جاری ہوا وہ یہ ہے :-

" سانحہ ناگزیر نواب صاحب وقبلہ فیروز جنگ مرحوم باعث ملال خاطر شد کہ بزرگ بودند وذات ایشان را از مغتنمات می دانستم الحال برائے تنبیہ وتادیب فرقہ واجب التفرقہ زیادہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُمدپس منزل بہ منزل توجہ عساکر فتح رہبر درپیش است بخاطر جمع برفاقت انورالدین خان بہادر[1] سرگرم شیوۂ زمینداری و مالگذاری بودہ رہ نورد اطاعت وانقیاد باشند واین معنی را ذریعہ سود و بہبود حال وقال شناسند زیادہ چہ نوشتہ شود۔"

(۶)

صاحب توزک آصفیہ کا بیان ہے کہ نواب غازی الدین فیروز جنگ مرحوم کے انتقال کے بعد نواب صلابت جنگ مرحوم کے نام پیشگاہ بادشاہی سے فرمان استقلال شرف صدور لایا، اور خطاب آصف الدولہ مرحمت ہوا،[2] اس ضمن مین جو عنایت نامہ بہ مہر آصف الدولہ ۱۱۶۵ صادر ہوا وہ یون ہے :-

" درین ایام فیروزی انجام شقہ موشح بخط قدسی نمط متضمن مشکور گردیدن مساعی وترددات تنبیہ وتادیب بالاجی درپیش گاہ خلافت وجہان بانی وظہور عنایات وتفضلات بے پایان

---

[1] غالباً نواب والاجاہ بہادر مراد ہین، [2] ص ۲۴۷

و شگفتگی گلشن ہمیشہ بہار خاطر ملکوت ناظر اقدس اعلیٰ بر شحات این لطیفہ روح افزا عنایت خطاب مستطاب

آصف الدولہ و خلعت ملبوس خاص مع سرپیچ مرصع بورود مسعود مرحمت آمود سرمایہ فخر و مباہات و

مبانی و آمال را استحکام تمام بخشید، مراتب مرقومہ از نقل آن کہ فرستادہ شد معلوم خواہد شد باید بر جادہ

صدق اعتقاد و بروج عقیدت مستقیم بودہ نویسان حالات ورود دادباشند و بادای زرہای برکار

ذمہ خود پرداز نداین معنی ذریعہ سود و بہبود خود شناسند زیادہ چہ نوشتہ شود"

اس عنایت نامہ سے واضح ہے کہ خطاب آصف الدولہ نواب غازی الدین خان فیروز جنگ مرحوم کے

انتقال سے قبل مرحمت ہوا، چنانچہ نواب حسین دوست خان کے قتل کے بعد جو عنایت نامے نافذ فرمائے گئے اس پر

"آصف الدولہ" کی مہر چسپاں ہے، نواب حسین دوست خان کا واقعہ نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے انتقال

سے قبل واقع ہوا ہے، بالاجی راؤ پر فتحیابی سے متعلقہ جو عنایت نامہ اس سے قبل نمبر ۲ پر نقل کیا گیا ہے، اس پر

"صلابت جنگ بہادر" کی مہر چسپاں ہے، اس کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ خطاب "آصف الدولہ" عنایت ہوا،

بہرحال تزک آصفیہ کا یہ بیان درست نہیں کہ "خطاب آصف الدولہ" بھی نواب غازی الدین خان فیروز جنگ

کے انتقال کے بعد مرحمت ہوا،

(۷)

پیشگاہ بادشاہی سے کوئی اور فرمان عنایت ہوا، اس کے متعلق ذیل کا عنایت نامہ بہ مہر آصف الدولہ

۱۱۶۵ھ نافذ ہوا:-

"درین ایام عشرت آغاز فیروز انجام فرمان والاشان موشح بخط خاص تقدس اختصاص مشحون باصناف

تفضلات و انواع تفقدات پرتو ورود افگندہ ساحت امانی و امال را روشن ساخت دقائق عواطف روز

افزون روح افزاے والا از روے نقل آن کہ بجہت مزید سرور و ابتہاج خاطران شہامت دستگاہ

سمت ترسیل پذیرفتہ واضح و لائح خواہد گردید زیادہ چہ نوشتہ شود"،

تلخیص و تبصرہ

اسلام کے قرون وسطیٰ مین ساہوکاری کی ابتدا

عنوان بالا سے مضامین کا ایک سلسلہ جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن مین شروع ہوا ہے، جس کی پہلی قسط کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے:-

گذشتہ تیس چالیس سال کے اندر دسوین صدی عیسوی کی سلطنت عباسیہ سے متعلق چند ایسے ماخذ شائع ہو گئے ہین مثلاً تاریخ الوزراء ہلال الصابی، کتاب تجارب الامم مسکویہ اور نشوار المحاضرہ التنوخی جو اس عہد کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کے لیے حقیقۃً ایک خزینۂ معلومات ہین، ان تصانیف نے ہمارے سامنے بالکل ایک نئی دنیا کھول کر رکھ دی ہے، ان کتابون کے مصنف چونکہ خود حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار تھے اسلئے انھون نے خاص طور پر معاشی حالات اور ملکی نظم و نسق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور مالیات، نظام مالگذاری، انتظام زمینداری، عملۂ حکومت اور وزراء کے حالات نہایت وضاحت سے پیش کیے ہین ان ماخذون مین مختلف ادارون، محکمون، اور دفترون کے نامون کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن ہم کو فوراً ہی یہ نہین معلوم ہو جاتا کہ کیونکر وہ تمام ادارے کام کرتے تھے یا یہ کہ حکومت کی اس مشین کی ہر کڑی سے متعلق کو نسا کام تھا اس پیچ در پیچ نظام حکومت کو سمجھنے کے لیے صرف ایک طریقہ ممکن ہے یعنی اصطلاحات سے ابتدا کیجائے اور علٰحدہ علٰحدہ ہر اصطلاح کے معنی متعین کئے جائین، یہی طریقہ بیت المال الخاصہ اور بیت المال العامہ کے معنی کی تعیین مین استعمال کیا گیا ہے اور اسی طریقہ سے مسلمانون کے مالی نظام کی تحقیق کی کوشش کی جائیگی،

نیز لفظ جہبذ کے سلسلہ مین یہود کی تاریخ کے ایک پہلو پر روشنی ڈالیجائیگی، ان کتابون مین معاشی اور مالی نظام کے بیان مین یہود کا ذکر بھی اکثر آیا ہے جو حکومت کے اعلیٰ عہدون پر مامور تھے اور جنکو سلطنت کے مالیات سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ایک مسلمان مورخ کے لیے ان کا ذکر کرنا ناگزیر تھا۔

ہم جہبذ کے لفظ سے اپنی تحقیق کی ابتدا کرتے ہین، ایک عرب لغت نویس اس کے معنی یہ بتاتا ہے

"ایک ماہر مالیات جو پیچیدہ ترین معاملات مین تجربہ رکھتا ہو اور روپیہ کے کاروبار مین پوری طرح ماہر ہو"

جہبذ کا ذکر خلیفہ المنصور (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) کے زمانہ کے عرب ماخذون مین بھی آیا ہے لیکن جو لوگ خاص طور پر اس لقب سے ممتاز تھے وہ دسوین صدی عیسوی مین زیادہ نمایان ہوئے، اسکا سبب غالبًا یہ ہو کہ اس صدی مین تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا، نوین صدی کے آخر مین سلطنت عباسیہ کے مالی نظام مین ایک تبدیلی واقع ہوئی، اسکا سبب جیسا کہ وان کریمر پہلے بیان کرچکا ہے، یہ ہوا کہ درہم نقرئی کے بجائے اب دینار طلائی معیاری سکہ قرار پایا، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آٹھوین اور نوین صدی کے فرد محصول مین مغربی صوبون کی آمدنی دنیار مین ظاہر کیگئی ہے اور مشرقی صوبون کی درہم مین، برخلاف اس کے دسوین صدی مین بجٹ کی تمام مدون کا حساب دینار مین دکھایا گیا ہے،

ان جدید حالات اور رائج الوقت سکون کے اختلاف اور انکی قیمتون کے اتار چڑھاؤ نے اس امر کی ضرورت پیدا کی کہ جو سکے بیت المال عامہ مین داخل ہون وہ معیاری سکون مین تبدیل کرکے داخل کئے جائین یہی کام جہبذ کو سپرد ہوا اور اسی وجہ سے جہبذ کا عہدہ ایک ضروری عہدہ قرار پایا، اس عہدہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان ماخذون مین مال الجہبذ کا ذکر اکثر آیا ہے، نیز ایک مخصوص دیوان الجہبذ کے قیام کا تذکرہ بیان ہے اور ان لوگون کا نام بار بار آیا ہے جو جہبذ کے لقب سے پکارے جاتے تھے، مال الجہبذ ایک قسم کا محصول ہی جو اس زمانہ کے مالیات مین کافی اہمیت رکھتا تھا، ۹۱۸ء-۱۹ء کے بجٹ مین یہ ایک مخصوص مد کے طور پر رکھا گیا تھا، دیوان الجہبذ کے قیام کا ذکر اول اول ۹۲۸ء مین آتا ہے، اس دیوان کا افسر اعلیٰ اسوقت ایک

عیسائی ابراہیم بن ایوب تھا، قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج مین دیوان الجہبذ کا تفصیلی بیان موجود ہے، لیکن جہبذ کے کام سے واقفیت کا ذریعہ مال الجہبذ کی اصطلاح کا رائج ہونا اور دیوان الجہبذ کا قائم ہونا ہی نہین ہے بلکہ ہمارے ماخذون مین بھی ان لوگون کے نام اور ان کے کامون کے صحیح حالات موجود ہین جو جہبذ کے لقب سے پکارے جاتے تھے، مثلاً ان ماخذون مین حسب ذیل جہبذون کے نام دیئے ہوئے ہین: ابراہیم بن احمد بن ادریس، ابراہیم بن یوحنا، ذکریا بن یوحنا، سہیل بن نذیر، اسرائیل بن صالح، نکوس بن اندونا وغیرہ،

خلیفہ المقتدر کے دربار مین جتنے جہبذ تھے ان مین سے کسی نے ان دو جہبذون کی سی اہمیت حاصل نہین کی جو الجہبذان الیہودیان کے لقب سے مشہور ہین اور جنکے نام یوسف بن فنحاس، اور ہارون بن عمران ہین، یہان عہد عباسیہ کے یہودی عہدہ دارون کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، اس وقت اس سے بحث نہین کہ اسلامی حکومتون مین یہود اور دوسرے اہل ذمہ کو سرکاری عہدے کس حد تک دیئے جاتے تھے، عرب لٹریچر مین جو کچھ ادھر اُدھر ملتا ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اگرچہ اسلامی قانون اجانب مین غیر مسلمون کو حکومت کے عہدون پر مامور کرنے کی سختی سے ممانعت تھی تاہم اس ممانعت کی کبھی پوری پابندی نہین کی گئی اس امر کی صریح تاریخی شہادت موجود ہے کہ یہود و نصاری اور دوسرے اہل ذمہ ہر زمانہ مین اسلامی حکومت کے مختلف شعبون مین ملازم تھے، حقیقت یہ ہے کہ بعض شعبون کے لئے اہل ذمہ کی مخصوص لیاقت کو دیکھتے ہوئے خلفاء انھین اپنی ملازمتون مین داخل کرنے پر مجبور رہتے تھے، خلیفہ المقتدر کو بھی جس کے عہد حکومت سے ہمین اسوقت بحث ہے یہود و نصاری کو حکومت کے بعض عہدون پر مقرر کرنا ہی پڑا، اسکے عہد سے قبل بھی سرکاری ملازمتون مین غیر مسلمون کی ایک تعداد ضرور رہی ہو گی کیونکہ اس نے اپنی حکومت کی ابتدا ہی مین اہل ذمہ کے مسئلہ ملازمت سے متعلق ایک قانون نافذ کیا اور ۳۰۹ھ مین ایک فرمان کے ذریعہ سے یہود اور نصاری کو صرف طبیب اور جہبذ کے عہدون پر مقرر کئے جانے کی اجازت دی، عرب جغرافیہ دان مقدسی مصر و شام کے حالات کے سلسلہ مین لکھتا ہے :-

"یہان اکثر جہابذہ، رنگساز، صیارفہ اور دباغ یہودی ہین، اکثر اطبار اور کتبہ (مصر) عیسائی ہین"

دسوین صدی مین سلطنت عباسیہ کے یہود کے پیشون سے متعلق ہماری واقفیت کا ذریعہ اب تک مقدسی کی یہ شہادت اور المقتدر کا فرمان ہی تھا لیکن ہمارے جدید ماخذ نہ صرف ان بیانات کی تصدیق کرتے ہین بلکہ ان مین بہت کچھ اضافہ بھی کرتے ہین، خصوصًا ان ماخذون سے یوسف بن فنیحاس اور ہارون ابن عمران کے حالات اور خلیفہ مقتدر کے دربار مین ان کے کارنامے تفصیل کیساتھ معلوم ہوتے ہین،

ان ماخذون مین ان دونون کا ذکر بار بار الجہبذان الیہودیان یا التجار کے نام سے آتا ہے اور ان مین سے ہر ایک کا ذکر جہبذ اہواز کے نام سے بھی آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق صوبۂ اہواز کی مالیات سے بھی تھا، ان القاب ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلطنت عباسیہ کے محکمۂ مالیات مین کس درجہ اہمیت رکھتے تھے، ان کا ایک لقب جہابذۃ الحضرہ (COURTBAN-KERS) بھی تھا جس سے انکی اعلیٰ حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، دونون کا ذکر ہمیشہ ساتھ ساتھ آتا ہے، سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داران کو ایک ہی فرد خیال کرتے تھے، وزیر سلطنت جب ان سے قرض لیتا تھا تو معاہدہ یوسف اور ہارون دونون کیساتھ بلکہ ان کے جانشینون (ومن قام مقامہما) کے ساتھ بھی ہوتا تھا، اسی طرح اگر وزیر انھین سزا کی دھمکی دیتا تو اس دھمکی مین دونون بلکہ ان کے ورثاء (وعلی ورثتکما) بھی شریک ہوتے،

ان بیانات سے کافی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ دونون نے ایک مشترک فرم قائم کر لی تھی، اس فرم مین یوسف اور ہارون کے علاوہ ممکن ہے اور لوگ بھی شریک رہے ہون، ہارون بن عمران کا ایک لڑکا اپنے باپ کیساتھ درباری جہبذ کے فرائض انجام دیتا تھا، اس مشترک فرم کے قیام کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ کے کثیر مطالبات کا پورا کرنا کسی ایک شخص کے اختیار سے باہر تھا، بہر حال جو سبب بھی رہا ہو یہ واقعہ ہے کہ خلیفہ مقتدر کے زمانہ مین ایک بنک قائم ہو گیا تھا جسے آجکل کی اصطلاح مین "یوسف ہارون، اینڈ کمپنی، ہیڈ آفس بغداد" کہہ سکتے ہین،

اس بنک کی اندرونی تنظیم آیندہ بیان کیجائیگی، اسوقت صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ یہودی ساہوکار کس زمانہ مین دربار خلافت سے تعلق رکھتے تھے، التنوخی کہتا ہے:۔ "دونون (یوسف اور ہارون) عبید اللہ بن یحییٰ الخاقانی کے زمانہ مین مقرر ہوئے تھے" لیکن یہ بیان عرب ماخذون مین دئے ہوے دوسرے واقعات اور تاریخون سے اسی وقت مطابق ہوسکتا ہے جب ہم عبید اللہ بن یحییٰ کے بجاے محمد بن عبید اللہ بن یحییٰ پڑھین، عبید اللہ ابن یحییٰ ۸۵۲ء سے ۸۶۱ء تک خلیفہ المتوکل کا اور ۸۶۷ء سے ۸۷۵ء تک خلیفہ معتمد کا وزیر تھا، لیکن اہل ذمہ کو سرکاری ملازمتون مین داخل کرنے کی نسبت ان دونون خلفاء کا جو طرز عمل تھا اس کے لحاظ سے امید نہین کہ ان کے زمانون مین یہود اعلیٰ عہدون پر مقرر کئے گئے ہون، علاوہ برین خود ماخذون مین اس بیان کی تائید کے لیے کوئی شہادت موجود نہین ہے، برخلاف اسکے محمد بن عبید اللہ ابن یحییٰ المقتدر کے وزراء مین تھا اور وہ ٹھیک اسی زمانہ مین تھا جب ہم کو اول اول ان یہودیون کے حالات معلوم ہوتے ہین، گمان غالب یہ ہے کہ دربار مین ان دونون یہودیون کا تقرر اس وقت ہوا جب محمد بن عبید اللہ کی وزارت شروع ہو چکی تھی یعنی ۹۱۱ء اور ۹۱۲ء کے درمیان، واقعات بھی اس خیال کے مطابق ہین کیونکہ ان یہودیون سے پہلا معاملہ جو ہمارے ماخذون مین مذکور ہے ۹۰۸ء مین وزیر ابن الفرات کے ساتھ ہوا تھا اسکے بعد بھی اور خصوصاً ۹۱۳ء، ۹۱۶ء، ۹۲۱ء، ۹۲۳ء، اور ۹۲۴ء کے حالات مین ان کا ذکر بار بار آتا ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقرر کے بعد سے ۹۲۳ء تک یوسف اور ہارون کا تعلق دربار خلافت سے برابر قائم رہا، ۹۲۳ء کے بعد اس فرم کا کوئی ذکر ہمارے ماخذون مین نہین پایا جاتا جس کی وجہ یہ ہے کہ وزیر ابن الفرات جوان کا مربی اور سرپرست تھا، ۹۲۴-۲۵ء مین برطرف کردیا گیا تھا، اگرچہ صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ "وہ دونون اپنی وفات تک برخاست نہین کئے گئے" لیکن یہ ممکن ہے کہ ان کی وفات بھی ۹۲۳ء ہی مین واقع ہوئی ہو، بہرحال ہر صورت مین المقتدر ہی کا زمانہ سلطنت عباسیہ مین ساہوکاری کی ابتدا کا زمانہ تھا،

"ع ز"

خلفائے عبّاسیہ کے چند آثار عراق مین،

خلفائے عباسیہ کے تمام تمدنی آثار جو ان کے دورِ حکومت مین، محلون، مسجدون، خانقاہون، مدرسون، مہمان خانون اور نہرون کی صورت مین قائم تھے مٹ گئے، البتہ عراق مین ان کے چند آثار اب بھی باقی ہین، جنکا تذکرہ جون ۱۹۳۲ء کے الہلال نے کیا ہے، ہم ناظرینِ معارف کی دلچسپی کے لیے اسکی تلخیص ذیل مین درج کرتے ہین،

جامع معتصم باللہ معتصم نے یہ جامع مسجد سُرّمن رائے مین پانچ لاکھ دینار کے صرف سے تعمیر کی تھی اور اسکی دیوارون کے سامنے کے حصے مین شیشے جڑوا دیئے تھے، اس لئے ہر نمازی حالتِ نماز مین اپنے پیچھے سے آنے والے شخص کو دیکھ سکتا تھا، شیشون کے جڑنے کی جگہ اب بھی دیوارون مین موجود ہے، اور وہ دیکھنے والون کو علانیہ نظر آتی ہے، اسکا منارہ بھی ایک عجیب چیز ہے، اور عراق مین اسکو ملویہ کہتے ہین،

قصر ابی العباس احمد الناصر لدین اللہ اس محل کا نام دار المسناۃ ہے، اور وہ بغداد کی مشرقی چار دیواری کے قریب شمالی جانب قائم کیا گیا تھا اور ابن جبیر نے اسکو دیکھا تھا، ناصر لدین اللہ نے اس مین ایک کتبخانہ بھی قائم کیا تھا، جسکا ذکر قفطی نے بشر بن احمد بغدادی کے حال مین کیا ہے، اب اس کے چند حجرے اور ایوان باقی رہگئے ہین، لیکن انھی سے اسکی تعمیری شان و شوکت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

منارہ جامع مکتفی باللہ یہ منارہ خود بنو عباس کے آثار مین شامل نہین ہے، البتہ ان کے دورِ خلافت کے ختم ہونے کے ۲۲ سال بعد انھی کی جامع مسجد مین بنایا گیا ہے، اور اس پر خط کوفی مین یہ عبارت لکھی ہوئی ہے،

"ابا قاخان مین ہلاکو خان کے عہدِ حکومت مین علاء الدین عطا ملک الجوینی الفارسی کی ولایت مین تعمیر کیا گیا"

۶۷۸ھ مین اسکی تعمیر آٹھ سال کی مدت مین ختم ہوئی،

معروف کرخی کی قبر کا منارہ یہ منارہ فنِ تعمیر کا عجیب و غریب نمونہ ہے، اور اسکو ابو العباس الناصر لدین اللہ نے بنایا

ہے، چنانچہ اس کے ایک چھوٹے سے طاق مین یہ عبارت منقوش ہے،

"یہ منارہ ۶۱۲ھ مین تعمیر کیا گیا"

اور یہی ناصر لدین اللہ کی حکومت کا زمانہ ہے، کیونکہ وہ ۵۷۵ھ مین خلیفہ ہوا اور ۶۲۲ھ مین وفات پائی، علی بن اثیر نے لکھا ہے کہ ناصر کے ولیعہد نے ۶۱۲ھ مین وفات پائی، اور معروف کرخی کی قبر کے پاس دفن کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولیعہد کی وفات اور اس منارے کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی ہے، اور غالبًا اس منارے کی تعمیر کا سبب بھی یہی ہے،

مسجد خطائر کا منارہ یہ منارہ بھی معروف کرخی کی قبر کے منارہ سے مشابہت رکھتا ہے، یہ مسجد اب جامع الخفافین کے نام سے مشہور ہے، اور دجلہ کے کنارے مدرسہ مستنصریہ کے نیچے واقع ہے، اس مسجد کو ناصر کی مان زمرد خاتون نے بنوایا تھا اس لیے منارہ بھی اسی کا بنوایا ہوا ہے،

مدرسہ مستنصریہ اور اسکی گھڑی یہ مدرسہ اب بالکل ویران ہے، صرف اسکی دیوارین دجلہ کے کنارے کھڑی ہین، اس کے دروازے پر ایک منقوش تحریر تھی، لیکن اب وہ موجود نہین، ایک دیوار پر البتہ ایک تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی عمارت ۶۳۱ھ مین تکمیل کو پہنچی،

اس مدرسہ کی آبی گھڑی اس کے سامنے کے ہال مین تھی جو ۶۳۳ھ مین تعمیر ہوا، اور اس کے نیچے ایک سائبان تھا، جس مین طبیب بیٹھکر طلبہ کو درس دیتا تھا اور مریضون کا علاج کرتا تھا، اسی سائبان کی دیوار مین ایک دائرہ بنایا گیا تھا جسمین آسمان کی شکل بنائی گئی تھی، اور اس مین چھوٹے چھوٹے طاق تھے، جس مین چھوٹے چھوٹے دروازے بنائے گئے تھے، اس دائرے مین سونے کے دو باز سونے کی دو طشتون مین کھڑے کیے گئے تھے، اور اس کے پیچھے سیسے کے دو گولے تھے جو دیکھنے والے کو نظر نہین آتے تھے، ہر گھڑی کے گذرنے کے بعد دونون بازون کے منھ کھل جاتے تھے اور ان سے وہ دونون گولے گر پڑتے تھے، اور جب ایک گولہ گرتا تھا تو ان طاقون کا ایک دروازہ کھل جاتا تھا، اور جب دونون گولے دونون طشتون مین گر چکتے تھے تو اپنی اپنی

جگہ پر چلے جاتے تھے، اس کے بعد سورج کے نکلنے کے ساتھ اس مصنوعی آسمان مین سونے کے بہت سے سورج نکل آتے تھے اور حقیقی سورج کی گردش کے ساتھ گردش کرتے تھے اور اس کے ڈوبنے کے ساتھ ڈوب جاتے تھے، پھر جب رات ہوتی تھی تو اس روشنی سے جو سورج کے پیچھے ہوتی تھی، بہت سے چاند نکل آتے تھے اور جب ایک گھڑی پوری ہو جاتی تھی تو چاند کے دائرے مین وہ روشنی بھی پوری ہو جاتی تھی پھر رات کے ختم ہونے اور سورج کے نکلنے کے وقت تک دوسرے دائرے مین شروع ہوتی تھی،

"ع"

ادبیات

یادِ دہی

از حکیم الشعراء امجدؔ حیدرآبادی،

موزون نہین گر نغمہ توفر یاد سہی — کچھ بھول گیا ہون مین یہی یاد سہی

جب زینتِ دنیا سے، مرا گھر بھر جائے — جب حرص و ہوا کی مے سے، ساغر بھر جائے

احباب بھی ہون، لطف کا سامان بھی ہو — جب عطر بھی ہو، ڈلی بھی ہو، پان بھی ہو

دلچسپ فضا ہو، چاندنی رات بھی ہو — اک ماہ جبین کے ہاتھ مین ہات بھی ہو

جب ناچ بھی ہو راگ بھی ہو، رنگ بھی ہو — روئی بھی ہو، چقماق بھی ہو، سنگ بھی ہو

جب اڑتے ہون قہقہے ہراک تال کیساتھ — جب طبلے پہ پڑ رہے ہون قوال کے ہاتھ

جب ہر دل مردہ شادمان ہو جائے — جب گھر مرا، کشتِ زعفران ہو جائے

جب، مجھکو جہان کے خزانے مل جائین — سارے عالم کے کارخانے مل جائین

جب ہو یہ خیال "خاک پر کون چلے" — ہو سونے کی اینٹ میرے پاؤن کے تلے

قدمون کا نشان نقشِ تسخیر بنے — لون خاک بھی ہاتھ مین تو اکسیر بنے

جب پھولون کی سیج پر مجھے نیند نہ آئے — جب میرا دماغ عرشِ اعلیٰ بنجائے

کردے اس وقت، باخبر اے مولا — بس یاد دلا دے اس قدر اے مولا

"بس اتنے ہی نشہ مین یہان چور ہے تو
اصلی ارام سے ابھی دور ہے تو"

۲

جب ٹوٹ پڑے پہاڑ غم کا سر پہ
باقی رہے جب نہ زور، زور و زر پہ

اس وقت، کہ رہنما ہی رہزن بنجائے
اس وقت، کہ خاص دوست دشمن بنجائے

تنکے کا غریق کو سہارا نہ ملے
ظلمت کدۂ دہر مین تارا نہ ملے

اعصاب، حصار کرب مین گھر جائین
اسوقت، کہ غم سے پتلیان پھر جائین

جب جل اٹھے غم سے تن کا ذرہ ذرہ
قُل نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا

خون جگر

از حضرت جگر مراد آبادی

یون بھی مجھے تو حاصل آرام جان نہین ہے
اب تو جو مہربان ہے، دل مہربان نہین ہے

جو داستان ہے اپنی افسانہ ہے کسی کا
شاید مرے دہن مین میری زبان نہین ہے

جو کچھ مین دیکھتا ہون، میری نظر سے دیکھو
عین مشاہدہ ہے، وہم و گمان نہین ہے

ہان اے جمال جانان اک اور بھی تجلی
دنیا مری نظر مین ابتک جوان نہین ہے

شاید تری نظر سے کچھ راز دل سمجھ لون
کہتے ہین عشق جسکو میری زبان نہین ہے

غم نے بنا دیا ہر ماتم گسار سب کا
اب کسکو پوچھتے ہو، کوئی یہان نہین ہے

ہر لحظہ کہہ رہا ہے یہ انقلاب فطرت
یعنی جہان ابھی تھی، دنیا وہان نہین ہے

تیرے کرم کے صدقے کرے، ستم بھی شامل
دل شادمان ہے لیکن غم شادمان نہین ہے

بابُ التقریظ والانتقاد

اردو کے نئے رسائل و اخبار

اردو کے نئے رسالوں اور اخباروں کے متعلق معارف کی یہ روش سالہاسال سے قائم ہے کہ وہ ہر چھ مہینے پر نئے رسالوں اور اخباروں کو یکجا طور پر ناظرین سے روشناس کرتا ہے، اور ہر مرتبہ ان نئے پرچوں کی تعداد اسقدر ہوتی ہے، کہ آٹھ دس صفحے انکی نذر ہوجاتے ہیں، اور بہ ظاہر نظر یہ اردو زبان اور اردو صحافت کی ترقی کی ایک روشن دلیل ہو لیکن افسوس ہے کہ ان پر حقیقی مسرت کا اظہار نہیں کیا جاسکتا، کہ اوّلاً تو ان میں بیشتر تعداد ایسے پرچوں کی ہوتی ہے جنکا سب بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ "ادبی" ہیں، اور ادب کا مفہوم اس میں منحصر ہے کہ چند بے معنی اور لغو افسانے چھاپ دیئے جائیں، چند سطروں میں "ادب لطیف" لکھ دیا جائے جو غیر مربوط خیالات، مغلق ترکیبوں، اور بے ڈھنگے لفظوں کا مجموعہ ہو، اور جنمیں بے معنی اور غیر ضروری نقطے اور لمبی لکیریں دیدی گئی ہوں اسی طرح چند غزلیں اور نظمیں چھاپ دیجائیں، خواہ موزون ہوں یا نہ ہوں، تقطیع درست ہو یا نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسے رسالے اپنی زندگی کے کتنے دن پورے کرسکتے ہیں، وہ جلد ہی فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں، اور پھر جو زندہ بچ رہے، وہ سسکیاں لے لے کر اپنی زندگی کے دن پورے کرتے رہتے ہیں، چند دن مضمون نگاروں سے رسل و رسائل رکھ کر رسالہ جاری کئے رہے، بالآخر مضمون نگار بھی مضامین کہانتک بھیجیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اردو ہی کے پرانے رسالوں کے مضامین نقل کرنے پر اتر آتے ہیں، یہانتک کہ لوگ نہ صرف رسالوں کے پرانے فائلوں سے بلکہ مستقل مجلدات اور تصنیفات سے صفحے کے صفحے نقل کرکے اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں، سرقہ کے ان واردات کا یہ عالم ہے کہ اردو کے مشہور ارباب کمال کے مضامین بھی جنپر ہر لکھے پڑھے کی نگاہ بالعموم ہوتی ہے، دوسرے کے ناموں سے چھپ جاتے ہیں۔ ہمارے بعض احباب نے رسائل کے ان واردات کا ایک نقشہ تیار کیا ہے، جو حد درجہ عبرت انگیز ہے؛

اردو صحافت کی یہ صورتِ حال، ہماری زبان کے دردمندون کے لیے لائقِ غور ہے، خصوصاً ہم ان علم دوست اور ادب نواز اصحاب سے جو کسی نئے رسالے کے نکالنے کے آرزومند ہون، یہ درخواست کرتے ہین کہ اس اقدام سے پہلے وہ خود اپنے دست و بازو کو تول لیا کرین کہ اس بوجھ کو کہان تک اٹھا سکتے ہین،

اس ششماہی مین بھی حسب معمول اسی تعداد مین پرچے نکلے ہین، لیکن اس مرتبہ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ان مین خالص "ادبی" پرچون کی تعداد بہت کم ہے، اکثر پرچے اپنا کوئی نہ کوئی مفید مقصد سامنے رکھکر نکلے ہین، اور جو ادبی پرچے ہین ان مین بعض ہندوستان کے ایسے دور دراز صوبون سے نکلے ہین، جنکا مقصد اردو کی واقعی خدمت ہے،

یہ سب نئے رسالے مختلف قسم کے مذہبی، اصلاحی، اقتصادی، تعلیمی، ادبی اور طبی ہین، جو بہ ترتیب درج ذیل ہین،

اصلاح لکھنؤ (ماہانہ) مرتبہ مولوی مطلوب الرحمن صاحب، ندوی نگرامی، حجم ۴۰ صفحے، معارف سائز قیمت سالانہ ے رتبہ :- بادشاہ باغ، لکھنؤ،

"اصلاح" لکھنؤ کا وہی دینی و تبلیغی و اصلاحی رسالہ ہے، جس کا ذکر کسی گذشتہ مہینہ کے شذرات مین آچکا ہے، یہ گذشتہ مہینہ سے شائع ہونا شروع ہوگیا ہے، اسکی سرپرستی حضرت الاستاذ مولنا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی اڈیٹر سچ نے قبول فرمائی ہے، پہلے نمبر مین مولنا عبد الماجد صاحب بی اے دریابادی نے "ارادۂ اصلاح" کے عنوان سے اس کا افتتاحیہ لکھا ہے، ان کے علاوہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دار المصنفین، مولوی مطلوب الرحمن صاحب ندوی نگرامی، مرتب رسالہ، اور جناب محمد احسن صاحب نگرامی ایڈوکیٹ رائے بریلی کے مذہبی مضامین ہین، اس کا سب سے دلچسپ باب قبولِ اسلام کا ہے، جس مین ہر ماہ کے نئے اسلام قبول کرنے والون کی فہرست مع وجوہ قبول اسلام شائع ہوتی رہیگی، اس رسالہ کا اصل مقصد مسلمانون مین سعی اصلاح اور غیرون مین دعوتِ حق کا فرض انجام دینا ہے، امید ہے کہ دردمند مسلمان اس پرچہ کی خدمت اپنی سعادت

حاشیہ صفحہ ماقبل) ؎ مولنا شبلی کا مقالہ "موبدان مجوس ہندوستان مین" الندوہ مین چھپا تھا، اور رسائل شبلی مین موجود ہے، وہ لاہور کے رسالہ "یادگار" بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ء مین جناب احسان میان آفتاب احمد صدیقی کے نام سے شائع ہوا ہے، رسالہ یادگار اسی سال جنوری سے نکلا ہے اور رسائل کے پچھلے تبصرہ مین ان صفحات مین اس کا ذکر آیا تھا،

سمجھکر اس کو اپنے پاؤن پر کھڑے ہونے کا موقع دینگے،

ترجمان القرآن، حیدرآباد، دکن، (ماہانہ) اڈیٹر مولٰنا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی، ۲، صفحے،

لکھائی چھپائی، کاغذ اور تقطیع معارف جیسی، قیمت سالانہ صہ، پتہ:- دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد دکن،

حیدرآباد، دکن مین مولوی ابو محمد صاحب مصلح سہسرامی کی کوششون سے ایک انجمن تحریک قرآن" قائم ہوئی ہے، جس کا مقصد تعلیمات قرآنی کو عام کرنا ہے، اس انجمن نے چند ماہ گذرے ایک ماہانہ رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا تھا جس کی حیثیت محض مختصر تبلیغی رسالہ کی تھی، اب وہی رسالہ دو مہینون سے نئے آب و تاب اور ظاہری و معنوی ترقی کیساتھ مولٰنا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی، مصنف الجہاد فی الاسلام کی ادارت مین نکلنے لگا ہے، اس کا مطمح نظر تعلیمات قرآنی کو احادیث و آثار کی روشنی مین رکھکر، دور حاضر کے اسلوب بیان مین پیش کرنا ہے، دور حاضر مین ہندوستان کے مختلف گوشون سے "حسبنا کتاب اللہ" کی صدائین بلند ہو رہی ہین، اور حامل وحی کے اقوال و آثار اور اسکی تشریح فیض کے پروانون کے بیانات اس لئے رد کئے جا رہے ہین کہ "مفکرین" کے غور و فکر اور عقل کی میزان پر وہ پورے نہین اترتے، حالانکہ وہی ارباب فکر اپنے دنیاوی معاملات مین تعزیرات کی دفعات کے سمجھنے مین اسکی شرحون سے کام لیتے ہین اور تعیین مفہوم مین عدالت عالیہ کے فیصلون سے نظیر لاتے ہین،

اس بے راہروی کو روکنے کے لیے ایک مستقل ترجمان کی ضرورت تھی مسرت ہے کہ رسالہ ترجمان القرآن اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عالم وجود مین آیا ہے، اسوقت تک اس رسالہ کے دو نمبر چھپ چکے ہین، جو اپنے مضامین کی نوعیت، لب و لہجہ کی متانت، مباحث کی دقت، اور رائے کی اصابت مین اسی صراط مستقیم پر گامزن ہے، جسے ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ، کہا گیا ہے، رسالہ کے مرتب نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ تعلیمات قرآنی یا دوسرے لفظون مین عقائد اسلامی کے متعلق جو شکوک و شبہات پیش کیے جائین گے، ان کے جوابات بھی درج ہونگے،

بشریٰ:- مدراس (ماہانہ) اڈیٹر مولٰنا ابو الجلال ندوی، و مولٰنا عبد الرزاق (فاضل دیوبند)

حجم ۴۸ صفحے، قیمت سالانہ سے ر، مقام اشاعت نمبر ۱۳ کتاب خان اسٹریٹ، مونٹ روڈ، مدراس،

"بشریٰ" صوبہ مدراس کا واحد ماہانہ اردو رسالہ ہے، جو ماہ جنوری ۱۹۳۳ء سے نکلنا شروع ہوا ہے کارکنان رسالہ کے پیش نظر مدراس میں اسلام کی خدمت ہے، مضامین مذہبی، تاریخی اور علمی ہر قسم کے مفید اور دلچسپ ہوتے ہین، سیاست کی ترجمانی بھی ہوتی ہے، مذہبی مضامین غور و فکر اور تلاش و تحقیق سے لکھے جاتے ہین، تاریخی مضامین کا معیار بھی کچھ پست نہین، مذہبی و معاشرتی اصلاح کا ذریعہ افسانون کو بھی بنایا ہے، خدا کرے کہ کارکنان رسالہ اسے ثبات قدمی سے جاری رکھ کر مدراس مین مذہب، معاشرت اور زبان کی مفید خدمات انجام دیتے رہین،

محدث، دہلی (ماہانہ) مدیر مولوی عبد الحلیم صاحب ناظم، حجم ۱۶ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اچھی،

پتہ:۔ دار الحدیث رحمانیہ، دہلی،

مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے کارکنون نے یہ مختصر رسالہ محض افادۂ علم کے لیے جاری کیا ہے، جسمین چھوٹے چھوٹے مذہبی، اصلاحی، اور تبلیغی مضامین درج ہوتے ہین، نیز مدرسہ کے کوائف بھی شائع ہوتے ہین، کارکنون نے رسالہ کی کوئی قیمت مقرر نہین کی ہے، صرف ۸ ر کے ٹکٹ ڈاک کے محصول کیلئے بھیجکر سال بھر تک رسالہ جاری کرایا جاسکتا ہے،

مالیات: پٹنہ، (ماہانہ) اڈیٹر جناب سید حفظ الرحمن صاحب، حجم ۴۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت سالانہ سے ر، دفتر اشاعت دی پریمیر جنرل انشیورنس کمپنی لمیٹڈ، پٹنہ،

صوبہ بہار مین چند نوجوان ہمت اصحاب کی کوششون سے ایک بیمہ کمپنی "دی پریمیر جنرل انشیورنس کمپنی لمیٹڈ پٹنہ" کے نام سے قائم ہوئی ہے، رسالہ مالیات اسی کمپنی کا آرگن ہے، صوبہ بہار کے مخلص رہنما جناب قاضی احمد حسین صاحب سابق ام ال سی، رسالہ کے سرپرست اور اس کمپنی کے جنرل منیجر جناب سید محمد جلیل صاحب رسالہ کی پالیسی کے نگران ہین، رسالہ کا دائرۂ عمل "بینکنگ، تجارت اور بیمہ" کے مباحث ہین، اسکا پہلا پرچہ بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ء نظر سے گذرا، مضامین کی ترتیب اچھی ہے، اولاً "خیالات" کے عنوان سے مالی اور تجارتی مسائل پر نقد و نظر ہے، پھر بینک، بیمہ، تجارت، مالیات، اور بعض تجارتی کمپنیون، بنکون اور ایجنسیون کے طریق کار ان کے افادی پہلو، مضرات کے

امکانات، اور بعض بینکون اور کمپنیون کی تاریخ و سرگذشت پر مضامین ہین، مضامین سطحی اور اچھے دونون قسم کے ہین بعض مضامین مین تشنگی باقی رہگئی ہے، اسی طرح ضرورت ہے کہ رسالہ کو مذہبی مباحث سے بچایا جائے، اور کسی فرد یا جماعت پر نکتہ چینی کرنے مین اس کے حدود ایسے قائم رکھے جائین کہ پیرایۂ بیان دلآزار نہ ہو، اگرچہ اکثر مضامین کا انداز بیان شگفتہ ہے، لیکن بعض جگہ صحت زبان کی خامی ہے، اسی طرح لکھائی کی غلطیان بھی ہین، رسالہ مصور ہے، لیکن پہلے ہی پرچہ مین اپنی آپ تصویر چھاپنا کچھ موزون نہین معلوم ہوتا،

بہرحال یہ خردہ گیریان ہین، اور لائق اعتنا بھی نہ ہوتین، اگر ہمین ذاتی طور پر رسالہ کی ترقی کی آرزو نہ ہوتی کہ سرزمین بہار اردو صحافت کے لیے نہایت شور واقع ہوئی ہے، اور یہ ایک اچھا خاصہ ایسا معیاری رسالہ وہان سے نکل آیا ہے، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے یک گونہ اردو زبان مین منفرد ہے، ہمین جناب قاضی سید احمد حسین اور سید محمد جلیل صاحب کی توجہ اور ہمت سے توقع ہے کہ یہ رسالہ اپنا مستقل وجود قائم کریگا،

مالی امروہہ (ماہانہ) مدیر جناب محمد نبی خانصاحب قادری، حجم ۳۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ

پتہ :۔ امروہہ، مرادآباد، یوپی،

مدرس، انجمن اصلاح مسلم مدرسین یوپی کی سرپرستی مین نکلا ہے، مختصر تاریخی اور ادبی مضامین کے علاوہ تعلیمی مسائل پر بھی مضامین ہوتے ہین، ایجوکیشنل کوڈ یوپی کا اردو ترجمہ اس رسالہ مین بالاقساط چھپ رہا ہے،

معصوم، رنگون، (ماہانہ) نگران جناب ایم۔ ای مائت صاحب، ایم اے، حجم ۳۲ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت سالانہ عہ پتہ :۔ مکان نمبر ۶۰، گلی نمبر ۲، رنگون، (برما)

رسالہ معصوم ہندوستان کے اس دور دراز صوبہ سے نکلا ہے، جسے آجکل جغرافی و سیاسی وجوہ سے ہندوستان سے الگ کئے جانے کی کوششین بھی ہو رہی ہین، اور یہ دراصل زبان اردو کی مقبولیت کی ایک بڑی نشانی ہے، رسالہ چھوٹے بچون اور بچیون کے لیے ہے، اور انہی کے لائق مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہین، مضامین پر از معلومات اور سبق آموز ہوتے ہین، رسالہ ایک سال سے کامیابی کے کیساتھ جاری ہے،

زبان ہند کراچی (ماہانہ) اڈیٹر جناب ہرگوبند پرشاد نگم ایم اے، دہلوی، حجم ۵۰ صفحے، قیمت سالانہ ہے،

پتہ:- جونا مارکیٹ، کراچی، (سندھ)

"زبان ہند" سندھ کا غالباً واحد اردو رسالہ ہے، جو ایک باہمت ہندو اہل قلم کی ادارت مین اس مقصد وحید کیساتھ نکلا ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہے، اسلئے اسکو بلا تفریق مذہب و ملت سب مین رائج کرنا چاہئے، اس کا پہلا نمبر بابت ماہ جنوری ۱۹۳۳ء سامنے ہے، اس مین جناب روشن صدیقی امروہوی نے "سندھ مین اردو" کو دکھایا ہے اور ولی، ضیاء الدین ضیا اور باقر شہید کے اسمار پیش کرکے اردو زبان کی تعمیر مین صوبہ سندھ کے حصہ کو نمایان کیا ہے، دوسرے مضامین بھی اچھے خاصے ہین، ضرورت ہے کہ اس رسالہ کو زندہ رکھا جائے کہ سندھ مین اردو کی مفید خدمت انجام پائے،

افسانہ لاہور (ماہانہ) حجم ۴۰ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت سالانہ عہ، پتہ:- پوسٹ بکس نمبر ۲۰ لاہور،

"افسانہ" اسم بامسمیٰ ہے، اس کے دو پرچے دیکھنے مین آئے، اسکو آنریبل کپتان سر سردار سکندر حیات خان کی سرپرستی حاصل ہے، شاید اسی مناسبت سے اس کے پہلے پرچہ مین ملک کے اکابر اور مشاہیر ادب کے بکثرت پیغامات افسانہ کے استقبال مین شائع ہوئے ہین، رسالے کے پہلے پرچہ کے مدیر جناب نذیر نیازی بی اے تھے، لیکن دوسرے پرچہ سے اسکی ادارت جناب ملک محمد اسلم خان ایم اے، (کیمبرج)، بیرسٹرایٹ لا، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی اور جناب سید عابد علی صاحب عابد ایم اے کے ہاتھون مین آئی ہے، مضمون نگارون کی فہرست مین ملک کے اچھے افسانہ نویس پریم چند وغیرہ شامل ہین، اور مضامین مین افسانے یا افسانون پر تنقیدین ہوتی ہین اور افسانون مین یورپ کے مشہور افسانہ نویسون کے افسانون کے ترجمے زیادہ ہوتے ہین، توقع کیجا سکتی ہے کہ اگر رسالہ جاری رہا، اور اسی طرح اسکو قلمی معاونین ملتے رہے تو ایک کامیاب ادبی رسالہ ثابت ہوگا،

میخانہ، لکھنو (ماہانہ) اڈیٹر جناب اسد انصاری، حجم ۲۰ صفحے، قیمت سالانہ عہ، پتہ:- پارچہ والی گلی لکھنو

"میخانہ" کچھ دنون پہلے جاری ہوکر بند ہوگیا تھا، اب نئے اہتمام سے پھر نکلا ہے، یہ ایک ادبی رسالہ ہے جسمین

چند غزلین اور چند افسانے ہوتے ہین، "میخانہ" کو ایک مجذوب صفت کہنہ مشق شاعر خواجہ عزیز (سابق ڈپٹی کلکٹر حال ڈپٹی انسپکٹر مدارس یوپی) کی امداد حاصل ہوگئی ہے، اکثر پرچہ مین ان کا کلام نظر آتا ہے،

اقبال وزیر آباد (ماہانہ) مدیر جناب تبسم قریشی حجم ۴۸ صفحے، قیمت درج نہین، پتہ:- وزیر آباد (پنجاب)

"اقبال" ایک ادبی رسالہ ہے، جو ڈاکٹر سر اقبال کے اسم گرامی سے معنون اور جناب خان بہادر نواب احمد یار خان دولتانہ، ام ال سی، کی سرپرستی مین جاری ہوا ہے، افتتاحیہ مین جو "اشارات" کے نام سے ہے، سیاسی مباحث پر بھی رائے زنی کیجاتی ہے، مضامین نظم و نثر اچھے خاصے ہین،

معیار کلکتہ (ماہانہ مصور) اڈیٹر جناب ڈاکٹر فیض قادری، و جناب ابراہیم شاہ، ۳۰ صفحے، قیمت سالانہ عدر، پتہ:- ۳ امرتلہ لین، کلکتہ،

یہ بھی ایک ادبی رسالہ ہے، جو مشرقی ہند مین اردو رسالون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نکلا ہے، بنگال کے شعرا اور ارباب ادب اردو کا تذکرہ اس مین خصوصیت سے ہوگا، پہلے پرچہ مین بنگالی زبان کے مسلمان شاعر قاضی نذر الاسلام کے سوانح اور ترجمہ کلام درج ہے،

علم و عمل لاہور (ماہانہ) اڈیٹر جناب کو براج ہر نام داس بی اے ۲۸ صفحے، قیمت سالانہ عہ، پتہ:- بالمقابل اڈہ تانگہ، لوہاری، لاہور،

یہ ایک ادبی اور معاشرتی اصلاح کا رسالہ ہے، رسالہ کو دلچسپ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے، بعض مضامین دلچسپ اور مفید ہین،

جوہر مراد آباد (ماہانہ) اڈیٹر جناب فاضل چغتائی، ۳۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ، پتہ:- ادبی محل، مراد آباد،

مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار مین "جوہر" کے نام سے ایک رسالہ اس سے پہلے نکل چکا تھا، اب اسی نام سے یہ دوسرا رسالہ نکلا ہے، اس کا چھٹا نمبر بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء سامنے ہے، مضامین سطحی قسم کے ادبی ہین، ایک مضمون مولنا محمد علی پر بھی ہے، اور ایک صفحہ پر انکی ایک غزل انھین کے ہاتھ کی تحریر کے عکس مین شائع ہوئی ہے،

حاذق، دہلی (ماہانہ) مدیر جناب حکیم سید محمد حسن صاحب رضوی، و جناب حکیم سید عطاء الرحمن صاحب، ۸۰ صفحے

قیمت سالانہ عہ، پتہ :۔ قرول باغ، دہلی،

یہ ایک طبی رسالہ ہے جسکو طبیہ کالج دہلی کے بعض فارغ التحصیل طلبہ نے فن طب کی خدمت کیلئے نکالا ہے، رسالہ کو طبیہ کالج کے بعض سابق اساتذہ کی قلمی امداد بھی حاصل ہے، رسالہ کی ترتیب اچھی اور مضامین گو مختصر مگر پڑھنے کے لائق ہین، اطبا و غیر اطبا دونون فائدہ اٹھا سکتے ہین،

تبصرۃ الاطبا، لاہور (ماہانہ) حجم ۲۸ صفحے، قیمت سالانہ سے، پتہ :۔ فلیمنگ روڈ، لاہور،

رسالہ تبصرۃ الاطبا پانچ چھ اڈیٹرون کی ادارت مین نکلا ہے، اور ان مین سے ہر ایک کو ممتاز القاب و انتسابات مثلاً "بقراط زمان" "حکیم حاذق" "ممتاز الاطبا" "زبدۃ الحکما" وغیرہ سے یاد کیا گیا ہے، مضامین مین طب قدیم و جدید دونون کے متعلق ہین،

اس ششماہی مین ذیل کے چند نئے اخبارات ہمین موصول ہوئے،

دستور، دہلی، (مصور ہفتہ وار) اڈیٹر جناب آزاد دہلوی، ۳۰ صفحے قیمت سالانہ سے، ہر پرچہ ۲، پتہ :۔ کوچہ چیلان، دہلی،

"دستور" دہلی سے، دہلی کے ہفتہ وار اخبار ریاست کے طرز اور اسی تقطیع اور ترتیب پر نکلا ہے، یہ اخبار اس حیثیت سے قابل قدر ہے کہ سیاسیات مین اسکی رائے آزادانہ ہے، اسلامی حقوق کی صحیح نمایندگی کیساتھ وطن کی حقیقی خدمت بھی اس کے مدنظر ہے، اسی طرح اسکے افسانون علمی اور تعلیمی مضامین، نظمون غزلون اور معلومات کے صفحے بھی اچھے اور پڑھنے کے لائق ہوتے ہین، جو مختلف مستقل عنوانون سے شائع ہوتے ہین، اس سے اردو کی اسلامی صحافت مین ایک مفید اضافہ ہوا ہے،

خادم کلکتہ (ہفتہ وار مصور) اڈیٹر جناب میر حشمت علی افقی، حجم ۱۲ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰ قیمت سالانہ ۱۲ ہر پرچہ ار، پتہ :۔ نمبر ۸ گنگادھر بابو لین، کلکتہ،

"خادم" کو سیاسی اخبار کہنے کے بجائے، ہفتہ وار رسالہ کہنا زیادہ موزون ہوگا، جس نے دین و دنیا کو اپنے دو گوشون مین یکجا کرنا چاہا ہے، ایک طرف مذہب کا حامی، زبان اردو کا خادم اردو کے شعر و ادب کا ناقد ہے، اور دوسری طرف فلم اسٹیج کا مبلغ ہے، اس مین انہی موضوعات پر مسلسل اور مختصر مضامین، شذرے، اور افسانے

عدد ۱	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۳۲

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

دین و دانش کی دنیا کا مہرانور ۳ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک مین ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا یعنی مولنا سید انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہندؒ و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے دو برس کی علالت اور ضعف و نقاہت کے بعد، ٥ برس کی عمر مین وفات پائی، مرحوم کا وطن گو کشمیر تھا، مگر تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک مدینہ منورہ مین اقامت فرمائی، پھر واپس آکر استاد کی خواہش اور اصرار سے دار العلوم کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی، اور جسکو حضرت شیخ کے زمانۂ جنگ مین ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک اس طرح انجام دیا کہ چین سے لیکر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجین لیتا رہا، اور ہندا اور بیرون ہند کے سینکڑون تشنگانِ علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی،

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، انکی مثال اس سمندر کی سی تھی جسکی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی تہ موتیون کے گران قیمت خزانون سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ مین اس عہد مین بے مثال تھے، علومِ حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علومِ ادب مین بلند پایہ، معقولات مین ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقوی مین کامل تھے، اللہ تعالی اپنی نوازشون کی جنت مین ان کا مقام اعلی کرے، کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ اور قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا،

۱۹ جون کی صبح کو مشرقی ہند کے مرکزی شہر پٹنہ کے جسم سے روح نے مفارقت کی، سر فخر الدین وزیر تعلیمات جو وہان کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز مسلمان تھے ٦٥ برس کی عمر مین وفات پائی، ان چند مہینون کے اندر اس شہر کے وہ پرانے نئے تعلیم یافتہ اصحاب جو وہان کی مجلس کی شمعِ بزم افروز تھے، ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، سر علی امام کی وفات پر سیاسی تدبر و قابلیت کا ماتم ہوا، حسن امام کے مرنے پر قانونی دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت پر انسانیت اور اسکی شرافت کا ماتم ہے، مرحوم نیکدل، متواضع، فیاض، مشرقیت پسند اور دیندار تھے، اسی لئے انکی وفات پر پورے

صوبہ نے ماتم کیا، شہر کے سب سے بڑے میدان میں پورے شہر نے نماز جنازہ پڑھی، اور صوبہ کے سب سے مقدس مقام پھلواری شریف میں اپنے مرشدین کے مقبرہ میں جگہ پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی مغفرت کے پھول برسائے،

نظامِ دکن کی مجلس میں فرمانروایانِ اودھ کی بزمِ دوشین کا ایک ٹمٹماتا چراغ مدت سے جل رہا تھا، افسوس کہ وہ ۳۰ مئی ۱۹۳۸ء کی شب کو رونق دہر کی بیاسی بہاریں دیکھکر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، مولنا علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نے بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی، لکھنؤ وطن تھا، اخیر تاجدار اودھ کے دربار کی خزاں دیکھی تھی، مٹیا برج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسوں کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر وسخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود اخیر تک علمی کاموں میں مصروف و منہمک رہے، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے،

اس ماہ کے شذرات کا صفحہ وفات نامہ ہوا چاہتا ہے، مگر احسان فراموشی ہوگی اگر ملک کے سب سے بوڑھے صحیفہ نگار مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار کا ماتم نہ کیا جائے، ۲۸ مئی کو انھوں نے اس دار فانی کو الوداع کہا، وہ اردو کے سب سے پہلے روزانہ اخبار (پیسہ اخبار) کے اڈیٹر تھے، انھوں نے صرف اپنی محنت و کوشش سے سرمایہ حاصل کیا، اور ملک میں تاریخ اور سیاحت ناموں کے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا، اور خود بھی دو سفر کئے، اور سیاحت نامے لکھے، مگر افسوس کہ اب انکو وہ سفر پیش آیا ہے، جسکا سفرنامہ انسانوں کے ہاتھ نہیں فرشتوں کے ہاتھ لکھتے ہیں، اس ان دیکھی منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، مرحوم نے ۷۴ برس کی عمر پائی،

اردو کے ایک اور کہنہ صاحب قلم استاد کی وفات پر دو آنسو بہانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ انکی انشا پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہل قلم رشک کرتے تھے، مگر افسوس کہ نوجوانوں نے انکو بھلا دیا، یہ خان بہادر میر ناصر علی مدیر صلاے عام دہلی تھے، مرحوم نے عمر کی چھیاسی بہاریں دیکھکر ۱۲ جون کو دہلی میں وفات پائی، ان کے قلم میں جو نزاکت اور ان کے انشا میں جو لطافت تھی وہ اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر میں وہ اپنی ساری جگر کاوی ان ناقدرشناس انگریز افسروں کے لیے کرتے تھے، جو ہندوستانی کو امتحان کے لیے سیکھتے تھے، اور انکی یہ ادبی کوششیں عام نگاہوں سے چھپکر رہ گئی تھیں، خدا اپنے دربار میں ہمارے اس بوڑھے صاحبِ قلم کی آبرو رکھے،

لوگون کو یاد ہوگا کہ ٹرکی مین ہماری سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ کے ترجمہ کا کام شروع ہوا تھا، اور انکی متعدد جلدین ترکی مین ترجمہ ہوکر وہان مقبول ہو چکی ہین، لیکن ٹرکی مین دو برس سے جب سے عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف کو رواج دیا گیا، ادھر سے خاموشی رہی، خیال ہوا کہ شاید حروف کی تبدیلی سے خیالات مین بھی تبدیلی آگئی ہے، بارے اس ہفتہ مین قسطنطنیہ سے مترجم مذکور کا ایک عربی خط آیا، جس سے پہلے خیال کی غلطی دور ہوئی، امین موصوف نے سیرت کی جلد چہارم اور سیر الصحابہ کے حصص مہاجرین کی جلدین ترجمہ کی غرض سے طلب کی ہین، اسی خط مین وہ لکھتے ہین کہ سیر الصحابہ مین سے انصار، مہاجرین جلد اوّل اور صحابیات کا ترجمہ وہ تمام کر چکے، فالحمد للہ،

ہم نے ہندوستان مین عربی زبان کی ترقی واشاعت کی غرض سے آج سے ایک سال پہلے الضیاء کے نام سے لکھنؤ سے جو ماہانہ عربی رسالہ نکلوایا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک سال کی عمر طے کرکے دوسرے سال مین قدم رکھا، ہندوستان کے دو سَو شائقین نے اسکو خرید کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا، ساتھ ہی ہماری تحریک پر حسب ذیل اصحاب نے اس کے اجرا مین مالی امداد دیکر اسکی طبع واشاعت کی مشکلات کو آسان کیا،

۱۔ نواب سر مزمل اللہ خان بہادر، بھیکن پور، علی گڈھ،	ما،
۲۔ نواب صدریار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شروانی حبیب گنج علی گڈھ،	صہ،
۳۔ مولنا ضیاء الحسن علوی ندوی، انسپکٹر مدارس عربیہ، الہ آباد،	صہ،
۴۔ مولنا عبد الباری ندوی، پروفیسر جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد دکن،	عہ،
۵۔ خاکسار سید سلیمان ندوی،	ما،

اس ایک سال کے عرصہ مین اس رسالہ نے ہندوستان اور دیگر ممالک عربیہ مین جو عزت ومنزلت حاصل کی، اور ہندوستان کے مسلمانون کے عربی ذوق کا جو ثبوت بہم پہنچا یا وہ ہماری توقع سے زیادہ ہے، ضرورت ہے کہ اس مقدس زبان کی اشاعت کے قدرشناس رسالہ کی دوسری منزل مین بھی ہمارا ہاتھ بٹائین،

نکلتے ہین،

صداقت، سری نگر، (ہفتہ مین دوبار) اڈیٹر جناب عبدالرحیم ایم اے، ال ال بی، حجم ۸ صفحے، تقطیع ۲۰×۲۶/۸ قیمت سالانہ للعہ، ہر پرچہ ۲/ پتہ :- سری نگر، کشمیر،

"صداقت" مسلمانانِ کشمیر کا ترجمان ہے، اس نے اپنا مسلک یہ بتایا ہے کہ وہ "تحریک کشمیر کا سچا حامی، حکومت کشمیر کا بہترین مشیر، اور برادرانِ وطن کا معاون و مددگار ہوگا، مسلمانون کے حقوق کی پاسبانی کرے گا، اور کشمیر کی مختلف قومون مین یگانگی اور اتحاد پیدا کرنے کی بھی کوشش کریگا،

الواحد، بجنور (ہفتہ وار) اڈیٹر جناب عبدالوحید صاحب، حجم ۸ صفحے، تقطیع ۲۲×۱۸/۲ قیمت سالانہ سے، ہر پرچہ ۲/ پتہ :- الوحید پریس، بجنور، یوپی،

الواحد کے اجراء کا مقصد غیر فرقہ وارانہ طور پر ملک کی خدمت کرنا بتایا گیا ہے، اس کا ایک نمبر دیکھنے مین آیا، خبرون کا انتخاب معقول ہے، اور بعض مضامین بھی دلچسپ ہین، "ر"

مطبوعات جدیدہ

طلسمِ زندگی، تصنیف جناب بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، حجم ۲۰۰ صفحے،

قیمت:- صہ پتہ:- منیجر ہمایون، المنظر، ۲۳ لارنس روڈ، لاہور،

میان بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، ایک ایسے خوش مذاق مغربی تعلیم یافتہ ہین، جنھین اردو ادب کا پاکیزہ مذاق عطا ہوا ہے، موصوف اپنی گوناگون مصروفیتون کے باوجود اپنے ادبی رسالہ ہمایون کو ایک رفتار سے چلار ہے ہین، جس کی ہر اشاعت مین ان کے قلم کی کوئی نہ کوئی گلکاری ضرور ہوتی ہے، وہ اکثر چھوٹے چھوٹے جملون اور فقرون مین اپنے لطیف خیالات اور غور و فکر کے انمول موتی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہین "طلسمِ زندگی" انہی گلہاے رنگارنگ کا ایک خوشنما اور دلآویز گلدستہ ہے، جو اپنی ظاہری و معنوی دونون حیثیتون سے دلفریب اور قابل قدر ہے،

یہ مختصر مضامین اپنی اپنی مناسبت سے مختلف عنوانون "مناظر" "صداے روح" "آئینۂ دل"، "جد و جہد" "سرگوشیان" اور "خیالات پریشان" مین منسلک کردیئے گئے ہین، اور گویا ان مین سے ہر عنوان "طلسم زندگی" کا ایک مفتاح باب ہے، جس کا آغاز ایک ایک رنگین اور منقش صفحہ سے ہوتا ہے، کتاب دبیز آرٹ پیپر پر اس اہتمام سے چھپی ہے کہ شاید سعی جستجو کے باوجود ساری کتاب مین ایک داغ اور دھبہ نظر نہ آئے، اسی طرح مضامین کی مناسبت سے تقریبًا ۲۰، ۲۲، رنگین تصویرین ہین، جنمین سے اکثر مشہور نقاشون اور مصورون کے کمالات کی ممنون ہین،

لیکن ہمارے نزدیک کتاب کی اس ظاہری زیبایش و آرایش سے زیادہ لائقِ ذکر ایک مغرب پسند کی مشرق نوازی ہے، قلم مغربی ہے، مگر زبانِ قلم سے جو بات نکلی ہے، وہ مشرق کے خیالات مین ڈوبی ہوئی ہے، انہی چند سطری مضمونون مین مشرقی خیالات کی ترجمانی، مشرقی تہذیب کی ستایش، مشرق کے اخلاق و موعظت کے حکیمانہ اصول، اور مشرقی تہذیب و تمدن کی دلپذیر تصویر کا جلوہ نظر آتا ہے، نمونہ کے لیے "چند بند" اور "چند بند (جدید اڈیشن)"

اور نئی اور پرانی دنیا" دیکھیے، اسی طرح فطرت انسانی کی صحیح مصوری اور معاشرت انسانی کی صحیح نقاشی" بڑے آدمی" "رشتہ دار" اور "خوش قسمت کون ہے" وغیرہ میں نظر آتی ہے، اور پھر مناظر "صدائے روح" "آئینۂ دل" اور "جدوجہد" وغیرہ مصنف کے تخیلات کی بلندی، جذبات کی مصوری، انسانی فطرت شناسی اور روح کی پاکیزگی، کی آئینہ دار ہیں، اور اگر خردہ گیری کیجائے، تو خامیاں کہاں نہیں، لیکن ایک بے داغ، صاف ستھری چھپی ہوئی کتاب پر خردہ گیریوں سے دھبے لگانا شاید ذوق و لطافت کے بھی خلاف ہو،

سیرت رسول اللہ تالیف جناب سید نواب علی صاحب رضوی، ایم اے، ایجوکیشن ممبر اسٹیٹ کونسل حجم ۲۹۰ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ قیمت قسم اول ۲ قسم ثانی ۱ روپے، دار المصنفین سے مل سکتی ہے،

اس کتاب کے مؤلف ہمارے نئے تعلیم یافتوں میں، اردو سیرت کے سب سے پہلے مصنف ہیں، اب جبکہ موصوف کے علم و تحقیق کا مرتبہ پہلے سے بہت بلند ہو چکا ہے "سیرت رسول اللہ" کے نام سے ایک اور کتاب لکھکر پیش کی ہے، اس کی تالیف میں مؤلف نے سیرت کے قدیم ماخذوں کے علاوہ یورپ کے اہم مخالفینِ اسلام کی ان تصنیفات کو بھی سامنے رکھاہے، جو سیرت پر اس وقت تک لکھی گئی ہیں، اور پھر اس طور پر اپنی تالیف مرتب کی کہ مخالفین کے اعتراضات بغیر الجھے ہوئے، دفع ہوں، اور اصل حالات آئینہ ہو جائیں، اور اس طرح آنحضرت صلعم کی سیرت کے تقریبًا تمام ابواب نقد و نظر کے ساتھ اجمالاً روشناس کر دیئے ہیں، اور سیرت کے مسائل مہمہ کو غور و فکر اور استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے، لیکن ضرورت تھی کہ مؤلف موصوف اسے اردو میں لکھنے کے بجائے انگریزی زبان میں لکھتے کہ انگریزی زبان میں ایسی سیرتوں کی زیادہ ضرورت ہے، البتہ اس کا افسوس ہے کہ مصنف نے مخالفین کے اعتراض کے خوف سے سیرت کی بعض ایسی روایتوں سے انکار کرنا مناسب سمجھا ہے، جنکو اب تک صحیح سمجھا جاتا رہا ہے، اور ان کی کمزوریِ تحقیق سے اب تک ثابت نہیں ہوئی ہے، اگر یہ کتاب اس عیب سے خالی ہوتی تو بہت خوب ہوتی،

زندگی، از جناب ملا رموزی، حجم ۱۱۲ صفحے تقطیع چھوٹی، قیمت ۱۲؍ پتہ :- جناب غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چار کمان، حیدرآباد، دکن،

جناب ملا رموزی مزاحیہ مضمون نگاری میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں، "زندگی" انہی کے چند فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے، جو اکثر رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، ابتدا میں ملا صاحب نے ایک دیباچہ منسلک کیا ہے، جس میں اردو زبان میں ظرافت نگاری پر تبصرہ کیا ہے، ملا صاحب اپنے مضامین میں علاوہ اس حصہ کے جو "در مدح خود میگویم" کا مصداق ہوتا ہے، ہنسی ہنسی میں بعض کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں، خصوصاً ان کی نظر گھریلو زندگی اور مجلسی معاشرت دونوں پر رہتی ہے، اور اس لحاظ سے ان کی تحریر سے معاشرتی اصلاح کی خدمت بھی انجام پاتی ہے،

روح جذبات، حجم ۶۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت عہ، مرتبہ: جناب عشرت رحمانی، دفتر رسالہ نیرنگ دہلی،

جناب اکبر حیدری، اردو کے روشناس ادیب اور شاعر ہیں، ان کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "روح جذبات" کے نام سے شائع ہوا ہے، اکبر حیدری کی شاعری میں تخیل آفرینیاں ہیں، اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے وہ اپنے عزم و یقین اور ترتیب و توازن کے ساتھ پیش کرتے ہیں، طریقۂ ادا سلیس اور سادہ ہے، مغلق اور بے معنی فارسی ترکیبیں نظر نہیں آتیں، اگر خردہ گیری کیجائے تو خامیاں بھی نظر آئینگی، ہمارے نومشق اردو شعراء اس مجموعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اکبر حیدری کی شاعری پر مجموعہ کی ابتدا میں چند اہل قلم کی دو دو لفظوں میں تقریظیں ہیں، اگر اس مجموعہ کو ان دو لفظی تقریظوں سے معرا رکھا جاتا تو مناسب ہوتا،

نظام الفوائد، حصہ اول و دوم، از مولوی ابو الحسن محمد صابر صاحب اعظمی، مدرسہ مظہر العلوم بنارس
حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۰۲، ۱۰۹ صفحے، قیمت ہر ایک کی ۲ر، مولف سے مل سکتی ہے،

نظام الفوائد، فارسی قواعد کا رسالہ ہے، حصہ اول میں صرف کے مسائل ہیں، اور آخر میں پورا آمدنامہ نقل کیا گیا ہے، اور دوسرے حصہ میں نحوی مسائل درج ہیں، مسائل کو سلجھا کر بیان کیا گیا ہے، اور متعدد مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، زبان آسان اور طرز ادا سہل ہے، رسالہ بچوں کے پڑھانے کے لائق ہے،

"ض"

جلد ۳۲	ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۳ء	عدد ۲،

مضامین



شذرات

گذشتہ شذرات میں بعض غلطیاں رہگئی ہیں جنکی اصلاح مناسب ہوگی، ورنہ آگے چل کر وہ شاید تاریخ کی غلطیاں نہ بنجائیں، مولٰنا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر وفات کے وقت یاد سے ستاون برس لکھدی گئی تھی، مگر انکے رفقاے خاص سے یہ معلوم ہوا کہ انسٹھ برس تھی، اسی شذرہ کے آخر میں "علم و حرفت" چھپ گیا ہی، حالانکہ وہ "علم و معرفت" ہی، امید ہی کہ ناظرین اسکو قلم سے درست کرلینگے،

منشی محبوب عالم مرحوم کے تذکرہ میں یہ لکھا گیا ہی کہ وہ اردو کے پہلے روزانہ اخبار کے بانی اور اڈیٹر تھے، اس سے مراد مسلمانوں میں تھی یعنی اردو کے پہلے اسلامی روزانہ اخبار کے وہ بانی اور اڈیٹر تھے، اردو میں منشی نولکشور لکھنؤ کا اودھ اخبار ان کے اخبار سے پہلے نکلا تھا، اور اب تک نکل رہا ہے،

اسدفعہ احباب کے اصرار پر جلسۂ سیرت کے موقع پر بڑودہ جانا پڑا، اعظمگڈھ سے ۲ر جولائی کی شام کو نکل کر لکھنؤ اور دہلی میں بارہ بارہ گھنٹے ٹھہر کر ۵ر جولائی کی رات کو ۹ بجے بڑودہ کے دارالریاست میں پہنچا، اسٹیشن پر ریاست کے نمایندہ مسٹر کلکر اور دوسرے مسلمان احباب نے خیر مقدم کیا، ریاست کے مہمان خانہ میں ٹھہرنے کی جگہ ملی، دوسرے دن ہز اکسلنسی دیوان بہادر کے زیر صدارت بڑودہ کالج کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد ہوا، میں نے اور دوسرے مسلمان اور ہندو مرہٹہ مقرروں نے اپنے اپنے انداز میں سیرۃ نبوی کے موضوع پر تھوڑی تھوڑی تقریریں کیں، تیسرے دن جمعہ کے روز شہر کی جامع مسجد میں بعد نماز میری ایک اور تقریر ہوئی،

بڑودہ ہندوستان کی بڑی ترقی یافتہ ریاستوں میں ہی، آج سے ۲۲ برس پہلے جب میں نے حضرۃ الاستاذ مرحوم کے زیر سایہ انجمن اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تھا، تو یہاں آیا تھا، اس وقت وہاں کے مشہور مسلمان رئیس نواب صدرالدین خاں مرحوم جنکے صاحبزادوں سے میرے عزیزانہ اور برادرانہ تعلقات تھے، اور ہیں، زندہ تھے، مرحوم نے اس وقت اردو کا سب سے بڑا کتبخانہ جمع کیا تھا، اور جامع مسجد بکوس کی تعمیر ختم ہو رہی تھی، اب وہ ان کا اردو کتبخانہ اسی جامع مسجد میں انکے صاحبزادوں نے منتقل کر دیا ہی، مگر افسوس کہ وہ مقفل پڑا رہتا ہی، اور کسی کو اس سے استفادہ کی توفیق نہیں ملتی،

ریاست بڑودہ کی آبادی چوبیس۲۴ لاکھ ہے جسمیں پانچواں حصہ مسلمانوں کا ہے خود شہر کی ایک لاکھ کی آبادی میں بیس ہزار مسلمان ہیں، الغرض یہاں بیس۲۰ فیصدی مسلمان آباد ہیں، تاہم آپکو یہ سنکر افسوس ہوگا کہ یہاں ایک بھی خاص مسلمانوں کا اسکول نہیں مجھے بتایا گیا کہ یہاں ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ ہے جس سے اسوقت تک گیارہ۱۱ سو لڑکے کامیاب ہوچکے ہیں، مگر ان میں مسلمان صرف آٹھ دس تھے جنمیں سے تین ریاست سے باہر کے تھے، یہی سبب ہے کہ بیس۲۰ فیصدی اسلامی آبادی ہونے کے باوجود ریاست کی ملازمت اور مناصب اور عہدوں میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں ہے، مسلمان اپنی غفلت کا الزام ریاست پر ڈالتے ہیں کہ وہ ہماری تعلیم کیطرف توجہ نہیں کرتی ہمکو بڑودہ کے بیدار مغز مہاراجہ کیساتھ جو حسن ظن ہے، اسکی بنا پر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ خود انکی ریاست کی بے توجہی سے وہاں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ بڑودہ کی ریاست کی تعمیر میں مسلمان امیروں اور سپاہیوں کی تلواروں کو بھی دخل ہے،

اگر لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جا سکتا ہے، تو بڑودہ کو کتبخانوں اور مدرسوں کا ملک کہا جا سکتا ہے، ریاست کے پورے طول و عرض میں متحرک کتبخانوں، مکتبوں اور مدرسوں کا جال پھیلا ہے اور گجراتی کی ابتدائی تعلیم ہندو مسلمان سب کے لئے جبری ہے، شہر میں ایک عام کتبخانہ ہے، ایک خاص سنسکرت کا مشرقی کتبخانہ ہے، ایک متحرک کتبخانوں کا مرکزی کتبخانہ ہے، یہاں کے کتبخانوں کی عمارت، ترتیب اور تقسیم سب امریکی نظام پر ہے، اور حق یہ ہے کہ آج تک یہاں سے بہتر طریق پر کوئی کتبخانہ نظر نہیں آیا، سب سے بڑے کتبخانہ کی الماریاں منزل بہ منزل لوہے کی چھڑوں اور تختوں سے بنائی گئی ہیں اور ہر منزل کی چھت دبیز شیشہ کی بنی ہے، تاکہ نیچے کی منزل میں بھی روشنی پہنچ سکے، اور کتبخانہ آتش زنی سے محفوظ رہے، اس وقت ریاست کے مرکزی کتبخانہ کے ماتحت پینتالیس۴۵ بڑے اور آٹھ سو کے قریب چھوٹے کتبخانے ہیں، اور تقریباً ہر سال چار لاکھ کتابیں پڑھی جاتی ہیں،

بڑودہ سے بھڑوچ، اور وہاں سے رانڈیر، رانڈیر سے سورت، وہاں سے انکلشور، انکلشور سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے سورت ہوکر دہلی اور لکھنؤ کے راستہ سے ۱۶ر جولائی کو اعظم گڈہ واپسی ہوئی، ہر جگہ ایک دو تقریریں کرنی پڑیں، بھڑوچ دریائے نربدا کے کنارے وہ مقام ہے جہاں ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں بحر عرب کی راہ سے نربدا میں داخل ہوکر مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ پہنچا تھا، اسکے ساحل پر پہنچکر تاریخ کا وہ مرقع آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور بے اختیار چند مصرعے موزوں ہوگئے،

رانڈیر گجرات کے دیندار تاجروں کا مرکزی وطن ہے، یہاں کی مسجدوں کی شان و شکوہ کو دیکھکر ان سندبادبحری و بری تاجروں کے

قصے یاد آگئے جنکا الف لیلہ میں ذکر ہے، مسجدیں ہیں، اور اکثر بڑی مسجدیں شروع سے آخر تک سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی موزوں ترکیب سے بنائی گئی ہیں، جامع مسجد، مسجد قوۃ الاسلام اور مسجد چار دار بہترین مسجدیں ہیں، اور اپنی صفائی اور ستھرائی میں ہندوستان بھر میں بے نظیر معلوم ہوئیں، پانچ ہزار کی اسلامی آبادی ہے، مگر اسکے اندر بہترین میونسپلٹی، بہترین سڑکیں، اور ہر جگہ سڑک پر برقی روشنی کا انتظام ہے، مسجدیں برقی پنکھوں سے راحت رساں، اور برقی روشنیوں سے منور ہیں، ان ظاہری سامانوں کیساتھ باطنی حیثیت سے بھی یہ مسجدیں نمازیوں سے آباد نظر آئیں، نوجوان مسلمانوں کی ایک خاص مجلس ہے جس کے ارکان باہمت ہیں، محفل اسلام نام ایک مجلس ہے جسنے اردو، عربی، انگریزی اور گجراتی کا اچھا خاصہ کتبخانہ جمع کیا ہے، ایک گوشہ میں ایک پرانا مزار بھی ہے جو حسب دستور ایک گنبد کے نیچے چادروں اور غلافوں میں لپٹا ہوا، مزوروں کے جھرمٹ میں ہے اور جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ کسی تابعی یا تبع تابعی کا ہے، بھروچ اور سورت اور راندیر میں ایسی مسجدیں نظر آئیں جنکی تاریخیں پانچویں صدی کی بتائی جاتی ہیں، اور کہیں دروازوں پر لکھی دیکھی ہیں، راندیر میں ایک عربی مدرسہ محمدیہ بھی موجود ہے، جس میں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اسمیں قدیم عربی کیساتھ جدید عربی بھی سکھائی جاتی ہے،

ڈابھیل سورت سے ایک دو اسٹیشن بعد ایک گاؤں ہے جہاں کے دو تاجر ملکر اس ستارہ کو جو دیوبند کے نظام شمسی سے چند سال پہلے ٹوٹا تھا یہاں اٹھا لائے ہیں، ہر قسم کی عمارتیں، مسجد، کتبخانہ، مہمان خانہ، دار الحدیث اور دار الطلبہ غرض جو کچھ ضروری تھا ان تاجروں کی فیاضی سے بے منت غیرے چند برس کے عرصہ میں بنکر تیار ہوگئی ہے، صرف مدرسہ کی خاطر بجلی کی روشنی کا خاص اہتمام ہے، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا ادریس صاحب اور دوسرے فاضل علما درس میں مصروف ہیں، اور تین سو کے قریب طالب العلم ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے زیر تعلیم ہیں، گجراتی اور اردو کے مکتب الگ ہیں، جائے وقوع گاؤں سے باہر میدان میں ہے، خوش فضا منظر، سکون کا مقام اور اسٹیشن سے جسکا نام مرولی ہے چار پانچ میل دور ہے، گجرات کے خاص طالب العلم بھی یہاں آرہے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ انشاء اللہ یہ چند سال میں گجرات کا دار العلوم ہو جائیگا،

اس دور دراز سفر کے ہر مقام میں جو پایہ تخت دہلی سے سینکڑوں میل دور ہے، یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ہماری پچھلی اسلامی حکومت کے دھندلے نشان اب بھی دور دور سے نمایاں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کے وہ پچھلے خاندان آباد ہیں جنکو سلاطین دہلی نے جاگیریں دے دیکر ہر جگہ بسایا تھا، اور تعلیم و تدریس، یا قضا، یا ہدایت و رہنمائی کی غرض سے جا بجا آباد کیا تھا، وہ اب تک اسی طرح آباد ہیں، انہیں سے ہر خاندان میں قلمی کتبخانوں کا سرمایہ پرانے تمدن کی یادگاریں ہیں، اور وہ آبادی میں امتیاز خاص رکھتے ہیں، ہر شہر اور قصبہ میں قاضیوں اور عالموں کے خاندان آباد ہیں، جو ابتک اپنی حقیقت کو سنبھالے ہوئے ہیں لیکن تا کے؟ ضرورت ہے کہ یہ لوگ اپنے ماحول کی ضرورتوں کو سمجھیں اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کریں،

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر مدت سے اسے دور زماں میٹ رہا ہے،

مقالات

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز

ناظرین کو یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے ہم نے اپنے شذرات میں جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیو بر کے ایک خط کا ذکر کیا تھا، جسمین موصوف نے اپنے ایک فلکی کرہ کے بنانے والے ضیاء الدین محمد کا حال دریافت کیا تھا، ذیل مین ہم پہلے موصوف کا خط درج کرتے ہین، اور اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ پتہ لگ سکا ہے، اسکو حوالۂ قلم کرتے ہین، اس سلسلہ مین اگر کوئی صاحبِ علم کچھ نئے معلومات پیش کرین گے تو ہمارے شکریہ کا باعث ہوگا،

نقل خط ڈاکٹر فان کلیو بر

"جناب محترم — میرا قصد ہے کہ ایک عربی کرہ کے متعلق جو برلن کے عجائب خانہ مین ہے کچھ لکھون، اس کرہ پر ایک تحریر ہے جس مین بنانے والے کا نام تاریخ، اور مقام درج ہے، اس تحریر کا عکس اس خط کیساتھ آپ کی خدمت مین بھیجتا ہون،

چاہتا ہون کہ اس کے بنانے والے کے متعلق تفصیلات معلوم کرون، کہ یہ کون شخص ہو؟ کیا کوئی معروف مہندس یا منجم ہے؟ کہان کا رہنے والا ہے؟ اس کا زمانہ کیا تھا؟ آیا اس نے اور بھی ایسے کرے تیار کیے ہین؟ اس کا کوئی تعلق آپکے ملک کے رئیس جے سنگھ سوائی سے تو نہین تھا جو خود بڑا نجومی تھا؟

یہان جو کتابین مجھے مل سکین ان مین ان باتون کا پتہ نہ چل سکا، لیکن بعض ہندوستانی دوستون نے بتلایا کہ اگر آپ کو لکھون تو ضرور کچھ سراغ لگ سکیگا، مین بہت ممنون ہونگا اگر آپ براہ کرم اپنی معلومات

سے مجھے مستفید فرمائیں، مجھے بڑی ہی خوشی ہوگی اور یقین ہے کہ ایشیائی تمدن سے ہماری محبت اور شغف میں اس سے اضافہ ہوگا، اپنی سیاحتوں میں میں خود بھی اس تمدن کا دلدادہ بن چکا ہوں،

آپ کا

فان کلیو بر،

ضیاء الدین محمد اسطرلابی ہمایونی لاہوری

اسطرلابی عربی علم ہیئت کی درسگاہوں میں جو آلاتِ فلکی عام طور سے استعمال کئے جاتے تھے، ان میں سب سے مشہور کرہ اور اسطرلاب ہیں، ان میں سے کرہ کی ضرورت صرف تعلیم میں پیش آتی ہے، وہ روزمرہ کے استعمال کی چیز نہیں، مگر اصطرلاب سے چونکہ آفتاب کا ارتفاع اور دوسرے ستاروں کا اندازہ لگاتے ہیں، اسلیے یہ ہیئت اور فلکیات کے عالموں منجموں اور جوتشیوں کے روزانہ استعمال میں آتا ہے، اور اسلئے یہ زیادہ متداول ہے، اور اسی بنا پر آلات فلکی کے بنانے والوں کا لقب بھی متاخرین میں **اسطرلابی** مشہور ہوگیا ہے، کہ کرہ کی نسبت "کروی" شخصیت کے بجاے شکل کی نسبت میں اصطلاحاً مستعمل ہے، اس لیے وہ کاریگر اور صناع کے نام کے لیے غیر موزون قرار دیا گیا ہے، اور "اسطرلابی" چونکہ اصطلاح میں کسی شکل کا نام نہیں، نہ ہیئت کی کسی اور اصطلاح سے متصادم ہے، اس لئے اس آلہ کی طرف انتساب سے فلکی آلات کے بنانے والے کا لقب بنایا گیا ہے،

ہمایونی یہ ہمایونی ہمایون کی طرف نسبت ہے، جو آلِ تیمور کے سلسلہ میں ہندوستان کے تیموری فاتح بابر کا جانشین تھا، سلاطین آلِ تیمور کو علوم ہیئت سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ المتوفی ۸۵۳ھ نے سمرقند میں مشہور رصدخانہ قائم کیا، جس میں اس عہد کے مشہور علمائے ہیئت قاضی زادہ رومی، غیاث الدین جمشید اور علی بن محمد قوشجی نے تحقیقات کیں، اور اس میں جو زیج لکھی گئی اس کا نام زیجِ الغ بیگی رکھا گیا، بابر نے اپنی تزک میں اس رصدخانہ کے کھنڈروں کا ذکر کیا ہے،

بابر کا بیٹا ہمایون جس کے نام کی طرف اصطرلاب کی نسبت ہے، نجوم و ہیئت کے علوم کا ماہر و عالم تھا، ملا بدایونی

نے منتخب التواریخ میں جو سنہ ۱۰۰۴ء کی تالیف ہے ہمایون کے حال مین لکھا ہے،

"در علوم نجوم وہیئت وسائر علوم غریبہ بے نظیر" (جلد اول ص ۴۶۶ کلکتہ)

فرشتہ مین ہے،

"در علم ریاضی علم مہارت می افراشت، مدار صحبتش با علماء و فضلا بودہ، ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد" (جلد اول، مقالہ دوم ص ۲۴۳ نولکشور)

بادشاہ نے ہیئت کا یہ فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا جو ہیئت کے تمام فنون اور رصد بندی مین ماہر تھے، (ان کا حال بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۳۱ مطبوعۂ کلکتہ مین لکھا ہے)

عراق وایران کے قیام کے زمانہ مین حکمت وہیئت کے علوم کے دو نامور عالم ایک وہی الیاس اردبیلی مذکور اور دوسرے شیخ ابوالقاسم جرجانی بادشاہ کے ساتھ تھے، اور اسوقت بھی جب بادشاہ ہندوستان کا تخت کھو کر آوارۂ غربت تھا ان دونون دانشورون سے قطب شیرازی المتوفی سنہ ۷۱۰ھ کی فاضلانہ کتاب درۃ التاج کا جو فارسی مین حکمت نظری وعملی پر مشتمل ہے، درس جاری تھا (مآثر رحیمی ص ۶۱۲ جلد ا کلکتہ واکبر نامہ دفتر اول ص ۲۴۲ نولکشور)

اکبر نامہ مین ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، ہمایون ایران کے سفر کے دوران مین جب تبریز پہنچا تو بیک محمد آختہ بیگی نام اپنے ایک نوکر سے کہا کہ یہ پرانا شہر ہے یہان "کرہ" تلاش کرو، "کرہ" فارسی مین گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہین، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لیکر خدمت شاہی مین حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابان کو دیکھکر ہنس پڑا، ابوالفضل نے اس واقعہ کو ان لفظون سے شروع کیا ہے،

"چون بہ تبریز نزول فرمودند از آنجا کہ توجہ اقدس با صطرلاب وکرہ وسائر آلات رصدی در حد کمال داشت ....." (ص ۲۱۱ نولکشور)

خود بادشاہ علماء کی طرح ہیئت وریاضی کا درس دیتا تھا، بادشاہ کے مصاحب [illegible] الدین ترخان سفیدونی (المتوفی سنہ ۹۹۳ھ) نے جو اس فن کے ماہر تھے، بادشاہ ہی سے اس فن کا درس حاصل کیا تھا، یہ یون [illegible] ہے،

"ملا نورالدین ترخان نوری سفیدونی جاگیردار سفیدون از توابع سندھ در علوم ہندسی و ریاضی و نجوم و حکمت ممتاز

و از اجلۂ مصاحبان ہمراز پادشاہ مغفرت پناہ بود" جلد ۳ ص۱۹۱)

مآثر الامراء (جلد اول ص۳۰۰ کلکتہ) مین مولنا نورالدین ترخان کے حال مین ہے:

"مولانا بفضل و کمال و شجاعت و سخاوت اتصاف داشت، و بہ ہیئت و ہندسہ و اصطرلاب شوق مند بود

. . . . . و صحبتش با جنت آشیانی (ہمایون) کوک گشتہ از جلۂ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی

گردید . . . . گاہے پادشاہ از وے استفادۂ علوم میکرد، و گاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب

ہمایونی کہ درین فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود"

بادشاہ کو ہیئت و فلکیات سے جو ذوق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی امیرالبحر جو سلطان سلیمان

خان کی طرف سے گجرات کے بندر سے پرتگیزون کو نکالنے آیا تھا، اور جسکا جہاز تباہ ہوا، اور اس کو بالآخر خشکی کی راہ سے

ہندوستان، ایران اور عراق کے راہ سے اپنے ملک کو واپس جانا پڑا، اس نے اپنے سفرنامہ مرآۃ الممالک مین ہمایون سے

ملاقات کے سلسلہ مین اس کے نجوم و فلکیات کے شوق کا تذکرہ کیا ہے، ہمایون چاہتا تھا کہ ترکی امیرالبحر جو خود بھی فلکیات

کا ماہر تھا، وہ ہمایون کے پاس سے نہ جائے، مگر امیرالبحر کو نے جانے پر اصرار کیا، اس پر بادشاہ نے اس شرط پر رخصت دی کہ

"برسات کے تین مہینون کے گذرنے کے بعد جنمین راستے ناقابل گذر ہوتے ہین، مین جا سکتا ہون،

اس اثنا مین چاند اور سورج کے گرہنون کا حساب کرتا رہون، اور وہان کے نجومیون کو آفتاب کی گردش

اور خط استوار کے نکات کے پڑھنے مین مدد دون . . . . مین کام مین معروف ہو گیا

اور نجومی مشاہدات ختم کئے" (باب ہشتم ترجمۂ مرآۃ الممالک پروفیسر ویمبری)

ہمایون کی بہن گلبدن بیگم جس نے ہمایون کے حال مین ہمایون نامہ لکھا ہے، اس مین ایک موقع پر مذکور ہے

کہ ہمایون نے خود ایک شادی کے لیے اصطرلاب اٹھا کر ستارون کی گردش معلوم کر کے تاریخ سعید مقرر کی،

"غرضکہ بعد از چہل روز در ماہ جمیدالاول ۹۴۸ھ در مقام پاتر روز دوشنبہ نیم روز بود کہ اصطرلاب را

حضرت بادشاہ بدست مبارک خود گرفتہ اند و ساعت سعد را اختیار کردہ" (ص۵۳ لندن)

ہمایون کو ریاضیات اور آلات ریاضی سے اسقدر انس تھا کہ اس کے رفیق سپہ سالار بیرم خان خانخانان نے اسکی مدح مین ایک قصیدہ لکھا ہے، اسمین اصطرلاب سے تشبیب کی ہے،

مطلع قصیدہ کہ در باب اصطرلاب گفتہ[1]

آن چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار | آن مرکز میانہ شہابش کند گذار

باآنکہ می کند ہمہ و خور برابری | آمد بجان ز حلقۂ گوشان شہریار

نارد بچشم کوکبۂ آفتاب را | چون ہیچ لوائے شہنشاہ نامدار

پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست | ہمچون نگین خاتم شاہ جم اقتدار

برکف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی | تا بر قدوم اشرف شاہان کند نثار

شاہ بلند قدر ہمایون کہ از شرف | بر درگہش سپہر نہد روی افتقار

اس قصیدہ مین چرخ، محور، مدار، بدر، شہاب، ماہ، خور (آفتاب) حلقہ، آفتاب، آسمان، زمین، شرف سپہر۔ اسی فن ہیئت اور اصطرلاب کے اصطلاحات ہین،

عام طور سے مشہور ہے کہ ہمایون کتبخانہ کے زینہ سے گر کر مرا تھا، واقعہ یہ ہے کہ پرانی دہلی مین شیرشاہ نے شیر منڈل کے نام سے ۹۴۷ھ مین بہت بلند سہ منزلہ ایک عمارت بنوائی تھی، اسکی تیسری منزل پر ایک برجی بنی ہے جو تمام عمارتون سے اونچی ہے، بادشاہ نے اس عمارت کو غالبًا اسلئے کتبخانہ بنا دیا تھا، کہ یہ اونچی عمارت اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام دے، جس شام کو وہ گرا ہے اُس شام کو خیال تھا کہ ستارۂ زہرہ طلوع ہوگا، بادشاہ وہان ریاضی دانون کیساتھ مباحث مین مصروف تھا، اور سرشام زہرہ کے طلوع کا انتظار تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ بیٹھکر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور زخمی ہوا، اور اس زخم سے جانبر نہ ہوا، اکبرنامہ مین ہے"

[1] بدایونی ج۳ ص ۱۹۲ کلکتہ ۱۸۶۹ء آثار الصنادید سرسید مرحوم ص ۱۵ نامی کانپور،

وآخرہاے روز بربالاے بام کتبخانہ رفتہ . . . . . جمعے از ریاضی دانان راطلب فرمودند

وآن شب منظنۂ طلوع زہرہ بود می خواستند کہ ملاحظہ فرمایند، الخ

اس بادشاہ کے تمام کام فلکیات اور نجوم کے اصول پر ہوتے تھے، دربار کے دنون مین کامون کی تقسیم بھی علم نجوم کی مناسبت سے تھی، غیاث الدین خوندمیر نے ہمایون نامہ مین اور ابوالفضل نے اکبرنامہ مین ان دنون کی تقسیم اور انکے مناسبات نجومی کی پوری تفصیل کی ہے[۱]، دربار اور خیمہ و خرگاہ کی ترتیب بھی فلکیات ہی کے اصول سے ہوتی تھی، دربار کے لیے خیمے ایسے بنوائے تھے، جو یونانی ہیئت کے نو دن آسمانون کی پوری نقل تھے، ہر آسمان مین جو ستارے ہین، ان کے نمونے اسمین بنے تھے،

ہمایون کو اس قسم کے اختراعات سے بڑی دلچسپی تھی ایک بساط "نشاط" بنایا تھا اس بساط مین فلکی دوائر اور کرات عناصر بنائے تھے، پہلا جو فلک اطلس کی طرف منسوب تھا، سپید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کی مناسبت سے صندلی، پانچوان مریخ کے تعلق سے لال چھٹا آفتاب کی مناسبت سے سنہرا، ساتوان زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھوان عطارد کے تعلق سے سوسنی، نوان چاند کی مناسبت سے سپید، اس کے بعد اربعہ عناصر کے نقشے تھے، ان مین سے کرۂ خاک مین ساتون اقلیمون کے نقشے تھے، نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ اہل نجوم نے خاص کیا ہے، اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، اسی طرح بارہ برجون کا ایک خیمہ بھی بنوایا تھا، کئی جگہ رصد خانون کے بنانے کا ارادہ کیا، اور بہت سے آلات رصد ترتیب دیئے تھے[۳]، انھیں آلات رصد مین سے ایک اصطرلاب بھی تھا۔

مارچ و مئی ۱۹۰۹ء مین یعنی آج سے چوبیس پچیس برس پہلے الندوہ مین مین نے "مسلمان اور علم ہیئت" پر ایک مضمون لکھا تھا، اس مین سب سے پہلی دفعہ مین نے ضیاء الدین ہمایونی اصطرلابی کا ذکر کیا تھا، اس سلسلہ مین مین نے لکھا تھا،

"ہندوستان مین اصطرلاب کا رواج ہمایون نے دیا، ہمایون علم ہیئت مین نہایت ماہر تھا، اُسنے ایک

---

[۱] اکبرنامہ نولکشور ص ۳۹۹ و مآثر رحیمی جلد اول ص ۶۰۹ کلکتہ [۲] دیکھو الیٹ کی تاریخ ہند جلد ۵ ص ۱۱۶ [۳] اکبرنامہ دفتر اول،

خاص طرز کا اصطرلاب بنایا تھا جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں، چنانچہ ندوہ کے کتبخانہ میں جو ایک قدیم

اصطرلاب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے "عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہ داد اصطرلابی

ہمایونی لاہوری ۱۰۵۹ھ"[1]

افسوس ہے کہ میرے اس مضمون میں اس بیان کا حوالہ مذکور نہیں، اس وقت ہر چند میں نے اس کے حوالے

جا بجا کتابوں میں تلاش کئے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی ہے، علامہ غلام حسین جونپوری المتوفی ۱۲۵۰ھ نے جامع

بہادر خانی میں لکھا ہے، کہ "صناعان متاخرین" نے اصطرلاب میں یہ اصلاحیں کی ہیں[2]، کیا عجب کہ ان متاخرین سے

اسی ہمایونی اصطرلاب کی طرف اشارہ ہو،

ہمایوں کی خدمت میں جو صناع فلکیات کے یہ آلے اور نقشے اور کرے بناتے تھے، ان کے نام تاریخوں

میں جگہ نہیں پا سکے ہیں، صرف ایک مولنا مقصود ہروی کا نام آئین اکبری میں ہے کہ

"از پرستاران جنت آشیانی (ہمایون) بود ۔ ۔ ۔ ۔ اصطرلاب و کرہ و مسطرے چند چنان برساخت

کہ کارویدگان را شگفت درآورد" (ج ۱ ص ۲۳۱ نولکشور)

ضیاء الدین اور اسکا خاندان

ضیاء الدین اور اس کے خاندان کا کوئی پتہ ہم کو اب تک تاریخوں اور تذکروں سے نہیں چلا ہے،

لیکن ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے بنے ہوئے کروں اور اسطرلابوں پر اس کے نام ونسب کا جو سلسلہ

لکھا ملتا ہے، اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ضیاء الدین کا پردادا اللہ داد ہمایون کے عہد کا صناع تھا، اور جو ہمایونی طرز کے

کرے اور اصطرلاب تیار کرتا تھا، ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے حسب ذیل مصنوعات کا پتہ ہم کو ملسکا ہے،

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک اصطرلاب کلکتہ میں قاضی عبید الباری[3] کے پاس ہے، اس اصطرلاب پر حسب ذیل کتبہ ہے،

۱۔ "عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن اللہ داد اصطرلابی ہمایونی ۱۰۳۲ھ"

---

[1] الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء ص ۳۳ [2] جامع بہادر خانی ص ۱۵۰ کلکتہ، [3] یہ کلکتہ کے ایک پرانے خاندان کی یادگار ہیں، ان کے اصطرلاب کی اطلاع پروفیسر محفوظ الحق پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجی ہے،

اسی اصطرلاب کے دوسرے گوشہ پر ہے: "سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری"

اس کا بنایا ہوا ایک کرۂ فلکی بانکی پور کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، اس پر یہ عبارت درج ہے،

۲- "صنعۃ اقل العباد قائم محمد ابن عیسیٰ ابن اللہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی" سنہ ۱۰۶۷

کرہ کی دوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے،

- تمت این کرہ مکمل مشتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب ثوابت کہ جمیع ازان چہل و ہشت صورت مرصودہ نمودہ اند، اہل (؟) علماء و حکماء تنجیم چنانچہ مرصود رصد مرزا الغ بیگ است، و بر تقویم ہر کوکب ثابتہ سہ درجہ زیادہ کردہ ایم بحساب حکماء علماء این فن تا باین تاریخ سنہ ۱۰۶۷ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے، ہر کوکب کے پاس چاندی کی کیل ہے، اور ہر برج کی شکل بھی بنی ہوئی ہے، اور برجون کے پاس اس طرح سے جڑی ہین کہ انکی شکلین متوہم ہوجاتی ہین،

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین محمد کے بنائے ہوئے حسب ذیل کرون اور اصطرلابون کا حال ہم کو معلوم ہوا ہے جنکو ہم سنہ کی ترتیب سے نیچے درج کرتے ہین،

۱- اس کی بنائی ہوئی سب سے قدیم صنعت ایک فلکی کرہ ہے، جو اس وقت پھلواری ضلع پٹنہ مین مولوی یوسف صاحب رضوی کے پاس ہے، یہ کرہ خالص پیتل کا ہے، اور ہر ستارہ کے پاس چاندی کی ایک کیل گڑی ہے تین پاؤ پختہ وزن ہے، اس خاندان مین یہ کرہ سنہ ۱۲۳۰ھ سے چلا آرہا ہے، کرہ پر حسب ذیل عبارت[1] نقش ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ، ابن ملا اللہداد، اسطرلابی، ہمایونی لاہوری، فی سنہ ۱۰۸۵ھ"

۲- اس کے بعد اس کی بنائی ہوئی دوسری چیز ایک اصطرلاب ہے، جو اس وقت ندوۃ العلماء کے کتبخانہ مین ہے، اس اصطرلاب پر نام و تاریخ اس طرح ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۸۵ ہجریۃ"

---

[1] اس کرہ کی واقفیت کے لیے ہم مولوی سید احمد عرف حج، ہاشمی، صدر منزل، ہسندہ، پٹنہ کے ممنون ہین،

۳- اس کا بنایا ہوا دوسرا اصطرلاب نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتبخانہ (حبیب گنج ضلع علی گڈھ) مین ہے، اسکی عبارت اور تاریخ یہ ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد، اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۳ہجری"

۴- اسی سال کا بنایا ہوا اسکا کرہ رامپور مین ایک حکیم صاحب کے پاس تھا اور جواب طبیہ کالج علی گڈھ مین ہے، اس کا حلقہ ٹوٹ گیا ہے، مگر کرہ سالم موجود ہے، اس پر یہ عبارت ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۳ھ"

۵- اس کی چوتھی فلکی یادگار وہ کرہ ہے جسکا حال ڈاکٹر کلو یر نے ہم کو لکھکر اس کے فوٹو کے ساتھ بھیجا ہے، یہ کرہ ہے، جو اس وقت جرمنی کے پایہ تخت برلن کے عجائب خانۂ انسانی مین ہے، اس پر کتبہ یہ ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری، فی سنہ ۱۰۸۰ ہجری۔"

اس کے بعد ۱۰۸۰ھ کے بنائے ہوئے اس کے چار اصطرلابون کا حال ہم کو معلوم ہے جو اس وقت یورپ اور ہندوستان مین موجود ہین،

۶- ایک مولانا ابو بکر صاحب جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کے پاس ہے، یہ نسبۃً چھوٹا ہے، اور اس پر عبارت یہ ہے:-

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن شیخ الہداد، اصطرلابی، ہمایونی، لاہوری، فی سنہ ۱۰۸۰ھ"

۷- دوسرا ریاست رامپور کے شاہی کتب خانہ مین ہے، اس کے حروف کہین کہین سے گھس گئے ہین جو پڑھے جاتے ہین وہ یہ ہین[1]،

[1] اس اطلاع کے لیے ہم مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی، نائب ناظم کتبخانہ شاہی رامپور کے ممنون ہین،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہ داد ۰ ۰ فی ۱۰۶۸ھ"

۸- اسی سنہ کا تیسرا اصطرلاب وہ معلوم ہے جو ۱۹۳۱ء کے ایرانی فنون کی نمائش منعقدہ لندن (پرشین آرٹ اگزبیشن) میں پیش ہوا تھا، اور جسکا ذکر نمائش مذکور کی مطبوعہ فہرست ص ۱۹۳ میں موجود ہے[1] اس پر یہ عبارت کھدی تھی:

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری، فی ۱۰۶۸ ہجری"

فہرست مذکور کے مرتب نے اللہداد کے نام کے پڑھنے میں غلطی کی ہے، اس ہندوستانی نام کو جو "اللہ" اور "داد" کا مجموعہ ہے، اور جس کے معنی عطیۂ الٰہی کے ہیں، "الحدّاد" پڑھا گیا ہے، جس کے معنی عربی میں "لوہار" کے ہیں، اور پیتل کی صناعی کی مناسبت سے شاید یہ الحدّاد موزون سمجھا گیا ہے، مگر یہ صریحًا تحریف ہے،

۹- اسی سنہ کا بنایا ہوا اسکا چوتھا اصطرلاب جو بہت بڑا ہے، بانکی پور لائبریری میں ہے، عبارت یہ ہے:

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی ۱۰۶۸ھ"

نتائج اوپر کے معلومات اور کتبوں کی بنا پر حسب ذیل نتیجے برآمد ہوتے ہیں،

ان لوگوں کا وطن لاہور (پنجاب) تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے، ضیاء الدین، اس کا باپ قائم محمد، اس کا باپ ملا عیسیٰ، اس کا باپ ملا شیخ اللہداد، کتبوں کی عبارت اور لفظ "ملا" کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صفتِ علم سے آراستہ تھے، بدایونی میں ایک شیخ اللہداد لنگرخانی لاہوری کا حال ان لفظوں میں ہے،

"منسوب بمحلہ ایست از لاہور (محلہ لنگرخان لاہور کا ایک محلہ ہے) دراکثر علوم متداولہ ماہر و متبحر . . . . . و بدرس مشغول است، ہرگز بخانۂ ارباب بیمروت، نیازفتہ، از ملوک حاجت نخواستہ و مدد معاش نگرفتہ، عمرش قریب بہشتاد است۔"

بدایونی نے اپنی کتاب ۱۰۰۴ھ میں لکھی ہے، اس حساب سے ان شیخ اللہداد کی پیدائش تقریبًا ۹۲۴ھ ہوتی ہوگی

[1] اسکی اطلاع بھی ہم کو پروفیسر محفوظ الحق نے دی ہے،

اورہمایون کی حکومت کا زمانہ سنہ ۹۳۷ھ سے سنہ ۹۶۳ھ تک ہے، اس بناپر یہ ہمایون کے سامنے پچیس تیس برس کے جوان ہونگے، تاہم ان کو وثوق کیساتھ ضیاءالدین کا پردادا شیخ اللہداد نہین کہا جاسکتا،

ضیاءالدین اور اس کے بزرگون کے نامون کو سلاطین کے نامون کیساتھ ملانے سے یہ نسبت پیدا ہوتی ہے:

۱- شیخ اللہداد،	۱- بادشاہ ہمایون (سنہ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء - سنہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء)
۲- ملا عیسی	۲- بادشاہ اکبر (سنہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء - سنہ ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء)
۳- قائم محمد	۳- بادشاہ جہانگیر (سنہ ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء - سنہ ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء)
	۴- بادشاہ شاہجہان (سنہ ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء - سنہ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۶۵ء)
۴- ضیاءالدین محمد،	۵- بادشاہ عالمگیر (سنہ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء - سنہ ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء)

ان مین سے دو کی تاریخین ہم کو ملی ہین، اور وہ دونون اس قیاس کے مطابق ہین، قائم محمد کے پہلے اسطرلاب کی تاریخ سنہ ۱۰۳۴ھ سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری ہے، اس کے دوسرے کرہ کی تاریخ سنہ ۱۰۴۷ھ ہے، اس سے ثابت ہے کہ اس نے جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ پایا ہے،

ضیاءالدین کے پہلے کرہ پر سنہ ۱۰۵۸ھ اور آخری کامون پر سنہ ۱۰۷۴ھ منقوش ہین، جنسے اس کے عمل وصنعت کا زمانہ کم از کم سترہ برس تو بالیقین ہے،

ان لوگون کا اس کثرت سے آلات بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ علمائے مدرسین یا علم ہیئت کے عام شائق وماہر نہ تھے، بلکہ یہ پیشہ ور کاریگر تھے، ایک ایک سال مین کم از کم چار چار اصطرلاب یا کرے بناتے تھے، جیسا کہ سنہ ۱۰۶۴ھ مین اسکے ایک اصطرلاب اور ایک کرہ کا اور سنہ ۱۰۶۴ھ مین اوس کے چار اصطرلابون کا پتہ ہمکو معلوم ہے،

ڈاکٹر کلو بر کا یہ شبہہ کہ ضیاءالدین یا اس کے کرہ کو راجہ جے سنگھ سوائی کے رصدخانہ سے تو کوئی تعلق نہ تھا، بے بنیاد ہے؛ اس رصدخانہ کی تعمیر محمد شاہ کے حکم سے راجہ جے سنگھ رئیس جے پور وصوبہ دار آگرہ ومالوہ نے سنہ ۱۱۳۷ھ مطابق سنہ ۱۷۲۴ء مین کرائی تھی، یعنی برلن کے کرہ کی ساخت کے چھیاسٹھ برس بعد اور ضیاءالدین کے پہلے بنائے ہوئے کرہ (موجودہ پھلواری ضلع پٹنہ) کی ساخت کے انہتر برس بعد،

وجودِ روح، روحانیین کے نقطۂ نگاہ سے

از

جناب محمد اصغر صاحب، انصاری، بی اے بھوپال

(۲)

اہل سائنس کی تحقیق نے مادیین کے اس نظریہ کو بالکل ہی کمزور کردیا ہے کہ اس عالم میں مادہ اور مادہ کے اشکال کے سوا کچھ نہیں ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم صرف مادہ ہی کے واسطے سے اس کائنات سے باخبر ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ نتیجہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کائنات تمامتر مادہ ہی مادہ ہے یا مادہ اس کائنات کی اصل اول ہے اگر ہم نے ایسا خیال کرلیا تو اس کے معنی تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے کہ ہم اصل محرک کو اسکی علامتوں اور نشانیوں سے خلط ملط کردیتے ہیں، اسکی مثال تو یہی ہوگی کہ ایک مقناطیسی برق پیما کی سوئی کا پھرنا ہی دراصل برق کی حقیقت ہے۔ اگر تم کو ایک لوہے کا ٹکڑا حرکت میں نظر آئے تو اس سے ایک مقناطیسی حلقہ (MAGNETIC FIELD) کا وجود تو ثابت ہوتا ہے، لیکن کوئی صاحب عقل سلیم یہ نہیں کہہ سکتا کہ خود یہ آہنی ٹکڑا ہی کوئی اصل شے ہے یقیناً ہم اپنے آپ کو ایک بہت ہی غلط راستہ پر ڈالدینگے اگر مقناطیس و برق کی حقیقت اور اصلیت کو صرف اسی مادہ کے مظاہر و حرکات ہی تک محدود کردیں لیکن کسقدر افسوس ہے کہ ذی حیات اجسام کے مطالعہ میں ان مادیین کا یہی رجحان پایا جاتا ہے کہ یہ حرکات ہی زندگی کی اصل حقیقت ہیں، حالانکہ یہ تو صرف زندگی کی علامات ہیں، بذاتِ خود زندگی نہیں، ہمارے دماغ کے اندر جو عمل کیمیائی ہوتا ہے اور جو عناصر و سالمات کا باہمی تغیر ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ خیال کا باعث نہیں ہے بلکہ خیال اس تغیر کا باعث و موجب ہے،

گذشتہ بیانات کا خلاصہ یہ ہوا کہ مادہ بذاتِ خود بیجان اور بیکار ہے یعنی وہ خود ان اثرات کا تابع ہے

جو "خلاء" سے اس تک پہنچتے ہیں، اگر اس پر کوئی بیرونی قوت عمل نہ کرے تو نہ اس میں کوئی حرکت پائی جائے گی، اور نہ اپنی کسی حالت و کیفیت کو بدلنے کی وہ کوئی اہلیت رکھتا ہے، جس قدر تغیرات بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ دراصل "خلاء" کی ایک غیر معلوم قوت کا عمل ہے، اسی نتیجہ کی تائید مزید زمین کی کشش ثقل، برقیات، مقناطیسیت اور "نور" کے مطالعہ سے بھی ہوتی ہے، کچھ عرصہ پہلے اگر اہل علم کی کسی مجلس میں یہ دعویٰ کیا جاتا کہ مادہ بذاتہ جامد محض ہے تو شاید اس کا جواب بے التفاتی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، لیکن آج ہر ماہر طبعیات کے لیے یہ ایک روزمرہ کی بات ہے کہ روشنی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ خلا کی ایک غیر معلوم کیفیت کا نتیجہ ہے، برق و مقناطیس اور جذب و کشش کے جملہ مظاہر دراصل کسی ایسی ہی قوت کا اثر ہیں جو مادہ کے واسطہ سے عمل کر رہے ہیں، یعنی آج پورے وثوق اور یقین کیساتھ یہ تسلیم کیا جاتا ہے، کہ مادہ میں زندگی کی حرکت مادہ کا کوئی ذاتی وصف نہیں ہے، بلکہ یہ چیز باہر سے آتی ہے،

آئیے، انھیں متذکرہ بالا نتائج کو ہم اُن مظاہر حیات پر منطبق کریں جو اجسام عضوی میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں، اسی تشریح کے ماتحت مظاہر حیات محض مادہ کے مرہون منت نہیں ہیں بلکہ جسطرح غیر عضوی اور غیر ذی روح اجسام میں مادہ پر ایک ایسی دوسری قوت عامل ہوتی ہے جو اس مادہ سے بالاتر ہے، اسی طرح ہمارے دماغ کے اندر بھی جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ کسی ایسی ہی قوت متصرفہ کے باعث ہوتا ہے جو ہمارے دماغ کے مادی وجود پر عامل و متصرف ہے اور اس بنا پر ہمارے دماغ کے سالمات و جواہر، خلایائے دماغی اور ہمارا نظام عصبی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اُس قوت مدبرہ کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے جس کی حقیقت سے ہم ناواقف ہیں اور جسکا ہم ابتک کوئی علمی نام بھی نہیں رکھ سکے، اس قوت مدبرہ کا براہ راست ہم کو کوئی علم نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ ان مادی مظاہر ہی کے واسطہ سے ہمارے علم میں آتی ہے جنکا ہم نظام عصبی مراکز دماغی وغیرہ میں مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن مادہ کے اوپر عمل کرنے والی قوت کا شعور و ادراک براہ راست ہم کو نہیں ہوتا، یہ چیز تو صرف استدلال و استخراج ہی کی بنا پر سمجھی جا سکتی ہے اور جس طرح ہم ایک برقی میدان کے خواص و کیفیات کو صرف ان اثرات

سے اخذ کرتے ہیں جو کسی برقی بار جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور جسطرح ہم برق اور مقناطیس کی اصلیت کا پتہ انھیں اثرات سے چلاتے ہیں جو اجسام مادی پر مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح ہم اس حیات بخش قوت کے وجود کو ان اثرات ہی سے اخذ و مستنبط کرتے ہیں، جنکو ہم مظاہر زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ قوتِ حیات دراصل بنیادی چیز ہے جس کی بنا پر انسان کی دماغی مشین کی توجیہ وتشریح توکیجا سکتی ہے لیکن خود اس قوتِ حیات کی تعبیر دماغی مشین کے ذریعہ ہرگز نہیں کیجا سکتی، ہمارا یہ میلان کہ یہ مادی مشین ہی اپنے اندر ابتدا و اولیت رکھتی ہے، واقعات وحقایق کی زد میں مفتوح ہوتا جاتا ہے، آج سے پہلے ہم عفونت کا سبب یہ سمجھتے تھے کہ مادہ میں عمل کیمیائی کے باعث تخمیر و عفونت پیدا ہوتی ہے لیکن پاسٹیور (PASTEURE) کی تحقیقات نے اس نظریہ کو بالکل لغو ثابت کردیا ہے، عفونت و تخمیر محض کیمیائی عمل نہیں ہے بلکہ ان تمام مظاہر کا سبب "زندہ جراثیم" کا وجود ہے، انھیں کے باعث یہ خرابی پیدا ہوتی ہے،

۵۰- اسی قسم کے شواہد وتجربات کی بنا پر پروفیسر وہائٹ فیلڈ (WHITEFIE-LD) جیسے مشہور و مستند طبیعی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ تمام کائنات ایک ذی حیات عضو ثابت کیا جا سکتا ہے،

الغرض اصل چیز ہمارے جسم و دماغ کی ساخت نہیں ہے بلکہ وہ قوتِ متصرفہ ہے جو جسم و دماغ کی اس مشین کو چلاتی ہے، اسی قوتِ متصرفہ کو ہم روح کے نام سے پکارتے ہیں، گو ہنوز یہ اصطلاح اہلِ سائنس میں رائج نہیں ہوئی ہے،

گذشتہ بیانات سے اس قدر واضح ہوگیا ہے کہ یہ نظریہ کہ انسانی روح کی حقیقت سوائے مادہ کے اور کچھ نہیں، قطعاً بے بنیاد ہے، اور ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے شواہد و دلائل معدوم ہیں لیکن ہنوز دو ایک شبہات اس سلسلۂ بحث میں ایسے باقی رہگئے ہیں جنکا جواب دینا لازمی ہے،

یہ تسلیم کرلینے کے بعد بھی کہ ہمارے دماغ کی اندرونی ترکیب و ساخت اور اس کا عمل مادی سالمات کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی غیر معلوم چیز کا نتیجہ ہے جسکو قوت، ایتھر وغیرہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے

اور گو اس ایتھر یا قوت وغیرہ کے متعلق یہ نہ کہا جا سکتا کہ وہ مادی ہے، لیکن بہر صورت یہ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح یہ غیر معلوم قوت ہمارے دماغ کے باہر اس عالم ظاہر میں کارفرما ہے، اسی طرح ہمارے دماغ کے اندر کارفرما ہے، اسلئے اس سے یہ نتیجہ صراحۃً اخذ ہوتا ہے کہ ہمارا نفس اور یہ عالم مشہود دراصل ایک ہی جنس سے ہیں یعنی وہی غیر معلوم قوت ہی ان دونوں چیزوں کا باعث اور ان کے عمل وظہور کا موجب ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہم (نفس انسانی) اصلاً اس عالم ظاہر سے مختلف ہیں واقعہ کے خلاف قرار پاتا ہے، اور جب اس استدلال کی بنا پر ہماری اور اس عالم مشہود کی اصل وذات ایک قرار پائی تو پھر یہ محض لفظی نزاع رہ جاتا ہے کہ ہماری اصل مادی ہے یا نہیں، نتیجہ بہر حال ایک ہی ہے، وہ قوت جس طرح کسی غیر معلوم قانون کے تحت میں ہمارے اندر حسیات، جذبات، اور شعور پیدا کرتی ہے، اسی طرح اس عالم مشہود کے دیگر مظاہرات کون وفساد کا باعث بھی ہوتی ہے، اور گو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مادی نظریہ کے ٹوٹ جانے سے ہماری نگاہوں کے بہت سے حجاب بھی دور ہو گئے اور مادیت کے اس طلسم فریب کے شکست نے ہم کو حقیقت کے قریب تر کر دیا، تاہم روحانیین کا اصل دعویٰ ہنوز تشنۂ بحث ہے یعنی اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہماری اصل مادی ہے یا غیر مادی بلکہ تصفیہ طلب امر تو یہ ہے کہ وہ شئے جسکو عرف عام میں روح کہا جاتا ہے، اس کا وجود کوئی مستقل بذات وجود ہے یا نہیں، ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور بقول ڈیکاوٹس "میں سوچتا ہوں اسلئے میں موجود ہوں" اسی سوچنے کے معنوں کو وسیع کر لیجئے، میں محبت کرتا ہوں، میں نفرت کرتا ہوں، میں ایک خواہش رکھتا ہوں، میں ایک ذی ارادہ ہستی ہوں، میرا ارادہ اس دنیا میں بعض تغیرات کا باعث بھی نظر آتا ہے، الغرض یہی وہ اوصاف ہیں جو مجھ میں ایک "شخصیت" یا "ذات" کی نسبت پیدا کر دینے کا موجب ہیں، اس لیے سوال یہ ہے کہ کیا یہ تشخص یا ذات دراصل کوئی ایسی حقیقت ہے جسکو بذاتہ ایک عامل ہستی تصور کیا جاتا ہے، یا یہ محض دھوکا اور فریب ہے اور یہ ہستی ایک دوسری نامعلوم قوت کی (جو خواہ مادی ہو یا نہ ہو) مرہون منت ہے، اور جس طرح بیجان مادہ اس قوت کے اثرات سے معذور ومجبور ہے اسی طرح میں بھی مجبور ومعذور ہوں،

یا بہ الفاظ دیگر یہ کہئے کہ مجھ میں اور بیجان مادہ میں صرف اس قدر فرق ہے کہ مظاہر مادی اور میری شیون نفسی میں صرف اشکال وحالات کا فرق ہے، اصل اصول کا کوئی فرق نہیں،

یہ بحث گذشتہ مباحث سے زیادہ دقیق اور بہت زیادہ پیچیدہ ہے، اس بحث کے سلسلہ میں ہماری توجہ بار بار روح کی حقیقت کی طرف منتقل ہو جائے گی، لیکن اس جگہ یہ واضح کر دینا چاہئے کہ ہمارا مبحث روح کی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ بتا دینا ہے کہ "روح کا ایک مستقل وجود ہے" "حقیقت روح پر" بحث کرنا نہ صرف ہمارے موضوع سے خارج ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آج تک کسی کی بھی اس حقیقت مستور تک رسائی نہیں ہوئی ہے، دنیا کی سب سے بڑی کاشف اسرار کتاب میں جو زیادہ سے زیادہ بات اس بارہ میں کہی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے

قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، بحث ونزاع کا اصلی میدان یہ ہے کہ ایک فریق سرے سے روح کے وجود کا منکر ہے، اور اس نے اپنے انکار کو بعض علمی نظریوں پر مبنی کر رکھا ہے، اور دوسرا فریق اس کے وجود کا مقر ہے اور اس اقرار سے یہ نتیجہ فرعی نکالتا ہے کہ یہ وجود اجسام مادی کیطرح فنا نہیں ہوتا بلکہ جس امر کو ہم موت کہتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس روح نے اپنا لباس ومکان بدل دیا ہے، منکرین روح کے نظریات علمی کی کمزوریاں تو آپ پر ظاہر ہو چکی ہیں لیکن اس سے زائد سے زائد جو نتیجہ مترتب ہوا وہ صرف یہ تھا کہ روح کے انکار پر کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس سے روح کا وجود تو ثابت نہیں ہوتا، سطور ذیل میں ہم کو اس مبحث پر کچھ عرض کرنا ہے،

اجازت دیجئے کہ اس موقع پر بحث کی وسعت کو سمیٹ لیا جائے، سیدھا سادہ سوال یہ ہے کہ انسان بذاتہ "عامل ہستی" ہے یا "معمول" ہے، اور اگر یہ "عامل ہستی" ہے تو اس کا یہ عمل خود اسکے وجود کی اصل حقیقت کے باعث پیدا ہوتا ہے یا یہ کسی بیرونی قوت یا اثر کا معمول ہے، اگر یہ معمول ہے تو پھر اس کا وجود کوئی مستقل شے نہیں ہے بلکہ دیگر اجسام ظاہری ہی کی ایک صنف ہے لیکن اگر یہ "عامل بالذات" ہے اور کسی بیرونی

اثر کا معمول نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ عامل بالذات حقیقت انسان کا اصل اصول ہے، تسمیہ کا سوال محض ثانوی اہمیت رکھتا ہے، خواہ تم اس کو روح کہو یا کوئی اور نام رکھو لو مراد و مفہوم ایک ہی رہیگا یعنی یہی عامل بالذات حقیقت سوچتی ہے، یہی ارادہ کرتی ہے، یہی محبت کرتی ہے، یہی نفرت کرتی ہے، یہی ہمارے اعمال ظاہری و باطنی کا موجب ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر اخلاقی احتساب جاری کیا جا سکتا ہے، یہی سزا و جزا کی مستوجب ہے اور اگر دلائل موجود ہوں تو یہی عامل بالذات "حقیقت، مرنے کے بعد زندہ بھی رہتی ہی،

جب ہم اس مسئلہ پر اس نوعیت کے تحت میں غور کرتے ہیں تو جو چیز سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ قوتِ ارادی ہے، نفس انسانی کا ارادہ ایک ایسی متعارف حقیقت ہے کہ کسی مزید تعریف کی محتاج نہیں ہے لیکن علمی حیثیت سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ارادہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، اگر بقول مادیین "ارادہ" مادی سالمات کے باہمی عمل کا نتیجہ ہے یا ایسی ہی کسی دوسری غیر معلوم قوت کے باعث اس کا ظہور ہوتا ہے، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک انسان اپنے ارادہ پر قادر نہیں ہے، بعض خارجی طبعی مؤثرات کے باعث ہمارے دماغ کے بعض مخصوص سالمات میں باہمی ایک عمل ہوتا ہے اور اس کے باعث ایک خاص ارادہ پیدا ہو جاتا ہے، ہمارے ارادوں کے باہمی اختلاف اور تنوع کی توجیہ بھی یہی کیجا سکے گی کہ وہ سالمات جو ارادہ پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں ان کے ائیتلاف باہمی کی نسبت میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے وہی ہمارے ارادے میں بھی تغیر کا باعث ہوتا ہے، اس توجیہ کو درست تسلیم کر لینے کا ایک بالکل منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب اسباب متقدم کی بنا پر ہمارے ان سالمات میں جو ارادہ پیدا کرنے کا موجب ہیں، ایک عمل کیمیائی ہو گیا تو ہم کو اس ارادے کے تبدیل کر دینے پر کوئی قدرت نہ ہونا چاہئے اور جب ہم ارادہ نہیں بدل سکتے تو ہم ارادے کے نتائج کو بھی نہیں بدل سکتے، ہمارے تمام اعضاء و جوارح ہمارے ارادے کے ماتحت ہیں، تمثیلاً یوں سمجھئے کہ اندرونِ معدہ ہضم غذا کا عمل جاری ہے جس کے باعث کیمیائی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، انھیں تبدیلیوں کے باعث معدہ کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی ضرورت کا احساس دماغ تک منتقل ہوتا ہے،

جس کے باعث ہمارے اعصاب حرکتی میں حرکت پیدا ہوتی ہے، اور ہم پیالہ اٹھاکر پانی پی لیتے ہیں،

اس تمام توجیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس شے کو ارادہ کہا جاتا ہے وہ در اصل "اضطرار" کے سوا کچھ نہیں ہے اور اسی توجیہ کے تحت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ ارادے کے پیدا ہونے کا کوئی نہ کوئی مقدم طبعی (نہ کہ نفسی) سبب ہونا لازمی ہے اور جب وہ اسباب جمع ہو جائیں تو پھر ارادہ بھی ایک مخصوص قسم کا پیدا ہوگا، اور اس میں تغیر نہ ہو سکیگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے تجربات زندگی اس نتیجہ کے مخالف ہیں، ہم میں سے ہر شخص بداہۃً جانتا ہے کہ ہم اپنے ارادوں میں مجبور نہیں بلکہ مختار ہیں، متذکرہ بالا مثال ہی کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ہم اس پر مجبور نہیں ہیں کہ جب ہمیں پیاس لگے تو ہم اضطراراً پانی پی لیں یعنی یہ نہیں ہوتا کہ پیاس لگتے ہی ہمارا ہاتھ کاسۂ آب پر جا پڑے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارا ہاتھ کاسۂ آب کی طرف بڑھ چکا ہے لیکن عین اس وقت ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ اس پانی میں سم ملا ہوا ہے فوراً ہمارا ہاتھ ٹھٹک کر رہجاتا ہے، یہ کیوں ہوا، اگر ہمارا ارادہ در اصل مقدم اسباب کا ایک نتیجہ تھا تو اس میں اس وقت تک تغیر نہیں ہو سکتا تھا جب تک دوسرے ایسے اسباب مترتب نہ ہوتے، جو اس ارادے کی نفی کرکے دوسرا ارادہ پیدا کردیتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر اس کے کوئی دوسرا سلسلۂ اسباب پیدا ہوا ہو ہم اپنے ارادہ کو بدلدیتے ہیں جیسا کہ متذکرۂ بالا مثال سے واضح ہو رہا ہے، تم کہوگے کہ اس مثال میں بھی ارادے کی تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ عین وقت پر یہ آواز کان میں آئی کہ "پانی سم آلود ہے"۔ بیشک یہ ایک سبب ہے، لیکن یہ کوئی طبعی سبب نہیں ہے، بلکہ نفسی سبب ہے اور بحث جو کچھ ہے وہ طبعی اسباب سے ہے، یعنی وہ اسباب جنکی اصل و نوعیت مادی ہو، یہ "آواز" کہ پانی میں سم ہے مادی حیثیت سے اس کے سوا کیا ہے کہ ہوا میں کچھ امواج پیدا ہوئیں اور وہ بذریعہ اعصاب دماغ تک پہنچ گئیں، فرض کرو کہ یہی آواز تمہارا ایک دوست مذاق میں بلند کرتا لیکن اس صورت میں یہ نتیجہ پیدا نہ ہوتا، تمہارے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوتی، درانحالیکہ آواز وہی ہے، امواج ہوا کی نوعیت یکساں ہے اور اس کے باعث ہمارے دماغ میں جو تغیرات کیمیائی وغیرہ پیدا

ہونے چاہئیں وہ سب یکساں ہیں، لیکن نتیجہ مختلف مرتب ہوتا ہے جس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا ارادہ بیرونی اسباب طبعی کا پابند نہیں ہے اور یہی صفت انسانی اس نتیجہ تک ہم کو پہنچاتی ہے کہ انسان بہر حال ایک "معمول" مخلوق نہیں ہے بلکہ بیشتر حالات میں ایک عامل بالذات وجود ہے، ہمارے روزمرہ کے شواہد اس کی تائید کرتے ہیں، ہم اپنے جذبات رذیلہ کے دبانے پر قدرت رکھتے ہیں، ان کی جگہ اعلیٰ جذبات کو اپنے اندر جگہ دیسکتے ہیں، اسی عامل بالذات قوت کی بدولت ہم تہذیب و ارتقائے نفس کا کام کرتے رہتے ہیں، ہماری تربیت کا سارا دار مدار اسی قوتِ انتخاب اور ارادے پر ہے، سزا و جزا کا موجب یہی قوت ارادی ہے اور یہی وہ قوت ہے جو ہم کو مجبور و مضطر مادہ کی صف سے نکال کر ذی اختیار مخلوق کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے،

قوت ارادی سے ملی جلی ایک قوت ہم میں اور ہے، یعنی قوتِ شعور و ادراک، علم الحیات کے مسلمات میں یہ بھی ہے کہ فطرت کسی چیز کو بیکار نہیں پیدا کرتی، اس مسلہ کے تحت میں قوت شعور کی بھی کوئی نہ کوئی ضرورت ہونی چاہئے، لیکن اگر انسان ایک مشین کے سوا کچھ نہیں تو پھر قوتِ شعور ایک بیکار شے ہو جاتی ہے، اگر ہمارے سارے اعمال و افعال دراصل مشین کی طرح ہم سے سرزد ہوتے رہتے ہیں اور انسان ایک ایسی مشین ہے جس کا ہر کیل کانٹا اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہے تو پھر قوت شعور کا وجود قطعاً غیر ضروری ہے جس طرح ایک موٹر گاڑی اپنا سب کام بغیر قوتِ شعور کے انجام دیتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنے تمام اعمال انجام دیسکتا تھا، لیکن قوت شعور انسان کا بہت ہی متعارف وصف ہے اس لئے علم الحیات کے اس اصول کی بنا پر کہ فطرت کسی چیز کو بیکار پیدا نہیں کرتی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے متعلق منکرین روح کا یہ قیاس قطعاً غلط ہے کہ انسان ایک ایسی مشین کے سوا کچھ نہیں جو خلایائے دماغی کے کل پرزوں کے بل پر چل رہی ہے،

ان جملہ مباحث کو یکجا کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان میں قوت ارادہ و شعور کا پایا جانا اسکو مستلزم ہے کہ انسان ایک ایسا وجود نہیں ہے جو تمامتر بیرونی اثرات یا قوتوں کا معمول ہو بلکہ وہ بذات

خود بھی ایک عامل ہستی ہے اور ہمارے مظاہرِ حیات کا یہی وصف (یعنی عامل بالذات ہونا) نمایاں ترین وصف ہے اس وصف کے متعلق جب ہم علمی حیثیت سے تلاش و جستجو کرتے ہیں تو ہم کو کسی دلیل سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ اُن اثرات کے باعث پیدا ہوتا ہے، جو بیرونی دنیا میں حدوث و تغیرات کے باعث معمولاً ہو رہے ہیں بلکہ یہ وصف انسان کا ایسا ذاتی وصف ہے، جس کا تعلق اس عالم مشہود و ظاہر سے معلوم نہیں ہوتا، رہا اس کی حقیقت کا سوال اس کے متعلق پہلے ہی معذوری کا اظہار کیا جا چکا ہے، ہمارا موجودہ موضوع تو صرف اس حد تک محدود تھا کہ ہم یہ بتا دیں کہ انسانی وجود کا راز خود انسان ہی کے عامل بالذات ہونے میں پنہاں ہے، اسی عامل بالذات وصف کیلئے روح کی اصطلاح ہماری زبان میں وضع ہو چکی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اصطلاح کے بارہ میں کوئی نزاع نہیں ہو سکتی،

جہاں تک "وجودِ روح" کی بحث تھی یہ موضوع ختم ہو چکا ہے، اب صرف یہ امر بحث طلب رہ گیا ہے کہ آیا یہ وصفِ انسانی جس کو روح کہا جاتا ہے، ہماری اس ظاہر ظہور موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے یا نہیں،

بقائے روح کے متعلق تفصیلاً کسی دوسرے موقع پر بحث کیجائے گی، لیکن اس مضمون کے خاتمہ پر اشارۃً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ ظاہر ہے کہ انسانی روح کا تعلق ہمارے اس جسم مادی سے نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے ماوراء اور اس پر متصرف ایک ایسی چیز ہے جو خود اپنا مستقل بالذات وجود رکھتی ہے تو پھر یہ گمان کیوں کیا جائے کہ فنائے جسم کے ساتھ یہ بھی فنا ہو جائے گی اور روح ہمارے جسم سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے، اس لیے یقیناً وہ ان حالات و اسباب کی تابع نہیں ہو سکتی جو ہمارے جسم یا اس عالم محسوس و مشہود سے متعلق ہیں، "فنا یا موت" کا جو کچھ بھی ہم کو علم ہوا اور اس کو جس طرح بھی ہم جانتے پہچانتے ہیں، وہ صرف اس جسم یا مادہ ہی کے احوال و کیفیات ہیں، اسلئے یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہوگا کہ جو شے جسم و مادہ کی جنس سے نہ ہو اس پر موت و حیات کا وہ قانون جاری نہیں ہو سکتا جو جسم یا جسمانیت سے متعلق ہے، اس لئے یہ خیال کہ فنائے جسم کے ساتھ ہی فنائے روح بھی لازمی ہے، قطعاً بے دلیل اور بے بنیاد ہے، بلکہ دلائل کا رخ سمت مخالف میں ہے، لیکن بہ ضرورت یہ ضرورت مسلم ہے کہ بقائے روح پر براہِ راست شواہد ہونے چاہئیں جو کسی آیندہ موقع پر بیان کئے جائینگے،

تاریخ خطیب بغدادی

از

نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی

اس دور قحط الرجال کی (جبکہ بقیہ نقبہ رجال علم بھی علمی مجلسون کو خالی کر رہے ہیں) یہ بڑی سعادت ہے کہ وہ علمی اسلامی تصانیف جنکو زمانے کی آنکھیں صدیوں سے ترس رہی تھیں، اور جن کے نام صرف کتابون مین رہ گئے تھے، یکے بعد دیگرے شائع ہوکر دل ودماغ کو منور کر رہی ہیں، تاریخ کے سلسلے کو ملاحظہ کیجئے، مثلاً۔ تاریخ ابن جریر طبری عرصہ ہوا طبع ہو چکی، حافظ ابن عساکر کی تاریخ کے اجزا شائع ہوئے، حال مین تاریخ خطیب بغدادی مصر سے آئی، طباعت کی ان خوبیون کو لیے ہوئے جنپر بیروت کے بہترین مطبعے رشک کریں، اہتمام صحت کیساتھ ضروری تحشی بھی ہے، رجال کی فہرست دی ہے، ہر صفحے پر سطرون کا شمار ہے، اس تاریخ کی چودہ جلدین ہین، کل صفحات ۶۴۲۱ ہین، تعجب ہے کہ مطبع نے ہر جلد کی لوح پر جلدون کی تعداد ۱۲ اور صفحات کی تعداد ۴۸۰۰ لکھی ہے، انتہا یہ کہ چودہوین جلد کی لوح پر بھی یہی اطلاع درج ہے۔

اس تاریخ کا خلاصہ بھی کیا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ میرے یہان ہے، یہ خلاصہ فلسکیپ کے ۲۸۱ صفحات پر ختم ہوا ہے، خلاصہ نگار قاضی ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری حنفی المتوفی ۴۹۱ھ خطیب کے شاگرد ہین، دیباچہ مین تاریخ خطیب کی تعریف کر کے لکھتے ہین کہ طویل زیادہ ہے، اس لئے مین نے منتخب رجال کے (بہ ترتیب اصل کتاب) حالات، شعر، حدیث، حکایت حسب سند خود مختصراً نقل کئے ہین، واضح ہو کہ کل رجال خلاصہ کی تعداد چند صد سے متجاوز نہ ہوگی، منتخب شعر وغیرہ مستقل عنوان ہیں،

بستان المحدثین سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ خطیب کا کوئی حصہ شاہ صاحب کے پیش نظر بھی تھا مگر مطبوعہ

نسخہ کو دیکھکر یہ تعین مشکل ہے، کہ کونسا جزکتاب تھا، عبارت بستان کا ترجمہ یہ ہے،

"تاریخ بغداد خطیب بغدادی کی تصانیف مین سے ہے، اس کے جز ثانی کے شروع مین مناقب بغداد

اور اس مبارک بنیاد کی بزرگی اور اس کے باشندوں کے محاسن اخلاق درج کئے ہیں"

اس کے بعد بغداد کی دونوں نہروں کا جو دجلہ اور فرات ہیں ذکر کیا ہے، بخاری کے حالات شرح وبسط

کے ساتھ لکھے ہیں، محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب کے احوال تک کتاب کا ایک ربع ختم ہو جاتا ہے، پہلی اسناد

اس کی یہ ہے، حافظ ابو بکر نے کہا ہے کہ ہم کو عبد العزیز ابن ابی الحسن القرمیسینی نے خبر دی ، الخ،

اس کے بعد چند شعر مدح بغداد کے نقل کئے ہین جنکا پہلا شعر ہے ؎

فدی لک یا بغداد کل قبیلۃ من الارض حتی خطتی و دیاریا۔

مطبوعہ نسخہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مناقب بغداد جلد اول کے ابتدا میں ہیں، علی ہذا القیاس دجلہ

وفرات کا ذکر، امام بخاری کا ذکر جلد دوم کے آغاز میں ہے، محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب کا ذکر اسی جلد کے تین ربع

ختم ہونے پر شروع ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ملاحظے میں کونسی جلد تھی، بظاہر جلد اول و دوم

کا مجموعہ تھا، اس صورت مین ابن ابی ذئب کے ذکر تک ربع کتاب ختم ہونے کا کیا مطلب ہوگا،

خطیب بغدادی نام احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بغدادی، کنیت ابو بکر، ۳۹۲ھ میں بمقام درزنجان

پیدا ہوئے جو عراق کا ایک قریہ تھا، ان کے والد قریۂ مذکور میں خطیب تھے، اور فی الجملہ علم آشنا، باپ کی تحریص

سے بیٹے نے تحصیل علم شروع کی، گیارہ برس کی عمر تھی کہ والد نے ان کو حدیث سنوانی شروع کر دی تھی، اس کے بعد

خطیب نے اپنی محنت سے اقلیم در اقلیم سیاحت کر کے علم حاصل کیا، جملہ فنون حدیث میں امام وقت ہو گئے، حافظ ابو نعیم

ان کے مشائخ میں ہیں، حافظ ابن ماکولا شاگرد، حافظ ابن عساکر جو بیس شاگردوں کے شاگرد، خطیب کا شمار اکابر

شافعیہ میں ہے، فقہ ابن المحاملی اور قاضی ابو الطیب سے حاصل کی، اس پر اتفاق ہے کہ دارقطنی کے بعد علوم حدیث کا

ماہر ان سے بڑھکر نہیں ہوا، حفاظ کا ان پر خاتمہ ہو گیا، صاحب ہیبت، باوقار اور ثقہ تھے، خط پاکیزہ تھا، کثیر الضبط

فصیح البیان، آواز بلند تھی، جو روایت حدیث کے وقت جامع منصور کے آخری حصے مین سنی جاتی تھی، کسی کریمہ کے سامنے صحیح بخاری مکہ مکرمہ مین پانچ دن میں پڑھی، عمر کا زیادہ حصہ بغداد میں صرف کیا، حاضری حرم کے وقت زمزم پی کر تین دعائیں کیں، بغداد میں اپنی تاریخ کی روایت کریں، جامع منصور میں روایت حدیث کریں، حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوں، تینوں دعائیں قبول ہوئیں،

سفر حج میں شام تک قریب غروب ایک قرآن ترتیل کے ساتھ ختم کر لیتے تھے، اس کے بعد لوگ جمع ہو کر روایت حدیث کی التجا کرتے، خطیب سواری میں بیٹھکر روایت حدیث کرتے (عرب میں سفر شب کو ہوتا ہے) ایک بار کسی نے ان کو دیکھکر کہا تم حافظ ابوبکر خطیب ہو، فرمایا میں ابوبکر خطیب ہوں، حفظ حدیث دارقطنی پر ختم ہو گیا،

چلتے چلتے کتاب کا مطالعہ کرتے جاتے، حنبلیوں کی سختی سے تکلیف اٹھائی، تصانیف کی تعداد ۵۶ ہے (تفصیل ملاحظہ ہو تذکرۂ ذہبی میں)

بہت دولتمند تھے، اہل علم اور علم کی خدمت میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں،

عقائد میں مذہب ابوالحسن اشعریؒ کے پیرو تھے جو بقول امام سبکی محدثین کا مذہب قدیماً وحدیثاً رہا ہے،

ایک بار شیخ ابو اسحاق شیرازی کے درس میں حاضر ہوے، شیخ نے ایک حدیث بحر بن کنیز السقاء سے روایت کی، بعد روایت خطیب کی جانب متوجہ ہو کر کہا ان کی نسبت کیا کہتے ہو، کہا اجازت ہو تو حال بیان کروں، یہ سنکر شیخ ان کے سامنے سنبھلکر شاگرد کی طرح بیٹھ گئے، خطیب نے اس شرح وبسط سے حال بیان کیا کہ اس کو سنکر شیخ ابو اسحاق نے کہا کہ خطیب اپنے وقت کے دارقطنی ہین،

اکہتر برس کی عمر پا کر ۴۶۳ھ میں انتقال کیا، نماز جنازہ ابوالحسن ابن المہتدی نے پڑھائی، شیخ ابو اسحق شیرازی نے جنازہ کو کندھا دیا، حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوئے، رضی اللہ عنہ، وفات سے پہلے کتابیں وقف کر دیں، مال و دولت خلیفہ کی اجازت لیکر تقسیم کر دی، چونکہ کوئی وارث نہ تھا، لہذا متروکہ حق بیت المال ہوتا، اجازت یوں ضروری تھی، (ماخوذ از تذکرۃ الحفاظ ذہبی وطبقات سبکی)

تاریخ خطیب | جیسا کہ اوپر لکھا گیا تاریخ چودہ جلدوں میں ہے، مصر سے ۱۳۴۹ھ میں اشاعت شروع ہوئی، بغداد کے حالات وواقعات آغاز بنیاد سے ۴۶۳ھ تک لکھے ہیں، اور یہ زمانہ (جیسا کہ لوح کتاب پر بھی لکھا ہے) بغداد کی اقبالمندی کا زمانہ ہے، خطیب دیباچہ میں لکھتے ہیں "یہ کتاب مدینۃ السلام کی تاریخ ہے جس میں اس کے آبادی کا ذکر ہے، اس کے کبرا، ساکنین، واردین اور علما کا تذکرہ ہے، اپنے علم ومعرفت کی حد تک میں نے اس میں حالات لکھدیئے ہیں" اس عہد کے دستور کے مطابق حالات وواقعات بسلسلۂ روایت لکھے ہیں، سب سے اوّل بروایت یونس امام شافعی کا قول لکھا ہے، یونس سے پوچھا تم بغداد گئے ہو نفی میں جواب سنکر فرمایا "ما رایت الدنیا" تم نے دنیا نہیں دیکھی،

تاریخ خطیب جسطرح بہترین زمانے کی تاریخ ہے اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معانی استعمال کئے ہیں، عبارت آرائی ومدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح وتعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآرا مقامات مین قوت فیصلہ کی کمی نمایاں ہے محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ منطقیانہ تذبذب پاس نہیں،

روش تاریخ مروجہ طریقہ سے علیحدہ ہے، بجائے خلفار وامرار کو مستقل موضوع قرار دیکر ان کے حالات بیان کرنے کے رجال تاریخ کا ذکر بہ ترتیب حروف تہجی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اپنے اپنے موقع سے خلفار وامرار بھی آجاتے ہیں، رجال کے سلسلے میں ہر فن اور علم کے ماہرین مذکور ہیں، مفسرین ومحدثین وفقہار سے لیکر شعرار و مغنیین واہل صنعت تک سب ہی کا ذکر ہے، اس طرح ۷۸۳۱ مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے،

چونکہ یہ زمانہ مجتہدانہ قوت کا تھا اس لیے اکابرین امت سب ہی اس سلسلے میں آگئے ہیں، اگر وہ حضرات جو بعد کو ہوے ابتدائی چند بابون میں مختلف فقہی مسائل سے محدثانہ وفقیہانہ بحث کی ہے، مثلاً زمین بغداد کی بیع وشرار اور اسکی پیداوار کا کیا حکم ہے، چونکہ حضرت عمرؓ نے سواد (عراق) کی زمین کو مسلمانون کے حق میں وقف فرمادیا تھا اس لیے اس پر مالکانہ قبض وتصرف فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک ناجائز ومکروہ تھا، امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے تقوی کے متعلق کوئی مسئلہ پوچھا تو فرمایا۔ استغفر اللہ! میرے لئے ورع وتقوی کے مسائل پر گفتگو کرنی

درست نہیں اس لئے کہ میں بغداد کی پیداوار کھاتا ہوں، بشر بن الحارث (حافی) ہوتے تو وہ تم کو جواب دے سکتے اصلاً کہ اسی لئے بغداد کی سکونت میں کلام تھا، اس مبحث پر موافق و مخالف دونوں پہلوؤں سے بسیط بحث کی ہے، فیصلہ جواز کے حق میں دیا ہے، دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارض سواد فاتحین میں تقسیم کیوں نہیں فرمایا، اسی سلسلے میں عہد فاروقی کے بند و بست اراضی کا ذکر آتا ہے، جو حضرت عثمان بن حنیف صحابی نے کیا تھا اس بیان میں بند و بست شدہ اراضی کی شرح لگان، اقسام پیداوار۔ تعداد رقبہ سب کچھ آجاتا ہے، لگان صرف قابل زراعت اراضی پر تھا، مکانوں وغیرہ پر ٹکس نہ تھا، دوکانوں پر ٹکس مہدی خلیفہ نے لگایا ۱۶۷ھ میں،

اسی سلسلے میں ایک باب ان روایتوں پر ہے جو عراق کی برائی پر ہیں اور بعد بیان ان کی تنقیح کر کے ضعیف قرار دیا ہے، اس کے بعد مناقب عراق اور اہل عراق کی صفات کا بیان ہے، عراق کی آب و ہوا کے اعتدال کی تعریف ہے، اہل عراق کی عقل و اخلاق کی تعریف ہے، اس کے ساکنین کی خدمت حدیث کا بیان ہے نمونے میں کہ محدثین بغداد کا دامن وضع حدیث اور کذب روایت کی شہرت سے پاک ہے، بخلاف اہل کوفہ و خراسان کے کہ ان کے احادیث موضوعہ اور اسانید مصنوعہ پر جلدیں کی جلدیں لکھی گئی ہیں، ایک قول لکھا ہے "علم حجازی اخلاق عراقی، طاعت شامی جب کسی شخص میں جمع ہوں تو وہ کامل ہے" دوسرا قول اذا خرجت من العراق فالدنیا کلہا رستاق۔ جب تم عراق سے نکل آئے تو ساری دنیا دیہات ہے، وجہ تسمیہ بغداد کا تذکرہ کہ کی ہیطاروس کی مشہور تھی

بغداد اس مقام کا قدیم نام بغداد تھا، بغداد کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ بغ اہل مشرق کے ایک بت کا نام تھا، داد بمعنی عطیہ یعنی بغ دیوتا کا بخشا ہوا، اسی لئے اگلے زمانے میں فقہا اس نام کا استعمال مکروہ خیال کرتے تھے، اب بغداد، بغداد شریف ہے۔ یہ ہے ارباب صلاح اور اہل دل کی گرمی تاثیر، بغداد کو بغدان اور مغدان بھی کہتے تھے (کیا دان اس میں ہندی کا لفظ خیرات کے معنی میں ہے) ایک وجہ تسمیہ میں بغ کو باغ کا مخفف بھی بیان کیا ہے اور داد ایک آدمی کا نام۔ اس صورت میں نام بغداد تھا اس نام کے استعمال میں فقہا کو کراہت نہ تھی،

منصور نے جس موقع پر مدینۃ السلام آباد کیا وہاں اہل بغداد کا ایک مزرعہ تھا جسکا نام المبارکہ تھا

ساٹھ آدمی اس کے مالک تھے، منصور نے ان کو معاوضہ دیکر رضامند کیا اور اسی مقام پر نیا شہر آباد کیا، چونکہ شہر دجلہ کے کنارہ بسایا گیا اور دجلہ کا نام وادی السلام وقصر السلام تھا اس مناسبت سے شہر جدید کا نام مدینۃ السلام رکھا گیا،

خلافت بنی عباس جن اثرات کے تحت بنو امیہ کے مقابلے میں قائم وکامیاب ہوئی ان کا اقتضا یہی تھا کہ اس کا دار الخلافہ و مرکز عراق میں ہوتا، اسی لیے عبد اللہ السفاح اول خلیفہ عباسی (۱۳۲ تا ۱۳۶ھ) نے دار الخلافہ پہلے کوفہ میں بنا کر اس کا نام ہاشمیہ رکھا، ۱۳۴ھ میں انبار کو دار الخلافہ قرار دیکر ہاشمیہ سے موسوم کیا، وہیں سفاح کی وفات وتدفین ہوئی اور وہیں منصور کی بیعت، (معجم البلدان)

مدینۃ السلام کی بنیاد ۱۴۵ھ میں رکھی گئی، ۱۴۶ھ میں شاہی عمارتوں کا اس قدر حصہ تیار ہوگیا کہ منصور مع لشکر اور خزانے کے ہاشمیہ سے منتقل ہوکر وہاں آگیا، سلسلۂ تعمیر ۱۴۹ھ تک جاری رہا، سنہ مذکور میں چار دیواری تیار ہونے پر کام ختم ہوگیا، مصارف تعمیر چالیس لاکھ آٹھ سو درم ہوئے، طریقۂ تعمیر یہ تھا کہ اول تمام ممالک خلافت سے ہر قسم کے کاریگر مثلاً انجینیر (مہندس) معمار، نجار، لوہار وغیرہ فراہم کئے گئے انکی تنخواہیں مقرر کیں، اس طرح ہزاروں آدمی جمع ہونے پر انجینیروں کو اپنا ذہنی نقشہ سمجھایا، انھوں نے اس کے مطابق داغ بیل کی، شہر کا نقشہ مدور قرار دیا گیا، اس اہتمام سے تعمیر شروع ہوکر پانچ سال میں ختم ہوگئی، عجیبت کا اثر یہ تھا کہ ساعت نوبخت منجم نے تجویز کی، یہاں تعمیر کے ضمن میں بہت سے مفید مباحث آجاتے ہیں، مثلاً معماروں وغیرہ کی شرح تنخواہ، انکی مناسبت سے اس عہد میں اجناس کا نرخ، مدینۃ السلام کی پیمایش، اس کے دروازے مساجد۔ پل، مقابر۔ نہریں وغیرہ،

تعمیر کے بعد جو ترمیمیں خود منصور نے کیں ان کا ذکر ہے، بازار پہلے محلات شاہی کے زیادہ قریب تھے، دور ہٹا کر آباد کے گئے، اسطرح کرخ کی آبادی وجود میں آئی، سڑکیں چوڑی کی گئیں، سب سے زیادہ چوڑی سڑک چالیس زراع رہا تھ، چوڑی تھی، تقریباً۔، فٹ کرخ کے بعد رصافہ ولیعہد مہدی کے لیے آباد کیا، یہ ۱۵۱ھ کا واقعہ ہے،

اسی طرح عہد بعہد کے اضافے بیان کئے ہیں، اسی ضمن میں عروج تکلفات کا وہ منظر سامنے آجاتا ہے جبکہ المقتدر کے عہد (۳۰۵ھ) میں سفیر روم کی آمد میں شہر آراستہ کیا گیا تھا، تفصیل کا شوق ہے تو اصل کتاب دیکھو،

ان مقابر کے بیان میں جو علما و صلحا کے لئے مخصوص تھے جداگانہ مستقل باب ہے، سب سے اول مقابر قریش کا بیان ہے جہاں حضرت موسیٰ کاظم کا مزار تھا (یہی مقام اب کاظمین ہے) ابو علی [illegible] کا قول نقل کیا ہے، ما همنی امر فقصدت قبر موسیٰ بن جعفر فتوسلت به الا سهل الله تعالیٰ لی ما احب، جب مجھکو کوئی مشکل پیش آتی اور میں موسیٰ بن جعفر کی قبر پر حاضر ہوکر ان کے توسل سے دعا کرتا تو اللہ تعالیٰ میری مراد برلاتا،

باب حرب کے مقبرے میں امام احمد بن حنبل اور حضرت بشر حافی مدفون تھے، اسی سلسلے میں دو روایتیں ہیں امام احمد بن حنبل کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا کہ ہر قبر پر ایک قندیل روشن ہے، پوچھا یہ کیا ہے؟ جواب ملا تم کو معلوم نہیں؟ امام احمد بن حنبل کی آمد کے سلسلے میں یہ قبریں پر نور ہوگئی ہیں، جو عذاب میں تھے ان پر رحم فرمایا گیا، خاکسار کہتا ہے کہ جوانمرد امام کا استقبال اسی شان سے ہوتا تھا رضی اللہ عنہ،

دوسری روایت حضرت بشر حافی کے وصال کے متعلق ہے، ایک راوی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے ایک پڑوسی کو بعد وفات دو حلے پہنے ہوئے دیکھا، استفسار پر کہا کہ ہماری قبرستان میں بشر بن الحارث دفن ہوئے ہیں، اس سلسلے میں تمام اہل مقبرہ کو دو دو حلے عطا ہوئے ہیں، قدس سرہ۔

حضرت معروف کرخی کی قبر باب الابر کے مقبرے میں تھی، اسکی نسبت لکھا ہے، قبر معروف مجرب بقضاء الحوائج، سو مرتبہ قل ہو اللہ پڑھکر جو دعا ان کے قبر کے قریب کیجائے مقبول ہوتی ہے،

مقبرہ خیزران میں محمد بن اسحٰق مصنف سیرۃ مدفون تھے، نیز امام اعظم ابو حنیفہ ؒ۔

امام اعظم کی قبر کے متعلق امام شافعی کی ایک روایت لکھی ہے، علی بن میمون (شاگرد امام شافعیؒ) روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے شافعی نے کہا، انی لا تبرک بابی حنیفة واجئ الی قبرہ فی کل یوم یعنی زائراً فاذا عرضت لی حاجة صلیت رکعتین وجئت الی قبرہ وسألت اللہ تعالیٰ الحاجة عندہ

فما بتعد عنی حتی تقضی، میں ابو حنیفہ کے توسل سے برکت حاصل کرتا ہوں، ہر روز انکی قبر کی زیارت کو جاتا ہوں؛ جب کوئی حاجت پیش آجاتی ہے دو رکعت نماز پڑھکر ان کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں، دعا کے بعد مراد برآنے میں دیر نہیں لگتی،

یہ بیانات جلد اول کے صفحہ ۲۰ تک چلے جاتے ہیں، اس کے بعد مداین کا ذکر بوجہ قرب تام آتا ہے ذکر مداین تقریب ہوجاتا ہے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر کی جنکے قدوم سے مداین مشرف ہوا، ان حضرات کی تعداد پچاس ہے، اسی شرف کی وجہ سے مداین کا ذکر دیگر قصبات متصلۂ بغداد مثلاً نہروان، انبار وغیرہ سے پہلے کیا ہے،

سب سے اول ذکر ہے حضرت امیر المومنین علی کا، سب سے آخر میں عبد اللہ الحارث کا ذکر مداین بھی باعث ہوا ہے تاریخ خطیب میں حضرات صحابہؓ کے ذکر مبارک کے آنے کا، ورنہ بغداد میں کسی صحابی کی آمد ثابت نہیں؛

حضرت علیؓ کے مدفن کی بحث بسیط ہے، راوی نے امام ابو جعفر محمد بن علی (امام باقر) سے پوچھا کہ حضرت علی کہاں دفن ہوئے تو کہا بالکوفۃ لیلاً وقد عُمّی عنی قبرہ، کوفہ میں شب کو اور مجھکو ان کے قبر کا حال نہیں معلوم، محمد بن سعد کی روایت ہے کہ کوفے میں مسجد جامع کے قریب قصر الامارۃ میں دفن ہوئے،

عبد الملک راوی کا بیان ہے کہ میں حافظ ابو نعیم کے پاس بیٹھا تھا کہ کچھ سوار وہاں سے گذرے، میں نے کہا یہ لوگ کہاں جاتے ہیں، کسی نے کہا علی بن ابی طالب کے مزار کو جاتے ہیں، حافظ ابو نعیم نے میری طرف مخاطب ہوکر کہا کذبوا نقلہ ابنہ حسن الی المدینۃ، یہ لوگ کاذب ہیں ان کو ان کے بیٹے حسن نے مدینہ منتقل کر دیا ہے، شریک کا یہ قول حدیث بنوی میں ہے، نقلہ واللہ الحسن بن علی الی المدینۃ، واللہ حسن بن علی نے ان کو مدینہ منتقل کر دیا، اس مضمون کی اور متعدد روائتیں ہیں،

حافظ ابو نعیم سے خطیب نے روایت کی ہے کہ ابو جعفر الحضرمی اس کے منکر تھے کہ جو مصنوعی قبر کوفے کی مسجد کے [illegible] ہے وہ حضرت علی کی قبر ہو اور یہ بھی کہتے تھے کہ شیعوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قبر کس کی ہے تو وہ سنگسار

کردینگے، یہ قبر مغیرہ بن شعبۃؓ کی ہے، اگر یہ قبر علیؓ کی ہوتی تو میں اسکو اپنا ملجا و ماوی بنا لیتا،

حضرت امام حسینؓ کی قبر کے متعلق لکھا ہے، احمد بن سعید الحمال سے روایت ہے، سألت ابا نعیم عن زیارۃ قبر الحسن فکانہ انکر ان یعلم این قبرہ ۔ میں نے ابو نعیم سے زیارۃ قبر حسین کی بابت دریافت کیا تو ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوا کہ ان کو اس کا علم نہ تھا کہ ان کی قبر کہاں ہے، صحابۂ کرام کے ذکر کے سلسلے میں پانچواں نمبر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذکر کا ہے، اثنائے ذکر میں لکھا ہے، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ قرآن اور شرائع و احکام کی تعلیم کے لیے بھیجا، فبث عبد اللہ فیھم علما کثیرا و فقہ منھم جما غفیرا، کوفہ پہنچکر عبداللہ نے کوفیوں میں بکثرت علم پھیلایا، اور ایک گروہ کثیر ان کی تعلیم سے فقیہ بنا، خاکسار کہتا ہے کہ یہی علم فقہ حنفی کی بنیاد ہے،

حضرت ابن مسعودؓ کے اخلاق اسلامی کی وسعت کا ایک واقعہ اس زمانے میں شمع ہدایت بن سکتا ہے، علقمہ راوی ہیں کہ میں عبداللہ بن مسعود کے ساتھ مداین سے نکلا، راستے میں ایک مجوسی بھی ہمارے ساتھ ہو لیا، آگے چلکر عبداللہ بن مسعود کسی ضرورت سے ہم سے الگ ہوگئے، واپس آئے تو مجوسی دوسرے راستے پر جا چکا تھا، یہ دیکھکر اس راستے پر جاکر اس سے ملے اور سلام کیا، اور فرمایا ان للصحبۃ حقا رفاقت کا بڑا حق ہے، کاش اس واقعے کو سنکر ہمارے سینے کشادہ ہو جائیں،

تراجم صحابۂ کرام کا ذکر صفحہ ۲۱۲ پر ختم ہونے پر کتاب اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتی ہے، اور اہل بغداد کا ذکر شروع ہوتا ہے، خطیب لکھتے ہیں، اس سلسلے میں خلفاء، اشراف، کبراء، قضاۃ، فقہا، محدثین، قراء، زہاد، صلحاء، متادبین، شعرائے اہل مدینۃ السلام کا مذکور ہے، اہل مدینۃ السلام سے وہ مراد ہیں جو وہاں پیدا ہوئے یا دوسری جگہ سے آکر وہاں بسے، ان کا بھی ذکر ہے جو بغداد چھوڑکر دوسری جگہ فوت ہوئے، وہ بھی مذکور ہیں جو اس کی نواح قریب میں ساکن تھے یا وہاں آکر رہے، ان کی کنیت، ان کا نسب، مشہور واقعات، حسب، اخبار نیک، مدۃ عمر، تاریخ وفات، حالات بقدر اپنی معرفت وعلم کے مدرج کئے ہیں، اس کیساتھ انکے متعلق ثنا و مدح وذم و قدح، قبول و رد اور تعدیل و جرح کے جو الفاظ محفوظ ہیں وہ نقل کردیئے ہیں، اور حروف معجم کی ترتیب ملحوظ ہے تاکہ مطلب بآسانی حاصل ہوسکے، بعض اوقات

کسی بلند پایہ کتاب میں کوئی اہم مضمون نظر سے گذرا دوسرے وقت تلاش کیا، بہت وقت صرف کیا، نہ ملا، چھوڑ دیا، حالانکہ ضرورت وحاجت باقی رہی، اسی لئے حروف تہجی کی ترتیب اختیار کی،

نام مبارک سے برکت حاصل کرنے کے لحاظ سے اول ان صاحبوں کا ذکر ہے جنکا نام محمد تھا، اس کے بعد حروفِ تہجی کی پابندی کی ہے، اسی ضمن میں حافظ تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ طالبِ حدیث پر لازم ہے کہ سب سے اول اپنے شہر کی کتبِ حدیث اور ان کے مولفین کے حال سے آغاز کرے، ان کی فہم میں ملکہ تامہ بہم پہنچائے جس سے صحیح وسقیم وغیرہ کی معرفت تامہ حاصل ہوا اس کے بعد دوسرے شہروں کو لے،

رجال تذکرہ کے حالات کے ضمن میں بڑے بڑے علمی دقائق و مباحث مجتہدانہ و محدثانہ قوت کیساتھ حل ہوتے جاتے ہیں، جن سے علما استفادہ کرسکتے ہیں، کاش اہل مطبع مطالب کی فہرست بھی مرتب کرسکتے جس طرح یورپ میں ہوتا ہے،

اسم مبارک سے مسمی مشاہیر کے ۷۰۵ تذکرے تین جلدوں میں آئے ہیں، چوتھی جلد احمد نامی مشاہیر سے شروع ہوتی ہے ہم چند تذکروں کا خلاصہ لکھکر اس عہد کے علمار کا پایۂ بلند دکھانا چاہتے ہیں، خصوصًا یہ کہ یونانیت سے اذہان کے مغلوب ہوجانے سے قبل ہمارے علم وعلما کی کیا شان تھی،

سب سے اول ذکر محمد بن اسحٰق سیرۃ نگار کا ہے، اور یہ (بقول مولف) اس وجہ سے کہ ان سے زیادہ کوئی اور اکبرسن، اعلی اسناد، اقدم موت نہ تھا، ورنہ حروف تہجی کے رعایت کے اعتبار سے محمد بن احمد کا ترجمہ پہلے آتا، واضح ہو کہ محمد بن اسحٰق صاحبِ سیرۃ کے تذکرے کی مناسبت سے تمام وہ مشاہیر جن کے باپ کا نام اسحٰق تھا، اسی سلسلے میں آگئے ہیں، اس طرح یہ سلسلہ ۵۱ سے شروع ہوکر ۹۶ پر ختم ہوتا ہے، ۷۹ نمبر سے محمد بن احمد کا آغاز ہے، آمدم بر سر مطلب،

محمد بن اسحٰق صاحب سیرۃ محمد بن اسحٰق صاحبِ سیرۃ کی کنیت بقول قوی ابوبکر ہے، ابوعبداللہ قول ضعیف ہے، صحابۂ کرام میں حضرت انسؓ بن مالک کو دیکھا، اکابر تابعین سے روایت کی ہے، مثلاً حضرت نافع زہری، قاسم بن محمد، امام محمد باقر، ائمۂ علما نے ان سے روایت کی ہے مثلاً یحیی بن سعید سفیان ثوری، شعبہ، حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ وغیرہم،

بغداد آکر مقیم ہوے، وہیں مقبرۃ الخیزران میں مدفون ہوئے بعض کے نزدیک فارسی الاصل ہیں، بعض کی روایت میں عربی، موسیٰ بن جسار حضرت ابوہریرہؓ کے راوی ان کے چچا تھے، ان کی جرح تعدیل کے متعلق طویل بحث ہے ان کے ثقہ اور صادق ہونے پر اکابر کا اتفاق نقل کیا ہے،

اسی سلسلے میں امام مالکؒ کی جرح کے مالہ وماعلیہ سے محققانہ بسیط بحث کی ہے، کہ محققین کے نزدیک امام مالک کی جرح کا کیا پایہ ہے، تالیف سیرۃ کی وجہ ایک روایت سے یہ بیان کی ہے کہ ابن اسحٰق ایک روز خلیفہ مہدی کے یہاں گئے، اس وقت خلیفہ کے پاس ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، مہدی نے پوچھا جانتے ہو یہ کون ہے، کہا امیرالمومنین کے فرزند ہیں، خلیفہ نے کہا تو ان کے واسطے ایک تاریخ لکھو جس میں آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک کی تاریخ ہو، چنانچہ ابن اسحاق نے سیرۃ لکھی، مہدی نے دیکھکر کہا طویل بہت ہوگئی، مختصر کردو، چنانچہ مختصر کی گئی، آج جو ان کی کتاب موجود ہے، وہ یہی مختصر ہے، پہلا طویل مسودہ امیرالمومنین کے خزانے میں رہا،

یہ روایت بیان کرکے خطیب نے تصحیح کی ہے کہ بلحاظ واقعات یہ روایت صحیح نہیں، ابن اسحٰق خلیفہ منصور کے پاس گئے ہونگے، اور اُن کے پاس مہدی ان کا فرزند ہوگا، مہدی کی خلافت کا آغاز ۱۵۸ھ میں ہوا، ابن اسحاق کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی، بعض نے ابن اسحاق کا سن وفات ۱۵۰ھ اور ۱۵۲ھ بھی بیان کیا ہے،

محمد بن ابراہیم ابوحمزہ الصوفی | محمد بن ابراہیم ابوحمزۃ الصوفی، احمد بن حنبل، بشر بن الحارث (الحافی) سری سقطی کے صحبت یافتہ ہیں، علم قرأت کے عالم تھے، خصوصاً قرآت ابوعمرو کے،

امام احمد بن حنبل صوفی کہکر ان کو مخاطب فرماتے تھے، ماتقول فیہا یا صوفی، سب سے اول اسرار تصوف انھوں نے بیان کئے، چنانچہ خطیب نے روایت کی ہے کہ بغداد میں جس نے سب سے اوّل صفاء ذکر، جمع ہمت محبت، شوق قرب، انس پر کلام کیا ہے وہ ابوحمزہ ہیں، ان سے پہلے کسی نے علی رؤس الاشہاد یہ مسائل بیان نہیں کئے، ۲۶۹ھ میں وفات پائی،

امام بخاری | امام بخاریؒ کے حالات میں تیس صفحے لکھے ہیں، جنمیں حالات کی پوری تفصیل ہے، خلق قرآن کے مسائلے

پر بھی مفصل بحث ہے جس کی وجہ سے امام بخاری کو آخر عمر میں دشواری پیش آئی،

حلیہ ضعیف الجثہ، قد اوسط نہ طویل نہ قصیر، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، عید الفطر کی شب میں ۲۵۶ھ میں وفات پائی، نماز ظہر کے بعد مدفون ہوئے، کسی نے پوچھا کہ طلب حدیث کس طرح شروع کی، فرمایا، دس برس کی عمر میں مجھکو الہام ہوا کہ حفظ حدیث کروں، اس وقت میں نشیبوں میں کام سیکھتا تھا، اسکو چھوڑکر میں تحصیل علم حدیث میں مشغول ہوگیا، الداخلی وغیرہ کے یہاں جانا شروع کیا، ایک روز الداخلی نے کہا سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم، میں نے کہا ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی، انھوں نے جھڑک دیا، میں نے کہا اصل تمھارے پاس ہے تو دیکھ لو، چنانچہ وہ گھر میں گئے، اصل کتاب دیکھ کر باہر آئے، مجھ سے پوچھا روایت کس طرح ہے، میں نے کہا "الزبیر بن عدی عن ابراہیم، یہ سنکر قلم میرے ہاتھ سے لیا اور اپنا نسخہ صحیح کرکے کہا تمہارا بیان صحیح ہے، کسی نے پوچھا اس وقت کیا عمر تھی، فرمایا گیارہ سال کی، سولہ برس کی عمر میں ابن مبارک، وکیع کی کتابیں، حفظ کرکے سمجھنے لگے تھے، اسی سال اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے، حج کے بعد بھائی واپس گئے، خود تحصیل حدیث کے واسطے وہاں رہ گئے، اٹھارہ برس کی عمر میں قضایا، صحابہ و تابعین اور ان کے اقاویل کی تصنیف شروع کردی، اسی زمانے میں چاندنی راتوں میں التاریخ کی تصنیف قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھکر کی، ان کا قول ہے کہ تاریخ میں جتنے نام آئے ہیں سب کے متعلق کوئی نہ کوئی قصہ مجھ کو معلوم تھا، مگر میں نے زیادہ طوالت پسند نہیں کی، فرمایا ہے میں نے تاریخ تین مرتبہ تصنیف کی ہے، تاریخ کی تصنیف کے بعد اسکا نسخہ اسحق بن راہویہ امیر عبداللہ بن طاہر کے پاس لے گئے، اور کہا کیا سحر میں تم کو نہ دکھلاؤں، عبداللہ بن طاہر دیکھکر متعجب رہ گیا،

جامع صحیح بخاری کی تالیف کی بابتہ ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اسحق بن راہویہ کے پاس تھا، بعض دوستوں نے کہا کاش تم سنن النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک مختصر لکھتے، میرے دل میں یہ خیال جم گیا، اور میں نے جامع صحیح کا جمع کرنا شروع کردیا، جامع میں صرف صحیح حدیث لکھی ہے، بہت سی حدیثین طویل الحال ہونے کی وجہ سے چھوڑ

بھی دی ہیں، ہر حدیث غسل کرکے لکھی ہے، تراجم کتاب نا بین المنبر و القبر دو رکعت نماز پڑھکر لکھے ہیں، فریدی کا قول ہے کہ جامع صحیح کی روایت بخاری سے نوّے ہزار آدمیون نے کی اب ان میں سے صرف میں باقی ہوں، رمضان المبارک میں دن میں افطار تک ایک بار کلام مجید ختم کر لیتے تھے، فرماتے تھے ہر ختم کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، مسجد میں کسی نے امام بخاری کی داڑھی میں سے تنکا نکال کر وہیں ڈالدیا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ امام نے لوگوں کی نگاہ بچنے پر ہاتھ بڑھا کر اس کو اٹھالیا اور آستین میں رکھ لیا مسجد سے باہر گئے تو اس کو لیجا کر باہر ڈالدیا آج بہت سے بخاری خواں اس واقعے سے ادب آموز ہو سکتے ہیں،

ایام طالب علمی میں چند روز درس میں حاضر نہ ہوئے، ساتھیوں نے تلاش کی تو معلوم ہوا کہ لباس پھٹ گیا، عریانی کی وجہ سے خانہ نشین ہیں، رفقا نے لباس کا اہتمام کیا تو شامل درس ہوئے ایک ساتھی کا بیان ہے کہ میں ایام سفر میں راتوں کو امام بخاری کو دیکھتا تھا کہ شب میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھتے چقماق سے آگ نکالکر بتی روشن کرتے، حدیثوں پر نشان بناتے، پھر لیٹ جاتے، امام کا قول تھا کہ میرے نزدیک حامد اور ذام (مدح کرنے والا اور مذمت کرنے والا) یکسان ہے،

کئی صفحوں پر امام کے فضائل اور اکابر کی رائیں اُن کے حق میں پھیلی ہوئی ہیں، امام مسلم بن حجاج ان کے سامنے اس طرح بیٹھتے جیسے لڑکا استاد کے سامنے، ایک موقع پر انھوں نے کہا، تم سے بغض سوا حاسد کے کوئی نہیں کرسکتا، تمہارا مثل دنیا میں نہیں، ابو مصعب المدینی کا قول ہے کہ امام بخاری ابن حنبل سے حدیث و فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں، کسی نے سنکر کہا آپنے حد سے تجاوز کیا، کہا اگر تم نے امام مالک کو دیکھا ہوتا تو تم ان کا اور بخاری کا چہرہ دیکھکر بول اٹھتے کہ یہ دونوں حدیث و فقہ میں برابر ہیں، امام بخاری کا ایک قول تھا کہ مجھکو ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حفظ یاد ہیں،

وفات کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ابن آدم طوا ویسی نے روایت کی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر مع صحابہ کے قیام فرما ہیں، میں نے سلام کیا، جواب سے مشرف ہوا، عرض

کی یہاں قیام کیوں ہے، فرمایا محمد بن اسمٰعیل البخاری کے انتظار میں کھڑا ہوں، ان کا بیان ہے کہ چند روز کے بعد امام بخاری کی وفات کی خبر پہنچی، حساب لگایا گیا تو وہی شب تھی جس شب کو خواب میں حضرت سرورعالم کو انتظار میں کھڑا دیکھا تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

امام محمد محمد بن الحسن بن الفرقد ابوعبداللہ الشیبانی، صاحب امام ابوحنیفہ وامام اہل الرائے، دراصل دمشقی ہیں، حرستا نامی قریہ کے باشندے، ان کے والد عراق آئے، محمد واسط میں پیدا ہوئے، کوفہ میں نشو و نما پائی، وہیں امام ابوحنیفہ، مسعر بن کدام، سفیان ثوری وغیرہ سے علم سنا، سماع حدیث بکثرت کیا، نیز امام مالک، اوزاعی اور امام ابی یوسف قاضی سے، بغداد میں سکونت اختیار کی اور حدیث و فقہ کی روایت کی، امام شافعی، جوزجانی وغیرہ نے ان سے حدیث روایت کی ہے، ہارون رشید نے قاضی مقرر کیا، ان کے ساتھ خراسان گئے، بمقام رے انتقال کیا، وہیں مدفون ہیں، اسی روز کسائی نے وفات پائی، ہارون رشید نے کہا میں نے آج لغۃ اور فقہ کو دفن کردیا،

پیدائش ۱۳۲ھ میں وفات ۱۸۹ھ میں عمر ۵۸ سال، اگرچہ حدیث کی سماعت کثیر تھی مگر رائے پر غور کیا، اسی کا غلبہ ہوا، اور اسی میں شہرت پائی،

ان کا قول ہے کہ باپ نے تیس ہزار روپیے چھوڑے تھے، میں نے پندرہ ہزار نحو اور شعر کی تحصیل میں اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تحصیل میں خرچ کردیئے،

امام شافعی نے امام محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں تین برس سے زیادہ امام مالک کے پاس رہا اور سات سو سے زیادہ ان سے حدیثیں سنیں، امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ جب محمد بن حسن مالک سے روایت حدیث کرتے تھے تو کثرتِ سامعین سے گھر بھر جاتا، گنجایش نہ رہتی، ایک موقع پر خلیفہ ہارون رشید کی آمد پر سب لوگ کھڑے ہوگئے، محمد بن حسن بیٹھے رہے، تھوڑی دیر کے بعد خلیفہ کے نقیب نے محمد بن حسن کو بلایا، ان کے شاگرد و احباب پریشان ہوئے، یہ خلیفہ کے سامنے پہنچے تو پوچھا کہ تم فلان موقع پر کھڑے کیوں نہیں ہوئے، کہا کہ جس طبقے میں خلیفہ نے مجھکو قائم کیا ہے اس سے نکلنا میں نے پسند نہیں کیا، اہل علم کے طبقے سے نکلکر اہل خدمت کے

طبقے میں آجانا پسند نہیں آیا،

آپ کے ابن عم (یعنی آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے، جو شخص اس بات کو محبوب رکھتا ہو کہ آدمی اس کے لیے کھڑے رہیں، وہ اپنا مقام جہنم میں بنائے، آپ کی مراد اس سے گروہ علما ہے، پس جو لوگ حقِ خدمت اور اعزاز شاہی خیال کر کے کھڑے ہوں تو یہ دشمن کے لیے ہیبت کا سامان ہوگا، اور جو بیٹھے رہے انھوں نے اتباعِ سنت کیا جو آپ کے خاندان سے لی گئی ہے، اور آپ کے لئے زینت ہے، ہارون رشید نے کہا سچ کہتے ہو، (ابن ابی ذئب کے بیان میں اس سے زیادہ شاندار واقعہ پڑھو گے)

بیس برس کی عمر میں مسجد کوفے میں علم کی تعلیم شروع کر دی تھی، یحیی بن صالح کا قول ہے کہ مجھ سے ابن اکثم نے پوچھا تم نے مالک کو دیکھا ہے، ان سے حدیث سنی ہے، محمد بن حسن کی صحبت میں رہے ہو کون زیادہ فقیہ تھا، میں نے کہا محمد بن حسن مالک سے افقہ ہیں، ابو عبید کا قول ہے کہ کتاب اللہ کا جاننے والا محمد بن حسن سے زیادہ کوئی نہ تھا ربیع بن سلیمان نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر میں یہ کہنا چاہوں کہ قرآن محمد بن حسن کی لغت میں اترا ہے، تو محمد کی فصاحت کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں، مزنی نے یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے کوئی موٹا آدمی محمد سے زیادہ سبک روح نہیں دیکھا، ان سے زیادہ فصیح بھی نہیں دیکھا، جب میں ان کو قرآن پڑھتے دیکھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن انہی کی لغت میں نازل ہوا ہے، ربیع بن سلیمان نے امام شافعی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نے محمد بن حسن سے زیادہ عاقل آدمی نہیں دیکھا، یحیی بن معین کا قول ہے کہ جامع صغیر میں نے محمد بن حسن سے حاصل کر کے لکھی ہے، ربیع کا قول ہے کہ امام شافعی کا مقولہ تھا کہ میں نے محمد بن حسن سے ایک شتر بار کتابیں سیکھی ہیں، مزنی سے کسی نے پوچھا کہ ابو حنیفہ کے حق میں کیا کہتے ہو، کہا، سیدہم، ان کے سردار ہیں، کہا اور ابو یوسف، کہا، اتبعہم للحدیث، ان میں حدیث کے سب سے زیادہ تابع۔ کہا، محمد بن حسن کہا، اکثرھم تفریعا، سب سے زیادہ مسائل نکالنے والے، کہا زفر کہا، احدھم قیاسا، قیاس میں سب سے زیادہ بہتر،

امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ "فقہ کے معاملے میں سب سے زیادہ احسان مجھ پر محمد بن حسن کا ہے"۔ محمد بن حسن

کہ اپنے متعلقین کو یہ حکم تھا کہ مجھ سے دنیاوی کوئی فرمایش نہ کرو، جو ضرورت ہو میرے مختار سے لو، تاکہ میرا قلب فارغ البال رہے اور میں بے فکر رہوں،

ابن داؤد کا قول ہے کہ بصرہ والوں کا فخر چار کتابیں ہیں، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین، نیز کتاب الحیوان، سیبویہ کی الکتاب خلیل کی کتاب فی العین (آنکھ پر) ہمارا فخر ستائیس ہزار مسائل پر ہے، جو حلال حرام کے متعلق ایک کوفی محمد بن حسن کے نتیجۂ عمل ہیں وہ ایسے قیاسی و عقلی ہیں کہ کسی انسان کو ان کا نہ جاننا روا نہیں

ابراہیم الحربی کا قول ہے کہ میں نے احمد بن حنبل سے سوال کیا کہ یہ مسائلِ دقیق تم کو کہاں سے حاصل ہوئے کہا محمد بن حسن کی کتابوں سے،

قاضی ابن رجا نے محمویہ سے (جو ابدال میں شمار ہوتے تھے) روایت کی ہے کہ میں نے بعد وفات محمد بن حسن کو خواب میں دیکھا، پوچھا، ابا عبد اللہ کیا گذری، کہا مجھسے ارشاد ہوا، میں تمکو علم کا خزانہ نہ بناتا، اگر تم کو عذاب دینے کا ارادہ رکھتا، میں نے کہا ابو یوسف کا کیا حال ہے، کہا فوقی، مجھ سے بالاتر ہیں، میں نے پوچھا ابو حنیفہ کہا فوق الطبقات، ابو یوسف سے بہت سے طبقے اوپر،

خطیب نے امام محمد بن حسن کی بابتہ جرح بھی نقل کی ہے جنہیں بعض سخت ہیں، مگر اس قریبًا ڈیڑھ ہزار برس کے زمانے میں، اکابر امت نے جو فیصلہ امام محمد کی عظمت کی بابتہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی جرح قائم نہیں رہ سکتی، خطیب کا قول ہے کہ جو قول آخر میں نقل کروں وہ میری رائے ہے، (تذکرۃ الحفاظ) چنانچہ محمویہ کا خواب جو سب سے اخیر میں نقل کیا ہے، اس سے جرح و تعدیل کا فیصلہ خطیب کی تنقید کے مطابق بھی ہو جاتا ہے،

محمد بن جریر الطبری صاحب التفسیر والتاریخ

ولادت ۲۲۵ھ، وفات ۳۱۰ھ، عمر ۸۵ سال، عراق و شام اور مصر کی خلق کثیر سے علم حاصل کیا، بغداد میں آکر بسے اور وفات تک وہیں رہے، ان ائمہ علما میں سے تھے جن کے قول پر فتویٰ دیا جاتا تھا، اور ان کی معرفت و فضل کی وجہ سے ان کی رائے مانی جاتی تھی، اتنے علوم کے جامع تھے کہ ان کے زمانے میں ان کی نظیر نہ تھی، کتاب اللہ کے حافظ تھے، قرأتوں کے ماہر، معانی قرآنی میں صاحب بصیرت

احکام قرآن کے فقیہ، سنت اور اس کے طرق کے عالم، نیز اس کے صحیح و سقیم و ناسخ و منسوخ کے، صحابہ و تابعین اور انکے بعد کے علما کے اختلافی احکام و مسائل حلال و حرام کے عارف، تاریخ انسانی کے عارف، تاریخ الملوک والامم میں ان کی تاریخ مشہور ہے، ایک کتاب تفسیر میں ہے جس کے مثل کسی نے تصنیف نہیں کی، ایک کتاب کا نام تہذیب الآثار رکھا تھا اپنی نوعیت میں وہ بھی بے مثل تھی مگر تمام نہیں ہوئی، اصول فقہ و فروع میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بہت سے مسائل فقہ میں متفرد ہیں جو محفوظ ہیں، اقوال فقہا میں اپنی رائے سے ترجیح بھی دی ہے، سمعانی کی روایت ہے کہ ابن جریر نے چالیس برس تک روزانہ چالیس ورق لکھے ہیں (کل تعداد اوراق ۵۸۴۰۰ ہوتی ہے، شروانی)

فقیہ ابو طاہر اسفرائینی کا قول تھا کہ اگر کوئی شخص چین تک تفسیر ابن جریر کے لیے سفر کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ سفر نہیں کیا،

یہ بھی روایت ہے کہ ابن جریر طبری نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ آیا تم تفسیر قرآن سے خوش ہو گے، پوچھا کس قدر ہوگی، کہا تیس ہزار ورق، شاگردوں نے کہا ختم ہونے سے پہلے عمریں ختم ہو جائینگی، یہ سنکر تین ہزار ورق میں مختصر تصنیف کی، اس کے بعد پوچھا تاریخ عالم سے خوش ہو گے، جو آدم کے زمانے سے لیکر آج تک ہوگی، باقی سوال و جواب مثل تفسیر کے ہوے، جب تیس ہزار ورق کو شاگردوں نے زیادہ بتایا تو کہا انا للہ ماتت الھمم، انا للہ ہمتیں فنا ہو گئیں،

ابن بالویہ کا بیان ہے کہ تفسیر کا املا ابن جریر نے کیا، میں کاتب تھا، ۲۸۳ھ سے لیکر ۲۹۰ھ تک آٹھ سال میں لکھی، ابوبکر بن خزیمہ نے یہ سنکر تفسیر مجھ سے مستعار لی اور کئی برس کے بعد واپس کی اور کہا کہ اول سے لیکر آخر تک میں نے پڑھی اور روے زمین پر محمد بن جریر سے بڑھکر عالم نہیں ہے،

حنبلیوں نے ان پر مظالم کئے، کسی کو ان کے پاس جانے نہیں دیتے تھے، جو جانا چاہتا تھا اسکو روکدیتے اسی کی وجہ سے حسین تیمی ان سے حدیث نہ سن سکے، کلام مجید اس خوبی سے پڑھتے تھے، کہ ابن مجاہد کا قول ہے، ما ظننت ان اللہ تعالیٰ خلق بشرا یحسن یقرأ ھذہ القرأۃ، میرا گمان نہیں کہ خدا تعالیٰ نے کوئی انسان پیدا

کیا ہو جو کلام اللہ کی اس قرأت کو اسی خوبی و حسن سے پڑھتا ہو، بعد وفات اپنے مکان میں دفن ہوئے، انکی وفات کی بابتہ اذن کسی کو نہیں کیا گیا، تاہم اسقدر مخلوق جمع ہوگئی کہ ان کے شمار اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، مہینوں شب و روز اُنکی قبر پر نماز جنازہ پڑھی گئی،

حلیہ | رنگ پختہ، آنکھیں بڑی بڑی، نحیف الجسم، بلند و بالا، خوش بیان، باوجود پچاسی برس کی عمر کے سر اور داڑھی کے بال کثرت سے سیاہ تھے، اس سے قوت مزاج کا اندازہ کرو، رضی اللہ عنہ،

للہ در الطبری

اذا اعسرت لم اُعلم رفیقی	واستغنی فیستغنی صدیقی
حیائی حافظ لی ماء وجھی	ورفقی فی مطالبتی رفیقی
ولو انی سمحت ببذل وجھی	لکنت الی الغنی سہل الطریقی

محمد بن عبدالرحمن بن المغیرۃ بن الحارث بن ابی ذئب مدنیؒ | پیدائش ۸۰ھ، ابو الحارث القرشی المدنی، عکرمہ مولی ابن عباسؓ، نافع مولی ابن عمرؓ، ابن شہاب الزہری وغیرہم سے حدیث سنی، سفیان ثوری، وکیع، عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان اور ان کے سوا ایک جماعت نے اُنسے حدیث روایت کی ہے، فقیہ صالح متقی تھے، آمر بالمعروف ناہی بالمنکر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جرأت میں ان کی مثال سعید بن المسیب سے دیجاتی ہے، یہی قول امام احمد بن حنبل کا ہے،

امیر المومنین مہدی نے ان کو بغداد بلایا، وہاں روایت حدیث کی، امام شافعی کا قول تھا کہ مجھ کو دو صاحبوں کے نہ ملنے کا افسوس ہے، لیث اور ابن ابی ذئب، امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ابن ابی ذئب ثقہ، صدوق ہیں، مالک بن انس سے افضل تھے، مگر مالک تنقیہ رجال میں زیادہ شدید تھے، ابن ابی ذئب کو اس کی پروا نہیں کہ کس سے روایت کرتے ہیں، ان کا مثل ان کے بعد نہ ان کے بلاد (حجاز) میں تھا اور نہ دیگر بلاد میں، ابن خلاد کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی کا سفر حج کے دوران

میں مسجد نبوی میں ورود ہوا، خلیفہ کے داخلِ مسجد ہوتے ہی تمام حاضرین کھڑے ہو گئے، صرف ابن ابی ذئب بیٹھے رہے، مسیب ابن زبیر نے کہا، کھڑے ہو جاؤ یہ امیرالمومنین ہیں، ابن ابی ذئب نے جواب دیا، انما یقوم الناس لرب العالمین، آدمی صرف پروردگارِ عالم کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، خلیفہ اس جواب کی جلالت سے کانپ گیا، ابن زبیر سے کہا ان کو چھیڑو میرے سر کے تمام بال کھڑے ہو گئے،

ابونعیم کی روایت ہے کہ جس سال منصور نے حج کیا، میں نے بھی اسی سال حج کیا، میری عمر اس وقت اکیس برس کی تھی، ابن ابی ذئب اور مالک بن انس خلیفہ کے ساتھ تھے، غروب کے قریب خلیفہ نے ابن ابی ذئب کو بلا کر اپنے پاس دار الندوہ پر بٹھا کر پوچھا کہ تمھارا خیال حسن بن زید کی نسبت کیا ہے، جواب دیا، انہ لیتحری العدل، وہ انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ سنکر منصور نے دو یا تین مرتبہ پوچھا، میری نسبت کیا کہتے ہو، ابن ابی ذئب نے فرمایا، ورب ھذہ البنیۃ انک لجائر، قسم ہے اس عمارت (کعبہ) کے رب کی تمھارے ظالم ہونے میں شک نہیں، ربیع حاجب نے یہ سنکر ان کی داڑھی پکڑ لی، منصور نے بگڑ کر کہا، اے گندی عورت کے بیٹے چھوڑ دے، اس کے بعد تین سو اشرفی انعام کا حکم دیا،

ابن ابی ذئب نے ایک بار منصور سے کہا،

امیرالمومنین تمھاری رعایا تباہ ہو چکی، کاش تم ان کی مدد مالِ غنیمت سے کرتے،

منصور، تمپر تباہی! اگر میں سرحدوں کی حفاظت نہ کرتا اور لشکر نہ بھیجتا تو تمھارے گھر میں خوب گوشت پکتا،

ابن ابی ذئب، تم سے جو بہتر تھے انھوں نے سرحدوں کی حفاظت، لشکروں کا سرانجام فتوح تم سے زیادہ کیں، اور اسی کے ساتھ آدمیوں کو مالا مال کیا،

منصور۔ تم پر تباہی، وہ کون تھے؟۔

ابن ابی ذئب ۔ عمر بن خطاب،

یہ سنکر منصور نے سر جھکا لیا، المسیب کے ہاتھ میں تلوار تھی، ابن ہشیم کے ہاتھ میں چوب، منصور اُس طرف تو متوجہ نہ ہوا، محمد بن ابراہیم امام کیطرف دیکھکر کہا، ھذا خیر اھل الحجاز، یہ تمام اہل حجاز میں برگزیدہ ہیں،

ابن ابی ذئب تمام شب خضوع وخشوع کے ساتھ عبادت میں مصروف رہتے، اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ کل قیامت قائم ہو جائے گی تو ان کو کچھ کرنا نہ تھا، ایک روز روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے،

ایک مرتبہ شام میں زلزلہ آیا، ایک شامی نے ان سے زلزلے کی بابتہ پوچھا، انھوں نے متوجہ ہو کر حدیث بیان کی، وہ سنتا رہا، جب ختم کر چکے تو کسی نے کہا کھانا کھا لیجئے، (وہ دن افطار کا تھا) کہا آج ملتوی رکھو، اس کے بعد مرتے دم تک تمام عمر روزے رکھے افطار نہیں کیا، تنگ دست تھے، روٹی اور تیل غذا تھی، ایک قمیص تھی ایک طیلسان، اسی میں گرما و سرما کے موسم بسر ہوتے، وکان من رجال الناس صراحۃ وقولا بالحق، سیف بیانی اور حق گوئی میں جوانمردوں میں سے تھے، حدیث کی سماعت بڑی عمر میں شروع کی، جن شیوخ سے اس تاخیر کی وجہ سے نہ مل سکے، ان کے نہ ملنے کا افسوس رہا،

تمام حدیثیں حفظ تھیں کسی کتاب میں لکھی ہوئی نہ تھیں،

امام احمد بن حنبل نے ان کو حدیث میں ثقہ، اور دینداری، تقوی اور حق گوئی میں امام مالک سے افضل کہا ہے، یہ بھی فرمایا ہے کہ ابن ابی ذئب منصور کے پاس گئے، حق کہنے میں ذرا بھی نہ ڈرے، صاف کہدیا الظلم فاشٍ ببابک، تمہارے دروازہ پر ظلم پھیلا ہوا ہے،

۱۵۹ھ میں وفات پائی، ۷۹ برس کی عمر تھی، جعفر بن سلیمان نے پہلی مرتبہ والی مدینہ ہونے پر انکو سو دینار دیئے تھے، ان میں سے دس دینار کو ایک کروی جبہ خریدا، ساری عمر وہی پہنا، انکے بعد ان کے بیٹے نے تیس برس پہنا،

خاکسار کہتا ہے کہ اس فقیرانہ گدڑی میں سے حق کے شعلے نکلتے تھے، خوش خوراکی و خوش لباسی کے دلدادہ وہ شعلے کہاں سے پیدا کریں گے،

(باقی)

خسرو باغ کے مقبرے

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف حیات جلیل الہ آباد،

(۲)

مقبرۂ خسرو

مقبرۂ خسرو ایک کنارے پر واقع ہے، اوس کے بعد کوئی مقبرہ نہین نہ اور کوئی چیز، باغ کے صدر (جنوبی) دروازہ سے وہان تک پہنچنے کے لئے کوئی مستقل راستہ بھی نہین بنایا گیا، آپ کیاریون کے کنارے کنارے یا روشون پر ہو کر نکل جائے "راہ راست برو اگرچہ دوراست" پر عمل فرماتے ہون، تو پھاٹک سے سیدھے سڑک پر ہو کر شاہ بیگم کے روضے تک (۱۰۰ قدم) تشریف لے جائین، اور وہان سے مقبرون اور حوضون کو دیکھتے ہوئے، خسرو کی قبر تک، یہ بھی کچھ دور نہین، مقبرون کے باہم درمیانی فاصلہ شرقاً غرباً تیس تیس قدم ہوگا، سیر و تفریح کا شایق، یا آثار قدیمہ کا دلدادہ چارسو قدم آسانی و خوشی سے طے کر لیتا ہے،

مقبرہ ایک مرتفع پختہ (خشتی) چبوترہ پر بنا ہے جسکی بلندی ڈھائی فٹ (خسرو باغ کے باقی مقبرون سے ایک فٹ زائد) ہے، چڑھنے کے لئے پتھر کی تین سیڑھیان موجود ہین، چبوترہ مربع اور خوب وسیع و فراخ ہے، ہر ضلع انچاس گز، اسی چبوترہ پر پھر ایک اور چبوترہ بلند اور سنگین نقشدار (پتھرون کا) واقع ہے، یہ بھی چوکور ہے، ہر پہلو چھبیس گز، بلندی ایک گز کے قریب، مقبرہ کی عالیشان تعمیر اسی پر ہوئی ہے سب ملا کر کرسی کی بلندی پونے دو گز سے بھی زیادہ ہو گی، بحسب دستور عام خام اور مسطح زمین پر تہ خانہ مین ہے، مقبرہ کے فرش بالائی سے اس کے اندر پہنچنے کے لئے کبھی راستہ رکھا گیا تھا، اب مسدود ہے، قفس زندگی کے ہم جیسے زندانیون کی رسائی وہان تک دشوار ہے، اس لئے اوس کی صورت کشی یا موجودہ حالت کے بتلانے سے معذور ہون،

عمارت مقبرہ ایک منزل کی ہے، مگر دور سے دو منزلہ معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ درون اور محرابون کی قطارین جیسی اوپر ہین، ویسی ہی نیچے بھی ہین، فرق یہ ہے کہ اوپر والے دروازے اور بند دراستے اونچے نہین ہین، جتنے کہ نیچے والے ہین، مگر دونون قطارین ایک ہی بنیاد پر قائم ہین، ہر ضلع یا پہلو مین پانچ پانچ دروازے (ہر سمت) ہین، بلند سادہ وضع کی محرابین ہین، درون کی چوڑائی چھ چھ فٹ ہوگی، کنارون کے دو دو دروازون مین زینہ ہے، دوسرا اور چوتھا ہر طرف کا بند ہے، طرق تعمیر اور محرابین اور نشانات سب یکسان ہین، محرابون کے اندر دیوار مین طاق ہین، ان کے پتھرون پر خط نستعلیق مین، ابھرے ہوئے حروف مین اللہ اللہ کندہ ہے، اسی طرح زیر و بالا محرابون پر نقطہ تماس کے دونون جانب کلمۂ طیبہ خوبصورت دائرون کے اندر کھدا ہے، گنبد مقبرہ کے چارون سمت، بیچ والی محرابون کے اوپر بڑے بڑے طاقچے ہین، ان مین پتھر کی جالیان اندر کی طرف پیوست ہین، آپ اُن کو ایک قسم کی گیلری تجویز کر سکتے ہین،

سامنے کے رُخ دُوسری چبوترہ پر چڑھنے سے، داخلہ کے دروازہ کے آس پاس اخیر کی دونون محرابون مین اوپر جانے کیلئے آمنے سامنے زینے ملین گے، سیڑھیون کی تعداد اُنیس اُنیس ہے، ایک خوش خیال مسلمان کا قیاس ہے، کہ حروف بسم اللہ کی رعایت سے یہ عدد فرد (۱۹) اختیار کیا گیا ہوگا، حفاظت و نگہداشت کے لئے ان زینون مین کواڑ لگا دئے ہین، نیچے شروع مین صرف پتھر کی چوکھٹ باز و ہے، اوپر پہنچکر زینہ کے ختم پر دروازے مین کواڑ ہین، کھولنے پر ایک چھوٹی سی مسطح جگہ اور اس کے بعد ایک قسم کی تنگ کنگنی (کارنس) ملتی ہے، کسی وقت لوگ باحتیاط کھسک کھسک کر محرابون مین آجاتے تھے، اور محرابون کے پاس سے جو گھومتا ہوا زینہ اوپر گیا ہے، اُس پر چڑھ جاتے تھے، یہ مرحلہ خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لئے کواڑ اب بند رہتے ہین، اس انسداد مین ایک مصلحت ظاہری مزار کی حُرمت و تعظیم بھی کارفرما ہے،

چھت کے چارون کونون پر نہایت مختصر بلکہ برائے نام منارے ہین، گوشے خالی نہین چھوٹے لوہے کی سیخون پر مختلف چڑھاؤ اُتار کے کلس پہنا کر ایک مخروطی شکل و ہیئت پیدا کر دی گئی ہے، اس سے کچھ ہٹ کر گنبد کے متصل (دونون کے وسط مین) ایک ایک گومٹی بنی ہے، جسکو بعض لوگ (شاید فن کی زبان مین) گلدستہ کہتے ہین، یہ ضرور خوشنما اور مشرقی تکلفات تعمیر کی علمبردار و یادگار ہے، ہلکے پھلکے چھوٹے چھوٹے آٹھ آٹھ ستونون پر چھجے کے لئے پتھر لگا کر بقدر مناسب باہر نکال کر، اوپر کو

ایک خوبصورت گول قبہ بنا دیا ہو، کم وبیش گولائی، اونچائی، اور مختلف وضع کے کلس اوس کی رونق بڑھا رہے ہین یہ ایک ہوادار خوبصورت نشیمن ہے، مگر وہان تک پہنچنا [illegible] دشوار ی خالی نہین،

مقبرہ پر ایک بہت بڑا گنبد سایہ اَگن اور قبر کے پورے دور پر محیط ہے، یہ عظیم الرفعت برج سقف عمارت کے وسط یا ضخیم دیوار کے اندر والے حصے پر سے اٹھایا گیا ہے جس سے نہ صرف عمارت مین حُسن پیدا ہوگیا، بلکہ دوبالا ہو جاتا ہے، اور اس مقبرہ کو خسرو باغ کی تمام تعمیرات سے ممتاز و شاندار بنا رہا ہے، حسب معمول اس پر بھاری بھاری لٹے تیتے بنے ہین جن کی چوٹی پر کلس ہے،

عمارت تمام وکمال سنگ سُرخ کی ہے، اس کے ساتھ سنگ کھلو یعنی زرد رنگ کے پتھرون کا استعمال واشتمال ایک خاص کیفیت ولطف پیدا کرتا ہے، جالیان سب لال پتھر کی ہین، انکا قدرتی رنگ چونے کی سفید قلعی سے اب بے رونق وبدزیب ہوگیا ہے، اندر چونے اور گچ کی استرکاری ہے، مگر سچ یہ ہے کہ ایسی سنگ تراشی ونقاشی کے نمونے الہ آباد کی بعض پرانی مساجد اور خانقاہون مین بھی نظر آتے ہین، کوئی بے نظیر چیز نہین، دیوار کی چوڑائی ٹھوس ہو یا نمایشی چودہ ۱۴ فٹ ہو گی، یہ بھی تعجب کی بات نہین، جہانگیر کے مقبرہ واقع شاہدرہ (لاہور) کی دیوارون کا آتار پانچ گز سے کم نہین پایا جاتا، مقبرہ مین داخل ہونے کے لئے ہر طرف صرف ایک ایک دروازہ وسط کا کھلا رکھا گیا ہے، باقی دروازے سنگی خوشنما پھولون اور خانہ دار جالیون سے بند ہین، فی الحال صرف دکھن رُخ کا بیچ والا دروازہ قبر تک آنے جانے کے واسطے نامزد ہے، باقی سمتون کے مقفل رہتے ہین، جو کھٹ بازو پتھر کے ہین، اور کواڑ لکڑی کے، ہندوستانی طرز کے مگر معمول سے کسی قدر زیادہ خوش وضعی کے ساتھ بنائے گئے ہین، تقریبًا مربع ہین، بعض حصون پر کہنگی اور دیرینہ سالی نمودار ہے جہم والا یقینًا تبدیل کر کے نیا لگایا گیا ہے، اس مین بھی اصلی نمونے کی پابندی کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے بدنما نہین قرار دئے جا سکتے سُرخ لاکھی رنگ پھرا ہے، اسی جنوبی (وسطی) دروازے کے اوپر محراب کے اندر دو پریان بنی ہین رنگین ہین، بظاہر اسوقت کا درباری لباس زیب تن ہے، ایک کی شبیہ پوری پوری ہے، جو اڑ رہی ہے اور کتاب کی سی کوئی چیز ہاتھ مین لئے ہے دوسری کا صرف چہرہ اور پر بنے ہین، یہ تصویرین کسی اور دروازہ پر نہین ہین، قیاس کہتا ہے کہ چابکدست مصور یا نقاش نے اُس وقت

کی تصویر کھینچی ہے، کہ جسوقت (حسب روایت پٹیر منڈے صاحب) ملک الموت نازل ہوا تھا، اور شاہزادہ قرآن پڑھ رہا تھا، فرشتہ کی صورت اہلِ ہنر پریوں سے مشابہ بناتے ہیں، ہاتھ کی کتاب سے خدا کی کتاب مراد ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ رحمت کا فرشتہ نذر و نیاز درود وسلام کا پیشکش ہاتھ میں لیکر ایصالِ ثواب کی اجازت لینے عالم بالا کو جارہا ہے، کسی ممتاز مسلمان کی گور پر تصویر کا بنایا جانا ایک نئی اور تعجب خیز بات ہے، مگر یہان تو وہی، ع :- سرِ مزار مجاور بھی نوحہ گر بھی ہے،

حجرۂ قبر اندر کی جانب کچھ لبندی تک جہان محرابین ختم ہوتی ہین، چوکور رہتا ہے، جہان سے گنبد کا دور دورہ شروع ہوتا ہے، گول ہوتا گیا ہے، چھت بھی خوب بلند ہے، اس کے نقطۂ علو کے گرد ایک دائرہ اور اس دائرے کے ہشت پہل، ابھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے سلے، اور ملاتے ہوئے دائرے، اور پھر دائرہ بناتے ہوئے رنگین پھول ہین، اُن مین سے متصل ابھرے ہوئے مثلث اور توسین اور پھول بھی بنتے چلے گئے ہین، یہ مثلثون، قوسون، اور دائرون کا لگاتار سلسلہ ایسا ملا جلا چلا آتا ہے، جیسے کوئی پھولون کا جال در جال اوپر سے نیچے تک بچھا ہو، حسرت ہے اور افسوس، کہ ناواقفیت فن وعدم ذہانت ومہارت کے باعث سے میرا قلم اس چیز کی صحیح صورت کشی سے عاجز ہے، اور اس طلسم رنگین کو محض ایک گورکھ دھندا بنا کر چھوڑنا چاہتا ہے، ورنہ اہلِ نظر کا فتوی یہ ہے کہ یہ کام اور یہ رنگ آمیزی مغلون کے عہدِ زرین کی پینٹنگ اور نگار بندی کی بہترین یادگار ہے، اور الہ آباد کی لئے مایۂ ناز،

اس کارنامۂ رنگ وجمال کے نیچے، مگر محرابون کے اوپر چارون سمت اشعار لکھے ہین یعنی تاریخ کا پورا قطعہ گردن مین سیاہی سے مرقوم ہے، مقبرہ کے اندر اُس حصہ پر جو مربع ہے، طاقون پر اللہ، اللہ اور محرابون کے دونون جانب خوشخط نستعلیق مین کلمہ طیبہ لکھا ہے، کندہ نہین ہے،

در و دیوار پر چارون طرف پھول پتے بنے ہین، محرابون اور طاقون کے گرد کے بیل بوٹے بالخصوص دلآویز ہین، سرو شمشاد کے جھاڑ بھی ہین، یہ تمام نقش ونگار ریختہ شوخ رنگ، مصالحون سے بنائے گئے تھے، دست وبرد زمانہ سے اب مٹتے جارہے ہین، مرمت مین عمارت کے حفظ وبقار کا انتظام کیا جاتا ہے، نقوش اور گلکاریون کے قائم اور برقرار رکھنے کا التزام مدِ نظر نہین رہتا، اسی طرح طاقون پر جو کچھ کام تھا یا تکلفات تھے، ان کو صدیون کے امتداد اور چراغون کے

اندھیرے نے تقریباً محو و صحو کر دیا ہی،

سلطان خسرو کی قبر عرف عام مین، اوسکی بے گناہی اور خون ناحق کے سبب سے یار شما ور وانجا مزار کہلاتی ہے،

مسٹر فرنیچ اپنے سفرنامہ مین لکھتے ہین[۱] کہ "مسلمان بادشاہون کی قبرین عام طور پر متبرک مانی اور سمجھی جاتی ہین، ان کا بڑا ادب و احترام کیا جاتا ہے، مسلمانون کی نسل کا یہ ایک طرۂ امتیاز ہے، کہ وہ اپنے بادشاہون کو پیوندِ خاک ہوجانے کے بعد بھی یاد رکھتے، اور بڑے خلوص و وفا کے ساتھ اظہارِ تعظیم و طاعت کرتے ہین" تربت سوا تین فٹ بلند چبوترہ پر واقع ہے جس کا طول و عرض یکسان ہے، ساڑھے تیرہ تیرہ فٹ، تعویذ دو فٹ اونچا ہوگا، آٹھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا سب ملاکر قبر کی بلندی، سوا پانچ فٹ ہوئی، چبوترہ کی بغلی دیوارون مین تین تین دلے خوشنما جدولون سے مصور ہین، قبر پر ایک انچ موٹا، مضبوط چونے کا پلاسٹر ہے جسکو اوس وقت کے طریقہ پر پالش کرکے جلا دی گئی تھی، سنگ مرمر کے مثل چمکنے لگا، مگر مرورِ زمانہ سے اب اس مین وہ آب و تاب باقی نہین رہی، ماند ہوتی جاتی ہے، دھوندلا پن اور خاکستریت چھا گئی ہے، اور دو جگہ مصالحہ بھی اوکھڑ گیا ہے، جس سے یہ کیفیت وحقیقت کھل گئی، ورنہ اس لطیف و نازک صناعی کی بدولت ہر دیکھنے والا سنگ مرمر کا دھوکا کھا جاتا ہی،

تعویذ کے باہر چارون گوشون پر چودہ چودہ انگل کے فصل پر چوکور سوراخ ہین، خادم و مجاور کہتے ہین، کہ کچھ زمانہ پہلے یہان نقرئی ستون نصب تھے، جو زبردستون کی درازدستی کے نذر ہوگئے، اوراق تاریخ شاہد ہین، کہ انھین چاندی سونے کے کھمبون پر مخمل کے زرین شامیانے کھڑے کئے جاتے تھے، پادری منڈی صاحب نے لکڑی کا حظیرہ (کٹہرہ) اور سیپ و سیپیون اور موتیون کی جڑائی یہین دیکھی تھی، آج اسکا نشان بھی باقی نہین، نہ کوئی پتہ دیتا ہے، ہائے ذوق افسوس حسرت سے دیکھتا ہون در و بام کی طرف، خیال رہے کہ اس قسم کی قیمتی نذرون نفیس و باریک دست کاری کی چیزون اور آبنوس پر لطیف و نازک پچی کاری کے چپر کھٹون کا مقابر پر چڑھانا اور لگانا صاحب مقدرت لوگون مین عام طور پر رائج تھا، جس کے قابل دید نمونے شیخ سلیم چشتی کے روضہ (فتحپور سیکری) اور خواجہ نظام الدین کے مزار[۲] (دہلی) پر اب تک موجود اور اپنے اولو العزم

---

[۱] سیاحت مقبول، ص ۹ سفرنامہ مسٹر فرنیچ ص ۱۲، [۲] آثار الصنادید ص ۳۵ مفتاح التواریخ ص ۱۲ تحفۃ الامرا ص ۵۳،

عقیدتمندون کی یادگار ہین،

خسرو کی قبر کے ادھر اودھر (پورب پچھم) نسبۃً چھوٹی چھوٹی دو قبرین شہ نشینون مین ہین، ایک داہنے پہلو مین ہے، دوسری بائین مین، اُن پر کوئی کتبہ نہین جس سے صاحبِ قبر کا پتہ چل سکے، ایک کے تعویذ پر صرف اللہ اللہ کندہ ہے، مجاورون کا بیان ہے، کہ پورب والی قبر مرد (لڑکے) کی ہے، پچھم والی لڑکی کی، ہیئت کذائی بھی اس قول کی تصدیق کرتی ہے کس کا لڑکا تھا اور کون سی لڑکی؟ یہان کیسے پہنچے؟ کیا نام تھا؟ تاریخ کی زبان اس بارہ مین خاموش ہے،

قبر کے دکن ایک تنگ کھڑکی ہے جس کے اندر زمین دوز راستہ بنا تھا، مگر اس وقت بند ہے، غیر مستند و غیر محقق روایت ہے، کہ اکبر اکبر کے قلعہ تک جاتا تھا جسکو بعض مصلحتون سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حل وعقد نے مسدود کرادیا، میرے نزدیک سُرنگ کا قصہ بداہۃً غلط اور ایک بے بنیاد افسانہ ہے، یہ راستہ قبر والے تہ خانے تک پہونچ کر ختم ہوجاتا ہوگا،

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل، ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی یہ مختصر تحریر[۱] جزواً درست ہے کہ مُقبرہ پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہو، اس کے اندر پھولون اور چڑیون کی تصویرین ہین" بے شبہہ مقبرۂ خسرو اپنی وسعت و فسحت اور عالی شان بُرج کے لحاظ سے، یا یون کہئے کہ بہ حیثیت مجموعی اپنے ہمسایہ مقابر بلکہ ضلع الہ آباد کی تمام متفرق شاہی عمارتون سے نمایان اور بلندی و خوبصورتی مین ممتاز ہے لیکن تاج کے ساتھ اوس کی مماثلت کیا ہو سکتی ہے تاج، دنیا کا تاج اوس کے سالہائے دراز بعد بنا ہے، مقبرۂ خسرو کے لئے اوس کی نظیر شاید بے نظیر شہرت و نام کی وجہ سے دی گئی ہو،

خسرو نے بھری جوانی مین جان دی تھی، فن زراعت کے ماہرین کا تجربہ ہے، کہ جس درخت کی شاخین بہار مین اٹھان کے وقت کاٹ دی جاتی ہین، وہ خوب بڑھتا، اور پھیلتا ہے، خسرو کی نو دو پودہ تو برابر قطع ہوتی رہی، بڑھنے نہین پائی، مگر شاید اس کلیہ کے ماتحت مزار خسرو کے خادم و مجاور یا مقبرہ کے محافظ ابھی عمر پاتے ہین، موجودہ خادم

---

[۱] طبع ۱۸۹۳ء جلد اول صفحہ ۱۹۸ نیز صفحہ ۱۴۳ مطبوعہ ۱۸۱۵ء،

اسّی سال کا ایک پیر مرد ہے، اس کا پیشرو اس کا بڑا بھائی سو برس کا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا،

خسرو اور اوسکی مادر گرامی نژاد کے مقابر کے گرد و پیش کی آبادی اور تعمیرات شاہی کا سلسلہ خلد آباد کہلاتا ہے،

گو سلاطین کے متصل بستیون کا یہ نام تبرکاً و تیمناً اور جگہ بھی رکھا گیا ہے، زمان و مکان کی قید نہین، دکن مین اورنگ آباد کے قریب شہنشاہ عالمگیر کے روضہ کے اطراف کو بھی یہی شرف تسمیہ حاصل ہے، سرکاری گزیٹیر کی روایت ہی کہ خسرو کی جلا وطنی کی حالت مین خلد آباد کے سادات نے اوسکی رفاقت کی تھی، مگر اپنے ماخذ یا کسی تاریخ کا حوالہ نہین دیا جس سے ان شرفا کے نامون اور کارنامون کا علم اور عصر حاضر مین ان کے اخلاف کی تحقیق و تصدیق ہو سکے نہین جانتا کہ زمانہ جلای وطن سے لکھنے کا مقصود کیا ہے، خسرو کی پوری زندگی مین کچھ دن بھی ایسے نہین پائے جاتے جن پر اوس کی تعریف صادق آسکے بچپن، اور کچھ جوانی دادا جان (اکبر) کے دربار اور سایۂ شفقت مین امن و امان، عیش و فراغت کے ساتھ گذری، اس کے بعد باپ کی نظربندی و نگرانی مین بھاگا (لڑا) پکڑا گیا، اور عمر بھر قید و حبس مین رہا، خسرو کی تمام کارزار حیات اور کارنامون مین اسکے رفقا اور جان نثارون کی فرد مین جو گرفتار اور بعد ازان لقمۂ نہنگ اجل ہوتے رہے کسی "الاباسی" کا نام نہین ملتا،

کہہ چکا ہون کہ شاہزادہ کی عظمت اور اوسکے روضہ کی حرمت عوام مین اب بھی باقی ہی، برسات کے موسم مین یعنی، اُس کے مزار پر ہر سال میلا لگتا ہے، شیرینی چڑھائی جاتی ہے، رات کو روشنی ہوتی ہے، گانا بجانا بھی، خسرو باغ کا بڑا پھاٹک جو معینہ قواعد و احکام کے بموجب معمولاً بند کر دیا جاتا ہی اس شب کو کھلا رہتا ہے، یہ رات اس پھاٹک اور اوس باغ کیلئے شب برات رونق اور چہل پہل کا باعث ہوتی ہے جنت نصیب شاہزادہ کی بدولت باغ کے دن بھی

---

[۱] ایلورا کے غارون سے پون میل اور دولت آباد سے ساتھ آٹھ میل کے فاصلہ پر حضرت شاہ برہان الدین غریب کا روضہ (مرقد مبارک) مسلمانون کی مشہور زیارت گاہ ہے جس کے پایین دفن ہونے کو نظام الملک آصف جاہ نے بھی سعادت و برکت کا باعث سمجھا تھا، یہ مقام پہلے روضہ کہلاتا تھا، اورنگ زیب خلد مکان دفن ہوا تب سے "خلد آباد" کہلاتا ہے، (مفتاح التواریخ صفحات ۱۴۹۹ و ۴۹۵ و تاریخ آگرہ صـ۹۱) قاموس المشاہیر صـ۱۲۶ ، ۵۳ سلسلہ جدید جلد ۲۳ صفحہ ۹۶ ۔

پھر جاتے ہین، اسی رات مین پھاٹک پر نعل چڑھائے جاتے، کیلون سے جڑے جاتے ہین، پہلے سونے چاندی کے بھی ہوتے تھے، جن کی دیکھنے والی آنکھین اور شہادت دینے والے لوگ اب تک باقی ہین، لیکن کفایت شعاری کے خیال یا حقیقۃً افلاس کے مارے اب عموماً لوہے کے رہ گئے ہین، اس اجتماع مین حسب معمول ہندؤن کی تعداد زیادہ ہوتی ہی یا ہوتی تھی، مسلمانون کی کم خوش اعتقاد مسلمانون کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کا سالانہ عُرس سمجھا جاتا ہی، اور ہندؤن کے دستور یا رسوم کے اعتبار سے ملک کی بول چال مین میلا، بہرصورت حاجت مندان عقیدت کیش خسرو شہید کے بابرکت مزار سے اب بھی منتین مانتے، مرادین مانگتے، اور سب کچھ پاتے ہین، مشعلین اور روشنی ساتھ لاتے اور قبر پر حسب حیثیت نذرین چڑھاتے ہین، رات کے آٹھ نو بجے تک ایک اچھا خاصہ صاف ستھرا، شہری نیز دیہاتی، ملاجلا مجمع دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہی، البتہ یہ جماؤ روز بروز کم ہوتا جاتا ہے، کچھ تو اعتقادات مین فرق آنے کی وجہ سے اور کچھ مخلوق کے اپنے اپنے اشتغالات اور موجودہ اختلافات کے باعث سے،

حتی کہ اب شہر کے اعلیٰ وادنی بھی اس سے کم واقف ہین کہ بھادون مین جب کہ یہان سے پچھم جانب کچھ فاصلہ پر سلیم سرائے کے قریب، ماموں بھانجے کا میلا دیوگیری مین (ہندون کا) لگتا ہے، تو اسی کے ساتھ اسی مہینہ (یعنی اگست) پہلی دو جمعراتون کو یہان بھی ہوتا ہے، مقامی شہرت واہمیت گھٹ جانے کے سبب سے، یا یہ کہ حسب دستور سابق غریب مجاورون کو کسی قدر اہتمام واعلان کرنا پڑتا ہے، پھاٹک پر نقارہ بجایا جاتا ہے، لوگ آجاتے ہین، اور شاہزادہ سے محبت وعقیدت رکھنے والے جمع ہوکر اس کی تربت پر دو پھول چڑھا دیتے ہین، آپ جائین گے اور کتنی ہی مدت گزری ہوگی تو بھی کچھ نہ کچھ باسی ہار اور بکھری ہوئی، پژمردہ وافسردہ کلیان وہان دیکھین گے، گزٹیر والون نے اپنی (میلون کی) فہرست مین اس کو شامل نہین کیا ہے، بعض اور میلے بھی جن کی نوعیت بالکل مذہبی رہ گئی ہے، نظرانداز کر دئے ہین[1]

(باقی)

---

[1] ڈسٹرکٹ گزٹیر جدید جلد ۲۳ صفحہ ۶۶،

تاریخ اسلام کا ایک ورق

۷۶۷ھ مین اسکندریہ کی تباہی اور اوس کے چشمدید حالات

از

مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی، مہتمم تالیفات ریاست رام پور، و سابق رفیق دار المصنفین،

ممالک اسلامیہ پر صلیبی مجاہدین کے حملون کا سلسلہ گیارہوین صدی عیسوی کے اخیر سے شروع ہوکر چودہوین صدی کے وسط تک جاری رہا، اس سلسلہ کی آخری کڑی وہ تھی، جو ۷۶۷ھ مین اسکندریہ پر بلاے آسمانی کی شکل مین نازل ہوئی، اس حملہ کا علمبردار قبرس کا فرمانروا پیٹر اول (PETER -I-) تھا، اس نے قبرس پر ۱۳۵۹ء سے ۱۳۶۹ء تک حکومت کی، انسائیکلو پیڈیا بریطانیکا کے مضمون نگار کا بیان ہے، کہ چودہوین صدی مین صلیبی جہاد کا عام جوش سرد پڑگیا تھا، اور اس وقت مسیحی دنیا مین صرف پیٹر ہی ایک ایسا تاجدار تھا کہ جس نے ارض مقدس کی واپسی کے لئے اپنی تلوار بے نیام کی، اور اس کے وزیر اعظم پی ڈ میزرس (P. DE. MEZIERES) نے تمام یورپ کا دورہ کرکے اس آگ کو بھڑکانا چاہا، اگرچہ سلاطین یورپ اس جنگ مین شریک نہین ہوئے تاہم اس وزیر کی کوشش سے پرستاران صلیب کی ایک بڑی جماعت قبرس مین مجتمع ہوگئی، اور خود شاہ قبرس کی زیر قیادت حضرت مسیح کی ان بھیڑون نے اسکندریہ مین وحشت و بربریت کا وہ ہولناک منظر پیش کیا، کہ اوس کے تخیل سے آج بھی آنکھون مین خون کے آنسو بھر آتے ہین،

اس واقعۂ ہائلہ کے متعلق کتب خانہ مشرقی پٹنہ مین تقریبًا پانچسو صفحات کی ایک ضخیم کتاب موجود ہے ٹائٹل پیج پر کاتب نے اپنی جہالت سے کتاب کا نام مرأۃ العجائب للواقدی" لکھدیا ہے، اس کتاب کا ایک غیر مکمل نسخہ برٹش میوزیم

لندن مین بھی ہے، مگر وہ شاید ہمارے اسی نسخہ کی نقل ہے، یا کم سے کم دونون ایک ہی اصل سے منقول ہین، کیونکہ "مرآۃ العجائب للواقدی" والی غلطی بعینہ وہان بھی موجود ہے، اس کتاب کا ایک تیسرا نسخہ برلن کے کتب خانہ مین ہے، اس مین مصنف کا نام مذکور نہین ہے، لیکن کتاب کا صحیح نام مندرج ہے، خود مصنف نے زیر تبصرہ نسخہ کے صنہ۲ مین اس کتاب کو "الالمام فیما جرت من الاحکام و الامور المقضیۃ من وقعۃ الاسکندریۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے، اگرچہ مصنف کا نام بالتصریح موجود نہین ہے، تاہم وہ اپنی نسبت "النویری" کو اکثر ذکر کرتا ہے، علاوہ برین صنہ۲۳ مین مصنف اپنے ایک قصیدہ مین جسکو اوس نے ایک دوست شیخ شرف الدین ابوحفص عمر بن سید الناس صدر مدرس مدرسۂ مالکیہ فیوم کی تعریف مین لکھا ہے، اپنے کو ابن قاسم کے نام سے مخاطب کرتا ہے، چنانچہ وہ شعر جسمین یہ نام آتا ہے درج ذیل ہے:-

انا ابن قاسم مخلصا لک بالدعاء

یرجو الاجابۃ من الہ الناس،

مذکورۂ بالا تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ درحقیقت یہ وہی کتاب ہے، جس کو حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (جلد ۲ صنہ۱۰ مطبوعہ یورپ) مین تاریخ اسکندریہ کے سلسلہ مین اس طرح بیان کیا ہے:-

وفی وقعتہا الحادثۃ کتاب لمحمد بن قاسم النویری المالکی المتوفی سنہ ۷۶۲ھ

صاحب کشف الظنون نے جو سال وفات درج کیا ہے، وہ یقیناً غلط ہے، کیونکہ صنہ۱۸۳ مین مصنف کا بیان ہے کہ اوس نے اوسکی تصنیف سے ۷۷۵ھ مین فراغت پائی، اس لئے وہ اس وقت تک یقیناً زندہ تھا، علامہ ابن حجر العسقلانی نے الدرر الکامنہ مین محمد بن قاسم النویری کا مختصر تذکرہ دیا ہے، مگر زیر مطالعہ نسخہ مین سال وفات مذکور نہین،

خود اس کتاب سے مصنف کے متعلق جسقدر حالات دستیاب ہوسکے، وہ یہ ہین، کہ ۷۳۶ھ مین وہ اپنا وطن النویرۃ چھوڑ کر تبلاش معاش اسکندریہ پہنچا، اور اوس کو ایک نہایت ہی خوبصورت اور پررونق شہر پاکر ہمیشہ کے لئے متوطن ہوگیا، کتابین نقل کرنا، اور اون کو علم دوست امرار و روسائے شہر کے ہاتھون فروخت کرنا اس کا پیشہ تھا، ۷۶۶ھ مین جب پیٹر اول (PETER-I-) اسکندریہ پر حملہ آور ہوا تو ہمارا مصنف بھی مدافعین کی جماعت مین ایک مرد میدان کی طرح

شریک کارزار ہوا، اہل قبرس کا یہ حملہ بالکل ناگہانی تھا، مسلمان بالکل غافل تھے، اسکندریہ کا حاکم حج کے سفر مین تھا، اس کا قائم مقام نہایت ہی ناتجربہ کار و ناعاقبت اندیش تھا، شاہی افواج بھی یہان سے دور تھین، صرف شہر کے رضا کارون نے ساحل پر ان مسیحی حملہ آورون کو جنہین تمام یورپ کے منتخب نبرد آزما شامل تھے، روکا، تھوڑی دیر تک تیر و تفنگ کی بارش رہی مجاہدین صلیب اپنی آہنی ڈھالون کی پناہ مین کشتیون سے کود کود کر خشکی پر چڑھ آئے، کچھ عرصہ تک دست بدست کی جنگ رہی بالآخر مسلمان پسپا ہوتے ہوئے، شہر کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہوئے، مگر یہ قبرسی فاتحین درندون کی طرح شہر مین گھس پڑے، اور عورت، مرد، بوڑھے، بچے، غرض ہر جاندار یہان تک کہ گھوڑے اور گدھے بھی نہایت ہی بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کردئے گئے، مصنف کا بیان ہے کہ اہل قبرس ایک خاص قسم کی آتشگیر چیز اپنے ساتھ لائے تھے، اس کو چھتون اور دروازون پر ڈال دینے سے فوراً آگ بھڑک اٹھتی تھی، غرض پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کردیا گیا، جو لوگ جان بچا کر بھاگ سکے، اُن مین ہمارا مصنف بھی تھا، یہ اپنے اہل و عیال کو لیکر اپنے قدیم مسکن النویرہ پہنچا، وہان علامہ ابن سید الناس اس سے مل کر اسکندریہ کی المناک تباہی کا حال دریافت کرنے آئے، مصنف نے اون کو اپنا وہ قصیدہ سنایا، جس کا ایک شعر اوپر مذکور ہوا، تھوڑے دنون کے بعد جب کہ سلطان مصر کی افواج قاہرہ نے اسکندریہ مین امن و امان قائم کردیا، اور جو لوگ جان بچا کر بھاگ نکلے تھے وہ پھر وہان واپس آنے لگے، تو ہمارا مصنف بھی اس ویرانہ کی زیارت کے لئے آیا، اوسکو اس اجڑی ہوئی حالت مین دیکھ کر اس کا دل بھر آیا، آنکھون نے خون کے آنسو بہائے، اور دل مضطر نے مرثیہ کی شکل مین اپنے جذبات درد و الم کا اظہار کیا، اوس نے جو مرثیہ لکھا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے، ؎

عاذلی لا تلم دخل ملامی

فعیونی بعد الدموع دوامی،

مرثیہ خوانی سے فارغ ہو کر اس واقعۂ ہائلہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے اوس نے زیر تبصرہ تاریخ مرتب کی، اگرچہ اس کتاب کا موضوع تباہی اسکندریہ کی تاریخ ہے، تاہم ضمناً الشئی بالشئی یذکر کے اصول پر ابتدائے عہد نبوت سے آٹھوین صدی تک کے تمام اہم تاریخی واقعات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ دہرایا گیا ہے، کہ اصل موضوع گم ہو کر رہ گیا ہے، مقصد

سیاسی حالات اور تباہی اسکندریہ کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، ان کو ہم کتاب کے مختلف حصون سے ڈھونڈھ کر ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہان درج کرتے ہین،

اسکندریہ کی تباہی کے وقت سلطان الملک الاشرف ناصر الدین شعبان (۷۶۴ھ - ۷۷۸ھ) مصر کا محض برائے نام بادشاہ تھا، الامیر الاتابکی یلبغا الخاصکی تمام سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا، بحری مملوک سلاطین مصر کے آخری عہد مین اس امیر نے سلطان گر کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اس کے پاس دو ہزار غلام تھے، ان کو جلبان کہا جاتا تھا، یہ نہایت ہی سرکش تھے، اون کے ظلم و تعدی سے اہل مصر عاجز آگئے تھے، اُن کی سرکشی بالآخر یہان تک بڑھی، کہ انھون نے خود اپنے آقا امیر یلبغا کو مار ڈالا اور اوس کے بعد سلطان شعبان پر حملہ آور ہوئے، مگر مصر کی رعایا نے سلطان کی بروقت مدد کی، اور یہ جلبان ۷۶۸ھ مین ایک ایک کر کے مار ڈالے گئے، اب سلطان نے آزادی کے ساتھ عنان حکومت اپنے ہاتھ مین سنبھالی، مصنف اوس کی دادرسی و رعایا پروری کی تعریف کرتا ہے، اور اوس کے طول حیات، دوام حکومت و استحکام مملکت کیلئے نہایت ہی خلوص کے ساتھ بارگاہ رب العزت مین دعا گو ہے،

مذکورۂ صدر تصریحات سے یہ صاف عیان ہے، کہ جس وقت پیٹر اول (PETER - I -) نے مصر و شام کے ساحلی شہرون مین قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس وقت دربار مصر کی حالت نہایت ہی بد سے بدتر تھی، اور غلامون کے ظلم و تعدی سے رعایا تباہ ہو رہی تھی، تاہم اسکندریہ کی تباہی نے مسلمانان مصر کی آنکھین کھولدین، ہر طرف سے انتقام انتقام کی صدائین بلند تھین چنانچہ اس واقعہ ہائلہ کے بعد امیر یلبغا نے مصر و شام کے سواحل مین جنگی جہازات کی تعمیر کے لئے متعدد کارخانے کھلوائے اور مصنف کے بیان کے مطابق صرف تھوڑے ہی عرصہ مین ایک سو پچاس جہازون کا ایک مضبوط بیڑا تیار ہو گیا، یہ ہر قسم کے سامان و اسلحۂ جنگ سے آراستہ تھا، اس مین دو قسم کے جہازات تھے، ایک کو "طرائد الخیل" اور دوسرے کو "شوانی الغزو" کہا جاتا تھا، بحری فوج اور ملاحون کی تعلیم و تربیت اندلس کے ایک امیر البحر ابراہیم التازی کے سپرد تھی، الغرض جب یہ بیڑا پوری طرح مکمل ہو گیا، تو دریائے نیل مین امیر یلبغا کے سامنے اون کی نمایش ہوئی، ان جنگی جہازات کے بالمقابل خشکی پر بری افواج بھی صف بستہ تھین، اس طرح تری اور خشکی مین ایک ساتھ

جان بازی وبہادری کے کرتب دکھائے جارہے تھے، دریائے نیل کے کنارے لاکھون تماشائیون کا مجمع تھا، اُن مین جزیرہ کیتلان کے سفرا بھی موجود تھے، واقعۂ اسکندریہ کے ساتھ دربار مصر مین یہ اس لئے حاضر ہوئے تھے کہ اہلِ قبرس کی سفاکی پر صاحب کیتلان کی طرف سے بیزاری کا اظہار کرین، مصنف نہایت ہی جوشِ مسرت کے ساتھ اسلامی شان وشوکت کے اسی پُر رعب منظر کا نقشہ کھینچتا ہے، اور کہتا ہے، کہ کیتلان کے سفراء پر اس نمایش کا بہت اچھا اثر پڑا ہوگا، انھین معلوم ہوگیا ہوگا، کہ صرف ایک سال کی مدت مین سکندریہ کی تباہی کا انتقام لینے کیلئے مصر کیسی عظیم الشان تیاریان کرین

انتقامی تیاریون کے ساتھ ساتھ تعمیر اسکندریہ کی تجدید کا کام بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا تھا، یہ خدمت امیر سیف الدین الاکز والی اسکندریہ کے سپرد تھی، اس نے بہت جلد اس کھنڈر کو پھر عروس البلاد بنا دیا، اہل شہر کی راحت وآسایش کے لئے کشادہ سڑکین نکالی گئین، مساجد ومدارس کی ترمیم وتعمیر عمل مین آئی، مریضون کے لئے ایک عظیم الشان مارستان (اسپتال) کی بنیاد ڈالی گئی، اس مین ہر وقت ہر قسم کی دوائین مہیا رہتی تھین، مریضون کی عافیت وآسایش کا خاص انتظام تھا، مصنف کا بیان ہے کہ اس زمانہ مین مصر کا سب سے بڑا مارستان قاہرہ کا "المارستان المنصوری" تھا، مگر اسکندریہ کا یہ جدید مارستان اپنی عظمت مین اس سے بھی بڑھ گیا، اس کا نام "المارستان الصلاحی" تھا، بلدیہ کیطرف سے سڑکون اور گلیون کی جاروب کشی، اور صفائی کے بہترین انتظامات عمل مین آئے، سڑکوں پر روشنی کا ایسا عمدہ انتظام کیا گیا کہ سارا شہر رات کو بقعۂ نور نظر آتا تھا، شہر کی حفاظت وقلعبندی کی طرف بھی خاص توجہ منعطف کیگئی، شہر پناہ کی دیوار مستحکم کیگئی، اسکے دروازون پر تیر اندازون کے لئے لکڑی کے برج بنوائے گئے، اور ان کو گائے اور گدھے کی کھالون سے منڈھا گیا، مصنف کا بیان ہے کہ کھالون سے منڈھے جانے کے باعث یہ دشمن کی آتشباری سے محفوظ ہوگئے تھے، شہر کے دروازون مین لوہے کے پھاٹک لگوائے گئے، یہ ایک مشین کے ذریعہ سے جب ضرورت ہوئی، اوپر اٹھا لئے جاتے، اور جب ضرورت ہوتی نیچے گرا دئے جاتے، اس قسم کے دروازے تعاقب کرنے والے حریف کو شہر مین داخل ہونے سے روکنے کے لئے زیادہ مفید خیال کئے گئے تھے، شہر کی مشرقی سمت مین خندق نہین تھی، اور اسی طرف سے اہل قبرس شہر مین گھس آئے تھے، چنانچہ اس تجدید تعمیر کے وقت اس جانب بھی ایک بڑی خندق کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا گیا، اس سلسلہ مین مصنف

نے چند جدید اختراعات کا ذکر کیا ہے، اون کو ہم یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں،

آتشبار شعل اسکندریہ کے دار الصناعۃ الحربیہ نے ایک خاص قسم کا شعل ایجاد کیا تھا، جو رات کو روشنی کا کام دیتا تھا، اور ضرورت کے وقت دشمن کے جہازات یا مکانات پر آتشباری کرکے اون کو خاک سیاہ کرسکتا تھا،

المکاحل یہ چھوٹی توپچی کے مانند ایک چیز تھی، بارود کی قوت سے یہ دور دور تک تیراندازی کا کام دیتی تھی،

رقائق الحدید یہ لوہے کے نہایت ہی تیز کانٹے تھے، ضرورت کے وقت ہانڈیوں میں بند کرکے منجنیق کے ذریعہ سے دشمن کے راستوں میں پھینکے جاتے تھے، یہ اس کثرت کے ساتھ راستہ میں پھیل جاتے، کہ دشمن کو قدم بڑھانا دشوار ہوجاتا،

قدور النفاط قدور ہانڈیوں میں ایک خاص قسم کا تیزابی مادہ جو پیشاب سے تیار کیا گیا تھا، بھرا جاتا، اور ان کو دشمن پر پھینکا جاتا، اس کا ہر قطرہ دشمن کی بصارت چشم و قوای دماغی کو زائل کرنے کیلئے کافی تھا،

المدافع الکبار خاص قسم کی بڑی بڑی توپیں بنوائی گئی تھیں، ان سے نہایت ہی تباہ کن پھٹنے والے گولے پھینکے جاتے تھے، یہ گولے آتشگیر اشیاء کی آمیزش کے ساتھ سنگریزوں سے تیار کئے جاتے تھے، ہم اون کو اوس زمانہ کا بم کہہ سکتے ہیں،

غرض ان جارحانہ و مدافعانہ تیاریوں کی تکمیل کے بعد ۷۶۶ھ میں سلطان الملک الاشرف نے اسکندریہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مفتخر کیا، امیر الامراء استبغا نے تمام اہم مقامات کا ملاحظہ کرایا، سلطان نے ایک دربار منعقد کرکے ان لوگوں کو جنھوں نے اسکندریہ کی تجدید تعمیر و قلعہبندی میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی تھی، خلعت و انعام سے مشرف فرمایا، امیر البحر ابراہیم التازی کو علاوہ خلعت فاخرہ کے خاص اپنی سواری کا ایک قیمتی گھوڑا اعطا فرمایا، اور مصر کے جنگی بیڑے کا افسر اعلیٰ مقرر کرکے اہل قبرس کی سرکوبی کی خدمت سپرد فرمائی،

ابراہیم التازی ایک تجربہ کار بحری مجاہد تھے، عمر کا بیشتر حصہ سمندر کی لڑائیوں میں بسر ہوا تھا، قبرس پر چڑھائی کرنے سے پہلے دشمن کی دیکھ بھال کے لئے ایک متجسسانہ بحری مہم لے کر روانہ ہوئے، صرف سات سو جانباز سپاہی اور دو جہازوں کا ایک مختصر بیڑا ساتھ تھا، دشمن کو دھوکے میں رکھنے کے لئے ان لوگوں نے فرنگی جہازرانوں کی پوشاک اختیار کی تھی، یہ مختصر بیڑا تقریباً ایک ماہ تک بحر روم میں چکر کاٹنے کے بعد واپس آیا، اور بہت سے قیدی اور مال غنیمت ساتھ لایا، اس

کامیاب بحری مہم اور مصر کی غیر معمولی جارحانہ تیاریون نے تمام جزائر بحر روم مین ہلچل برپا کردی، اہل قبرس سے اظہارِ بے تعلقی کے لئے جنیوا، روڈس، اور بندقیہ (وینس) کے وفود آنے لگے، اور اون کی طرف سے مصالحت کی کوششین ہونے لگین، اہل قبرس اسکندریہ کے ہزارون عورتون اور بچون کو پکڑ کرلے گئے تھے، اُن مین سے اکثر بحر روم کے مختلف جزائر و ملحقہ ممالک مین غلامانہ زندگی بسر کررہے تھے، چنانچہ سلطان نے ہر ملک کے وفد کو یہی جواب دیا، کہ جب تک وہ تمام اسیران اسکندریہ جو اُن کے ملک مین پائے جاتے ہون، واپس نہین آئین گے، اوس وقت تک مصالحت کی گفتگو ناممکن ہے، سلطان کے اس اصرار کے باعث تھوڑے ہی عرصے مین قیدیون کی ایک بڑی تعداد واپس آگئی، مصنف ان قیدیون کو نام بنام بیان کرتا ہے، اور بعضون سے مل کر اون کی گرفتاری کے قصے اور جن ممالک مین اون کو رہنے کا اتفاق ہوا، وہان کے حالات دریافت کرکے کسی قدر تفصیل کے ساتھ سپرد قلم کرتا ہے، اُن سے ظاہر ہوتا ہے، کہ زنانِ فرنگ کی بے حجابی و مردانہ وشی آٹھوین صدی ہجری مین بھی تقریباً ویسی ہی تھی، جیسی کہ اس موجودہ دورِ مدنیت مین ہے، مصنف کو اہلِ فرنگ کی بے شرمی و بے حیائی کے بہت سے قصے سنائے گئے ہین، مگر وہ ان کو قصداً نظرانداز کرتا ہے،

جن ممالک نے اسیرانِ اسکندریہ کو واپس کیا تھا، وہان کے تجار کو مصر و شام کے سواحل پر تجارت کی اجازت دی گئی، اور امیر سیف الدین طغیہ ابن العوضی سلطان کی طرف سے تحائف لیکر فرمانروایانِ بندقیہ (وینس) جنیوا اور کیتیلان کے دربار مین، بھیجے گئے، اُن سے جو معاہدے ہوئے اون مین ایک شرط یہ بھی تھی، کہ وہ سلطانِ مصر کے مقابلہ مین اہل قبرس کی اعانت نہین کرین گے، سلطانِ مصر کی ان تیاریون سے اہلِ قبرس نہایت خائف ہوئے، اور کیتیلان کے سفیر کی معرفت مصالحت کے لئے نامہ وپیام شروع کیا، سلطان کی طرف سے وہی اسیرانِ اسکندریہ کی واپسی کی شرط یہان بھی پیش ہوئی، چنانچہ خاص قبرس مین جسقدر قیدی رہ گئے تھے، سفیر کیتیلان کی وساطت سے وہ بھی واپس آگئے،

غرض ان مصلحانہ کوششون کے ساتھ ہی مصر کی سیاسی حالت مین بھی کچھ ایسا قدرتی انقلاب رونما ہوا کہ

قبرس کی چڑھائی کا خیال ہی جاتا رہا، امیر یلبغا کی شہادت اور اس کے غلامون کے ہنگامہ و فساد نے سلطان کو اپنے ملک کی حالت درست کرنے پر مجبور کر دیا، دوسری طرف دربار قبرس بھی سیاسی ہیجان سے محفوظ نہین تھا پطیر اول (PETER- I-) کے خلاف ملک مین سازش ہوتی ہے، اور ۱۳۶۹ء مین وہ مارا جاتا ہے، اس کی جگہ پر اس کا بھائی جس کو مصنف برزز کے نام سے یاد کرتا ہے، تخت نشین ہوتا ہے، اس کی مصالحانہ کوششین بالآخر مصریون کے جوش انتقام کو ٹھنڈا کر دیتی ہین،

اوپر جو کچھ لکھا گیا، وہ اصل موضوع کتاب کا ایک مختصر خلاصہ ہے، مگر جیسا کہ ہم کہہ آئے ہین، یہ کتاب درحقیقت اسلامی تاریخ کا کشکول ہے، تاریخ اسلام کے متعلمین و محققین اس سے بہت کچھ فوائد حاصل کر سکتے ہین، زیر تبصرہ نسخہ نہایت ہی قدیم ہے یعنی ۸۰۹ھ کا لکھا ہے،

دیوان نظامی کے قلمی نسخے

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڑھی،

رسالہ معارف (نمبرا جلد ۲۳) مین بعنوان بالا ہم نے دیوان نظامی کے پانچ قلمی نسخون کا ذکر کیا تھا جنمین سے بوہار، رامپور، اور باڈلی کے کتبخانون کے قلمی نسخون کی نقلین ہم نے حاصل کرلی ہین، اس سلسلہ مین ہم یہان اس دیوان کے دو اور نسخون کا تذکرہ کرتے ہین جنمین سے ایک کتب خانۂ خدیویہ مین محفوظ ہے، اور دوسرا مطبع نولکشور (لکھنؤ) کے کتب خانہ مین موجود ہے، اور جس کی ایک نقل ہماری استدعا پر مطبع مذکور کے مہتم صاحب نے ہمارے لئے بہم پہنچائی ہے

۱- نسخۂ خدیویہ کتبخانۂ خدیویہ مصر (بسلسلہ درب الجامیز) کے فارسی مخطوطات کی فہرست مین اس نسخہ کے متعلق لکھا ہے

"دیوان نظامی، تالیف المولیٰ نظام الدین ابی محمد جمال الدین یوسف بن موید الگنجوی الاویسی المتوفی سنۃ ۵۹۷ اولہ ۔ یا اشرف البریۃ یا سید الوریٰ الخ نقلم تعلیق بخط بیر احمد بن اسکندر تم تحریرہ فی سنۃ ۹۲۳ وھو باللغۃ الترکیۃ"[1]

اس تحریر سے جہان یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ یہ دیوان انہی نامور شاعر نظامی کا ہے، جو گنجوی کہلاتے ہین وہان یہ امر بھی کچھ کم تعجب خیز نہین ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان مین ہے، اگر واقعی یہ دیوان شیخ نظامی کا ہے تو شائقین ادب فارسی کے لیے یہ ایک نیا انکشاف ہوگا کہ نظامی ترکی زبان بھی جانتے تھے بلکہ اس مین شعر کہتے تھے، لیکن یہ آج تک ان کے کسی سوانح نگار یا تذکرہ نویس نے نہین لکھا اور نہ کہین نظامی کے کلام مین اندرونی طور پر اسکی کوئی

[1] فہرست الکتب الفارسیۃ والجاویۃ المحفوظۃ بالکتبخانۃ الخدیویۃ المصریۃ ص ۴۸۹،

شہادت ملتی ہے، علاوہ ازین آغازِ دیوان کے عربی شعر سے، جو عربی قصیدۂ نعتیہ کا مطلع معلوم ہوتا ہے، یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ اس دیوان مین ان کے عربی اشعار بھی ہونگے،

ہم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا یہ دیوان فارسی زبان مین ہے، یا ترکی مین، اپنے ایک کرمفرما مصر کے عیسائی کتب فروش الیان سرکیس کو لکھا تھا کہ وہ اس دیوان کے متعلق ضروری معلومات سے ہم کو آگاہ کرین، چنانچہ انھون نے جواب مین لکھا ہے کہ

"یہ کتاب فارسی زبان مین ہے، ترکی مین نہین ہے، اس دیوان کے ۵-۶ صفحے الٹنے کے بعد اشعار ذیل ملتے ہین:-

نظامی نظمکی نورسہ نظامی گنجہ — اوتردی کنج لحدون کہ نم نیک مقال

دکل براہل معانی قتسندہ دون تنج — محدث نم ایدر بو حال اہل مقال

طاب چتر سخن وا مکن ولا اطناب — کہ تا بخاطر عاطر رسد گزند ملال"

ظاہر ہے کہ ان مین سے پہلے دو شعر ترکی زبان مین اور تیسرا شعر فارسی مین ہے، غالباً ہمارے کاتب کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوان مین صرف چند اشعار ترکی زبان مین پائے جاتے ہین، لیکن اگر تمام دیوان اسی زبان مین ہو تو پھر صاحبِ فہرست کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان مین ہے، ہم نے موجودہ مخطوطات مین ان اشعار کی تلاش کی مگر بے سود، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کے دیوان کے مختلف مجموعے ہین، چنانچہ عوفی نے اپنے تذکرہ مین جو غزلین نظامی کی نقل کی ہین، وہ بھی ہمارے ان مخطوطات مین نہین پائی جاتین، اسی طرح ہرمن ایتھے نے بھی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی (بوڈلین لائبریری) مین لکھا ہے کہ "آگرہ کا مطبوعہ (سنہ ۱۲۸۳ھ) نسخہ دیوان بوڈلین کے قلمی نسخہ سے بالکل مختلف ہے، اس مین وہ قصائد اور غزلیات نہین پائی جاتین جو اس نسخہ مین موجود ہین" اس سے دولت شاہ اور لطف علی آذر کے اس قول کی تائید ہوتی ہے، کہ "خمسہ کے علاوہ نظامی کے قصائد و غزلیات، قطعات و رباعیات کے بیس ہزار اشعار ہین"؛ اس کی مزید تائید اس امر

سے بھی ہوتی ہے کہ حال مین ادارۂ مجلہ ارمغان دطہران) خمسۂ نظامی کا ایک صحیح اڈیشن شائع کررہا ہے، اور اسکی عنقریب شائع ہونے والی پہلی جلد شیخ کی مثنوی مخزن اسرار کے علاوہ ان کے دیوان پر مشتمل ہوگی، جس کے اشعار کی مجموعی تعداد ۹ ہزار ہوگی، حالانکہ موجودہ مخطوطات مین اشعار کی مجموعی تعداد بارہ تیرہ سو سے زائد نہین ہے،

۲۔ نسخۂ نولکشور | یہ نسخہ مطبع نولکشور کے کتب خانہ مین موجود ہے، دیوان کے آخر مین یہ عبارت درج ہے،

"دیوان حضرت اولیائی نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ، در دار الخلافت شاہجہان آباد بہ اشتیاق تمام بہ سرعت بتاریخ دوازدہم ماہ اگست ۱۸۳۵ء روز دوشنبہ بخط پنڈت دھرم نراین اختتام پذیرفت"

اس نسخہ کی نقل ہم کو ملگئی ہے، اور اس طرح کل چار قلمی نسخون سے مقابلہ و تصحیح کے ساتھ دیوان نظامی کا ایک صحیح متن ہم نے ترتیب دینا شروع کر دیا ہے، جو امید ہے کہ انشاء اللہ عنقریب تیار ہو کر مطبع مین جائیگا۔

مثنوی مولنا روم کا ایک عارفانہ انتخاب

مولانا عبد الماجد دریابادی اڈیٹر سچ فرماتے ہیں،

"مثنوی معنوی کو اللہ نے عجیب و غریب مقبولیت دے رکھی ہے، اور اس سلسلہ میں تازہ ترین اور نہ صرف تازہ ترین بلکہ بہترین انتخاب وہ ہے جو معز نغز کے نام سے مولنا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے قلم سے نکلکر ابھی شائع ہوا ہے، کتاب فاضل مرتب کے ذوق سلیم و حسن انتخاب وسلیقۂ ادب کا روشن ترین آئینہ ہے، صاحب مثنوی علیہ الرحمہ کے اس پھیلاؤ کو اس طرح سمیٹنا کہ لطف بیان کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے آسان بات نہ تھی، دریا کو کوزہ میں بند کرنا حقیقۃً ایسے ہی موقع کیلئے لکھا گیا ہے، ہر جزو مثنوی کا خلاصہ پوری لطافت کیساتھ آگیا ہے، کوئی ضروری بات بھی چھوٹنے نہ پائی ہے، اور تسلسل و ربط بیان اس طرح قائم کہ پڑھنے والے کو کہیں سے پتہ نہیں چلنے پاتا کہ اس کے سامنے اصل تصنیف نہیں ہے،

کتاب علاوہ طلبا کے عام شائقین کیلئے بھی ہر اعتبار سے مفید اور دلچسپ ہے، چھ ابواب میں تقسیم ہے، کاغذ کتابت طباعت تقطیع سے ظاہری محاسن کے اعتبار سے پسندیدہ ہے، اور سفر و حضر میں ہر جگہ رکھنے کے قابل ہے، قیمت عہ کچھ بھی نہیں ہے (پتہ، دائرہ مطبوعات عالیہ، قصبیا جونپور)

تلخیص و تبصرہ

کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟

رومن حروف جنہیں یورپ کی اکثر زبانیں لکھی جاتی ہیں، اُن کی اصلیت کے متعلق اتنا تو معلوم ہے، کہ ان کو فنیشین قومیں مشرق سے مغرب کو لائیں، لیکن یہ مسئلہ اب تک پوری طرح ثابت نہیں، کہ وہ کس مشرقی خط کی نقل ہیں، دسمبر ۱۹۳۲ء میں ایک فرنچ اہل قلم نے فرانس کی مجلس علمی میں اپنی ایک نئی تحقیق پیش کی ہے، جس میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ رومن حروف مصر کے مقدس حروف سے ماخوذ ہیں، جنکو ہیروگلیفی کہا جاتا ہے، اس ہیروگلیفی کے لفظی معنی بھی مقدس حروف کے ہیں،

صاحب قلم مذکور کا ذہن اس نظریہ کی طرف بالکل اتفاقی طور سے متوجہ ہوا، پرانی چیزوں کی ایک دکان پر اس کا گذر ہوا، تو وہاں اس کو ایک ایسی کتاب ملی جس میں ہر قوم کے، ہر زمانہ کے، خطوط کے نمونے دیئے گئے تھے، اس کتاب میں اس نے فنیشین حروف کا باب کھولا، تو اس میں اس کو ۲۲ حروف ملے، لیکن بعض حروف کی شکلوں کے سمجھنے میں اس کو بڑی دشواری پیش آئی، تو اس نے فنیشیہ کی دوسری ہمسایہ قوموں کے حروف سے ان کا مقابلہ کیا، تو ان فنیشین حروف اور قدیم مصریوں کے حروف میں جنکو ہیروگلیفی کہا جاتا ہے، عجیب وغریب مشابہت معلوم ہوئی، پھر اس نے مصری حروف میں سے ایک ایسے حرف کی تلاش کی جو فنیشین خط کے پہلے حرف "الف" کے مقابل ہو، شکل وصورت، اور آواز وتلفظ دونوں لحاظ سے، تو اسکو ایک حرف ایسا ملا، جو مصری خط میں "مرد" کی طرف اشارہ کرتا ہے، اب اس نے فنیشین خط کے دوسرے حرف "ب" کا مقابل تلاش کیا،

تو اس کو وہ مصری حرف ملا، جو "عورت" سے عبارت ہے، اب یہ مسئلہ حل ہوا، کہ ان حروف کا سرا "مرد" ہے جو دنیا کے ہر کاروبار کی جڑ ہے، اور اس کے پہلو میں "عورت" ہے جو انسانیت کے تمام مشکلات میں اسکے ساتھ ہوتی ہے، اتنی بات معلوم ہونے پر یہ خیال سامنے آیا، کہ ان حروف کی ترتیب زبردستی کی نہیں ہے بلکہ ایک منظم و باترتیب خیال پر مبنی ہے، ان دو حرفوں کی دریافت نے تحقیق کے اس طالب کو تیسرے فنیشین حرف کی طرف پہنچایا اور وہ "جیم" ہے، جو ہیروگلیفی میں بل کا اشارہ ہے، چوتھا حرف جو "دال" ہے، وہ دو چلتی پھرتی ٹانگوں کو بتاتا ہے، اور پانچواں جو "ذ" ہے، وہ گھڑیال کی تصویر پیش کرتا ہے، جو بطریق تشبیہ خود مصر کی طرف اشارہ ہے، اب اس محقق نے ان پانچوں حرفوں کو جب ایک دوسرے کے پہلو میں رکھا، تو اس کو اور مصری آثار قدیمہ کے ہر عالم کو معلوم ہوا کہ ان پانچ حرفوں میں ایک پورا فقرہ پوشیدہ ہے جو حسب ذیل ہے،

"مرد اور عورتیں جوے کی قید سے مصر سے نکلے ہیں"،

اس سے معلوم ہوا، کہ یہ حروف کسی مرتب خیال پر اور ان کی ترتیب کسی حکیمانہ منطق پر مبنی ہے، اور یہ اس قصہ کے رموز ہیں، جو بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کو ظاہر کرتا ہے،

باقی فنیشین حروف کے ہیروگلیفی ماخذوں کی حسب ذیل تشریح بھی ملی ہے،

واؤ	"Y"	سورج جس کے نیچے لکڑی کا ایک عمود ہے، جس سے مراد "پورب کیطرف"
ز	"Z"	وہ عضو جو پھیپھڑے کی تمام شاخوں کو ملاتا ہے، جس سے مراد "اکٹھا ہوئے"،
ح	"H"	عبادتگاہ، اس سے مراد "عبادتگاہ" ہے،
ط	"T"	مختلف راستوں کا ملنا، یعنی "شہر میں"،
ی	"J"	روتی ہوئی آنکھ جس سے مراد "رونے لگے"
ک	"K"	بط جو اپنے دونوں بازو پھیلائے ہے، جس سے مراد "وہ اٹھے"

ل	L	ایک شیر جو حملہ کے لیے تیار ہے، جس سے مراد "بہادر بن کر"
م	m	پہاڑیوں کا سلسلہ جس سے مراد "قوم"
ن	n	ایک شخص دوڑتا ہوا، یعنی "چلا"
س	s	تین ٹیڑھی لکیریں، اس سے مراد "دریا کو عبور کیا"۔
ع	o	ایک دائرہ جس کا کچھ حصہ سایہ میں ہے، اس سے مراد "پورے چاند کے وقت"
پ	P	کمان جس سے مراد "لشکر"
ص		شکار کے آلات جس سے مراد "وہ جو اس کے پیچھے تھا"۔
ق	q	ایک برتن جس سے پانی بہ رہا ہو، جس سے مراد "ڈوب گئے"
ر	R	کھلا ہوا منھ، جس سے مراد "سبھوں نے گایا"۔
ش	S	ایک ہندسی کمان جس سے مراد "جلال اور بزرگی"
ت	T	تاروں بھرا آسمان جس سے مراد "خدا"

اس نظریہ سے یہ منکشف ہوتا ہے، کہ یہ فنیشین حروف مصری قدیم حروف میں بنی اسرائیل کے مصری قصے کی پوری زبانی روداد ہیں، "س"

اسلامی فن تعمیر

"اسلامی فن تعمیر" پر رسالہ الہلال مصر میں اختصار کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کی تلخیص حسب ذیل ہے۔

اثناے فتوحات میں جن سلطنتوں کو عربوں نے اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا، ان کے اختلاط اور میل جول سے ایک نیا اسلامی فن تعمیر پیدا ہوا، جس میں اگرچہ کلّی طور پر یکرنگی پائی جاتی ہے، لیکن مختلف شہروں کے اثر سے اس کے جزئیات میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کے لحاظ سے اس کی پانچ قسمیں قرار دیجا سکتی ہیں،

مصری اور شامی طرز تعمیر سلطنت امویہ کے زمانے سے شام میں فن تعمیر کے نہایت نادر نمونے قائم ہوئے، جنمیں

دو چیزیں اس عہد کی بہترین یادگاریں ہیں، ایک تو قبہ صخرہ جس کو بیت المقدس میں عبدالملک بن مروان نے بنایا تھا، اور دوسری جامع اموی جسکو ولید بن عبدالملک نے تعمیر کیا تھا، ان دونوں کے اندر کی دیواروں میں پچہ کاری کا کام بنا ہوا ہے، جو بیزنطی صناعوں کی دستکاری کا بہترین نمونہ ہے،

مصر میں اسلامی فن تعمیر کی ابتداء احمد بن طولون کے زمانے سے ہوئی، اور جب سے اس نے جامع طولونیہ کو اینٹ سے بنا کر چونہ سے پختہ کرایا، اور اس پر نہایت نادر نقش ونگار بنوائے، مصریوں نے چونہ کی گچ بنانے میں نہایت کمال پیدا کر لیا،

فاطمیین کے عہد سے مصر میں ایک جدید تمدن کا آغاز ہوا، اور انھوں نے اپنی یادگار بہت سی مسجدیں چھوڑیں، جو حسن وجمال میں فن تعمیر کی بہترین مثال ہیں، اور ان میں سب سے قدیم اور قابل ذکر جامع ازہر ہے، لیکن جامع سلطان حسن جو قلعہ کے پاس ہے، وہ مصر کے آثار اسلامیہ کا سرتاج ہے،

مغربی طرز تعمیر یہ قسم اندلس اور بلاد مغرب یعنی تونس، جزائر اور مراکش کی اسلامی عمارتوں پر شامل ہے، اس وقت تک بلاد مغرب اور اندلس میں جو اسلامی عمارتیں باقی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ مشہور جامع قیروان اور تونس کی جامع زیتون ہیں، اور یہ دونوں مصری اور شامی طرز تعمیر سے متاثر ہیں۔

مغرب میں مسلمانوں کے طرز تعمیر کی قابل فخر یادگار غرناطہ کا قصر حمرا ہے، جس کی شہرت صرف حسن تعمیر ہی کی بنیاد پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس میں اسکے باغات اور ان فواروں کو بھی بہت بڑا دخل ہے جو درندہ جانوروں کی شکل پر بنے ہوئے ہیں،

ایرانی طرز تعمیر ایران خلفاے راشدین کے زمانے میں مفتوح ہوا، لیکن خلفائے راشدین بلکہ خلفاے بنو امیہ اور بنو عباس کی بھی کوئی تعمیری یادگار ایران میں موجود نہیں ہے، البتہ دسویں اور اگیارھویں صدی ہجری یعنی صفویہ کے زمانے میں دارالسلطنت اصفہان میں جامع اصفہان تعمیر ہوئی،

اسلامی عہد میں ایران کی اکثر عمارتوں کی دیواریں کاشانی لوحوں سے مزین تھیں، جس میں ایرانیوں نے نہایت کمال پیدا کیا تھا، اور اس میں نہایت چمکدار رنگ شامل کئے تھے،

ایرانیوں کو نہایت قدیم زمانے سے قالین بافی میں بھی کمال حاصل تھا، اور اب تک یہ کمال باقی ہے، اسلامی فنون لطیفہ میں ایران جیسے مرقع تصاویر بھی نہیں پائے جاتے جس میں آدمیوں اور پرندوں کی تصویروں کے ذریعہ سے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں،

ترکی طرز تعمیر ترکی طرز تعمیر ایرانی اور بیزنطی طرز تعمیر کا مجموعہ ہے، یعنی ترکوں نے ایرانیوں سے الواح کاشانی کے ذریعہ سے دیواروں کے مزین کرنے کا طریقہ سیکھا ہے، اور بیزنطی شکل کی عمارتیں تعمیر کی ہیں،

تمام عثمانی مسجدیں کنیسہ اباصوفیہ کی طرح، ایک وسیع مربع شکل کی ہیں، جن کے اوپر ایک بڑا قبہ بنا ہوا ہے جو چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے قبوں سے گھرا ہوا ہے،

عثمانیوں نے اول اول مسجدوں کے تعمیر کی یہی شکل اختیار کی تھی لیکن بعد کو ان قبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جو بیچ کے قبہ کو محیط تھے اور ستونوں میں بھی قبے بنائے جانے لگے، پھر ان تمام قبوں کے گرد بھی بہت سے قبے بنائے گئے،

عثمانیوں نے قسطنطنیہ میں جو مسجدیں بنائی ہیں، ان میں جامع بایزید اور جامع سلیمانیہ نہایت ممتاز ہیں،

ہندوستانی طرز تعمیر یہ طرز تعمیر شمالی ہند میں پیدا ہوا اور وہ دو عظیم الشان زمانوں پر مشتمل ہے،

(۱) ایک تو مغلوں سے پہلے کا زمانہ جس میں اسلامی فن تعمیر قدیم ہندوستانی فن تعمیر سے متاثر تھا،

(۲) دوسرے مغلوں کا زمانہ جس میں ایک خاص طرز تعمیر ایجاد ہوا،

ہندوستان کے شہروں میں اسلامی عمارتیں سب سے زیادہ فتح پور سیکری، آگرہ اور دلی میں پائی جاتی ہیں، بالخصوص آگرہ میں جہاں اعتماد الدولہ کا مقبرہ اور تاج محل موجود ہیں،

"ع"

کوہ نور

جنرل آف انڈین ہسٹری میں کچھ عرصہ سے شاہجہان کے عہد کی تاریخ باقساط شائع ہو رہی ہے، اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار

جناب عبدالعزیز، بیرسٹر نے "کوہ نور" کی تاریخ پر ایک محققانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے، عہد مغلیہ کے مورخین کے سامنے یہ مسئلہ ابتدا سے زیر بحث رہا ہے کہ جو ہیرا آج "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہے، اسکی گذشتہ تاریخ کیا ہے، اس باب میں تین مختلف جماعتیں قائم ہو گئی ہیں اور ہر جماعت کے نزدیک "کوہ نور" اس ہیرے سے مختلف ہے جو دوسری جماعت میں اس نام سے موسوم ہے یعنی اس بحث میں تین مختلف ہیرے پیش کئے جاتے ہیں اور ہر گروہ اپنے ہیرے کو "کوہ نور" ثابت کرنا چاہتا ہے، مقالہ نگار موصوف نے ہر فریق کے بیانات و دلائل پیش نظر رکھنے کے بعد فیصلہ کی کوشش کی ہے، لیکن جیسا کہ موصوف نے اعتراف کیا ہے، اس مسئلہ پر کوئی آخری فیصلہ نہیں دیا جاسکتا، بہرحال موضوع کی دلچسپی کے خیال سے ہم اس مضمون کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

"جن تین ہیروں پر کوہ نور کا گمان ہوتا ہے ان میں پہلا وہ ہے جسے بابر کا ہیرا کہتے ہیں، بابر نامہ کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہیرا بابر کے پاس کیونکر آیا:-

"سلطان ابراہیم کی شکست میں گوالیار کا راجہ بکرماجیت مارا گیا، اسوقت بکرماجیت کا خاندان آگرہ میں تھا، ابراہیم کی شکست کے بعد ان لوگوں نے آگرہ سے بھاگنا چاہا لیکن ہمایوں نے وہاں پہنچکر ان کا راستہ روک دیا، اسیران لوگوں نے ہمایوں کے سامنے بہت سے جواہرات اور قیمتی چیزیں پیش کیں، ان میں وہ مشہور ہیرا بھی تھا جو علاء الدین دکن سے لایا تھا، اسکی قیمت کا اندازہ یہ ہے کہ ڈھائی روز تک اس سے تمام دنیا کی خوراک کا انتظام ہو سکتا ہے، بظاہر اس کا وزن آٹھ مثقال ہے، جب میں آگرہ پہنچا تو ہمایوں نے یہ ہیرا میرے سامنے پیش کیا لیکن میں نے اسے واپس کر دیا۔"

اس ہیرے کی ابتدائی تاریخ قصوں اور غیر مستند روایتوں میں پوشیدہ ہے، پروفیسر اسکیلاٹن کا خیال ہے، اس پر تاریخ کی روشنی اول اول چودھویں صدی کی ابتدا میں پڑتی ہے، سنہ ۱۳۰۴ء میں یہ مالوہ کے راجہ کے قبضہ میں تھا، سنہ ۱۳۰۴ء میں سلطان علاء الدین محمد شاہ کی فوج نے مالوہ کو فتح کیا، اور اجین کا خزانہ اس قدیم راج کے ہاتھوں سے نکل گیا، اس وقت یہ عظیم الشان ہیرا تاریخی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا، تاریخ میں یہ ذکر نہیں کہ علاء الدین خلجی کے ہاتھ سے نکل کر یہ کیونکر راجگان گوالیار کے پاس پہنچا، بہرحال یہ ایک عرصہ تک ہمایوں کے پاس رہا، پھر جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران پہنچا تو اس نے اس شاہانہ مہمان نوازی کے صلہ میں جو شاہ طہماسپ نے اس کیساتھ برتی تھی یہ ہیرا اور اس کے ساتھ ڈھائی سو لعل بدخشانی

اسکی نذر کیے، خور شاہ جو دربار ایران میں ابراہیم قطب شاہ والیِ گولکنڈا کا سفیر تھا بیان کرتا ہو کہ شاہ طہماسپ نے اس ہیرے کی قدر نہ کی اور کچھ دنوں کے بعد اسے نظام شاہ فرمانروائے دکن کے پاس بطور ہدیہ بھیجدیا، اس روایت کی تصدیق تاریخ فرشتہ سے بھی ہوتی ہی، اس کا وزن بابر کی روایت کے مطابق آٹھ مثقال تھا یعنی (۳۲۰) رتی یا ۱۸۷، ۵۸۹) چاول،

دوسرا ہیرا جسے بعض لوگ "کوہ نور" بتاتے ہیں وہ ہے جو میر جملہ کے ہیرے کے نام سے مشہور ہے، اس کے متعلق شاہجہاں کے دربار کا مستند مورخ محمد وارث بادشاہ نامہ کی تیسری جلد میں بیان کرتا ہے کہ "۱۸ر صفر سنہ ۱۰۶۶ ہجری (۱۷ دسمبر سنہ ۱۶۵۵ء) کو نئے وزیر اعظم محمد سعید میر جملہ نے شاہجہاں کے سامنے پیشکش کے طور پر قیمتی جواہرات حاضر کئے جنمیں ایک بڑا ہیرا بھی تھا جس کا وزن (۹) ٹانک یا (۲۱۶) سرخ تھا، اور جس کی قیمت دو لاکھ سولہ ہزار روپیہ تھی"، اس بیان کی تصدیق نہ صرف قارنیر (؟) اور ماثر الامرا بلکہ عمل صالح اور منتخب اللباب سے بھی ہوتی ہے، تمام مقامات پر اس کا وزن ٹانک کے علاوہ رتی میں بھی دیا ہوا ہے اور اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اسکا وزن (۲۱۶) جوہری رتی یا (۰۵۶، ۴، ۰) چاول تھا،

تیسرا ہیرا وہ ہے جو اب عام طور پر "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہے، سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اسے دہلی سے لے گیا، بیان کیا جاتا ہو کہ اُسی نے اسکا نام "کوہ نور" رکھا تھا، سنہ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد "کوہ نور" اُس کے جانشین شاہ رخ کے قبضہ میں آیا، شاہ رخ نے اسے احمد شاہ درانی کو دیدیا اور احمد شاہ کے بعد یہ اس کے لڑکے تیمور کو وراثت میں ملا، تیمور کے بعد سنہ ۱۷۹۳ء میں یہ اُس کے بڑے لڑکے شاہ زماں کے ہاتھ آیا، دو سال کے بعد یہ شاہ زماں کے تیسرے بھائی شاہ شجاع کے قبضہ میں آیا، شاہ شجاع اپنے بڑے بھائی محمد سے شکست کھا کر رنجیت سنگھ کے دربار میں لاہور پہنچا اور کابل کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے مدد کا خواستگار ہوا اور اس کے معاوضہ میں "کوہ نور" رنجیت سنگھ کی نذر کر دیا، یہ سنہ ۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے، سنہ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد "کوہ نور" اس کے جانشین دلیپ سنگھ کے قبضہ میں آیا، سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب سلطنت برطانیہ میں شامل کر لیا گیا، اور جدید بورڈ آف گورنمنٹ نے "کوہ نور" کو حاصل کر کے ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجدیا،

یہ ہے ان ہیروں کی تاریخ، ان کے متعلق تین مختلف رائیں ہیں، بعض مورخین مثلاً پروفیسر ماسکیلائن کا خیال ہے کہ بابر کا ہیرا اور "کوہ نور" دراصل ایک ہی چیز ہیں، دوسرے گروہ کی جسمیں ڈاکٹر بال سب سے زیادہ ممتاز ہیں یہ رائے ہو کہ

"ہم نے ملا دیا تجھے — لے، ترے چارہ ساز سے"

ہر رگِ جانِ امجد اب — رقص میں ہے بصد طرب

بربطِ روح بھر گیا — نغمۂ دل نواز سے

وثائقِ حقائق

از جناب میرزا عزیز صاحب فیضانی، دارا پوری

۱

عشقِ سرور میں ماسوا سے کیا کام — سید ھا رستہ ہے رہنما سے کیا کام

اس رہ میں فقیر بنکے جاتا ہوں عزیز — جو بھی مل جائے، مدعا سے کیا کام

۲

کیوں آج ہے کل کی فکر، کیسا ہوگا — ایسا سوچیں ہی کیوں کہ ایسا ہوگا

ہاں چھوڑ کے کل کو، کچھ کرو آج کی فکر — کل ہی دیکھینگے کل کو، جیسا ہوگا

۳

میدانِ عمل نہ ہو تو جینا بیکار — دنیا بے سود، روزِ عقبےٰ بیکار

اب وقت ہے کوئی کام کر لے غافل — یادِ ماضی و فکرِ فردا بیکار

۴

چھوڑ و غفلت کو، آنکھ کھولو، جاگو — یہ وقت کی ہے صدا کہ جاگو جاگو

تم سوتے ہو اور جاگ اٹھی ہے دنیا — جاگو! جاگو!! خدا کے بندو جاگو!!!

۵

پھر جلوہ فگن جہاں میں خاور ہوگا — دنیا میں بلند نام سرور ہوگا

"مغرب" میں غروب ہو چکا ہے، اب پھر — "مشرق" سے طلوعِ مہرِ انور ہوگا

۶

نظارہ و رونقِ جوانی دلکش — ہستی دلکش ہے، زندگانی دلکش

دلکش ہے عزیز "نقشِ اول" لیکن — ہوگا کس درجہ "نقشِ ثانی" دلکش

مطبوعات جدیده

مولنا شبلی اینڈ عمر خیام۔ (انگریزی) تالیف جناب رستم پستن جی بھاجی والا، ۱۱۸ صفحے، قیمت عہ خوبصورت جلد للعہ، مصنف سے امبا واڑی مزے گاں بمبئی نمبر ۱۰ کے پتہ سے طلب کریں،

جناب رستم پستن جی بھاجی والا، بمبئی کے ایک معزز پارسی خاندان کے رکن ہیں، ان کو حب وطن کے طور پر فارسی ادبیات سے عموماً اور خیام سے خصوصاً گہری شیفتگی ہے، اور اسی تعلق سے فارسی ادبیات کے خدمتگذار شبلی نعمانی کی عقیدت ان کے دل میں جاگزیں ہوئی، زیر نظر کتاب انہی اثرات کا آئینہ ہے، اس میں پہلے تقریباً پچاس صفحوں میں مولنا شبلی کے سوانح حیات شرح و بسط سے لکھے ہیں، بلکہ مولنا کے حالات میں اب تک اس سے مفصل کوئی چیز لکھی نہیں گئی، مصنف نے کاوش سے ان تمام ماخذوں پر نظر ڈال لی ہے، جو سیرت شبلی سے متعلق ہو سکتے ہیں، نیز مستند ذرائع سے دیگر حالات بھی فراہم کئے ہیں، پھر شعر العجم کے حصہ "خیام" کا ترجمہ ہے، جس میں کہیں کہیں مترجم نے خود حاشیے بھی لکھے ہیں،

خیام کے حالات میں بعض باتیں اسوقت تک علمی حلقوں میں بعض حیثیات سے "خلافیات" کی شکل رکھتی ہیں اور شعر العجم کے اس حصہ پر بھی اختلافی مضامین نکل چکے ہیں، جنکا حوالہ بھی زیر نظر کتاب کے تبصرہ میں اردو کے ایک رسالہ میں نظر سے گذرا، جس میں مترجم موصوف کو مطعون کیا گیا ہے، کہ اس تحقیقی نقد نظر کو مترجم نے نظر انداز کر دیا ہے، جو ان مضامین میں پیش کئے گئے ہیں، لیکن کیا ستم ہے کہ معترض نے بھی اس جواب نقد کو نظر انداز کر دیا ہے، جو ان خلافیات میں بہر صورت نظر انداز کرنے کے لائق نہیں، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اسوقت تک عمر خیام کے موضوع پر بعض ابواب لاینحل رہ گئے ہیں، لیکن ہمیں انھیں یہاں چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ امروز فردا میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک ضخیم تصنیف "عمر خیام" چار پانسو صفحوں میں پریس سے نکلنے والی ہے، جو امید ہے کہ خیام کے مالہ وما علیہ

پر حاوی ہونے کے علاوہ ان خلافیات میں بھی شاید قول مختتم بن سکے،

کتاب کے آغاز میں ایک دوسرے فاضل پارسی مستشرق جناب شمس العلماء ڈاکٹر سرجیون جی جمشید جی مودی پی ایچ ڈی، ال ال ڈی، سی آئی ای، کے ٹی، کا ایک مقدمہ ثبت ہے جس میں مقدمہ نگار نے اپنے انکسار کے باوجود ادبیاتِ ایران پر فاضلانہ نظر ڈالی ہے، اور فاضل مترجم نے شعر العجم کے حصہ کے ترجمہ میں رباعیاتِ خیام کا انگریزی ترجمہ بھی اپنے ذوق وشوق سے خود کیا ہے، جو سلیس اور شگفتہ ہے، اور یوں تو پوری کتاب کی زبان نہایت شستہ سلیس اور عام فہم ہے، ہم جناب بھاجی والا کو اس مفید خدمت پر دلی مبارکباد دیتے ہیں،

کیفیۃ العارفین ونسبۃ العاشقین، (فارسی) مرتبہ ومصححہ جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ گیا، حجم مجموعی ۸۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ ادسط درجہ، قیمت عہ، پتہ :- خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ، محلہ رام ساگر گیا،

حضرت سید شاہ عطا حسین صاحب منعمیؒ (۱۲۳۱ھ - ۱۳۱۱ھ) دور آخر میں صوبہ بہار کے برگزیدہ بزرگوں میں گذرے ہیں، موصوف اپنے عین حیات میں اپنا فیض عام جاری کئے رہے، اور صوبہ بہار کے جنوبی اضلاع خصوصیت سے اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوئے، اور موصوف کی وفات کے بعد بھی ان کی تصنیفات لوگون کی روحانی تسکین کا ذریعہ ہیں، اور سلسلۂ فیض جاری ہے، موصوف کی تقریباً تیس سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں ہیں جنیں سے بعض ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں، لیکن ان کا بیشتر حصہ قلمی صورت میں ان کی خانقاہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے مسرت ہے کہ اس خانقاہ کے لائق سجادہ نشین جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب منعمی نے ان قلمی کتابون کی اشاعت کا تہیہ کیا ہے، اور اسی سلسلہ کی پہلی کڑی زیر نظر کتاب کیفیۃ العارفین ونسبۃ العاشقین ہے جو سلسلۂ ابو العلائیہ کے اکابر مشائخ وخلفا کی مرتب سوانح عمریوں پر مشتمل ہے، اور اس میں حضرت مخدوم ابو العلاء رحمۃ اللہ (سنہ ۹۹۰ھ تا ۱۰۶۱ھ) کے عہد سے مصنف کے زمانہ تک کے بزرگوں کے مختصر حالات، روحانی جذب وشوق، رحلت اور مقام دفن وغیرہ کی مرتب تصریحات ہیں، مصنف کے زمانہ کے مشائخ وخلفاء میں زیادہ تر صوبہ بہار کے بزرگوں

کا تذکرہ آیا ہے، کتاب کے مرتب ومصحح جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب نے کتاب میں جا بجا خود بھی حواشی لکھے ہیں، جنسے ان اسلاف کے اخلاف کا تذکرہ بھی منضبط ہوگیا ہے، نیز موصوف نے کتاب کے آخر میں ایک اردو ضمیمہ بھی لگا دیا ہے، جس میں پہلے مصنف کے حالات زندگی، پھر ان کے خلفاء ومسترشدین کے حالات وتراجم ہیں، اور اسی ذیل میں خانقاہ دانا پور وگیا کے تاریخی حالات بھی ضمناً آگئے ہیں، اور کتاب کی ابتدا میں مرتب کا ایک دیباچہ ہے، جسمیں مصنف اور تصنیف دونوں کا سرسری تعارف کرایا گیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اپنے عہد کے بہت سے ایسے اکابر کے حالات منظر عام پر آگئے، جو ابھی تک نگاہوں سے اوجھل تھے، اور جو ہندوستان کے پچھلے دور کی تاریخی تحقیقوں میں ماخذ بن سکتے ہیں، اسلئے مرتب موصوف نہ صرف تصوف کے حلقہ سے بلکہ علمی حلقوں کیجانب سے بھی شکریہ کے مستحق ہیں ضرورت ہے کہ موصوف مصنفؒ کی دیگر قلمی کتابوں کو بھی وقف عام فرما کر علم وتصوف دونوں کی خدمت انجام دیں،

مثنوی یاد اسلام، از جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب آہ، امیٹھوی، حجم ۷۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۱۰؍ پتہ :- مولوی محمد ساجد صاحب مغل پور، فیض آباد،

جناب آہ امیٹھوی، امیر مینائی مرحوم کے وہ تلمیذ رشید ہیں جنکو وہ اپنے نومشق شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح کے لیے منتخب کرتے تھے آہ اردو کے مشہور لغت امیر اللغات کی ترتیب وتدوین میں بھی اپنے استاذ کے دست راست تھے لیکن رامپور سے قطع تعلق کے بعد خلوت نشین ہوگئے تھے اور اب ایک زمانہ بعید کے بعد اس مثنوی یاد اسلام کے ذریعہ پھر شریک بزم ہوئے ہیں، یہ مثنوی حالی کی مثنوی کے طرز پر لکھی ہے جس سے عروج وزوال اسلام دونوں کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں اسلام کو محض قرآن مجید ہی کی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ابتدا حمد وصفات الٰہی کا ذکر ہے پھر صنعت وخلقت سے صانع وخالق کے وجود کا ذکر کرکے خالق باری تعالیٰ کا تصور پیش کیا ہے اس کے بعد توحید تخلیق آدم، ضرورت رسالت، نبوت محمدی، سیرت نبوی، فضائل اسلام اور کارنامہائے اسلام کا تذکرہ ہے پھر یہیں سے گریز ہے اور دور حاضر کے مسلمانوں کا حال زار آتا ہے، دراصل یہیں سے یہ مثنوی مسدس حالی سے بھی جدا ہوتی ہے کہ حالی نے اپنے زمانہ کے حالات کے اعتبار سے علماء کا ماتم کیا ہے آہ نے اپنے دور کے مغرب پسند مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے، اور پھر اصلاح حال کی دعوت دی ہے، مثنوی کا طرز بیان مؤثر اور دلنشین ہے ضرورت ہے کہ اس کی عام اشاعت ہو کہ اسکا مطالعہ عام وخاص دونوں طبقوں میں دلچسپی سے کیا جا سکتا ہے،

"ر"

جلد ۳۲ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء | عدد ۳

مضامین

شذرات

اخبار پڑھنے والے دوستون کو معلوم ہوگا کہ آجکل دار العلوم ندوة العلمار لکھنؤ کے احاطہ مین طلبہ اور مدرسین کے لیے ایک مسجد زیر تعمیر ہے، اور ہمارے مہتمم دار المصنفین مولنا مسعود علی صاحب ندوی رکن ندوة العلمار نے اسکی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، اور اسی تقریب سے وہ دو تین مہینون سے لکھنؤ مین مقیم ہین، موصوف کا کام نہ صرف مسجد کو اپنی نگرانی مین بنوانا ہے، بلکہ اس تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کرنا بھی ہے، خوشی کی بات ہے کہ ان کو حسب دستور سابق دونون کامون مین کامیابی ہورہی ہے، مسجد کا طول ترسٹھ ۶۳ فٹ ہے، اور محرابون تک عمارت پہنچ چکی ہے، مسجد کے نقشہ مین کسی قدر جدت بھی روا رکھی گئی ہے جس سے مسجد ہوادار اور خوش منظر بھی ہوگی، دائین بائین اور قبلہ رخ بمبئی کی مسجدون کی طرح دروازے اور کھڑکیان رکھی گئی ہین، اور گنبدون کے بجاے چھت کا خیال ہے،

تعمیر مسجد مین امداد سے مسلمانون کو فطرةً جو شغف ہے وہ بیان کا محتاج نہین، اور نہ معارف کے ناظرین کو اس کے ثواب کی آیتین اور حدیثین سنانی ہین، صرف ان کو یاد دلانا اور متوجہ کرنا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے پرجوش اور فرض شناس ناظرین، اپنے سے خود اور اپنے خاندان کے افراد اور اپنے شہر کے نیک عمل مسلمانون سے تحریک کرین، اور جو کچھ جمع ہو اسکو ناظم صاحب ندوة العلمار لکھنؤ کے پتہ سے بھیجدین،

آجکل مولنا مسعود علی صاحب ندوی کے قیام کی وجہ سے دار العلوم کے مختلف صیغون مین اصلاح اور ترقی نظر آرہی ہے، اور امید ہے کہ ان کے "ڈکٹیٹر شپ" مین دار العلوم کو ہر قسم کے فوائد میسر ہونگے، ضرورت اسکی ہے کہ ہمارے طلبہ اور مدرسین بھی اپنے فرائض کو محسوس کرین، یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ طلبہ آجکل مسجد اور مدرسہ کے کام مین پوری دلچسپی لے رہے ہین، اور سمجھ رہے ہین کہ کسی درسگاہ کی اصلی اہمیت بلند عمارات اور وسیع سامان نہین، بلکہ خود طلبہ ہین،

دارالعلوم کے فارغ شدہ طلبہ بھی آجکل کے ماحول مین دین وملت کی خدمت مین مصروف نظر آتے ہین، لاہور مین مولنا محمد حنیف صاحب ندوی خطیب جامع مبارک کے خطبات پسند کئے جارہے ہین کلکتہ مین مولنا مظفرالدین صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ نے انگریزی مین اسلام کے اصول ومآخذ پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے جسمین اسلام کے عقائد کلامی اور تصوف کے قرآنی ماخذ بتائے ہین، اور ان مستشرقین کی پرزور تردید کی ہے جنھون نے اسلام پر دوسرے مذاہب کی خوشہ چینی کا الزام لگایا ہے، اور انکی غلطیان دکھائی ہین، ایک تیسرے ندوی عالم مولوی مطلوب الرحمان صاحب نگرامی ندوی نے لکھنؤ سے **اصلاح** کے نام سے ایک ماہوار تبلیغی اور اصلاحی رسالہ جاری کیا ہے جسکے تین پرچے نکل چکے ہین، تین روپیے سال اسکی قیمت ہے، اس رسالہ کا مقصد مسلمانون کی مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی اصلاح ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اس کی خریداری کی طرف توجہ کرین،

آجکل کے اسلامی اخبارات مین باہمی ذاتی مناقشون کی ایسی بدترین تصویرین نظر آرہی ہین، کہ انکے صفحات کو غض بصر کے بغیر پڑھنا مشکل ہے، ایک دوسرے پر الزام تراشی، اور حریف کو ہر طرح بدنام کرنے کیلئے مشتبہ الفاظ، ذومعنین جملے اور دوسرے ناپاک واقعات کی تلمیحات بے محابا استعمال کیجارہی ہین اور مزید تعجب یہ ہے کہ ان چھینٹون سے مقدس عباؤن کے دامن بھی پاک نہین، انقلاب وزمیندار، و ہندجدید کا قضیہ تو پرانا ہو چکا، اب ہندجدید اور خلافت باہم دست وگریبان ہین، مدینہ اور الجمعیۃ ایک طرف، الامان ووحدت دوسری طرف ہین، بہار مین اتحاد ایک جانب، اور نقیب دوسری سمت، باہم اس طرح نبرد آزما ہین، کہ متانت اور سنجیدگی کو آنکھین بند کرلینی پڑتی ہین، جب ہمارے معلمین اخلاق کے یہ اخلاق ہین، تو عام مسلمانون کا کیا شکوہ؟

ان خانہ جنگیون کا آغاز گو اختلاف رائے سے ہوا، مگر اب وہ قومیات کے بجائے ذاتی عناد وکاوش کا مظاہرہ کررہی ہین جنمین ہر فریق اپنے حریف کو بدنام کرنے کے لیے اس کے خلاف غلط فہمیون کے پیدا کرنے مین سراپا مصروف عمل ہے، موجودہ جدید طرز تحریر کا ہر اسلوب ایک مستقل حربہ کی صورت مین استعمال پارہا ہے مشتبہ الفاظ، سوالات، نقطے، افواہ، طنز، تلمیحات، بے نام تحریرین، ہر چیز معرض اشاعت مین آرہی ہین، اور ان کو "پاک قومیات" کا درجہ دیا جارہا ہے،

یہ منظر کس قدر دردناک ہے،

مسلمانون کا سیاسی انتشار اب کچھ چھپا راز نہین، ہم نے پہلے **مسلم لیگ** بنائی، پھر **خلافت** قائم کی، پھر **جمعیت** کھڑی کی، بعد ازین **مسلم کانفرنس** کو پیدا کیا، پھر جماعت احرار میدان مین آئی، اور ان مین سے ہر ایک کو مسلمانون کی سیاسی نمایندگی کا دعویٰ ہے، اور ہر ایک پوری قوم کی زبانِ ناطق بننے کی مدعی ہے، ایسی حالت مین مسلمانون کا کوئی پروگرام اب تک نہ قابلِ عمل ہو سکا ہے، اور نہ آیندہ ہوگا، اس سے پہلے کہ مسلمانون کو اصلاح کی دعوت دی جائے، ضرورت ہے کہ ان انجمنون کی شکست وریخت کیجائے، ان مین سے بعض کو دفن کر دیا جائے بعضون کے مقاصد بدل دیئے جائین، اور صرف ایک سیاسی انجمن قائم رکھی جائے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ احرار اور معتدلین دو گروہون مین منقسم ہوکر، دو سیاسی مجلسین بنالین، لیکن یہ تو نہ ہو کہ دو جمعیۃ العلمائین، ایک شہر مین، بلکہ ایک ہی محلہ مین قائم ہوکر" جمعیۃ علمائے ہند" کہلائین، اور اصلی کو نقلی سے تمیز کرنا مشکل ہوجائے، حالانکہ شعراء کے تخلص کی طرح ابھی نئی انجمنون کے لیے نامون کی کمی نہین،

ملکی حالات کے انقلاب کے سبب سے ضرورت ہے کہ ہم اپنے حالات پر پھر ایک نظر ڈالین اور گذشتہ تعصبات کو چھوڑ کر فکر وعمل کی وحدت کی نئی کوشش کرین، اور اس ذمہ داری کو محسوس کرین جو پوری قوم کی گمراہی اور غلط روی سے ہمارے رہبرون کے سر پر عائد ہوگی، ذاتی کدوکاوش، اور پرانی مخالفتون اور رایون کے اختلافات کو اگر اب بھی مسلمانون نے دفن نہین کیا، تو وہ نہ ملک کے کام آسکین گے، اور نہ حکومت ہی کی خوشنودی کی وہ "دولت" پاسکین گے، جس کے لئے ہمارے بہت سے افراد بہت بیتاب ہین، سلطنتین دوستی کا پیمان صرف اس طاقت اور قوت سے باندھتی ہین جو ان کو نفع یا نقصان پہنچا سکے مختلف الآراء، کمزوردل، اور ناتوان جماعت کس برتے پر کسی کو اپنے ساتھ عہد وپیمان باندھنے پر مجبور کرسکتی ہے،

مقالات

مُسلمانون کی آیندہ تعلیم

"مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے عنوان سے اڈیٹر معارف نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۲ء کی شب کو جامعۂ ملیہ، دہلی کے ایوان مین ایک مبسوط مقالہ پڑھا تھا جسکو رسالہ جامعہ نے اپنے مئی اور جون کے نمبرون مین شائع کیا ہے، اب ہم اس مقالہ کو فائدہ کی تعمیم اور صحیح خیالات کی اشاعت کی غرض سے معارف مین شایع کرتے ہین،

"اڈیٹر"

دوستان و عزیزان جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے مین "مسلمانون کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا، جو نہایت مقبول ہوا تھا، اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ "مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے مسئلے پر غور کیا جائے،

اسی زمانہ مین سر سید مرحوم نے مسلمانون کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانون کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا، بہت سے صاحبون نے اس کا سبب جہالت اور اس کی علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا، چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کرکے عمل کیا، اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے، اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے، کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہئے، ان پچاس برسون مین ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے، اور ایک منٹ کیلئے بھی اس پر غور نہین کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جسمین مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے جہان

ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہو گیا، ورنہ ہلاکت کا عمیق غار اُن کے پاؤن کے نیچے تھا،

اب یہ کوئی چھپا راز نہین کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے مین اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہین، پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریان تھین، اور یہ یقین تھا، کہ سرکاری نوکریون کا دروازہ اسی کنجی سے کھلے گا لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت مین ہے، کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہوگا پچاس برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعے کی شکل مین ہمارے سامنے آگیا، :-

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر،

مسلمانون مین جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ۱۸۸۲ء مین علی گڑھ سے مولینا شبلی نے اپنے وطن کے دوستون کو یہ مبارکباد بھیجی تھی، کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانون کے ہاتھ مین ہے، آٹھ لڑکے انٹرنس مین پاس ہوئے جنمین پانچ مسلمان ہین"، (مکاتیب اول ص۲ طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا اس سے وہ چند گریجوٹ ہو رہے ہین، تاہم اب کیا مسلمانون کا انحطاط کم ہو گیا، اور وہ اب ترقی کر رہے ہین، ؟ مولینا شبلی مرحوم جب مولویون کے مدرسون کو چھوڑ کر علی گڈھ کالج آئے تھے تو وہان کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے، :-

یہان آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خوان فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہین، یہان ان چیزون کا ذکر نہین آتا، بس خالی نوتہ تیون کی تماشا گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے، کہ وہ مذہبی باتون کو تمام تر ضعیف ثابت کردین گے، لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہین سکتے،

"سید صاحب (سرسید) نے کئی مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانون مین ایک بھی ایسا نہین، جو کسی مجمع مین کچھ کہہ سکے، یا لکھ سکے، صرف تین شخصون کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہین کہ انگریزی ان کے

دماغون مین کچھ تبدیلی نہین پیدا کرتی،،

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے، جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے، کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانون کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہین ہے، ؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ نفس اے بی سی ڈی ہمارے کامیابیون کے خزانے کی وہ کنجی ہے، جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی،

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھین، ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہئے،

تعلیم | تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہین، اور ہم اپنی زبان مین اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہین، اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے، اور آج کل اس کے معنی اس بھی زیادہ محدود ہین یعنی انگریزی زبان مین لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہین، ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے، تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے، جو عام یونیورسٹیون کے ماتحت دی جاتی ہے، دوسرے معنون مین ہم یون کہہ سکتے ہین، کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے،

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے، کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور اُن کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جسطرح نجاری، لوہاری، معماری، اور دنیا کے دوسرے پیشے ہین، اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہو، تو وہ اسی طرح مورد الزام ہوسکتا ہے جسطرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیون نہین جانتا کہ موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے مین یہ چیز حد فاصل تھی کہ اسمین فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہین، کیا جب عربون نے رومیون اور ایرانیون کو شکست دیکر تاج و تخت پر قبضہ کیا، وہ اپنی فی صدی تعلیم مین اپنے حریفون سے بڑھ کر تھے پھر جب ان عربون کو سسلی مین نارمنون نے اور اندلس مین اسپینیون نے اور عراق اور خراسان مین تاتاریون نے شکست دی، تو وہ فی صدی تعلیم مین ان نارمنون، اسپینیون، اور تاتاریون سے کم تھے،

خود ہندوستان مین مسلمانون کو ایک طرف سکھون نے اور دوسری طرف مرہٹون نے دبا کر اُن کے نظام حکومت

کو درہم برہم کر دیا، تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانون سے فی صدی تعلیم مین بڑھکر تھے، ؟

عزیزو! "فی صدی" کا لفظ بھی ان منترون مین ہے جبکو یورپ کے سیاسی ساحرون اور جادوگرون نے اپنی محکوم دنیا مین پھونک رکھا ہے، اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہوگئے ہین، کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازہ سے تول کر جانچتے اور مانتے ہین، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد مین نہین، بلکہ اس کی کیفیت مین ہے، اگر کہین صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی، تو وہ ۵۰ ہزار انگریز ۳۵ کروڑ ہندوستانیون پر حکومت نہ کرسکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیون کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے،

قوم کی ترقی کا راز ان واقعات سے جو مشاہدات ہین، یہ راز خود بخود فاش ہوجاتا ہے، کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہین، بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت مین ہے، اس کیلئے سب سے پہلی چیز یہ ہے، کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراضِ زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصودِ زندگی رکھتے ہون جس کے حصول مین اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد، غرض، اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو، اور اسی کی دھن مین اس کا جینا مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سب کچھ ہو اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو، کہ جب کبھی اسکے سامنے اسکے ذاتی اور شخصی مقاصد اسکے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہون، تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہان تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کردے،

اٹھارہوین صدی کے ہندوستان کی تاریخ مین جو واقعات پیش آئے، ان کی تحلیل کیجئے، تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا، کہ ارکاٹ، سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی مین مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستون اور سلطنتون کو اس آسانی سے کیونکر توڑ پھوڑ کر رکھدیتے تھے، ایک طرف ایک متفقہ مقصد متحد قوت اور منتظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر افراد اور پراگندہ اشخاص تھے جنمین سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا، کہین اگر کوئی خاندان حکمران تھا، تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے باہم نبرد آزما تھے، آرکاٹ اور بنگال کی نوابیون مین کیا یہی پیش نہین آیا؟ حیدر علی، اور ٹیپو جنھون نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ یہ ذہنی مضبوطی

اُن کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت مین کس طرح ڈھل گئی تھی، اور اس وقت تک اس آہنی انسان کی قوت مین کمزوری نہین آئی، جب تک اس کے خاندان اور دربار مین وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آگئی، مذہب کی اصطلاح مین اسی "ذہنی وحدتِ مقصد" کا نام **ایمان** ہے، جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہین ملسکتا، اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہین ہوسکتا، بہت کچھ اسی مقصدِ عزیز کی گران بہا متاع کی حفاظت بقا، ترقی، اور استواری کی خاطر وجود مین آتی ہے، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری، اور موت سے بے خوفی، اسی طلسم کے روحانی اسرار ہین، یہ حقیقت مین وہ جرس ہے، جس کی آواز پر قومون کے قافلے اپنے سفر کرتے ہین، اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہین،

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا مین کوئی بھی متحدہ مقصد ہو، ؟ اگر نہین ہے تو وہ قوم نہین، بلکہ جانورون کا گلہ اور حیوانون کا جھنڈ ہے،

غور سے دیکھئے اسی ملک مین ہندو قوم آباد ہے، اس پر انقلابات کے بیسیون دور گذر چکے ہین، صدہا سال کی حیرانی وسرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، اُن کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک نوکری پیشے سے لیکر آزادی طلب تک غریبون سے لے کر دولتمند مہاجنون تک، محکومون سے لیکر اُن کے رئیسون اور راجاؤن تک، اور سب سے بڑھکر یہ کہ اُن کے کانگریسیون سے لیکر خوشامدیون تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے، اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر، اور عائق اور مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندوستان کو واحد قوم بنانا، اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک مین مستقل وجود بخشنا، اب اس قوم کی ہر کوشش ہر راہ سے اسی ایک منزلِ مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے، اس کے اہلِ سیاست کی کوشش یہ ہے، کہ اس کو سیاسی خود مختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشین، اہلِ تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کیلئے اس کے علم وفن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہین، اصلاحِ معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقون سے آگے بڑھا رہے ہین، اہلِ دین اس کی دینی وحدت کی دُھن مین ہین، اہلِ علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہین، اہلِ ادب

اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق مین مصروف ہین، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتون کی تفریق کے خلاف حصول وحدت کیلئے پس دیوار لڑ رہے ہین، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتین اور تدبیرین ہین، قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان مین سے ہرایک کی تکمیل مین مصروف ہین، اوران مین سے ہرایک یہ جانتا ہے، کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہین جارہا ہے جہان وہ خود جانا چاہتا ہے، اسلئے راہ رو اور راہ بر باہم دست و گریبان نہین،

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلے چیز "وحدت مقصد" کا وجود ہے، یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہین، حکمران اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان مین، اہل پیشہ اپنے بازار مین، عالم اپنی درسگاہ مین، صناع اپنی کارگاہ مین، اخبار نویس اپنے دفتر مین، یہان تک کہ اسکے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ مین اپنے دوسرے کامون کے ساتھ اسی ایک مقصد کیلئے جیتے اور مرتے ہین،

تعلیم کا پہلا مقصد، مقصدِ زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے، کہ وہ قوم کے افراد مین اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے، قوم کے ہر فرد مین بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اسکی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اسکے حصول اور بقا کی خاطر ہر آزمایش اور امتحان مین پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے،

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اول مسلمانون کے سامنے اور خصوصًا ہندوستان کے مسلمانون کے سامنے اُن کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی، اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک کوئی درسگاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے،

ہمارا پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی بُرا سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیر سایہ علوم و فنون کی تحصیل اس مقصد کا اثر یہ تھا، کہ تعلیم ہمارے نظام زندگی مین ایک دنیوی نہین، بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا، یہان تک کہ کتابین اور کتابون کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب اور احترام کے قابل تھے، ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی، اور اوسکی خدمت کیلئے ہر علم و فن کو سیکھتے تھے،

اور پڑھتے تھے، ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا، اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیرمسلم قوموں سے لئے، مگر غور سے دیکھئے، کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح و ترمیم کرکے ان کو اپنے نصاب درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمامتر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں، ارسطو، اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں کہ دہریت سکھاتا ہے، جب وہ ہماری مشرقی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے، تو پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھکر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے، تو نیچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی، بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدء فیاض کے فلسفیانہ لیکن بااوب ناموں سے اس کی تعبیر کیجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درسگاہوں کے طلبہ میں بے دینی یا مذہبی بےحسی پیدا نہیں ہوتی،

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا، تو قرآن پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتائے گا، کہ وَمَنْ یُّوْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (جس کو حکمت دی گئی، اسکو بڑی نیکی دی گئی) جب ہیئت و فلکیات کا درس دیگا، تو تمہید میں وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا اور لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتوں کو پہلے پیش کریگا، جغرافیے کی کتاب لکھے گا تو کہے گا کہ یہ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کی تفسیر ہے، علم طب پڑھائے گا تو شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچہ میں ذکر کرے گا، فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالی کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھائے ومن لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ۔ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامرد ہے) غرض جس علم و فن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی، اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا، کہ ہر عقلی علم و فن اور ہر دنیاوی صنعت و ہنر بھی سرتاپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا، ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دکاندار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارث پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ استاد کے رنگ میں رنگ کر ظاہر ہو، اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد و ستد کا معاملہ اور ایک ہاتھ سے لینے اور دوسر

ہاتھ سے دینے کی نیوتی، اور مزدوری کا پیشہ نہین سمجھتے تھے، بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ اس لئے اس راہ مین ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر ومناظر پیش ہوتے تھے جنکو آجکل لوگ مشکل سے باور کر سکتے ہین،

آج کل کی تعلیمی تاریخ مین یہ کوئی انوکھی بات نہین کہ چند روپیون کی خاطر استاد اس کالج سے اس کالج اور اس یونیورسٹی سے اس یونیورسٹی مین دوڑے پھرتے ہین، اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا ذریعہ جانتے ہین، اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپیون کی خاطر زمین وآسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہین،

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ مین یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقویٰ اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے، اور پھر لیتے بھی تھے، تو وجہ کفاف سے آگے نہین بڑھتے تھے، وہ بڑے بڑے علما جن کے نامون کی عزت ہمارے دلون مین ہے، انھون نے دس دس اور پندرہ پندرہ روپیون پر اپنی زندگی بسر کردی ہے، اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر دوسرون پر اپنے احسان کا بار بھی نہین رکھتے تھے،

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا، اور خصوصاً بیرونی ملکون مین جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے، لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے، جب ہماری نگاہون کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا، تو علم کی طلب مین نہ تو خشکی کی مسافت اور نہ تری کی ہولناکی ہماری ہمتون کو پست اور ہمارے ارادون کو کمزور کرتی تھی، محدثین نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا، بخارا کا یتیم محمد بن اسمٰعیل بخاری اپنی بیوہ ماں کے زیر سایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور واپسی مین عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درسگاہ کو چھان ڈالتا ہے، مصر کے طالب علم خراسان آتے ہین، خراسان کے مصر جاتے ہین، اسپین اور سسلی سو چلکر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہین، اور مصر و شام سو اسپین جاتے ہین، بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۷ھ نے علم کی طلب مین بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہراۃ، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصری، دینور، ری، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسدآباد، اسفراین، آمل، اہواز، بسطام، خسروباد وغیرہ شہرون کی خاک چھانی، جغرافیے مین دیکھئے، یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لیکر ترکستان، خراسان،

ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہین،

محمد بن مفرج اموی اندلسی کی راہ طلب مین یورپ، افریقہ، اور ایشیا، تین براعظمون کے شہر داخل ہین، اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر، اور ایشیا کے شہر دمشق صنعا، اور زبید (یمن) ان کے تعلیمی مقامات ہین، ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر سرقسطہ (سراکوزہ) مین ہوئے لیکن اندلس سے لیکر خراسان تک کوچہ گردی کی، ابو محمد عبد اللہ بن عیسی بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے، وہ اسپین سے فارغ ہو کر اسکندریہ اور مصر آئے، پھر مکہ گئے، پھر عراق مین داخل ہوئے، اور بغداد مین مقیم رہے، پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور، اور بلخ مین قیام کیا، پیدا اسپین کی خاک مین ہوئے، اور ۵۴۸ھ مین افغانستان کے شہر ہرات مین پیوندِ زمین ہوئے حسین بن احمد پیدا قرطبہ مین ہوئے اور ۵۸۶ھ مین یمن کی سرزمین مین دفن ہوئے،

تاج الدین سرخسی ۵۲۳ھ مین پیدا خراسان کے شہر سرخس مین ہوئے، نشوونما شام مین ہوئی، اور وفات ۵۹۴ھ مین اندلس مین پائی، نحو کے مشہور امام ابو علی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر مین ہوئے، تعلیم و تعلم کی خاطر ملکون کی سیر کرتے، بغداد اور موصل سے مل کر اسپین مین جا کر دم لیا، اور ۳۵۶ھ مین قرطبہ مین وفات پائی، ابن المقری اصفہان کے محدث تھے، انھون نے اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، صیدا، بیروت، عکہ، رملہ، واسطہ، عسکر مکرم، حمص، رقہ، اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی، کہتے ہین، کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کئے، اور اونکی حالت یہ تھی، کہ اگر کسی نان پز کے سامنے ایک روٹی کے معاوضہ مین اوسکو پیش کیا جاتا تو وہ اوسکو قبول نہ کرتا،

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے، کہ وہ پیٹھ پر کتابون کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابو العلاء معری کی خدمت مین شام پہنچے ہین، تو پسینے سے کتابون کی یہ حالت تھی، کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا،

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیون مین دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علمون کو دیکھ کر ہم دنگ رہجاتے ہین،

لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانیوالی دوربینین ہوتین، توآپ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعا، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہراۃ، اور نیشاپور، مین ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے،

مین اس عہد کی صرف دو درسگاہون کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہون، ایک کوفہ مین حضرت امام ابوحنیفہؒ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ مین امام مالک کی، امام ابوحنیفہ کے حلقہ تعلیم مین مکہ، مدینہ منورہ، دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استراباد، ہمدان، نہاوند، رَی، قومس، دامغان، ترمذ، ہراۃ، قہستان، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے، ذرا نقشے مین ان شہرون کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے،

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ مین ہے، حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجین اٹھتی ہین، اور یثرب کی پہاڑیون سے آکر ٹکراتی ہین، عرب کے شہرون مین مکہ معظمہ، صنعا، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہرون مین سے ایلہ، دمشق، عسفان، خلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور، اور انطاکیہ، اور عراق، کے شہرون مین سے بغداد، بصرۃ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رہا، اور ممالک عجم مین سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قومستان، چغانی، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہراۃ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہوچکا، اب مغرب کی طرف چلئے، مصر کے شہرون مین سے قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسوان، تنیس، اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہرون مین سے، افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بسطہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ اور اٹلی کی سسلی، اور ایشیائے کوچک کے سمرنا (ازمیر) سے طالب العلم آ اور جا رہے تھے،

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن مین رہے، کہ اس وقت دنیا مین نہ آج کی طرح ریلین تھین جنھون نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے، اور نہ دُخانی جہازات تھے جنھون نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے، اور جو برسون کے سفر کو ہفتون مین اور مہینون کے راستون کو دنون مین اور دنون کی مسافت کو

گھنٹون مین طے کرتے ہین، اور وہان نہ ڈاک اور تار کے یہ انتظامات تھے، جو گھر بار اور اہل وطن کی خبرین دمبدم پہنچاتے رہتے ہین، اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے، جو مسافرون کو گھرون سے زیادہ آرام پہنچاتے ہین، اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا، جو ریتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کیلئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے،

لیکن ایک لمحہ ٹھہریئے یہ گذشتہ عہد کی داستان کہن استخوان فروشی کے لئے آپ کو نہین سنائی گئی ہے، بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا، جو ان طالب علمون کو اس زمانے مین اس طرح کوچہ بکوچہ شہر بشہر، اور ملک بملک لئے پھرتا تھا، کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے، نہ دریا عائق ہوتے تھے، پھر وہ کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہ طلب مین اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا،

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت ‏‏ دانہ می چیدم من آن روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصد زندگی اور نصب العین تھا جس کو "دین کا ولولہ" اور "مذہب کا جوش" کہتے ہین، یہ ان کی زندگی کی روح تھی، اور ان کی حیات کا مقصد، ان کے قبضے مین یہی بجلی کا وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک با مراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبون سے عبارت ہین، چل رہے ہین،

اس سے دوسرے درجے پر جو جذبہ ہے وہ سیاست ہے، اگر اسلام مین دین خود سیاست ہے، تو اس کے یہ معنی ہین، کہ سیاست کا جذبہ کار اس مین دین کے تحت ہے، ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہون یا گورے، ایشیائی ہون یا اروپی سب کے سب سلطنت مین برابر کے حصہ دار ہین، اسلام مین صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری، اور قومون کو غلام بنانے کی نیت سے نہین، بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانون مین قومیت، وطنیت اور رنگ و روپ کی مختلف برادریون کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے، انسانون کے درمیان طبعی اور فطری تفرقون کو ملیت کی بنیاد نہ قرار دیا جائے، جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہین سکتے، بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جس کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان بدل سکتا ہے،

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا، اور کم از کم بارہ سو برس تک اُس نے ہر میدان مین اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ مین لے کر نکلتا تھا، اور چند روز مین نو مسلمون کی ایک جماعت اپنے ساتھ لیکر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے مین اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا، افریقہ مین، بحری جزیرون مین اور مختلف ملکون کے دور دراز گوشون مین اس طرز سیاست نے بڑی بڑی ریاستین، اور حکومتین کھڑی کر دین، اسطرح غلامون کو اسلام کی آزادی سے مالامال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشور کشائی، اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا، مصر مین غلامون کی سلطنت صدیون تک اسی طرح چلتی رہی ہے، اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نومسلم ہین جنھون نے بارہا شمالی افریقہ مین حکومتین کین،

وہ کون سا جذبہ تھا جو نو مسلم ترکون، تاتاریون، اور مغلون کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیوارون سے لیکر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکون پر ان کو بارہا حکمران بنا تا رہا، سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچتا، اور پھر غزنی مین بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہی، جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہی، غور کے نو مسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہین، وہ اٹھتے ہین، اور آندھی کی طرح غزنی سے لیکر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہین،

ان مثالون سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مین یہ دکھاؤن کہ اسلام نے کیون کر دین ہونیکے ساتھ سیاست کا فرض انجام دیا، دوسرے لفظون مین یون کہنا چاہئے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پر زور اور قوی ہے' کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہین پڑتی ہے،

عشق خود راہ است وہم خود منزل است

باین ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہین برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قومون اور اسلامی ملکون مین جو فشار برپا کر رکھا ہے، اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے، کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومین اور جماعتین باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملکر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہون کہ حریف ہماری صفون کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے، اس کیلئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان مین تطبیق دی جائے جس طرح ہم عقل و

نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہین، غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہین جنمین کبھی صلح نہین ہو سکتی، اسلامیت کے حامی ہر چیز مین مسلمانون کی علیحدگی کے خواہان ہین، اور وطن کی دوسری قومون سے ملکر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کرکے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرنا چاہتے ہین، دوسری طرف وطنیت کے طرف دار اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تبری کرنے پر آمادہ ہورہے ہین، پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے، تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بے زاری ہے اور یہ دونون نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لیجا رہے ہین، حالانکہ جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ممکن ہے، اسی ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے، ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء کے نظریۂ سیاست نے اس امکان کو واقعہ کی صورت مین ہمارے سامنے پیش کردیا ہے، کیا ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت مین پست تھا، اور موجودہ عہد تحریک مین جمعیتی خادمانِ وطن کانگریسی خدمت گذارون سے کسی بات مین کم ہین، حالانکہ سب کو معلوم ہو کہ جمعیۃ العلماء سر تا پا مذہبی جماعت ہے، اور بایں ہمہ وطنی خدمات مین خالص وطن پرستون سے کسی درجہ کم رتبہ نہین،

میرے نزدیک جس طرح **ندوۃ العلماء** کی درسگاہ عقل و نقل کی تطبیق ہے، **جامعہ ملیہ** اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق ہے، اور اسی لئے یہ دونون درسگاہین مسلمانون کی آیندہ تعلیم مین بہت بڑا اثر رکھین گی،

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکشون کا بہترین فیصلہ نہ کرین گے، اس ملک مین ان کا مستقبل حد درجہ خطرناک رہے گا،

ہندوستان مین اسلام اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکون مین جہان مسلمانون کو تعدادی اکثریت حاصل نہین ہے، ان کے دینی اور وطنی فرائض مین یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے، کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل مین اپنی وطنی حکومت کے زیر سایہ نیم خود مختاری حاصل کرکے ملک کے عام سیاسی و انتظامی امور و مسائل مین اپنے دوسرے ہموطنون کے ساتھ اشتراکِ عمل کرین، صاف لفظون مین یون کہا جاسکتا ہو کہ اُن کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل مین جن سے قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خود مختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی سیاسی

انتظام ومسائل مین وہ دیگر فرزندانِ وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہوکراپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراکِ عمل کرین، موجودہ سیاسی اصطلاح مین ہم یون کہہ سکتے ہین، کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلاشرکت غیرے کلچرل آٹانومی حاصل کرین، اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات مین وہ اپنے ہم وطنون کے ساتھ شریک رہ کراپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی پر قناعت کرین، اس طرح مسلمانون کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہوجاتی ہے اور دوسری طرف ان پر ملی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہین ہوتا، جن مذہبی وقومی اغراض ومصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخابِ نمایندگی کی علٰحدگی کا مطالبہ کرتے ہین، وہ بجائے خود علٰحدہ نمایندگی سے طے ہونگے اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات مین ان کو دوسرون سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبے کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے، اور نہ لوگون کو عام ملکی معاملات وسیاسیات مین ان کی مخصوص قومی معاملات مین علٰحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے،

اس طرح مسلمانون کی دو مجلسین ہون گی، ایک خالص اسلامی جوان کے خالص اسلامی امور ومعاملات کا فیصلہ کرے گی، اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی،

ہم نے جہانتک ان مسائل پر غور کیا ہے، ہم کو اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلے کا نظر نہین آتا، یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے مین جو پہلے سے ملک مین رائج نہ ہو، ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے، مگر جس طرح پر نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر طے کرکے عمل مین لاتے ہین، اسی طرح اس پر ہم عمل کر سکتے ہین،

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہوگا، کہ ہندوستان مین ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہین،

۱- پیغام اسلام کی تعمیل، حفاظت اور بقا،

۲- اس ملک کیلئے ایک عام جمہوری نظامِ حکومت کا قیام،

۳- اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص اسلامی کلچرل آٹانومی" کا قیام،

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہین جنکو ہم اپنی قومی زندگی کی روح عمل قرار دیسکتے ہین، ان کے لئے جد وجہد اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہو سکتا ہے،

شاید اس موقع پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی باز پرس کی جائے، لیکن اگر میری تقریر کا پچھلا حصہ حاضرین کے ذہن نشین ہے، تو یقیناً وہ میری طرف سے اس باز پرس کا جواب دیسکتے ہین، میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے، کہ وہ قوم کے بچون کو انکی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے، اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کرکے ان کو سرتا پا عمل بنائے، دنیا مین آج جہان کہین کوئی قومی حکومت ہے، اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے، انگلستان مین جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزون کے تعلیمی مرکز ہین، اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہین، وزیر اعظم سے لیکر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہون کے احاطون مین آکر اپنی سیاسیات کے نظریون کو بیان کرتا اور وہان کے طالب علمون کو آیندہ کی سیاسی ذمہ داری کیلئے تیار کرتا رہتا ہے،

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے، تو مین کہونگا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچون کی بے مقصد تعلیم ہے، جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے، اور دنیا مین ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہے جسکی زندگی کی کوئی غایت نہین ہے،

سبب کھلا ہوا ہے انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہین، بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا، اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانون کی اور دوسری قومون کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کر دیجائے، جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے، اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کر دیا جائے،

دوسری طرف اسکو اپنی سلطنت کے چلانے کیلئے ایسے کم قیمت وسیلون کی ضرورت تھی جو اسکے محکمون کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکین، اسلئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جسمین کوئی زندگی نہ تھی، اور علوم مین سے بھی صرف وہ چیزین سکھائی جائین، جن کی ضرورت آیندہ بننے والے کلرک (بابودن) کو پیش آسکتی ہین،

اسکول تک مین ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے، ایک ایسی بدیسی زبان جسکے ذریعے سے ہم اپنے افسرون سے گفتگو کرسکین اوران کیلئے انکی زبان مین اون کے لئے مواد مہیا کرکے رکھ سکین، اورجغرافیہ جس مین زیادہ تر ہم یہ جانین، کہ وہ دنیا کے کون کون سے براعظم، جزیرے اور ٹاپو ہین، جہان وہ علَم لہراتا ہے جس کا آفتاب دنیا سے کبھی نہین ڈوبتا، اور تاریخ جس مین ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے، کہ ہندوستان کی موجودہ قومون نے کیونکر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے، تاکہ اس ملک کی قومی تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے،

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جسمین ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈون کا ذکر ہوتا ہے پڑھکر بے انتہا ہنسی آتی ہے، ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفین اوٹھائی ہین، اور جو انتظامات کئے ہین ان کا ذکر ہوتا ہے، پھر وہ رخصت ہو کر چپ جاتا ہے، اور دوسرا آتا ہے، تو پھر انھین مناقب کی تکرار ہوتی ہے، اس لغو طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جاسکے، اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا چاہئے جس سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو، اور قوم کو زندہ قوم، سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم بنائے،

ہم نے ہزارون اور لاکھون کے صرف سے ملک مین جابجا اسلامی اسکول، اسلامی کالج، بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے، لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے، کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول، اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہین، اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچتا ہے، بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹرون اور پروفیسرون کی پرورش ہوتی ہے، اور کچھ مسلمان طالب علمون کو کلاس مین جگہین مل جاتی ہین، مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایہ سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے، تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہین، کہ ان قومی سرمایے سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہین، وہ قومی نتائج کے لحاظ سے سرکاری مدارس سے کس حال مین بہتر ہین، ؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت مین کہین بہتر یہ ہے، کہ ہم اس سرمایہ کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہرون مین صرف اسلامی دارالاقامے قائم کرنے مین صرف کرین کہ ان اسلامی اسکولون اور کالجون سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے،

وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہین، بلکہ دارالاقامے کی حیثیت سے ہی،

بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ ہے، کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربہ کو جھٹلانا ہے، اور اس تعلیم نے صرف نوشت وخواند کے ہنر کی تعلیم واشاعت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو، مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی مین اس سے فائدے کے بجائے روزافزون نقصان پہنچ رہا ہے، مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے، کہ وہ حرف لایعنی جن کا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا، اب وہ برملا ادا کئے جا رہے ہین، اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے، کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے، اور خیالات واعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہی، ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے، اور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے، جو ظاہر و باطن دونون لحاظ سے حکمران قوم کے ثقافت کی صرف نقل ہی،

مسلم یونیورسٹی کیلئے ۱۹۱۱ء مین جس وقت ملک مین جوش وخروش برپا تھا، مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد مین اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی، جس کا ایک مصرع یہ ہے :-

کہ این سررشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے "مگر دستِ شما دستِ شما باشد" لوگون نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال وجواب پر محمول کیا ہو، مگر بیس برس کے بعد معلوم ہو گیا کہ لسان العصر نے جو شبہہ ظاہر کیا تھا، وہ شبہہ نہین حقیقت تھا، اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آجانا چاہئے، کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہئے، اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہئے، اور آیندہ ہماری درسگاہین صرف نوشت وخواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کیلئے نہ ہون، بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے،

اسی لئے مسلمانون کی آیندہ تعلیم کیلئے ضروری ہے، کہ ایسی درسگاہین بکثرت قائم کیجائین، جو بامقصد ہون، اور ان کا سررشتہ واقعی مسلمانون کے حقیقی ہاتھون مین ہو، مسلمانون نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی، مگر انھون

نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہین کیا کہ یہان کے کرورون دماغون کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھون مین لے کر ان کو مذہبی وقومی جذبات سے یکسر خالی کردین، اب ضرورت ہو کہ مسلمان اس نظامِ تعلیم سے علانیہ بغاوت کرین اور ایسی درسگاہون کی بنیاد قائم کرین، جو ان کو ان کی زندگی کا مقصد بتائین، اور ان پر ان کی حیاتِ ملی کے اسرار کھولین،

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانون کی زندگی کا تنہا مقصد تھی، اس وقت ملک کی عربی درسگاہون پر پھبتی کہی جاتی تھی، کہ یہ اپاہجون کے پیدا کرنے کی کلین ہین، اس طعن کو قبول کرلینے کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہین، کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و مبتذل حالت مین ہون، تاہم وہ با مقصد ہین، اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتا دیا کہ زمانے کی بے التفاتیون اور بے توجہیون کے باوجود وہ زندگی رکھتی ہین، اور آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ آج کل کے ایک بڑے سرگرم کانگرسی نے مجھ سے یہ کھلا ہوا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے مین اور ان پر عمل کرنے مین آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولون اور کالجون کے طلبہ سے بڑھکر ثابت ہوئے، اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہین، جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کردیتی ہو،

مسلمانون کی علٰحدہ تعلیم اوپر کے معروضات اگر ذہن نشین ہون تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے مین عذر نہ ہونا چاہئے، کہ مسلمانون کی با مقصد تعلیم کیلئے یہ نہایت ہی ضروری ہے، کہ ان کی قومی درسگاہین، بالکل الگ ہون جہان ان کو خاص اُن کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دی جائے، ہمارے بہت سے مسلمان دوستون کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلون مین اُن کی نشستین معین ہون اور نشستون کا انتخاب مخلوط نہ ہو تا کہ مسلمانون کی مستقل ہستی قائم رہے، میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستون مین عدم مخلوط انتخاب سے کہین زیادہ ضروری یہ ہے، کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تا کہ ان کی علٰحدہ قومی ہستی فنا نہ ہوجائے، اور ان کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہوجائے،

اسی اصول کی بنا پر مسلمانون کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے مسلمان ملک کی دوسری قومون کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیکس ادا کرتے ہین، لیکن آپ دیکھین گے، کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ

کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اُٹھاتے ہیں، اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں، وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمامتر ہندو ہے، مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے اکثر عاری ہیں، ایسی حالت میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی بات ہے،

یہ تو اُن مدارس کا سلبی پہلو ہے، ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمامتر کفیل ہیں، مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کرکے نہ خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں، ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں کم ہونا بالکل کھلی بات ہے، یوپی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اس لئے ناکام ہے، کہ اُن کیلئے بھی اُن کے سررشتہ کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے، جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں،

مکتبی تعلیم کا نظام پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے، جابجا شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جنہیں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے، اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے، پورے ملک میں چھوٹے بچوں کا ایک بھی معیاری مکتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے، جامعہ ملیہ کے کارفرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو بار بار پیش کیا ہے مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہیں، اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے، گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام سے ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلع میں قائم کئے ہیں، اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلع میں ضرورت ہے جنکے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو، اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے مکتبی سلسلوں کیلئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کریں، اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغے کے سپرد کیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کر رہے ہیں،

میری اس گذارش سے اس نتیجہ تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کیلئے مسلمانوں کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے

سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے خصوصًا جب وہ وقت آئے گا، کہ ملک مین جبری تعلیم کا نفاذ ہو، اس وقت مسلمانون کیلئے علٰحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج سے زیادہ عیان ہو جائے گی،

ضرورت ہو کہ بچون کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کی جائے اور اس کیلئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائین، اور بچون کے نفسیات سے باخبر اہلِ قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائین، جو سادہ سے سادہ سہل سے سہل ہو، حمایت اسلام لاہور کا نصاب بہت کچھ مقبول ہو، مگر افسوس ہو کہ اس مین الفاظ کے استعمال مین بے احتیاطی برتی گئی ہو، مثلًا دینیات کی پہلی ہی کتاب مین محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفون سے مرکب ہین، استعمال کیے گئے ہین، کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے، نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہون، ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے، کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو،

ابتدائی تعلیم مین دو اور مشکلین حل کرنی ہین، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے، لوگ قرآن پاک پڑھانے کیلئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہین، اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہین، میرے خیال مین یہ طریقہ غلط ہو، میرا تجربہ یہ ہے، کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو دان ہو جائے، تو اردو عبارت عربی خط مین چند روز پڑھائی جائے اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے، اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہو، لیکن ضرورت ہو کہ بچون کیلئے ایسے قرآن چھاپے جائین جنین خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت مین کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچون کی نظرون مین مشتبہ نہ ہونے پائین، اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت مین اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صور بچون کا ذہن اس حرف کے پہچاننے مین مشوش نہ کر دے،

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے، کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے، افسوس ہو کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے اس طرف توجہ نہین کی ہو،

بچون کیلئے جو نصاب بنایا جائے اس مین شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی

اور قومی روح کی تربیت کرے، بدیسی نظامِ تعلیم کی بے مقصد کتابین جن مین چوہا اور بلی کے بے جوڑ اور بے مزہ قصے ہمارے بچون کیلئے وہ غذاے فاسد ہے، جو جزوِ بدن نہین ہوتی، بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہو، اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کیلئے ایک ذرہ کارآمد نہین،

ہم ترکون کو ملحد کہنے کے عادی ہین لیکن بہرحال انھون نے اتنا پورے یقین کیساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہو، کہ اگر ہمکو زندہ رہنا ہو تو بامقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہو، چنانچہ اسی لئے انھون نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے،

امریکہ کے ایک مشنری رسالہ "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈرون سے ایک سبق نقل کیا ہو، جو درج ذیل ہے،

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھون نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی، ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہین، اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے، ہم پورے طور سے یہ نہین جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے، یا کیونکر ہے، وہ بہت بڑا ہے ......

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگون مین اتحاد پیدا کرتا ہے، اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے، اللہ تعالیٰ، پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے،

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے، ہم ترک ہین، ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہین، ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا، اور ہمیشہ دشمنون پر فتحیاب ہوگا، جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے، اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے، مین ان لوگون سے محبت کرتا ہون، جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہین، جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہین، ان سے مجھے مطلق محبت نہین"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے، کہ ترک مدبرون نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پا لیا ہے، اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے یہی وہ راستہ ہے جو قومون کی ایک منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے،

(باقی)

تاریخِ وفات نظامی گنجوی

۵۳۶ھ یا ۵۹۹ھ

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جونا گڈھی،

اختلاف سنین فارسی شعراء کے حالات مین عام طور پر سنین و تواریخ بلحاظ صحت مشتبہ اور بسا اوقات مختلف پائی جاتی ہین، لیکن جیسا شدید اختلاف نظامی کی تاریخِ وفات مین ہے، شاید ہی کسی شاعر یا مصنف کی نسبت پایا گیا ہو، اس کی وجہ زیادہ تر یہی معلوم ہوتی ہے، کہ نظامی کی مثنویان جن سے ان کی تاریخ وفات پر استناد کیا جاتا ہے، اغلاط و تصحیفات سے لبریز ہین، چنانچہ ان مثنویون کی تواریخ تصنیف متعدد نسخون مین آپس مین ایک دوسری سے اس قدر مختلف ہین کہ ان سے صحیح سنین و تواریخ کا معلوم کرنا بہت دشوار امر ہے، یہی سبب ہے، کہ تمام تذکرہ نویس نظامی کی تاریخِ وفات پر متفق نہین ہین،

نظامی کا تذکرہ لکھنے والون مین سب سے قدیم محمد عوفی صاحب لباب الالباب ہے، مگر اوس نے سوائے چند مبہم مدحیہ سطور اور چند غزلیات نظامی کے اور کچھ نہیں لکھا، اس کے بعد قدیم مآخذ مین مولانا جامی ہین، جنھون نے بہارستان اور نفحات الانس مین نظامی کا مختصر تذکرہ لکھا ہے، اونھون نے آخر الذکر کتاب مین اتمام سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۲ھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ نظامی کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے متجاوز تھی،[1]

اون کے علاوہ اور کئی مورخین اور تذکرہ نویسون نے نظامی کی تاریخِ وفات کا ذکر کیا ہے، جن کو ہم

[1] نفحات الانس ص ۶۰۳، مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۵ء

ذیل میں درج کرتے ہیں :-

مشرقی مصنفین کی دی ہوئی تاریخیں

(۱) مشہور جغرافیہ نویس قزوینی نے گنجہ کا ذکر کرتے ہوئے نظامی کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور تاریخ وفات تقریباً ۵۹۰ھ بتائی ہے[۵۱]

(۲) دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے، کہ نظامی نے طغرل بن ارسلان کے عہد (۵۷۱ھ - ۵۹۰ھ) میں وفات پائی، اور ۵۷۶ھ تاریخ وفات بیان کی ہے[۵۲]

(۳) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں مختلف مقامات پر مختلف تاریخیں لکھی ہیں :-

۵۷۶ھ - ۵۹۶ھ - ۵۹۷ھ - ۵۹۹ھ[۵۳]

(۴) ملا عبد النبی نے میخانہ میں ۸۴ برس کی عمر پر ۶۰۲ھ میں نظامی کی وفات بیان کی ہے[۵۴] جو یقیناً غلط ہے، جیسا کہ خود اس کتاب کے مدون کا خیال ہے[۵۵]

(۵) لطف علی آذر نے (بقول ریو) ۵۷۶ھ لکھی ہے، مگر بمبئی والے نسخہ میں یہ سنہ نہیں پایا جاتا، کہ لفظ "سنہ" کے بعد اس میں سے تاریخ محذوف ہے[۵۶]

(۶) تاریخ حبیب السیر میں صرف اتمام سکندر نامہ کی تاریخ بقول جامی بیان کی گئی ہے لیکن حاشیہ پر محمد تقی تستری نے ایک مختصر نوٹ لکھا ہے جس میں اتمام سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۷ھ بتا کر تذکرۂ تاریخ الافکار، اور صبح صادق کے حوالہ سے نظامی کا اس تاریخ کے بعد پانچ سال اور زندہ رہنا ثابت کیا ہے، اور اس لحاظ سے ۶۰۲ھ تاریخ وفات بتائی ہے[۵۸]

(۷) تاریخ جہان آرا میں (بقول ریو[۵۹]) ۵۹۶ھ ہے،

---

[۵۱] آثار البلاد القزوینی ص۳۵۲ مطبوعہ یورپ [۵۲] تذکرۂ دولت شاہ ص۱۳۱ مطبوعہ یورپ بمبئی والے نسخے میں صرف "سنہ سبعین" لکھا ہے، (دیکھو ص۱۱) [۵۳] کشف الظنون جلد اول ص۵۲۵ و ص۵۰۴ و ص۲۶۲، جلد دوم ص۴۰ [۵۴] میخانہ ص۱۱ [۵۵] حواشی میخانہ ص۱۰ [۵۶] فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم ص۵۶۴ [۵۷] آتشکدہ طبع بمبئی ص۲۴۲ [۵۸] تاریخ حبیب السیر جزو چہارم از جلد دوم ص۱۲۱ کا حاشیہ [۵۹] فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم ص۵۶۴

(۸) مجمع الواصلین میں گنجوی گل جنت "مادۂ تاریخ لکھا ہے جس سے ۵۹۲ھ برآمد ہوتی ہے، طامس ولیم بیل[۵]
اور مولینا آزاد[۵] نے اتمام سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۹ھ نقل کر کے اس تاریخ کی تغلیط کی ہے،

(۹) تقی کاشی صاحب صبح صادق نے (بقول اسپرنگر[۵]) ۶۰۶ھ لکھی ہے،

(۱۰) ہدایت قلی نے اپنے تذکرہ[۵] میں ۵۷۶ھ (غالباً دولتشاہ کے تتبع میں) لکھی ہے،

مستشرقین یورپ کی دی ہوئی تاریخیں، ان مشرقی مآخذ نیز اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر مستشرقین یورپ نے مندرجۂ ذیل سنین لکھے ہیں،:-

۱- ڈمل (دیباچہ شاہنامہ ص ۷)
۲- وان ہیمر (تاریخ ادب فارسی)
۳- اردمین فلوگل (تاریخ ادب فارسی)
} ۵۷۶ھ[۵]

۴- سر گور اوسلی (SIR GOUROUSLEY) ۵۹۶ھ[۵]

۵- ڈاکٹر باخر، (DR. WILHELM BACHER) ۵۹۹ھ[۵]

۶- ڈاکٹر ریو، (DR. RIEU) ۵۹۹ھ[۵]

۷- ڈاکٹر ایتھے، (HER MAM ETHE) ۵۹۹ھ[۵]

---

[۵] مفتاح التواریخ [۵] نگارستان فارس ص ۲۲۶، [۵] اودھ کیٹلاگ ص ۱۷، [۵] مجمع الفصحا، جلد اول ص ۶۴۳، طبع ایران [۵] ترجمہ سکندر نامہ از ولبرفورس کلارک (دیباچہ) [۵] (BIOGRAPHICAL NOTICES OF PERSIAN POETS P. 48 (1846)) [۵] باخر نے نظامی کے سوانح اور تصانیف پر ایک محققانہ رسالہ جرمن زبان میں لکھا ہے، جس کا نام (NISAMISLEBEUUNDWERKE) ہے، اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ رابنس نے اپنی کتاب (PERSIAN POETRY FOR ENGLISH READERS) میں شامل کیا ہے، جو ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی ہے، دیکھو کتاب مذکور ص ۱۰۹ تا ۱۱۳۔ [۵] فہرست مخطوطات جلد دوم ص ۵۶۵ [۵] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۷ ص ۵۲۱

۸ - ڈاکٹر مودی (J. J. MODI)[1]

۹ - پروفیسر براؤن (E. G. BROWNE)[2]

ان سب مین جرمنی کے مستشرق باخر نے خود نظامی کی مثنویات کے بعض اشعار کی بنا پر ان کی تاریخ وفات سے متعلق ایک نظریہ قایم کیا ہے جس کی اکثر مستشرقین نے تائید کی ہے، یہ نظریہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے قابلِ غور ہے، اور ہم اس کا خلاصہ ذیل مین درج کرتے ہین،

باخر کا نظریہ (الف) نظامی نے لیلی مجنون کی تاریخ تصنیف ۵۸۴ھ بیان کی ہے، جیسا کہ اشعار ذیل سے ثابت ہوتا ہے،:-

برجلوۂ این عروس آزاد آباد تر آن کہ گوید آباد،

کاراستہ شد بہ بہترین حال در سلخ رجب بہ ثا و فا و دال،

تاریخ عیان کہ داشت باخود ہشتاد و چہار بعد پانصد،

اس مثنوی کے اختتام کے وقت نظامی کی عمر (۴۹) انچاس برس کی تھی، جیسا کہ اسی مثنوی کے سبب تالیف مین فرماتے ہین،:-

مجموعۂ ہفت سبع خواندی یا ہفت ہزار سال ماندی

اور :-

زان سحر سحرگہی کہ رانم مجموعۂ ہفت سبع خوانم،

[1] شمس العلماء ڈاکٹر جمشید جی مودی بمبئی کے مشہور علم دوست پارسی مستشرق اور ایرانیات و پہلویات کے بڑے محقق عالم تھے، جنھون نے گذشتہ ماہ اپریل مین انتقال کیا، سکندر نامہ کے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۸۱۱ھ پر سے اونھون نے نظامی کی تاریخ وفات پر ایک مضمون رایل ایشیاٹک سوسائٹی (شعبہ بمبئی) کے جلسہ مین پڑھا تھا، جو اسی سوسائٹی کے جرنل مین شائع ہوا تھا، [2] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۴۰۱،

اب اگر ۵۹۶ھ سے ان کی عمر کے ۶۳ سال وضع کئے جائیں، تو ۵۳۳ھ ان کا سالِ ولادت ہوتا ہے،

(ب) خمسۂ نظامی کے کسی جامع یا حاشیہ نویس نے جس نے بعد میں ان کی تدوین و ترتیب کی ہوگی، سکندر نامہ کے آخر میں نظامی کی وفات کے متعلق اشعارِ ذیل اضافہ کر دئے ہیں،

نظامی چو این داستان شد تمام | بعزم شدن تیز برداشت گام،

نہ بس روزگارے بر این برگذشت | کہ تاریخِ عمرش ورق در نوشت

فزون بود ششش مہ ز شصت و سہ سال | کہ برعزم رہ بر دہل زد دوال

ان اشعار کے مطابق نظامی نے سکندر نامہ کے اتمام کے بعد ہی وفات پائی ہے، اور اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال (یا ½ ۶۳) کی تھی، لہذا اگر ۵۸۴ھ میں ان کی عمر ۴۹ سال کی ہو تو لازمی ہے کہ پندرہ سال کے بعد (۴۹ + ۱۵ = ۶۴، ۵۸۴ھ + ۱۵ = ۵۹۹ھ) جب کہ انھوں نے انتقال کیا، ۵۹۹ھ تاریخِ وفات ہونی چاہئے،

نظریۂ مذکورۂ بالا سے معلوم ہوگا کہ باخر نے خود مصنف کی سند پر نہیں، بلکہ اس مدون یا جامعِ خمسہ کے قول پر اسکی بنیاد رکھی ہے جس نے نظامی کی عمر ½ ۶۳ بتائی ہے،

باخر کا خیال ہے کہ نظامی نے سکندر نامہ کی تاریخ تصنیف نہیں بیان کی، چنانچہ وہ لکھتا ہے،:-

"سکندر نامہ کی تاریخِ تصنیف کا تعین ہنوز باقی ہے جسکو نظامی نے براہِ راست نہیں بیان کیا"[۱]

لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ باوجودیکہ سکندر نامہ کے دونوں حصوں (شرف نامہ و اقبال نامہ، یا بری و بحری) میں سنینِ تصنیف ۵۹۷ھ اور ۵۹۹ھ علی الترتیب دے گئے ہیں، باخر کو یا تو سکندر نامہ کے وہ مخطوطے نہیں ملے جنمیں یہ سنین موجود ہیں، یا اس نے اون کو صحیح نہیں تسلیم کیا،

باخر کے تمام نظریہ کی بنیاد لیلیٰ مجنون کے اشعار مندرجۂ بالا ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ "ہفت بسبع خواندن" کے معنی سات کو سات سے ضرب دینے کے کیسے ہوگئے، ؟ فارسی کے کسی معتبر لغت یا فرہنگ میں اس کے

[۱] دیکھو راہبن کی کتاب ص ۱۱۳

یہ معنی نہیں پائے جاتے تعجب ہے کہ باخبر کی کورانہ تقلید میں تمام مستشرقین حتی کہ ریو اور براؤن جیسے محققین بھی اس کو ان معنوں میں صحیح سمجھتے ہیں، "ہفت سُبع" سے مراد قرآن کریم کی سات منزلیں یا حصے ہیں، جو قاریوں نے قرأت کی سہولت کی غرض سے مقرر کئے ہیں، تاکہ ایک ہفتہ میں پڑھا جا سکے[۱] سعدی نے بھی ایک شعر میں "ہفت سُبع خواندن" کا ذکر کیا ہے؛:-

اگر خود ہفت سُبع از بر بخوانی،

چو آشفتی الف با تا ندانی،[۲]

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر باخر نے جو نظریہ قائم کیا ہے، گو نتیجہ کے لحاظ سے وہ صحیح ہو، مگر تفصیلات کے لحاظ سے غلط ہے، چنانچہ ڈاکٹر ریو کے قول سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، "کہ ناکافی مواد کی وجہ سے باخر کے نتائج کی تفصیل اغلاط سے پاک نہیں ہے[۳]"

تاریخ وفات معلوم کرنیکا صحیح اور مکمل طریقہ؛

ہمارے خیال میں نظامی کی تاریخ وفات معلوم کرنے کا بہترین اور مکمل طریقہ یہ ہے، کہ مثنویوں کی تاریخ تصنیف، اُن کی عمر کی نسبت اشارات، ان کے صاحبزادہ کی عمر، ان فرمانرواؤں کے سنین حکومت جن کے نام پر یہ مثنویاں معنون ہوئی ہیں، ان سب میں صحیح طور پر مطابقت دیکر تاریخ وفات معلوم کی جائے، تاکہ بعد میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو، چنانچہ مندرجہ ذیل طریقہ سے نظامی کی تاریخ وفات کے متعلق ہم ایک صحیح نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں؛:-

(الف) تاریخ ولادت:-

۱- مثنوی شیرین خسرو کا سال اتمام معتبر قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے مطابق ۵۷۶ھ ہے؛:-

گذشت از پانصد و ہفتاد و شش سال[۴]

نزد بر خدِ خوبان کس چنین خال،

[۱] غیاث اللغات ص۵۵ رزاقی پریس کانپور [۲] گلستان باب ہفتم، [۳] فہرست مخطوطات جلد ۲ ص۵۶۴، [۴] خمسۂ نظامی کے بعض قدیم

اگرچہ طغرل بن ارسلان سلجوقی (۵۷۳ھ - ۵۹۰ھ) کی مدح محمد جہان پہلوان اتابک کی وفات (۵۸۲ھ) کا ذکر، قزل ارسلان کے قتل (۵۸۷ھ) کا واقعہ اور ابوبکر نصرالدین اتابک (۵۸۷ھ - ۶۰۷ھ) کی وفات اتنی چیزیں اس مثنوی میں پائی جاتی ہیں، لیکن ان سے صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے، کہ نظامی نے اسی کتاب کو طغرل کے بعد قزل کے نام، اور اسکی وفات کے بعد نصرۃ الدین کے نام سے، جو فرمانروایانِ وقت تھے، منسوب کیا تھا، اور اس لئے یہ مدحیہ اشعار بعد کو اضافے کئے گئے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اصل کتاب ۵۷۳ھ سے شروع ہو کر ۵۷۶ھ میں پوری ہو چکی تھی، جیسا کہ خود نظامی نے تصریح کی ہے،

۲- اس مثنوی میں وہ اپنے صاحبزادہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، :-

ببین این ہفت سالہ قرۃ العین

مقام خویشتن در قاب قوسین

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے صاحبزادہ کی عمر اس وقت سات سال کی تھی،

سببِ نظمِ کتاب میں نظامی نے اپنے ایک دوست کی زبانی اپنی عمر چالیس سال کی بتائی ہے، :-

پس از پنجاہ چلہ در چہل سال

مزن پنجہ برین حرف و رق مال

اسی طرح معلوم ہوا کہ ۵۷۶ھ میں نظامی کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، اب اگر اس سنہ میں سے ان کی عمر کے چالیس برس کی تفریق کی جائے، تو ان کا سالِ ولادت ۵۳۶ھ ہوگا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۱) ۲ نسخوں (موجودہ برٹش میوزیم) میں ہفتاد و یک، ہفتاد و دو، اور ہفتاد و نہ تک سنین پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں قدیم ترین نسخہ مکتوبہ ۷۱۸ھ کے ورق ۱۰۱ ہفتاد و شش ۵۷۶ھ ہی لکھا ہوا ہے، یہی سن مخطوطات نمبر ۲۵۵۰۰ (مکتوبہ ۸۴۶ھ) نمبر ۲۷۲۴۰ اور دیگر قدیم نسخوں میں پایا جاتا ہے، اسی طرح طہران کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی ہفتاد و شش موجود ہے، (دیکھو فہرست ریو جلد دوم ص ۵۶۶) بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم میں خمسہ نظامی کا ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۰۹۲ھ موجود ہے، اس میں بھی ہفتاد و شش ہی لکھا ہوا ہے،

(ب) تاریخ وفات:۔

۱۔ مثنوی لیلیٰ مجنون ۵۸۴ھ میں لکھی گئی، جیسا کہ اس کے تاریخی حروف اور سال اتمام سے صاف ظاہر ہے:

کار استہ شد بہ بہترین حال، در سلخ رجب بہ تا و فا و دال[۵۸۴]،

تاریخ عیان کہ داشت با خود ہفتاد و چہار بعد پانصد،

اس مثنوی کی تصنیف کے وقت ان کے صاحبزادہ کی عمر ۱۴ سال کی تھی، چنانچہ اس کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

اے چاردہ[۱۴] سالہ قرۃ العین بالغ نظر علوم کونین،

اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، کہ مثنوی شیرین خسرو کی تصنیف کے وقت یعنی ۵۷۶ھ میں ان کے صاحبزادہ کی عمر سات سال کی تھی، اور ان کی عمر چالیس[۴۰] سال کی، اس طرح لیلیٰ مجنون خسرو شیرین سے سات سال کے بعد لکھی گئی، یا یوں کہو کہ ۵۸۴ھ میں ختم ہوئی، لہذا اس حساب سے نظامی کی عمر اس سنہ میں ۴۸ یا ۴۸ سال کی ہونی چاہئے،

۲۔ لیلیٰ مجنون کے ۳ سال بعد یعنی ۵۸۷ھ میں سکندر نامہ یا شرفنامہ کا آغاز ہوتا ہے، (کہ اس کا زمانۂ تصنیف ۵۸۷ھ سے ۵۹۷ھ تک ہے) جیسا کہ اپنے صاحبزادہ کی عمر ۱۷ سال کی جو ۵۸۷ھ ہی میں ہو سکتی ہے) بتاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

وزین ہفدہ[۱۷] خصل آوریدن بدست

شدہ ہفدہ سالہ بدینسان کہ ہست[۱]

اسی میں وہ اپنی عمر پچاس[۵۰] برس کی بتاتے ہیں:۔

چو تاریخ پنجہ در آمد بہ سال دگرگونہ شد برشتابندہ حال،

---

[۱] سکندر نامہ (شرفنامہ) ص ۲۵، طبع بمبئی ۱۳۲۸ھ

یعنی ۵۸۶ھ میں نظامی کی عمر پچاس سال کی تھی، اس مثنوی کی تاریخ اتمام ۵۹۷ھ اشعار ذیل سے معلوم ہوتی ہے:-

گفتم من این نامہ را در جہان　　کہ تا دور آخر بود در جہان

بتاریخ پانصد نود ہفت سال　　چہارم محرّم بوقت زوال[1]

۳- سکندر نامہ کا دوسرا حصہ یا اقبال نامہ ۵۹۹ھ میں اتمام کو پہنچا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں:-

جہان برد ہم روز بود از ایار

نود نُہ گذشتہ ز پانصد شمار[2]

اس طرح ۵۸۷ھ سے لیکر ۵۹۹ھ تک سکندر نامہ (ہر دو حصہ) کی تکمیل ہوتی ہے، اور اسی اثنار (غالباً ۵۹۷ھ) میں وہ اپنی عمر ۶۰ برس کی بتاتے ہیں:-

---

[1] آغا احمد علی (ہفت آسمان ص ۲۹) کو ان اشعار کی صحت میں کلام ہے، کیونکہ یہ اشعار سکندر نامہ جلد اول کے کسی نسخہ میں اُن کی نظر سے نہیں گذرے، علاوہ ازین ان کے نزدیک ابیات کی رکاکت اور قافیہ کی تکرار اس کے موید ہیں، کہ یہ اشعار نظامی کے نہیں ہو سکتے، لیکن آغا صاحب کی یہ رائے درست نہیں معلوم ہوتی، خمسۂ نظامی کی کثرت اغلاط و تصحیفات پر نظر کرتے ہوئے بہت ممکن معلوم ہوتا ہے، کہ کتابت کی غلطیون کی وجہ سے ان اشعار کی صورت مسخ ہوگئی ہو، مگر اس مین شک نہیں ہے کہ ان اشعار سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے، تو یہ مصرعۂ تاریخی ایک سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ نسخون مین پایا جاتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے، (جلد دوم ص ۵۶۰) کہ برٹش میوزیم کے مخطوطات ۹۰۰ھ، ۱۱۱۷ھ اور ۱۲۲۷ھ مین یہ تاریخ موجود ہے، ڈاکٹر مودی نے بھی اپنے مضمون مین جو نسخہ مکتوبہ ۱۰۱۲ھ کا ذکر کیا ہے، اس مین بھی یہ اشعار باختلاف بعض الفاظ پائے جاتے ہین، اسی طرح بمبئی کے دو مطبوعہ نسخون (۱۲۶۵ھ اور ۱۳۲۵ھ) مین بھی یہی اشعار موجود ہین، پھر قرائن بھی اسی تاریخ کے موید ہین، لہذا حصہ اوّل کا سنۂ تصنیف ۵۹۷ھ صحیح معلوم ہوتا ہے، [2] سکندر نامہ بحری مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر، مطبوعۂ کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی ص ۱۹۰ خمسۂ نظامی کے ایک نسخہ مکتوبہ ۹۳۶ھ موجودہ برٹش میوزیم (فہرست ریو جلد ۲ ص ۵۷۰) مین بھی یہی تاریخ موجود ہے،

بشصت آمد اندازۂ سال من ،

نگشت از خود اندازۂ حال من [۱]،

اس حساب سے ۵۹۹ھ مین سکندر نامہ ختم ہوا، اس وقت انکی عمر ۶۲ یا ۶۳ سال کی ہوتی ہے،

۴۔ اب اُن اشعار کو لیجئے جو کسی نے سکندر نامۂ بحری یا اقبال نامہ کے آخر مین، "انجامش روزگار نظامی رحمتہ اللہ علیہ" کے عنوان سے الحاق کر دیے ہین، ان اشعار کا لکھنے والا غالباً جامع اوراق یا کاتب ہوگا، جو معلوم ہوتا ہے، کہ نظامی کے "دم واپسین" کے وقت حاضر تھا، اور جس کو نظامی کی عمر کا بھی صحیح علم تھا، ممکن ہے کہ وہ نظامی کا کوئی قریبی عزیز یا دوست ہو، بہرحال یہ اشعار قدیم ترین نسخون مین بھی پائے جاتے ہین، اور حسب ذیل ہین :۔

نظامی چو این داستان شد تمام	بعزم شدن تیز برداشت گام
زبس روزگارے براین برگذشت	کہ تاریخ عمرش ورق در نوشت
فزون بود شش مہ ز شصت و سہ سال	کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال
چو ن حال حکیمان پیشینہ گفت	حکیمان بخفتند و او نیز خفت
رفیقان خود را بگاہ رحیل	گہ از رہ خبر داد و گہ از دلیل
بخندید و گفتا کہ آمرزگار،	بآمرزشم کرد امیدوار،
ز مارحمت خویش دارید دور	شما وین سرا ما و دارالسرور،
درین گفت گو بود خوابش ربود،	تو گفتی کہ بیدار خود نبود [۲]،

اشعار مرقومۂ بالا سے دو باتین معلوم ہوتی ہین، جو زیادہ قرین قیاس ہین، ایک یہ کہ داستان سکندر نامہ ختم ہونیکے بعد بہت ہی قلیل عرصہ مین نظامی نے وفات پائی، دوسری یہ کہ انتقال کے وقت نظامی کی عمر ۶۳½ برس

---

[۱] سکندر نامہ بحری ص ۵۹ طبع اسپرنگر [۲] سکندر نامہ بحری مرتبہ اسپرنگر ص ۱۸۲،

کی تھی، لہذا اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ ۵۹۹ھ میں نظامی ½ ۶۳ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اور کہ ۵۹۹ھ میں یعنی اتمام سکندر نامہ کے ساتھ ہی ان کا بھی خاتمہ بالخیر ہو گیا، جیسا کہ ریو، ایتھے، باخر، اور براؤن کا خیال ہے، یا کم ازکم یہ کہ وہ ۵۹۹ھ تک زندہ تھے،

پروفیسر شیرانی کی تحقیق اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پروفیسر محمود خان شیرانی ۶۰۶ھ تک نظامی کا زندہ رہنا بتاتے ہیں، چنانچہ اپنی "تنقید شعر العجم" میں فرماتے ہیں:-

"نظامی کی وفات کا حادثہ اقبال نامہ کے اختتام کے بعد تصور کرنا چاہئے"۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن آگے چل کر سکندر نامہ کی مختلف اشاعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس کی آخری اشاعت اتابک نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، اور ۶۰۶ھ میں اوس کی وفات کے بعد نظامی اسی کتاب کو نور الدین ارسلان شاہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں"[1]

غالباً شیرانی صاحب کو مندرجۂ ذیل اشعار پر سے دھوکا ہوا ہوگا، جو سکندر نامہ بحری کے بعض قلمی نسخوں میں پائے جاتے ہیں، اور جن کو ڈاکٹر ریو[2] نے بھی نقل کیا ہے:-

طرفدار موصل بمردانگی ، قدر خوان شاہان بفرزانگی،

سر سرفرازان گردن کشان، ملک عز الدین قاہر شہ نشان

بطغرائے دولت چو طغرل تگین ابو الفتح مسعود بن نور الدین

آخری شعر میں مسعود بن نور الدین کا نام ہے، لیکن ان اشعار میں بھی شیرانی صاحب کے خیال کے مطابق نور الدین ارسلان نہیں، بلکہ اس کے بیٹے مسعود کا نام ہے، اور چونکہ "قاہر" کا لقب بھی موجود ہے، اس بنا پر ڈاکٹر ریو کو بھی مغالطہ ہو گیا کہ یہ الملک القاہر عز الدین مسعود ثانی بن نور الدین ارسلان ہے، چنانچہ خمسۂ نظامی کے ایک مخطوطہ

[1] رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۰ [2] فہرست جلد ۲ صفحہ ۵۶۹،

۵۹۷ھ مین اقبال نامہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ریو رقمطراز ہے:-

"شروع مین ملک قاہر عزالدین مسعود بن نورالدین والی موصل کے نام پر انتساب ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

طرفدار موصل بر دانگی، الخ

الملک القاہر آخر رجب ۶۰۷ھ مین اپنے باپ کا جانشین ہوا، (کامل ابن اثیر ج ۱۲ ص۱۹۳) اگر یہ انتساب واقعی نظامی کا لکھا ہوا ہے، تو اس سے معلوم ہوگا کہ نظامی اس تاریخ کے بعد تک بھی زندہ رہے ہین، اور آخر مین بھی ملک عزالدین مسعود کی مدح پائی جاتی ہے[۵۱]"

لیکن اس سے پیشتر ریو خود ہی لکھ چکا ہے کہ

"نظامی کی وفات کے متعلق اس تہدیہ (بنام عزالدین مسعود) سے شبہ پیدا ہوتا ہے، کہ یہ تہدیہ بہت سے قدیم مخطوطات نیز مطبوعہ نسخون مین نہین ہے، اور سب سے بڑھکر اشتباہ انگیز امر تو یہ ہے، کہ بغور معائنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ سوائے نامون کے یہ مدح تمامتر سکندر نامہ حصہ اول سے (جو ملک نصرۃ الدین کے نام پر معنون ہے) نقل کر دی گئی ہے"

عزالدین بن قطب الدین مودود اپنے بھائی سیف الدین غازی کی وفات کے بعد ۵۷۶ھ مین موصل کا فرمانروا ہوا، اور شعبان ۵۸۹ھ مین رحلت کر گیا، (دیکھو ابن خلکان اور کامل ابن اثیر ج ۱۲ ص ۶۶)

ڈاکٹر باخر کا خیال ہے، کہ یہ تتمہ سکندر نامہ کی کسی اگلی اشاعت کا ٹکڑا ہے، چنانچہ ایک اتفاقی حوالے جسمین نظامی کے صاحبزادہ کی عمر ۱۷ سال بتائی گئی ہے:- ؎

شدہ ہفدہ سالہ بدینسان کہ ہست

ڈاکٹر باخر نے قیاس کیا ہے کہ چونکہ لیلیٰ مجنون کی تصنیف (۵۸۴ھ) کے وقت نظامی کے صاحبزادے کی عمر ۱۴ سال کی تھی اسلئے یہ تتمہ اس کے تین سال کے بعد یعنی ۵۸۷ھ مین لکھا گیا ہوگا[۵۲]

---

[۵۱] ضمیمہ فہرست مخطوطات تدیو ص۱۵۴ تا ص۱۵۵، [۵۲] فہرست مخطوطات جلد دوم ص۵۶۹

بہرکیف اگر یہ تہدیہ صحیح ہو تو بھی یہاں عزالدین مسعود سے مراد ہوتا نہیں، بلکہ داداہے، جیسا کہ آخری مصرع مین اوس کی کنیت ابوالفتح اس پر صریحًا دلالت کر رہی ہے، اس لئے باخز کا یہ خیال صحیح ہے، کہ سکندر نامہ کی اگلی اشاعت اسی کے نام سے منسوب کی گئی ہی، پروفیسر براؤن کے قول سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے :-

"سکندر نامہ پہلے عزالدین مسعود (اول) اتابک موصل کے نام معنون کیا گیا، اور بعد مین نظر ثانی کے بعد اوس کی دوسری اشاعت نصرۃ الدین ابوبکر بشکین کے نام منسوب کی گئی، جو اپنے چچا قزل ارسلان کے بعد ۵۸۷ھ مین اتابک آذربائیجان کی حیثیت سے اُس کا جانشین ہوا[۵۲]"

مندرجۂ بالا بیانات کی بنا پر پروفیسر شیرانی کے اس خیال کی کماحقہ تردید ہوجاتی ہے، کہ نظامی نے ۵۷۸ھ کے بعد اسی کتاب کو نورالدین ارسلان کے نام سے منسوب کیا،

---

[۵۱] ابن خلکان جلد دوم ص ۴۳۹، [۵۲] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۴۰۲،

شعر العجم

حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس مین شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیون اور ان کے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، مطبوعہ معارف پریس ضخامت ۳۵۰ صفحے، قیمت ۳ر

حصہ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک) مع تنقید کلام، مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۳۰۲ صفحے، قیمت :- عہ۲

"منیجر"

گجراتی زبان اور اوسکی تاریخ،

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی)

ہندوستان مین جو دوسری ترقی یافتہ زبانین ہین، ضرورت ہے کہ ہم اون کی تاریخ خصوصیات اور اونکے لٹریچر سے واقف ہون خصوصًا گجراتی اور سندھی ایسی زبانین ہین جن کا تعلق اردو سے بہت پرانا ہے، ہم چاہتے ہین کہ ان زبانون کی مختصر تاریخ اور لٹریچر سے اہل اردو کو مطلع کرتے رہین، اور اس سلسلہ کا ہم گجراتی زبان کی تاریخ سے آغاز کرتے ہین،

یہ مضمون مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی نے اپنی تاریخ گجرات کے لئے، مہادیوبائی احمدآباد کے اپنے ایک شاگرد سے انگریزی مین لکھوایا تھا، اور پھر انگریزی سے اوسکا اردو مین ترجمہ کرایا تھا،

"اڈیٹر"

تاریخ گجرات کے طالب علمون کے لئے اور اون کے لئے جو گجرات کے باشندون کو اور اون کے رسوم ورواج اور خصوصیات کو جاننا چاہتے ہون، گجراتی زبان کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے،

ہر پرانی قوم کی تاریخ کی طرح گجرات کی قدیم تاریخ اور اوس کا لٹریچر بھی گمنامی مین رہا ہے، اور یہ کہنا بہت دشوار ہے، کہ ایام قدیم اور متوسط زمانون مین گجرات مین کوئی لٹریچر موجود بھی تھا، اور اگر کوئی تھا، تو وہ کس قسم کا تھا، جب آریہ ہندوستان کی طرف ہجرت کرکے آئے، تو پہلے پہل وہ گجرات مین نہین آئے، مگر ایک بڑی مدت کے بعد یہ ہوا

کہ وہ جنوب کی جانب پھیلے، بعد میں گجرات کی طرف، ازمنۂ متوسط میں بہت سی قومیں مثل آریون کے گجرات پر حملہ آور ہوئین،
اُن مین سے خاص خاص قومیں ہنس، گرجرز، (گوجر) عرب، پٹھان وغیرہ تھیں، پارسیون نے بھی جو مسلمانون کے عہد مین ایران
سے بھاگ کر آئے[۱] تھے، گجرات مین پناہ لی تھی، یہ تمام اجنبی قومیں اور جماعتیں رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ملتی جلتی گئیں، اور
اپنے رسوم اور تہذیب و تمدن کو گجراتی سوسائٹی مین بھی داخل کر دیا، اور گجراتی سوسائٹی نے اپنا بہت کچھ اثر ان پر ڈالا، اسطرح
سے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے ملنے جلنے سے ایک جماعت کی خصوصیات کو دوسری جماعت نے اختیار کر لیا، یہ مختلف
جماعتیں ایک طریقہ پر متحد ہوگئیں، ان کے طریقے اور رسوم مشترک ہوگئے، ان کا تمدن ایک ہوگیا، اور اون کی سوسائٹی متحد
ہوگئی، اور اس طرح انکی تاریخ، زبان اور لٹریچر سب نے باہم ملکر ترقی کی،

"انار یاز" کی زبان کو چھوڑ کر ایسا یقین کیا جاتا ہے، کہ صرف سنسکرت ہی تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونی چاہئے،
بہت سی ملکی اور غیر ملکی زبانیں اس وقت کی سنسکرت کے ساتھ مل جل گئیں، اور یہ تمام زبانیں آپس مین ایک دوسرے پر اثرانداز
ہوئین، اس طرح سے ان زبانون مین سے ہر ایک زبان نے کچھ اپنا کھویا کچھ دوسری زبان سے لیا، اور جس کو جذب نہ کر سکے
چھوڑ دیا، برہمنون اور اعلیٰ طبقہ کے لوگون کو خاص کر سنسکرت پڑھنے کا عام طور سے حق حاصل تھا، اور یہ تکلیف دہ امر ہے،
کہ اسطرح دوسری جماعتون کا اس بڑے تمدن کی زبان کے ساتھ تصادم نہین ہوسکا، تعلیم اور تمدن کا فقدان، تلفظ کی
دشواریان اور ادنیٰ جماعتون کی جہالت بعض وہ وجوہ ہین جن سے سنسکرت عوام مین دخل نہ پاسکی، اور مستقل اور عام طور
پر مقبولیت نہ حاصل کر سکی، تہذیب و تمدن کے طالب علم سنسکرت کا مطالعہ کرتے تھے، اور شایستہ سوسائٹی کی زبان بھی ایسے
وقت مین سنسکرت تھی، جب کہ سوسائٹی کے بعض اشخاص ٹوٹی پھوٹی سنسکرت پراکرت بولتے تھے، اب سنسکرت نے اپنی
ممتاز جگہ کو کھونا شروع کیا، ایسے موقع پر آریہ قوم کا قیام ہندوستان کے شمالی حصہ مین نہین معلوم ہوتا تھا، بلکہ وہ گجرات
اور دیگر جنوبی صوبون مین چلے گئے تھے، آریون کے دور دراز صوبون مثل گجرات اور بنگال مین چلے جانے آمد و رفت کی

---

[۱] یہ قطعاً غلط ہے بلکہ ایرانی لوگ مسلمانون سے پہلے ملک گجرات مین تجارتی آمد و رفت رکھتے تھے مسلمانون کے ایران پر قابض
ہو جانیکے بعد وہ تجارتی سلسلہ ٹوٹ گیا، تو وہ یہین رہ پڑے، (ابو ظفر)

سھولتین نہ ہونے مختلف آب و ہوا، اور ملکی اور غیر ملکی جماعتون کے آپس مین ملنے جلنے سے نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت کی مختلف شاخین نکل آئین، پراکرت، پالی، مگدھی، اردھ مگدھی وغیرہ پراکرت کی مختلف شاخین ہین،

علاوہ اس کے پراکرت خود خراب ہوگئی، اور اس سے ایک اور زبان "اپھابراہمنست" پیدا ہوئی، "اپھابراہمنست" ازمنۂ متوسط مین گجرات کی زبان تھی، "سدھ راج جے سنگھ" کے زمانہ کے پنڈت ہیمچند سوری نے "اپھابراہمنست" زبان کے قواعد اُس وقت لکھے تھے، جب کہ ہندوستان کی دیگر صوبہ وار زبانون مین کسی زبان کو یہ فخر حاصل نہ تھا، "اپابراہمنست" مین بھی بہت سی تبدیلیان ہوئی ہین، ہر ایک صوبہ کو اپنی خاص زبان رکھنے کا فخر تھا، ہندی، وراج، مارواڑی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی زبانین وجود مین آئین، مارواڑی زبان یا تو گجراتی زبان کی شاخ، یا اسکی مختلف شکل یا ہندی اور گجراتی دونون ملی ہوئی زبانین ہین، ان زبانون مین بھی صوبہ وار زبان کی خصوصیات پائی جاتی تھین، ہر ایک زبان صاف اور مہذب ہونے لگی اس طرح سے ہماری موجودہ متمول گجراتی زبان جو قریبًا ایک کروڑ انسانون کی مادری زبان ہے، وجود مین آئی،

اس نے اپنی بعض اصلی خصوصیات کو قائم رکھا ہے، اور نئی خصوصیات اور دوسری زبانون کی خاص خاص باتین اُن سے وقتًا فوقتًا ملنے جلنے سے حاصل کرلی ہین، سنسکرت گجراتی کا مخرج ہے، اور یہی وجہ ہے کہ گجراتی زبان سنسکرت زبان کی خصوصیات اور دیگر اوصاف سے پُر ہے، گجراتی کی لغت مین بہت سے سنسکرت کے الفاظ ہین، اور یہ الفاظ دو قسم کے ہین، ان مین سے بعض وہ الفاظ جو قسم اول سے تعلق رکھتے ہین اپنی اصلی سنسکرت کی شکل مین ہین، اور باقی ماندہ الفاظ دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہین، گو علم اللغۃ کے قواعد کی وجہ سے ان مین قدرے تبدیلی واقع ہوگئی ہے، لیکن پھر بھی وہ الفاظ سنسکرت سے لئے گئے ہین، جو الفاظ قسم اول سے تعلق رکھتے ہین، بہت ہین، اور ہم ان مین سے بعض الفاظ مثال کے طور پر ذیل مین دیتے ہین، ان تمام الفاظ کا شمار کرنا اتنا ہی دشوار امر ہوگا جتنا کہ ایک ڈکشنری کا تیار کرنا، لیکن ان مین سے بعض الفاظ جو عام طور پر داخل ہوگئے ہین، انھین انتخاب کرلیا ہے، اور وہ یہ ہین،

سنگیت، ودھا، بدھی، مت، شریر، آتن، منتو، ایشور، پشو، کیپنتی، شاستر، تھاگ، النکار، ہنسکار، آنب، ناری، ندی، لکشمی، پتنگ، مستک، جنم، نام، وددان، پنڈت، سرناسور، گرک، بھگتی، شششٹ، دپتی، اندر، یدو وغیرہ، ان الفاظ مین

سے بہت سے الفاظ کو مِن یا کو جا تین بدل دیا گیا ہی، یُوان، جوان بن جاتا ہے، اور یتی جتی مین تبدیل ہو جاتی ہے،

علم اللغۃ کے قواعد کے مطابق بہت سے الفاظ مین تغیر و تبدل واقع ہوا ہے، سنسکرت سے اون کو پراکرت مین لیا گیا تھا، اور پراکرت سے اُنھین "اپا براہمنت" مین داخل کیا گیا تھا، اور وہان سے انھین گجراتی مین شامل کر لیا گیا تھا، ان تمام الفاظ کو جنہین تبدیلیان واقع ہوئی تھین، اس مختصر مضمون مین شامل نہین کیا جا سکتا ہے لیکن ایک عام قاعدہ کا بیان کر دینا کافی ہوگا، جس سے یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے جس سنسکرت لفظ کے آخر مین "اک" واقع ہو، وہ پراکرت یا اپا براہمنت مین "اُٹ" مین تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر وہ گجراتی "او" مین تبدیل ہو جاتا ہے، مثلاً:-

سنسکرت،	پراکرت یا اپا براہمنت،	گجراتی،
دنتک،	دنتٹ،	دنتو،
مرکٹک،	مکٹٹ،	ماکڑو،
پرستر‌ک،	پتھرٹ،	پتھرو،
کرپک،	کپیٹ	کانو
رسک،	رسٹ،	رسو،
بھارک،	بھارٹ	بھارو وغیرہ،

جس سنسکرت لفظ کے آخر مین "ک" واقع ہو، وہ گجراتی مین "آ" سے بدل جاتا ہی، مثلاً:-

سنسکرت،	پراکرت یا اپا براہمنت،	گجراتی،
دنک	دنتو،	دان،
کرک،	کینتہ،	کان،
ہت، (؟)	ھتو،	ہاتھ،
رسن (؟)	رسو،	رس،

اس طرح سے گجراتی لفظ کا مخرج عام طور پر سنسکرت مین ملتا ہے، اور گجراتی لغت کا زیادہ تر حصہ ایسے الفاظ کا ہوتا ہے، جو یا تو سنسکرت ہوتے ہین، یا جو سنسکرت سے لئے جاتے ہین، اور جنمین علم اللغۃ کے قواعد کے مطابق تبدیلیان ہوتی رہتی ہین، گجراتی زبان پر سنسکرت کا اثر بہت زیادہ ہے، اس سے ہم یہ دیکھ سکتے ہین، کہ سنسکرت کا اثر گجراتی پر بہت مضبوط ہے، اور اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے، اور وہ یہ ہے، کہ گجراتی اور دیگر صوبہ وار زبانین اپنی اصلی زبان سنسکرت سے نکلی ہین، لیکن بوجہ زمانہ گذر جانے کے، اور غیر ملکی لوگون کے ساتھ بہت عرصہ تک میل جول رکھنے کے، اور غیر ملکی زبانون کو ان کی اصلی غیر تبدیل شدہ حالت مین جذب کرنے کی قابلیت نہ ہونے کے بہت سی تبدیلیان واقع ہوگئی ہین، اور نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ صوبہ دار بول چال کی دو زبانین بن گئی ہین،

دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھنے سے اور علم اللغۃ کے دوسرے عام قاعدہ کو لینے سے مذکورۂ بالا حقیقت اور زیادہ صاف طور سے معلوم ہوتی ہے، کوئی زبان بغیر تبدیل ہوئے نہین رہ سکتی، ہر سو سال مین کچھ نہ کچھ تبدیلیان ضرور ہوتی ہین، اور یہ تبدیلیان کچھ اس غیر معلوم طریقہ سے ہوتی رہتی ہین، کہ وہ آسانی سے نظر نہین آسکتی ہین، مزید یہ کہ وہ اتنی سرعت کے ساتھ ہوتی ہین کہ وہ شخص بھی جو جاتا ہے، اور زبان کی تنقید کرتا رہتا ہے، ان کی غیر معلوم رفتار پر قدغن لگانے مین پس و پیش نہین کریگا، اس طریقہ سے تمام صوبہ وار زبانین مثلاً گجراتی، بنگالی، ہندی، مرہٹی، وغیرہ سنسکرت سے مختلف اور علحدہ ہین، اور دوسری طرف سے نظر ڈالنے سے ہم کو مشترک ہونے کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے، گجراتی، بنگالی، ہندی، مرہٹی وغیرہ تمام خاص طور پر ایک دوسرے سے علحدہ ہین، ایک صوبہ کا باشندہ دوسرے صوبہ کی بات چیت یا زبان نہین سمجھ سکے گا، لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ یا تو لغت یا ایک صوبون کی زبانون کے قواعد مین اشتراک ضرور معلوم ہوگا، اس سے ایک صوبہ کے باشندے کو دوسرے صوبہ کی زبان کا مطالعہ کرنے مین بہت مدد ملتی ہے، اس قاعدہ کے مطابق دنیا کی تمام زبانین خواہ وہ کتنی ہی مختلف اور جدا ہون، تمام ایک دوسرے سے ان طریقون پر وابستہ کردی گئی ہین،

ان غیر معمولی حالات کے ماتحت زبانون کے علم اللغات کا ارتقاء ہوا ہے، گجراتی زبان سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ تر نازک ہوگئی ہے، کیا ان کے حسن اور نزاکت کے ورثہ سے اس کی لاڈلی بیٹی ہمیشہ محروم رہ سکتی ہے، اس بحث کو کہ گجراتی کا

سنسکرت کے ساتھ کیا رشتہ تھا، طول دینے کی ضرورت نہین ہے، اب ہم یہ دکھین گے، کہ گجراتی زبان دوسری زبانون کی کہانتک زیر بار احسان ہے، ہندوستان کی اصلی زبان "دیشیا" کہلاتی تھی، اس زبان کے بعض الفاظ چند تبدیلیون کے بعد گجراتی مین داخل کرلئے گئے ہین، ان مین سے بعض یہ ہین،:-

دیشیا،	گجراتی،
کڈایو،	کڈیو،
کوئیلا،	کوئیل،
ڈنگارو،	ڈونگرو،
پدن چا،	نیاچ،
اوسریا،	اوسری،
اوکھیا،	اکھیون،
منکاڈ،	نکون،

ان کے علاوہ کھاپو، شاپنہ، ڈالبھو، بامیان، نیستی، بھانڈے، ڈھانکے، کھانڈے، چابانی، ڈھیکون، وغیرہ تمام دیشیا الفاظ ہین،

گجراتی کا مرہٹی زبان کے ساتھ بھی رشتہ بہت قدیم ہے، مرہٹی زبان کا اثر قدرے گجرات کے قدیم ترین شاعر "نسیاح" مین بھی پایا جاتا ہے، کبھی کبھی وہ مرہٹی لفظ "چا" جو اسم صنس کے آخر مین واقع ہوتا ہے، بے تکلف استعمال کرتا ہے، اس کی نظمون مین سے ایک نظم مین ہین چار یا پانچ سطرین خاص مرہٹی کی ملتی ہین، مسلمانون کی حکومت کے بعد مرہٹون نے گجرات پر کچھ وقت تک حکومت کی، اور اس سے مرہٹی کا اثر گجرات پر اور زیادہ ہوگیا، اس وقت بھی شہر بڑودہ کی تقریباً نصف آبادی مرہٹون اور دکنیون کی ہے،

کاٹھیاواڑ کے گجراتی بولنے والے "کاٹھی" اور "اہیر" جب کبھی وہ ادب کے ساتھ کسی معزز خاتون سے مخاطب

ہوتے ہین، تو وہ لفظ آئی کو جو ماں کے لئے مرہٹی لفظ ہے، بے دریغ استعمال کرتے ہین، گجراتی شاعر پریمانند جس نے مرہٹون کی حکومت کی ابتدا مین ترقی کی بعض وقت اپنی نظمون مین لفظ "ڈرل" استعمال کرتا تھا، جو خالص مرہٹی زبان کا لفظ تھا، ان کے سوا الفاظ مثل "اٹا پڑ نائی" وغیرہ بہت زیادہ عام ہوگئے ہین، گجراتی مرہٹی کی نسبت ہندی سے زیادہ صاف طور پر مناسبت رکھتی ہے، ہندی اور "ڈراج" کا گجراتی پر اتنا مضبوط قبضہ تھا کہ دیارام، پریمانند، نرسینہ، اور میران، جیسے بڑے شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہین رہ سکے، دیارام کا دیوان شاید ہندی مین گجراتی کے بہ نسبت زیادہ ہے،

ہندوستان بحیثیت مجموعی عدم تشدد کے مسلک پر کاربند ہے، اور گجرات زیادہ کاربند ہے، گجرات کی زبان بھی اس صوبہ کے لوگون کی طرح نازک واقع ہوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ گجراتی زبان اس قدر نرم اور نازک ہے، کہ اس زبان مین کوئی شخص غصہ کا اظہار کافی طور سے نہین کر سکتا ہے، جب کبھی کسی گجراتی کو غصہ آتا ہے، تو وہ جان بوجھ کر یا بغیر جانے ہندی مین غصہ کا اظہار کرتا ہے، گجرات کی تاریخ مین ایک ایسا زمانہ بھی تھا جب کہ گجراتی مین نظم لکھنا ذلیل کام خیال کیا جاتا تھا، بہترین (اعلیٰ تہذیب یافتہ) شاعر وہ شخص ہوتا تھا، جو یا تو ہندی یا سنسکرت مین نظمین لکھتا تھا، اس دھبہ کو گجرات کے بڑے شاعر پریمانند نے دور کر دیا، اور اوس نے مادری زبان کی ترقی کے لئے مصمم ارادہ کر لیا، مگر وہ بھی ابتدا مین اس دھبہ سے بچ نہ سکا، ہندی کا تسلط گجراتی پر اس قدر تھا کہ اس زبان کا گجراتی پر اثر ہونا لازمی امر تھا، خود پریمانند نے ہندی لٹریچر کی نقل مین نظمین لکھنے کا کام اپنے لڑکے اور اپنے خاص شاگرد ولبھ کے سپرد کر دیا، بعض "ناٹک لٹریچر" اور بڑی نظمین نیم تاریخی لٹریچر کی ہندی کی نقل ہین،

گجرات کا صوبہ تجارتی میدان کے لئے مشہور ہے، ہندوستان تمام دنیا کی تجارت کا مرکز سمجھا جاتا تھا، اور دنیا کو اپنا مال و اسباب مہیا کرتا تھا، ہندوستان کا دوسرے ملکون کے ساتھ تعلق عام طور پر سمندر کے راستون کے ذریعہ تھا، اور گجرات ان راستون کی کڑی تھا، بھروچ، سورت، اور کھمبایت، گجرات کے خاص اور قدیم ترین بندرگاہ تھے، نہ صرف گجرات، بلکہ ہندوستان کا تجارتی کاروبار انھین بندرگاہون کے ذریعہ کیا جاتا تھا، قدیم ترین

غیر ملکی سوداگر جنھوں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنی شروع کی، وہ عرب تھے، ہندوستان اور عرب کے سوداگروں کے درمیان تجارتی رشتہ (مسیح سے پہلے) موجود تھا، اس لئے بعض عرب سوداگروں نے کھمبایت اور گجرات کے بندرگاہوں پر سکونت اختیار کرلی، کھمبایت عربوں کا خاص مرکز تھا، اور اس مین کوئی تعجب کی بات نہین ہے، کہ گجراتی زبان کا اثر ان پر ہوا، اور یہ اتصال مسلمانون کی حکومت کے بعد اور زیادہ مضبوط ہوگیا، ساتوین صدی عیسوی کے بعد مسلمان ہندوستان کے بہت سے مختلف حصون مین اور زیادہ بستے چلے گئے، پٹھان، مغل، ترک عرب اور بہت سی دیگر مسلم قومین ہندوستان پر حملہ آور ہوئین، اس کا اثر گجرات پر ہوا، اور وہ اس اثر سے بچ نہین سکتا تھا، محمود غزنوی نے ہندو بادشاہ بھیدیو (بھیم دیو) کے زمانہ مین گجرات پر حملہ کیا، لیکن وہان سکونت اختیار کرنے کے بجائے وہ سومناتھ دیو کے بڑے مندر کو لوٹ کر وہان سے چلا گیا، اس کے بعد شہاب الدین غوری نے "چھوٹے بھیدیو" کے زمانہ مین گجرات کو لوٹنے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن گجرات کو دراصل علاؤ الدین خلجی نے آخری ہندو بادشاہ کرندیو (کرن دیو) سے، بوجہ خانگی منافشات کے فتح کیا، اس وقت گجرات کی راجدھانی کو "انھل واڑا پاٹن" سے احمد آباد داساول (موجودہ اساول) کے قریب منتقل کر دیا، اور اس کی بنیاد احمد شاہ نے ۱۴۱۲ء مین رکھی، اس وقت سے احمد آباد گجرات کی راجدھانی رہی، محمود بیگڑا نے محمد آباد کی بنیاد ڈالی، اور جوناگڈھ اور چمپانیر کے قلعون کو فتح کیا، اب مسلمانون نے بغیر کسی رکاوٹ کے تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ پر حکومت کرنا شروع کر دی، یہ پہلے ہی سے بتا دیا گیا ہے، کہ سوسائٹی اپنا اثر لٹریچر پر ڈالتی ہے، لٹریری اور سیاسی تاریخین دونون مین کچھ نہ کچھ اشتراک ضرور ہے، ان دونون مین سے کوئی ایک دوسرے پر اثر ڈالے بغیر نہین رہ سکتا، مسلمانون نے مسلسل صدیون تک گجرات پر حکومت کی، اور اس وجہ سے آجکل کی انگریزی زبان کے اثر کی طرح فارسی اور عربی کا بہت کچھ اثر گجراتی پر ہوا، یہی وجہ ہے کہ گجراتی کی لغت مین فارسی اور عربی کے الفاظ پائے جاتے ہین، اور معمولی طالب علم کے لئے ان الفاظ مین جو بہت زیادہ عام ہوگئے ہین، فرق معلوم کرنا قدرے دشوار ہے، ان مین سے بعض الفاظ مخلوط نہین ہوئے ہین، اور دوسرے الفاظ نے علم لغت کے قواعد کے مطابق اپنی اصلی شکل ترک کر دی ہے، اور وہ گجراتی الفاظ بن گئے ہین، جیسا کہ ہم انھین آج پاتے ہین، ایسے فارسی اور عربی الفاظ مین سے چند الفاظ ہم ذیل مین ان کی اصلی اور مخلوط شکلون مین دیتے ہین،

مشکل، قول، تیجانو، حیران، عیب، غیر حاضر، امامت، (امانت) پردو، اثر، ہمارون، خزانون، ڈگلو، بیرہن، باغ، بغیچہ، غلیچہ، ریزو، مادرن، کھانا، کھاتون، دیوانو، نا لو، زنانو، خریطو، جامو، دامو، نگارون، نجلو، کاوا، تکیو، شنبتیہ، حصو، محلو، ہیتو، غریب، غلام، سال وغیرہ، یہ تمام الفاظ اس قدر مانوس ہوگئے ہین، کہ گجراتی بولنے والے ان الفاظ کو اپنی روز مرہ کی بات چیت مین بے دریغ استعمال کرتے ہین، اور ان فارسی اور عربی الفاظ کو جو بول چال مین اور تحریر مین بھی اتنے عام ہوگئے ہین، کہ ترک کردینا قطعی بے سود، اور عملاً ناممکن ہے، ایسی تباہ کن تجویز کا تصور کرنا بھی محض مضحکہ انگیز ہے، مزید یہ کہ خود گجرات کے مسلمان بھی اپنے گھرون مین گجراتی بولتے ہین، اُن کی اردو بہت ہی زیادہ خراب ہے، اور وہ ایک گجراتی اُردو زبان بن گئی ہے، اس طرح سے گجرات کے ہندو اور مسلمان دونون قومین ایک مشترکہ زبان بولنے لگی ہین، اور انھون نے بہت سے مشترکہ تمدنی رسوم ورواج اختیار کرلئے ہین، اس اتحاد نے اُن کی بہت سی قومی تمناؤن کی پرورش کی ہے، ایرانی خصوصیات گجرات کی سوسائٹی اور زبان مین پائی جاتی ہین، ضمیر اتصالیہ "کہ فارسی "کہ" سے لیا گیا ہے، قریبًا تمام اصطلاحات جو گجرات کی عدالتون اور کچہریون مین استعمال ہوتی ہین، وہ یا تو عربی سے یا فارسی سے لی گئی ہین،

یہ ایک قاعدہ ہے کہ جب کوئی غیر ملکی قوم دوسری قوم پر حملہ کرتی ہے، تو حملہ کرنے والی قوم انصاف کے نظم ونسق مین بہت سے اپنی ہی زبان کے الفاظ داخل کرتی ہے، یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ پہلے پہل نئی حکومت کی نگرانی کا دارومدار محض اس کی فوج اور عدالتون پر ہوتا ہے، وہ الفاظ بھی جو پہننے کے متعلق استعمال ہوتے ہین، وہ بھی یا تو فارسی سے لئے گئے ہین یا عربی سے، اس زمانہ کا عدالتی لباس خالص اسلامی لباس تھا، اس کی ایک وجہ اوپر بتائی جاچکی ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ لباس جو کہ اب تک پہنا جاتا ہے، وہ مسلمانون ہی کے زمانہ کا تحفہ ہے، مسلمانون کی حکومت کے زمانہ مین جو ہندو وزیر اور پردھان کے اعلیٰ عہدون پر ممتاز تھے، وہ ناگر اور کایستھ جماعتون سے تعلق رکھتے تھے، ہندو اچھے حساب دان تھے، "ناگر" اور کایستھ" جماعتون کی طبیعت کا رُجحان چونکہ سیاسی تھا، اس لئے وہ عدالتون اور دربارون سے میل جول رکھتے تھے، اُس زمانہ کی عدالتی زبان فارسی تھی، اور اون کو یہ زبان

سیکھنا پڑتی تھی، اور وہ اسکو سیکھتے تھے، اس لئے دوسرے ہندؤون نے بھی فارسی سیکھنا شروع کردیا، اور اس غیر ملکی زبان کے اتصال کا اثر ان کی مادری زبان کو مالدار بنانے مین فائدہ مند ثابت ہوا، ناگرون مین فارسی زبان مین گفتگو کرنا ایک "فیشن" تھا اور آج بھی ہم اُن ناگرون، اور کایستھون کو اس زبان سے خوب واقف پاتے ہین، یہ مسلمانون کی حکومت کا اثر تھا کہ بہت سے فارسی اور عربی کے الفاظ گجراتی زبان مین داخل کرلئے گئے تھے، اب ہم یہ دیکھین گے کہ دوسری کس قوم اور زبان نے گجراتی زبان پر اثر ڈالا ہے، ؟

انگریزون کے آنے سے پہلے فرانسیسی اور ڈچ ہندوستان مین تجارتی اغراض کیلئے بس چکے تھے، ڈچ زیادہ مدت تک نہ رہ سکے لیکن پرتگیز اور فرانسیسیون نے ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات بہت مدت تک قائم رکھے، انھون نے اپنے تجارتی مرکز قائم کئے، "گوا" اور "دمن" اب تک پرتگیز کے قبضہ مین ہین، گجرات کا تجارتی تعلق ان لوگون کے ساتھ تھا، اور اس وجہ سے بہت سے تجارتی الفاظ پرتگیزسے لئے گئے تھے، اُن مین سے حسب ذیل الفاظ ہین، آپوس (آم) پائری (آم) اناناس، کافی، کاجو، اسکوپڑا، پڈری، بٹاٹا، ٹماٹا، تماکو، انگریز، اجنیر (انجنیر) وغیرہ وغیرہ،

اس کے سوا گجراتی زبان نے بہت سے ملکون اور صوبون کی خصوصیات اختیار کرلی ہین، گلی ڈنڈا گجرات کا خاص کھیل ہے، اس کھیل کے اصطلاحات "ٹامل زبان" سے لئے گئے ہین، مثلاً وکات، لین، ملہ، ناز وغیرہ، الچی، کنوی لفظ ہے، اس طرح سے ٹامل، کنڑی اور دیگر جنوبی دور دراز ملکون کی زبانون سے بھی گجراتی زبان کے لغت نے بہت کچھ حصہ لیا ہے، ان کے علاوہ بنگالی زبان کا بھی اثر گجراتی زبان پر ہورہا ہے، اگر کسی صوبہ کی زبان نے گجراتی زبان پر زیادہ اثر ڈالا ہے، تو وہ یقیناً بنگالی زبان ہی ہے، فی الحال بہت سے بنگالی زبان کے ناولون اور کھیلون کا ترجمہ گجراتی مین ہورہا ہے، کلکتہ کی تجارتی جماعت کا بہت بڑا حصہ گجرات کے لوگ ہین، گجرات مین بھی ہم بہت سے آدمیون کو بنگالی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے پاتے ہین، گجراتی لفظ "مہاشئے" جو انگریزی لفظ "سر" کے برابر ہے، خالص بنگالی زبان کا لفظ ہے،

اب ہمین یہ دیکھنا ہے، کہ ہماری موجودہ کورٹ لینگویج (عدالتی زبان) یعنی انگریزی زبان کا گجراتی زبان پر

کہان تک اثر ہوا ہے، انگریز ہندوستان پر ڈیڑھ صدی سے حکومت کر رہے ہین، انگریزی تعلیم کے متعلق بعض قوانین ہندوستان مین ۱۸۳۳ء مین نافذ کئے گئے تھے، ہندوستانیون کو انگریزی تعلیم دینے کی اسکیم تیار کی گئی تھی، اور ان کو کلرک اور غلام بنانے کیلئے یونیورسٹی اور سکنڈری (ثانوی) تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دیا جانا تجویز کیا گیا تھا، اور یہ طریقہ تمام تعلیم گاہون مین اب تک جاری و ساری ہے، لارڈ میکالے نے جس نے انگریزی زبان کو تعلیمی ذریعہ قرار دینے کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کیا تھا، ابتدا ہی مین یہ اعلان کر دیا تھا، کہ اس اسکیم سے ہندوستانی ذہنیت عیسائی خیالات مین تبدیل ہو جائیگی، اور فی الواقع حالت یہی ہے تعلیمی ذریعہ کے لئے حکمران کی زبان کو مادری زبان پر ترجیح دی گئی ہے، اور اس طرح سے جبراً اُسے ملکی زبان پر غالب کر دیا گیا ہے، اس طرح سے انگریزی کے بہت سے الفاظ بول چال، تقریر، سائنس، تاریخ اور جغرافیہ کے گجراتی ڈکشنری مین داخل کر لئے گئے ہین، سائنس کے قریب قریب تمام الفاظ انگریزی زبان سے لئے گئے ہین، یہی حالت انجینیرنگ کے متعلق الفاظ کی ہے، یہ اس لئے ہے کہ تمام سائنس مغرب ہی سے متعلق ہے، ان موجودہ اختراعات کے لئے گجراتی زبان مین ارد و الفاظ نہین ہین، اس سے ایک فائدہ یہ ہوا ہے، کہ ڈکشنری کے الفاظ مین اضافہ ہو گیا ہے، ہین اُن مین سے بعض وہ الفاظ درج کرون گا، جو روزانہ استعمال ہوتے رہتے ہین، مثلاً ٹیبل، کوٹ، پوسٹ آفس، پوسٹ کارڈ، کورٹ، جج، مسٹر، ماسٹر، سائنس، اسکول، کالج، اسٹیشن، ریلوے، ٹرین، کلاس، برج، پیپر، گلاس، مشین، بائیسکل، موٹر کار، انجن، انجینیر، الیکٹریسٹی، پولیس، گیٹ، انجن، یونیورسٹی، گیٹر، نیکٹائی، بل وغیرہ وغیرہ

رسم و رواج، آداب نیز پوشاک کے لئے بھی انگریزی الفاظ لئے گئے ہین، ہمین فوج، عدالت، ملکی نظم و نسق، تعلیم اور مغربی تہذیب کی چیزون کے لئے بھی انگریزی الفاظ گجراتی مین ملتے ہین، ایک وقت وہ تھا، کہ تمام گجرات بلکہ تمام ہندوستان مین انگریزی زبان مروج ہو چلی تھی، لیکن خوش قسمتی سے قومیت کے جذبہ کے بیدار ہونے سے متذکرۂ بالا حالت بہت تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے، اور مادری زبان کے ساتھ محبت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت کے الفاظ بھی بنائے جانے لگے ہین، ہم نے یہ اکثر دیکھا ہے کہ سوسائٹی اور علوم و فنون ہمیشہ دونون باہم منسلک

رہے ہیں، اور لوگ جان بوجھکر یا بغیر جانے بوجھے اپنی ضروریات کے مطابق نئے الفاظ بنا لیتے ہیں، گویائی تحریک نے نئے نئے دو یا تین الفاظ کو باہم ملا کر نئے الفاظ یا پُرانے الفاظ کو نیا جامہ پہنا کر بنائے ہیں، چونکہ آج کل تحریک عدم تعاون خوب زور پر ہے، زبان اور لٹریچر بھی نئے قالب اختیار کر رہے ہیں، گو پہلے لفظ کا پریشن (تعاون) تھا، اب نیا لفظ نان کوا پریشن (عدم تعاون) مروج ہوگیا ہے، اور سول ڈس اوبیڈینس (تحریک سول نافرمانی) سُتیا گائی، خاص مفہوم رکھتا ہے، اور مزید برآن تحریک عدم تعاون نے زبان کو بہت کچھ بدل دیا ہے، پہلے الفاظ کو اہمیت دی جاتی تھی، اور اب اوسکی جگہ خیالات نے لے لی ہے، گجراتی زبان اب زور دار سادی ستھری خیالات سے مملو مضبوط، اور با اثر ہوگئی ہے، الفاظ کی پہیلیاں اب جا چکی ہیں، گجراتی زبان شیریں زبان ہے، خیالات کی گہرائی اس زبان میں سنسکرت زبان سے لی گئی ہے، اس میں نہ تامل زبان کی سختی اور نہ مرہٹی زبان کی سنگدلی ہے جسطرح گجرات میں چھوٹے سیر چھوٹے گھر تنگ گلیاں چھوٹے پلاٹ، چھوٹے شہر چھوٹی سڑکیں ہیں، اس طرح سے زبان بھی چھوٹی نازک معصوم، شیریں حسین مثل معصوم بچے کے ہے، دنیا نے گجراتی لٹریچر کو زنانہ لٹریچر اور زبان بنایا ہے، گو اس میں اس قدر حسن ہے، کہ جب کبھی کوئی غیر ملکی آکر "گربا پارٹی" کو دیکھتا ہے تو وہ درحقیقت گجرات کے حسن و نزاکت اور اسکی زبان سے ششدر و حیرت زدہ ہوجاتا ہے "گربا" ہندو خواتین، آشا مہینے کی پہلی نوراتوں میں گجراتی زبان میں گاتی ہیں، وہ ایک حلقہ بنا لیتی ہیں، اور وہ گاتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہوئے اور پاؤں کو زمین پر ٹپکتے ہوئے چکر لگاتی ہیں،

گربا لٹریچر کی نوعیت گانے والا یا پڑھنے والا دیوی کی طاقتوں اس کے حسن اُس کے لباس، اس کے زیور کی تعریف کرتا ہے، اور اسکی مہربانی کے لئے التجا کرتا ہے، گجرات کے اس نوعیت کا لٹریچر ناظرین کو بنگال میں بھی ملے گا، جہاں متوسط زمانہ کے بنگالی لٹریچر (نظم) کے ہر شاعر نے ہمیشہ کالی کے تعریف کا راگ گایا ہے، کہ وہ ماتا ہے، محافظ ہے، اور کبھی کبھی تباہ کرنے والی بھی ہے، آسوین مہینے کے پہلے نو دن خاص طور سے دیوی کی پوجا کے لئے مخصوص ہوتے ہیں، اور اس زمانہ میں ان گربوں کو بہت کثرت کے ساتھ کاٹھیاواڑ میں مرد اور گجرات میں عورتیں

گاتی ہین، ان عورتون کا حلقہ بناکر گھومنا اور تالیان بجا بجا کر تال دینا اور نصف جسم کو جھکا کران گربون کو رات کے وقت دیرتک گاتے رہنا بہت پیارا نظارہ ہے، سورت، بڑودہ، احمد آباد، اور بمبئی جیسے مقامات مین ان عورتون کا رقص مردون کے رقص سے بہت زیادہ پرلطف ہوتا ہے، مرد تو محض کودتے اچھلتے اور چیختے چلاتے ہین، اور تالیان بجاتے ہین، جب دوسرے صوبہ کا آدمی ان عورتون کو بے پردہ پورے سازوسامان اور مکمل آزادی کے ساتھ گجرات کے شہرون اور قصبہ کے گلی کوچون مین گربا (جھومر) گاتے ہوے دیکھتا ہے، تو وہ اس حسین منظر سے محو حیرت ہوجاتا ہے، گجرات کے گربون مین خاص لٹریچر ہوتا ہے گربون کا نفس مضمون " دیوی ماتا" کی تعریف مین راگ الاپنا ہے، دلبھ ڈھولا نے "بھاجارا" ماتا کی تعریف مین گربے لکھے ہین، اس کے بعد اس مضمون کا بہترین شاعر دیارام تھا، اس نے اپنے گربون مین رادھا اور کرشنا کے حسن وعشق کے قصے دکھائے تھے، یہ بہت زیادہ مقبول ہین اور بہت سی عورتین ان گربون کو دل سے چاہتی ہین، آج کل کے زمانہ مین نانالال، راس، اور گربا، کا بہترین لکھنے والا ہے، اس نے روحانی عشق مین جواب تک گربون کا مضمون ہوتا تھا، دنیاوی عشق کا بھی اضافہ کر دیا ہے، گربے گجرات کی خصوصیات ہین،

گجراتی کی تقسیمات تمام گجرات مین گجراتی زبان ایک ہی طریقہ سے نہین بولی جاتی ہے بلکہ مختلف مقامات کے لئے مختلف تلفظ مخصوص ہین، گجراتی زبان تین خاص قسمون مین تقسیم کی جاسکتی ہے،

۱- **احمد آبادی** یعنی وہ گجراتی زبان جو خاص احمد آباد اور اسکے گردونواح اور بمبئی مین بولی جاتی ہے یہ ادبی زبان ہے جو بولی لکھی جاتی ہے

۲- **کاٹھیاواڑی** گو یہ گجراتی بولی ہے مگر اسکے تلفظ کے طریقہ مین فرق ہے کاٹھیاواڑکے لوگونکا تلفظ بہت وسیع ہے "ڈس" کے بجائے "خ" بولتے ہین

۳- **کچھی** گو کچھ گجرات مین ہے، لیکن اس کی بولی گجراتی زبان سے بالکل جدا ہے، اس پر سندھی زبان کا زیادہ اثر پڑا ہے، احمد آبادی یا کاٹھیاواڑی، کچھی زبان کو سمجھ نہ سکے گا، لیکن باوجود اس اختلاف کے تمام لوگون کی تجارتی زبان وہی ہے، جو احمد آباد مین بولی جاتی ہے، لٹریچر بھی مشترک ہے، کچھی گجراتی زبان کی ایک شاخ ہے، اور وہ ایک ایسی بولی ہے جو صرف بولی جاتی ہے لیکن کبھی لکھی نہین جاتی ہے احمد آبادی کی ایک اور شاخ ہے اور وہ سورتی زبان ہے یعنی وہ زبان جو سورت مین بولی جاتی ہے یہان "شا" ہا" بولا جاتا ہے، جیسے شربت کے بجائے ہربت بولتے ہین،

باقی

خسرو باغ کے مقبرے

از مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف "حیات جلیل" الہ آباد،

(۳)

مقبرۂ خسرو

پھاٹک پر چڑھائے اور جڑے ہوئے نعل نووارد تماشائی کے لیے سب سے پہلے جاذبِ توجہ ہوتے ہین، یہ مرادین برآنے والوں کے حسنِ عقیدت کے نگینے ہین، ان کی تعداد اب بھی کافی ہے، ان میں ہر قسم اور ہر نمونہ کے حاضر ہین، بڑے بھی، چھوٹے بھی، گھوڑون کے بھی، بیلون کے بھی، حتیٰ کہ جوتون کے بھی، ہندوستانی اور انگریزی دونون وضع کے، حال کے لگائے ہوئے نعلوں میں تازگی اور چمک بخوبی نمایاں ہے، اس فلزاتی (معدنی) نذر دنیاز یعنی آہنی نعلون سے منت پوری کرنے کی کوئی معقول اور جلد باور ہو جانے والی وجہ نہین بتائی جاتی، مختلف روایتین زباں زد ہیں، سب سے زیادہ مشہور و مقبول قصہ یہ ہے کہ مرزا خسرو کا گھوڑا نہایت عمدہ، اچھی نسل اور شریف ذات کا تھا، کسی نازک موقع پر اس نے کود کر جان بچائی اور دادِ رفاقت دی تھی، یہ صحیح ہو سکتا ہے، خسرو کے مقبرے کے سامنے یا اس کے دامن میں، جو ایک مسطح پست سا چبوترہ (کچھ کم ایک بالشت اونچا، چار گز دو فٹ لمبا، ساڑھے تین گز چوڑا) مع ایک مختصر نشانِ تعویذ کے بنا ہے، وہ اسی غازی مرد کی قبر بتائی جاتی ہے، مین اس روایت کو باور کرنے اور اس رسم اور اسکی اصلیت کو اس طرح ماننے سے معذور ہون، خادمون کی حاضر جوابی اور فضول گوئیوں کی شکایت ہمیشہ سے چلی آتی ہے، حتیٰ کہ آج سے ایک صدی پیشتر مسٹر فرینچ[1] بھی اسکو برداشت نہ کر سکے تھے، مین نے تو اس قسم کے نعل اکثر قلعون، پرانی عمارتوں اور مشہور روضون پر دیکھے ہیں، ان کی نسبت مجھے معلوم ہوا تھا کہ کواڑوں کی

[1] سیاحت نامہ بالائی ہند ۱۸۳۱ء ۶۳ ص ۱۱۸،

استواری و استحکام اور آہن پوش بنانے کے لیے لگائے گئے ہیں، ان کی خوش اندامی اور جامع ومانع ہیئت کو ان کی برتری و انتخاب کی سب سے بڑی سند سمجھا جاتا ہے، فتح پور سیکری کی درگاہ کے بلند دروازہ (جسکو مسٹر فرنیچ ساو سیع النظر تمام عالم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جلالت و عظمت والا پھاٹک اور ایک عجیب و غریب چیز لکھتا ہے) پر کے سیکڑوں موٹے موٹے اور بھاری بھرکم نعل اسی خیال کے مؤید ہیں، یہی صاحب لکھتے ہیں کہ قلعہ بھرت پور کے عجیب پھاٹکوں پر پتیل کے موٹے موٹے تختے جڑے ہوئے ہیں، ان پر بڑی بڑی کیلیں اور اسی دھات کے لٹو لگے ہیں، میں نے بھی دیکھا ہے کہ دروازہ کی یہ شان اب تک قائم ہے، قلعہ آگرہ کے باہر بیرونی فصیل کے نیچے پھاٹک کے پچھم امرسنگھ دروازہ پر اس بہادر راجپوت کے گھوڑے کی مورت بہتوں نے دیکھی ہوگی، اس شریف نژاد جانور کے متعلق واقعات اور اسکی جولانیوں کی داستانیں بہت سی زبانوں پر ہیں، کتابوں میں بھی، لیکن خسرو کے کسی خاص گھوڑے کا ذکر یا اسکا کوئی کارنامہ صفحات روزگار پر درج نہیں،

مولوی خدابخش خاں مرحوم کے ذخیرۂ نوادر یعنی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی تصاویر کا ایک نایاب البم محفوظ ہے، اس مرقع میں خسرو کی شبیہ بھی ہے، وہ جوانی کی عمر اور اپنے زمانے کے چست مردانہ لباس میں اونچی بنا ہوا ایک چاق چوبند گھوڑے پر سوار ہے، ہاتھ پر کلائی کے قریب ایک شاہباز متمکن ہے، وہ توسن راہوار فرضی و خیالی نہ ہو، تاہم اس کا وجود اور الہ آباد میں آمد متخیلات و موہومات سے خالی نہیں میں اپنی تحقیق و تفحص کے نتیجہ اور قرائن و قیاسات کو اس قبرنما چبوترہ کے حالات میں درج کرونگا جسکا ذکر ابھی کیا ہے،

اس قدیم رسم کے پرستار کچھ ہم ہی نہیں، ایشیا کے حدود سے نکل کر آپ یورپ میں بھی اسکو پائیں گے، عہد برطانوی کی تاریخ حکومت ہند میں محمود غازی کے مقبرے کے دروازوں کا غزنین سے لے آنا ایک عظیم معرکہ شمار کیا جاتا ہے،

---

[1] مفتاح التواریخ صفحہ ۲۷۳ [2] ایضاً ص ۱۷۱، [3] ایضاً ص ۱۱ [4] ان کواڑوں کے متعلق مسٹر بیل نے بعض باتیں اپنے علم و آگاہی اور بعض منشی موہن لعل کے حوالہ سے لکھی ہیں، (مفتاح التواریخ ص ۸۰) مولوی سید احمد تحریر فرماتے ہیں کہ انگوری باغ (قلعہ) کے ایک دالان میں محمود غزنوی کے مقبرہ کا صندلی پھاٹک رکھا ہوا ہے جسے ابتدائی غلطی سے سومنات کے مندر کا پھاٹک سمجھا گیا تھا (تاریخ آگرہ ص ...) .... چنانچہ اس مضمون کا اشتہار انگریزی، اردو اور ہندی میں اس پر چسپاں ہے، (صفحہ ۹۰)

لارڈ ایلن برا نے اپنے اعلان میں اسکو بڑی اہمیت دی تھی، انگریزوں کی سعی تحقیق، کاوش اور دقتِ نظر مسلم ہے، مسٹر ولیم سیمسن نے دیکھا، شبہ کیا، اور قوی وجوہ و دلائل کے ساتھ لندن ڈیلی نیوز کو لکھا کہ یہ پھاٹک تو مندر سومناتھ والے ہو نہیں سکتے، مسٹر فرگسن[1] نے خوردبین سے جانچ کی، تشخیص فرمایا کہ "صنوبری دیودار کی لکڑی ہے، حالانکہ تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ سومناتھ کے مندر کے کواڑ چوب صندل کے تھے، جن پر اعلیٰ درجہ کا نفیس کام تھا، جنکی بڑی شہرت تھی، جنکو محمود اپنی فتحمندی کے اظہار کے لیے گجرات سے کابل لے گیا تھا جو اُسکی وفات کے بعد اُس کے مقبرہ میں لگا دیئے گئے تھے، بیشک یہ کواڑ بھی نئے نہیں ہیں، لنگی اور دستبردِ زمانہ کے بہت سے بدیہی آثار ان پر نمودار ہیں، دِلے چور چور ہو گئے ہیں، بہت سا آرایشی کام ضائع ہو چکا ہے، بدنما بھدّی مرمت لکڑی کی چھپڑیوں ٹکڑوں اور لوہے سے کر دی گئی ہے (سب سے بڑھکر یہ کہ) مشرق و مغرب کے اتصال کی عجیب و غریب کڑی یہاں بھی جلوہ فرما ہے، یعنی اُن پرانے کواڑوں پر گھوڑوں کے نعل کثیر تعداد میں، کیلوں سے جڑے ہیں[2]"

یورپ کے ہنرمندوں نے کامل غور و فکر اور تجربہ کے بعد اپنی کثیر الاجتماع محفلوں اور درباروں کے لئے ایمفی تھیٹر، اور کونسل ہال کے واسطے نعل کی شکل کی عمارتیں پسند و اختیار فرمائی ہیں، کیا اس انتخاب و قرارداد میں آپ مقبرۂ خسرو کی نعل والی رسم کی ذرا سی بھی جھلک دیکھتے، یا اس سے کچھ دور کا لگاؤ تجویز فرماتے ہیں،

رسمی معذرت و عفوخواہی کی ضرورت نہیں، بعض شرق نواز شرفا کی خفیف سی غلط رائی و غلط آرائی سے اختلاف و گریز پر بر خود غلط مقبول مجبور تھا، ورنہ ان فرزانگانِ فرنگ کی تحقیق پسندی اور علم دوستی کا کون نا احسان شناس قائل نہ ہوگا، جو غیر ملک، غیر قوم، غیر زبان کی ایسی گرانقدر خدمت فرما رہے ہیں، اپنے اوقات عزیز کی ساعات فرصت میں جتنا غور کرتا ہوں، ان کی کرامتِ نفس کمال عظمت و عزت میرے دل میں بڑھتی جاتی ہے،

---

[1] مسٹر ڈنکن فرماتے ہیں کہ جیمس فرگسن دنیا میں، عصر حاضرہ کا علم تعمیر و آثار کا سب سے بڑا ماہر اور مستند شخص تھا، اسکی "تاریخ تعمیر" لاجواب اور یادگار زمانہ ہے، دوسری کتاب ہندوستانی اور مشرقی تعمیرات کی تاریخ "بیش بہا ہے ۱۸۸۶ء میں انتقال کیا، (آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۰۷ - نوٹ) [2] فریئیج صاحب کا سفرنامہ، صفحہ ۱۲۹ نوٹ، آگرہ و نواح آگرہ)

سلطان خسرو کی وفات کا قطعۂ تاریخ روضہ کے اندر گنبد کے قریب حاشیہ کے دور میں تحریر ہے،

آہ، افسوس آسمان راسیرتِ بیداد شد | آرے آرے کار چوں برظلم آمد داد شد
زندگی زد خیمہ بیرون از دیارِ خرمی | دید چوں بنیادِ عالم را خراب آباد شد
اہلِ واو باش اند آگاہ از فلک کا حداثِ او | ہر کجا زد شعلۂ خاکسترش برباد شد
گلبنے ہر جا کہ بینی برگ ریز اندر پے ست | بلبلِ ایں باغ بودن مصلحت از یاد شد
گل عذارے را طراوت جیست کا خر خار مرگ | از پئے چاکِ قبا صد سوزنِ فولاد شد
چوں بہ لب رانم حدیثے را کہ می سوزد بہ آہ | مشکل است اما جہاں تا ہست ایں معتاد شد
آں گل رعنا کہ بود آرائے گلشن صد دریغ | عندلیباں را برنگ و بوئے او دل شاد شد
چاک پیراہن شد از خارِ قضا در باغِ عمر | ہم زمین بگریست ہم از آسمان فریاد شد
شد قبا بر قامتِ مردم قبا در ماتمش | شاہِ خسرو را بسوئے خلد چوں ارشاد شد
آں تنِ نازک کہ بروے بود پیراہن گراں | در تہِ خاکِ جفا افسوس استعداد شد
شد غریقِ رحمتِ حق چوں ولیِ پاک بود | خاصِ درگاہِ خدا و ہمدمِ اوتاد شد
سلمیٰ ارشد سال فوتش "فیض لائق" باز گو | صفۂ جنت زجانِ پاکِ او آباد شد

(کتبہ سلطان سرہندی)

خسرو کا تذکرہ نویس حال، خسرو کے اولین تاریخ نگار یا اُس کو حیاتِ جاوید بخشنے والے شاعر کا بھی شکرگذار ومنت پذیر ہے،

ہائے شوقِ جستجو کو کیا کروں | لب پہ بے قصد اُس کا نام آہی گیا

یہ تسلیم ہے کہ سلمیٰ کا نام شعرا کے زمرہ میں پایا نہیں جاتا، میں نے خود بہت سے مطبوعہ ومخطوطہ تذکروں میں تلاش کیا، ناکام رہا، چند وسیع النظر کرم فرماؤں اور اساطینِ علم وفضل کو بھی زحمت وتکلیف دی، کوشش وکاوش

فرمائی، بھی نامشکور ثابت ہوئی، نواب والاجناب مولوی محمد حبیب الرحمن خانصاحب شروانی، صدر یار جنگ بہادر اپنے ملاطفہ عالی میں ارقام فرماتے ہیں:-

"میں اول مرتبہ الہ آباد اس وقت حاضر ہوا تھا جبکہ مسلم بورڈنگ کا سنگ بنیاد مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کے زیر اہتمام رکھا گیا تھا، اس موقع پر پہلی دفعہ خسرو باغ دیکھا، تاریخ پڑھی، نقل کی، اب تک محفوظ ہے، کبھی کبھی نظر بھی پڑ جاتی ہے، جب سے اب تک سلمی ارشد والا مصرع کھٹکتا ہی رہا"

گرامی نامہ کو پڑھکر مزید کاوش کی بے ڈھنگا ہی رہا، ایک شاہزادہ کی تاریخ فوت "فیض لائق" واقعۂ رحلت سے کیا مناسبت رکھتی ہے، میرا قاصر ذہن اس کے فہم سے عاجز ہے، پھر ارشد، باز گو کی کھپت، بھرتی ہی بھرتی ہے، اب "لفظ سلمی" سامنے آتا ہے، بفتح سین بالکسر میم تخلص ہے تو یہ نسبت کس طرف ہے، کوئی مناسب معنی سَلَمی کے نظر سے نہیں گذرے، بکسر سین و میم ہے، تو البتہ سلم بمعنی صلح یا اسلام کی طرف نسبت ہوسکتی ہے، بہر حال پیش نظر تذکرے اس تخلص سے خالی ہیں، ریاض الشعراء داغستانی، مخزن الغرائب، تذکرۂ حسین دوست سنبھلی، مراۃ الخیال، صبح گلشن دیکھے گئے، کسی میں یہ تخلص نہ پایا، اگر سَلمیٰ ہے تو کسی بی بی کا تخلص ہوسکتا ہے، کیا ضرورت ہے کہ جس کی تاریخ ایک معتوب شاہزادے کے مقبرے پر کندہ ہوجائے وہ بانام و نشان شاعر بھی ہو، قابل تذکرہ، رہا یورپین میدان سخن، وہ مجموعۂ خرافات ہے، سوائے تخلص کے کوئی اور لفظ یہاں آہی نہیں سکتا،

میں ان جامع تذکروں کی فہرست میں شیخ محمد افضل سرخوش دہلوی کی مبسوط و مشہور تالیف کلمات الشعراء کو بھی داخل کرنا چاہتا ہوں جو ۱۰۹۵ھ میں شروع ہو کر ایک قرن ممتد کی مسلسل محنت و عرق ریزی سے بارہویں صدی کے عشرۂ دوم میں مکمل ہوا تھا، اس میں جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد کے تمام مستند شعرا کے حالات مندرج ہیں، سرخوش کا دعویٰ ہے[1]

داخل اہل سخن نیست بہ پیش دانا آنکہ نامش نہ بود در کلمات الشعرا

---

[1] خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۶۳ نولکشوری،

وہ بھی سلمی کو اہل سخن کی صف میں جگہ نہیں دیتے، نہ نام لیتے ہیں، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے نقوش اولیں ید بیضا اور سرو آزاد، میں جو فی الجملہ جامع اور ہر صنف کے شعراء کے احوال پر حاوی ہیں، سلمی کا ذکر نہیں کیا، یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کی حیثیت سے ان کا پایہ اسوقت (۱۰۳۱ھ = ۱۶۲۲ء میں) یا اس کے بعد بھی چنداں بلند نہ رہا ہو، شاید یہ بھی اعتراف حقیقت ہو گا کہ ایک بادشاہزادہ کی موت کی تاریخ "فیض لائق" کسی طرح قابل داد نہیں ہو سکتی، لیکن دوسرا مصرع (تاریخ) بلکہ پورا قطعہ، زبان کی لوچ، خیال کی برجستگی، بیان کے زور، حسرت و درد کا قصہ سنانے، دل کی چوٹ دکھانے کے اعتبار سے کس سے کم ہے، جس نے ان کے عنفوان شباب میں باوجود نومشقی وکمی مہارت ایک مہتم بالشان بادشاہی عمارت ایک عالی مرتبت سلطان کے مرقد پر جگہ پائی، واقعہ یہ ہے کہ سلمی نے ایک دوسری حیثیت سے شہرت و نمود حاصل کی تھی صاحب مخبر الواصلین، سید محمد فاضل[۲] ان بزرگ کا پورا نام و نژاد، ملا سلمی ہندی سرمست خاں اور سال وفات ۱۰۹۱ھ بتاتے ہیں[۳] یہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا، ظاہر ہے کہ خسرو کے مرنے کے وقت سلمی محض نوخیز یا جوان رہے ہونگے، ساتھ ہی دلخستہ و جگر ریش، زمانہ کی سردی و گرمی سے کم آشنا، تلخی ناچشیدہ، دنیا سے دل ہٹائے گوشہ گزین بسر کرتے ہونگے، زہد و ریاضت میں مشغول، اپنے قطعہ میں وہ درد بھری باتیں کہہ گئے ہیں جو سن رسیدہ باکمالوں کو بھی نہیں سوجھتیں، وہ خدمت بجالائے ہیں جس کی انجام دہی کی جرأت کسی جاہ طلب اہل قلم کو نہیں ہو سکتی تھی، سید فاضل کیسے مرتبہ شناس نے جب دنیا بھر کے مشائخ اور اہل اللہ کو یاد کیا اور ہر ایک کی وفات کی تاریخیں نکالیں تو ان میں شہرت و نمود سے گریزاں و نفور انسان کے متعلق تین قطعے لکھے، سب کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، یہ شعر کافی ہیں،

(۱) سلمیِ ہندی کہ سخن سنج بود ۔۔۔ رفت ز دنیا بہ رباط بہشت

(۲) مست مئے صلاح سلمی بودست ۔۔۔ تاریخ وصال او ازیں نیز بدال

---

[۱] تاریخ جہانگیر از گلیڈون، صفحہ ۱۷۰، [۲] ابو عبد اللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسین، مظہر الحق اکبرآباد کے باشندے تھے ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۷ء) میں وفات پائی، اپنی کتاب میں ۱۰۶۰ھ تک کے مادہائے تاریخ وفات لکھے ہیں، (قاموس المشاہیر ص ۵۰) [۳] صفحہ ۱۱۹، مطبوعہ ۱۲۶۵ھ۔ مصطفائی،

(۳) چہ در دنیا و عقبےٰ جز خدا و مصطفےٰ ہرگز   ندارد التجا، و تکیہ بر کس سلمی ہندی

(۴) بماہ صوم تاریخ وصال آں سخن آرا   بگفتا ہاتفم بودہ خدا رس سلمی ہندی

پہلے اور چوتھے شعر کے پہلے مصرعوں کو میں نے کئی بار پڑھا، "سخن سنج" و "سخن آرا" سلمی کی شاعری کا درجہ مجھے نہایت ممتاز و رفیع نظر آتا ہے، ان کے صلاح و تقوی، بزرگی و مشیخت کیساتھ ان کا کمال و کلام بھی مسلم ہے، ملا کا لقب اس دور میں اکابر علما، و فضلا کے لیے مخصوص تھا، کون تھے؟ کہاں کے تھے؟ یہ مراحل ہنوز جلبابِ خفا میں ہیں، قرینہ مقتضی ہے کہ بلادِ دکن کو ان کے توطن اور بود و باش کا شرف حاصل رہا ہوگا، اگر اطرافِ الٰہ آباد کے ہوتے تو ان کی شہرت و بلند نامی کا کچھ نہ کچھ نشان اب تک ضرور باقی رہتا[1]،

---

[1] فقیر ہیچمدان یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ خان سرمست کا یہ تخلص یا لقب نسبی امتیاز سے وابستہ تھا، یا انتسابی سے، نسب کا علو و تعلق فریدوں کے پسر بزرگ سَلم تک پہنچتا ہے اور انتساب کی برتری و اعزاز صوفیہ صافیہ کے ایک مشہور اور پرانے خانوادے "سُلمی" تک، جسکو غالباً صحابی جلیل حضرت سَلمان فارسی سے شرف اختصاص حاصل ہے، اس سلسلہ کے چند برگزیدہ شیوخ کے نام مولینا فریدالدین عطار کی لاجواب کتاب، اور درویش صفت صوفی مشرب پروفیسر نکلسن کے مایۂ ناز کارنامے "تذکرۃ الاولیا" (مطبوعہ لائیڈن، ہولانڈ سنہ ۱۹۰۵ میلادی) میں جابجا ملتے ہیں، (۱) عطار سلمی ان میں متقدم الایام پائے جاتے ہیں، جنھوں نے بعض بعض باتیں عبداللہ مبارک کے حوالہ سے اور بعض خود ابراہیم ادہم سے نقل کی ہیں، (صفحہ ۹۶) (۲) احمد سُلمی، ذوالنون کے معاصر و معتقد تھے، (صفحہ ۱۲۱) (۳) عبداللہ سلمی نے وصیت کی تھی کہ میں جب مرون تو ابو حفص حداد کے پانوں پر میرا سر رکھدیا جائے، جنکا حضرت جنید بھی ادب کرتے تھے، (صفحہ ۳۳) ان صورتوں اور اعرابوں کے علاوہ جو نواب محتشم نے تحریر فرمائے ہیں، اس لفظ کی ایک صورت اور بھی ہوسکتی ہے "سُلمی"، ابو عبدالرحمن السُّلمی (ف ۴۱۲ھ و تمہید انگریزی ۱-۸ ا) جن کی زندۂ جاودان مثال موجود ہیں، مگر وزن شعر اس کو قبول نہیں کرتا،

متصوفین کے سوا عرب کے شاعروں میں بھی یہ نام و لقب اور اس لفظ (سَلم) کے بعض مشتقات و مصروفات و منسوبات بہت محبوب و رائج تھے، نامور کاتب عبداللہ بن مُسلم ابن قتیبہ کی "طبقات الشعراء" (مطبوعہ لیڈن، سنہ ۱۹۰۲ء) میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، جیسے عُقبہ بن سَلم (صفحہ ۷۷۴) اور سعید بن سَلم (صفحہ ۵۳۱) وغیرہ، اشجع السلمی (۵۶۲) کے حالات سے واضح ہے کہ سلمیون کا خاندان برامکۂ عجم کا قرابتدار تھا،

صحابہ (سیرۃ النبی ج ۳ صفحہ ۸۳۵ و ۲۳۵) میں بھی حضرت عمرو عتبہ سلمی اور عتبہ بن عبد السلمی کے نام ملتے ہیں، نیز حجاج بن علاط السلمی کا (المستطرف جزء دوم صفحہ ۱۳۳)

شاہی کتابخانہ رامپور کے آلات ہیئت

از

جناب مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی، نائب ناظم کتبخانہ شاہی رامپور،

معارف کے گذشتہ نمبر مین لاہور کے فلکی آلات ساز پر جو مضمون شائع ہوا ہے، اوسکی تقریب سے ریاست رامپور کے شاہی کتبخانہ مین ہیئت و فلکیات کے جو آلات اس وقت موجود ہین، ان پر یہ ایک سرسری تبصرہ ناظرین معارف کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا،

کتبخانہ مذکور مین اس وقت اس قسم کے نو مختلف آلات ہین، جن کا ذکر بترتیب ذیل مین کیا جاتا ہے،

اڈیٹر

۱- اصطرلاب نمبر ۱ | پیتل کا بنا ہوا ہے، علامات و حروف اصطلاحی و اسماء سب بخط کوفی ہین، ½ ۱۵ انچ کا قطر ہے، ¾ ۱۴ انچ قطر کا جوف مین خلا ہے، جسمین ۴ باریک پرت اسی دھات کے تلے اوپر رکھے ہوئے ہین، اور ہر دو جانب نقوش و خطوط سے پُر ہین، ان پرتون کے اوپر ایک ہلالی شکل کا اور پرت ہے، جس کے وسط مین بدری شکل تراشی گئی ہے، اس پرت پر ستارون کے نام کندہ ہین، اور یہ گردش کر سکتا ہے، وسط مین ایک سوراخ ہے جس مین ایک کیل پڑی ہوئی ہے، اس کا ایک سرا موٹا ہے، جس کے باعث یہ وار پار نہین گذر سکتی، دوسرے سرے پر ایک شگاف ہے، جسمین ایک پیتل کا پتلا ٹکڑا ڈال دیا جائے، تو وہ قفل کا کام دیتا ہے،

پشت کے بالائی حصہ پر بخط کوفی صانع کا نام، اور تاریخ و مقام صنعت ان الفاظ مین منقوش ہین:-

"صَنعہٗ السراج بدمشق سنتہ خطوط"

یہ تمام حروف غیر منقوط ہیں، چونکہ تاریخ بلحاظ حروف ابجد لکھی گئی ہے، اس لئے حساب کرنے سے سنہ ۶۱۵ھ برآمد ہوتے ہیں،

۲- اصطرلاب نمبر ۲- پیتل کا بنا ہوا ہے، علامات و حروف اصطلاحی و اسماء غیرہ بخطِ نسخ کندہ ہیں، ۵ انچ کا قطر ہے، جوف میں ۴/۱ ۴ انچ قطر کا خلا ہے، جس میں ۵ پرت پیتل ہی کے نیچے اوپر رکھے گئے ہیں، اور ہر دو جانب منقوش ہیں، اس اصطرلاب کے بالائی ہلالی شکل کے پرت میں پھولدار جالی تراشی گئی ہے، پشت پر وسط میں بخطِ نسخ صانع کا نام اور تاریخ کتابت منقوش ہے، جس کے حروف گھومنے والے حصہ کو بے احتیاطی سے چکر دینے کے باعث کہیں کہیں سے محو ہو گئے ہیں، عبارت یہ ہے :-

عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قاسم[1] محمد بن ملا عیسی بن شیخ الہداد[2] فی سنۃ ۱۰۶۴ھ

۳- کرہ افلاک خورد نمبر ۱ یہ کرہ مسی ہے، تمام علامات ہیئت اور تحریریں بخط کوفی کندہ ہیں، اس کرہ میں ستاروں کے نام، اور ان کے مقامات ظاہر کئے گئے ہیں، ہر ستارہ کے جائے وقوع پر کرہ میں کسی دوسری سفید دھات کی باریک کیلیں جڑ کر ہموار کر دی گئی ہیں، کرہ کو ایک مسی گھیرا محیط ہے، یہ گھیرا اسٹینڈ پر رکھا گیا ہے، اسٹینڈ کے چار پائے ہیں، کرہ کا قطر ۲ انچ کے قریب ہے، اور اسٹینڈ کی اونچائی ۲/۱ ۳ انچ ہے،

کرہ پر ایک جانب ۵ سطروں پر بخط کوفی یہ عبارت کندہ ہے،

سطر نمبر ۱ رسمت هذه الكواكب بعد زياده اطوالها.

سطر نمبر ۲ ركه على مافى صور الى الحسن عبد الرحمن.

سطر نمبر ۳ الكوفى فى سنه ضلل الحرنه وض ه .

سطر نمبر ۴ الرحرد سه د غ ذ ل د.

---

[1] یہ نام غالباً قاسم محمد ہے، (محشی) معارف:- قاسم محمد ہے، [2] یہ نام یا الہداد ہے، اور یا الہدی، (محشی) معارف:- الہداد صحیح ہے،

سطر نمبر ۵ الاسکند ر،

دوسری جانب یہ عبارت ۳ سطرون مین منقوش ہے :-

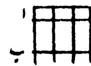
سطر نمبر ۱ صنعہ محمد بن جعفر

سطر نمبر ۲ بن عمر الاصطرلابی.

سطر نمبر ۳ الملقب بجلال .

یہ دونون تحریرین غیر منقوط ہین، اور تاریخ حروف ابجد کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے، مین نے ان عبارتون کو اس طرح پڑھا ہے، رسمت ھذہ الکواکب بعد زیادۃ اطوالھمارہ علی مافی صور ابی الحسین، عبد الرحمن الکوفی[1] فی سنۃ ضلد (۶۳۴ھ) الھجریہ وض ہ (۶۰۵ھ) ایزدجردیہ وغ ذ ل و (۱۷۳۴ھ) الاسکندریہ.

صنعہ محمد بن جعفر بن عمر الاصطرلابی الملقب بجلال

اسٹینڈ کی شکل یہ ہے :- 

صدب پر بخط نسخ یہ عبارت کندہ ہے :- صاحب سابق بوستانجی باشی الحاج احمد آغا ۱۲۱۳ھ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ کرہ ٹرکی مین بھی رہ چکا ہے،

۴- کرۂ افلاک متوسط نمبر ۲ یہ کرہ پیتل کا بنا ہوا ہے، اس مین ستارون کے نام، ان کی مفروضہ اشکال اور جائے وقوع وغیرہ بیان کئے گئے ہین، اسمائے نجوم بخط نستعلیق اور حروف اصلاحیہ ابجدیہ بخط نسخ ہین، ستارون کو ظاہر کرنے کے واسطے سفید کیلین جڑ دی گئی ہین، کرہ کو ایک سی گھیرا محیط ہے، یہ گھیرا اسٹینڈ پر رکھدیا جاتا ہی، اسٹینڈ کی شکل مذکورۂ بالا کرہ نمبر ا کے اسٹینڈ کی سی ہی، کرہ کا قطر ۹ انچ کے قریب اور اسٹینڈ کی اونچائی ۱۶ انچ ہی، اسم صانع اور تاریخ و مقام وغیرہ ندارد، غالبًا دسوین صدی کا ہے،

[1] معارف :- الکوفی صحیح نہین الصوفی ہی، یہ مشہور عالم ہیئت ہی

۵۔ کرۂ افلاک نمبر ۴ کلان | کرہ تانبے کا بنا ہوا ہے، اسمین ۱۲ برجون کے نام، جای وقوع اور اختلاف موسم وغیرہ کو ظاہر کیا گیا ہے، کرہ پر اسما وغیرہ بخط نستعلیق اور اسٹینڈ کے اوپر کے گھیرے پر بخط نسخ کندہ ہین، اس کرہ کے چار پائے ہین، جنکے نیچے کے سرے شیر کے پنجون کے مشابہ ہین، تاریخ کتابت اور صانع کا نام کندہ نہین ہے، لیکن اسٹینڈ کی شکل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸وین صدی عیسوی کی یورپ کی ساخت ہے، ممکن ہے کہ اسٹینڈ دوسرا ہو، کرہ کا قطر ۶ انچ کے قریب ہے، اور اسٹینڈ کی اونچائی ۱۶½ انچ ہے

۶۔ کرۂ افلاک نمبر ۵ | یہ کرہ دفتی کا بنا ہوا ہے، لندن کی ساخت ہے، اسمین اشکال و اسما اور مواقع نجوم ظاہر کئے گئے ہین، اسما بخط انگریزی ہین،

۷۔ ربع مجیب نمبر ۱ | پیتل کی ساخت ہے، ۷ انچ لمبائی اور ۷ انچ چوڑائی ہے، تاریخ صنعت ۱۲۷۳ھ بالائی گوشۂ راست پر بخط نسخ اور صانع کا نام عبدہٗ جمال الدین محمد علی الحسینی عفی عنہ بالائی گوشۂ چپ پر بخط مذکور کندہ ہین، اس آلہ کے حروف اصطلاحی وغیرہ بخط نستعلیق کندہ کئے گئے ہین

۸۔ ربع مجیب نمبر ۲ | یہ آلہ لکڑی کے پالش شدہ تختہ پر بنایا گیا ہے، پالش زرد اور تحریر سیاہ ہے، حروف بخط نستعلیق اور عبارت بزبان فارسی ہے، صانع کا نام مرزا افضل علی عامل ہے، تاریخ صنعت ندارد، ۵۰۰ سال سے اوس طرف کا معلوم ہوتا ہے،

۹۔ دوامی جنتری | یہ آلہ پیتل کے ایک گول ٹکڑے پر بنایا گیا ہے، جس کا قطر ۴ انچ ہے، وسط مین ۲½ انچ قطر کا خلا ہے، جسمین ایک گول پرت رکھا ہے۔ یہ پرت گردش کرتا ہے، اس پرت کے وسط مین ایک تیسرا پرت ہے،

پرت نمبر ۱ پر انگریزی مہینون کے نام، نمبر ۲ پر ہندوستانی دنون کے نام اور نمبر ۳ پر تاریخین ظاہر کرنے والے اعداد سے لیکر ۳۱ تک اور ہندی اور انگریزی مہینون کے نام منقوش ہین،

پشت پر بروج دوازدہ کے اسمار اور کچھ نجومی اصطلاحات منقوش ہین، حروف و اسمار بخط نستعلیق کندہ ہین، شکم کے بالائی حصہ پر یہ عبارت کندہ ہے،

از عمل دہر محنید اختر ح نو جوتشی سمبت ۱۹۱۸

پشت کے بالائی حصہ پر یہ عبارت منقوش ہے:-

برای نظر (نذر) خداوند نعمت حضور فیض گنجور مہاراجہ صاحب بہادر،

تلخیص و تبصرہ

اسلام کے قرون وسطیٰ مین ساہوکاری کی ابتدا

یہ مضمون جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے دو نمبرون (اپریل و جولائی ۱۹۳۲ء) مین شائع ہوا ہے، پہلے حصہ کی تلخیص معارف ماہ جولائی ۳۲ء مین گذر چکی ہی، دوسرے حصے کا خلاصہ سطور ذیل مین پیش کیا جاتا ہی،

جہابذۃ الحضرۃ (COURT BANKERS) کی حیثیت سے یوسف بن فنیحاس اور ہارون بن عمران کا کاروبار خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل مدات پر مشتمل تھا،

۱- مالی کاروبار:- (الف) سرمایہ کا انتظام، (ب) سرمایہ کی ترسیل، (ج) سرمایہ کی فراہمی،

۲- تجارتی کاروبار،

(۱) الف:- سرمایہ کا انتظام | دسوین صدی کے عرب ماخذون سے معلوم ہوتا ہی، کہ اس زمانہ مین لوگون کو دولت جمع کرنیکی حرص بہت زیادہ تھی، ساتھ ہی ساتھ اس کے تلف ہو جانے کا خطرہ بھی بہت تھا، حکومت کے عہدہ دارون اور تاجرون کو اس بات کا اندیشہ رہتا تھا، کہ اون کی دولت حکومت کی طرف سے ضبط نہ کر لی جائے، اس خطرہ کی وجہ سے لوگ اپنے سرمایہ کو کسی محفوظ مقام پر رکھ دینا چاہتے تھے، چنانچہ اس کے لئے طرح طرح کی تدبیرین اختیار کرتے تھے، سونا چاندی کو زمین کے نیچے دفن کر دیتے تھے، یا کنوؤن مین، حوضون مین، کھمبون مین، اور کپڑون مین چھپا دیتے تھے، بعض اوقات ناجائز مال کی ضبطی کے خوف سے اُسے زیورون اور جواہرات کی شکل مین تبدیل کر دیتے تھے، غیر منقولہ جائدادون کو وقف کر کے محفوظ کر لیتے تھے،

اپنی دولت کو زمین میں دفن کرنے یا کسی اور جگہ چھپا کر رکھنے کے علاوہ لوگوں نے اُسے سربرآوردہ اشخاص، تجار اور پیشہ ور ساہوکاروں کے پاس رکھنا شروع کیا، یہ تدبیر بڑے بڑے عہدہ دار اور خلفا کے وزیر اختیار کرتے تھے، اسی لئے عام لوگ بھی ان ساہوکاروں کو قابلِ اعتماد سمجھ کر اپنی دولت اُن کے پاس جمع کر دیتے تھے، مقتدر کے زمانہ کے ہر وزیر کا دستور تھا، کہ وہ اپنا ایک خاص ساہوکار رکھتا تھا، اس امر کی احتیاط کی جاتی تھی، کہ جو سرمایہ ان ساہوکاروں کے پاس جمع کیا جائے، وہ اُن کے کھاتہ میں درج نہ ہو، چنانچہ وزیر ابن الفرات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ اوس نے پوشیدہ طور پر بڑی بڑی رقمیں تاجروں اور ساہوکاروں کے پاس جمع کی تھیں، اسی طرح ایک دوسرے عہدہ دار نے بھی حفاظت کے خیال سے دس ہزار دینار ایک ساہوکار کے پاس جمع کر دیے تھے لیکن اس رقم کو کھاتہ میں درج نہیں کرایا، وزیر حامد بن عباس نے بھی ایک لاکھ دینار شخ ابراہیم بن یوحنا جہبند کے پاس جمع کئے تھے، یوسف بن فینحاس اور ہارون بن عمران جہابذۃ الحضرۃ ہونے کی حیثیت سے خاص طور پر قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے، اور ان کے پاس اس قسم کے سرمایے جمع کئے جاتے تھے، ان سے کاروبار کرنے والے زیادہ تر وزرا، ہوتے تھے خصوصًا ابن الفرات کا کاروبار ان سے سب سے زیادہ تھا، چنانچہ اپنی معزولی کے بعد ابن الفرات کو اقبال کرنا پڑا کہ اوس نے مال المصادرہ کی رقم سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار ہارون بن عمران اور اس کے لڑکے کے پاس جمع کئے تھے،

(ب) سرمایہ کی ترسیل، یوسف اور ہارون نہ صرف دوسروں کا سرمایہ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے، بلکہ رقموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کا کام بھی کرتے تھے، اس زمانہ میں ہنڈی کا رواج شروع ہو گیا تھا، دسویں صدی عیسوی میں قرضہ صرف نقدی کی شکل میں نہیں، بلکہ چک کے ذریعہ سے بھی ادا کیا جاتا تھا، اس چک کو سفتجہ کہتے تھے، سفتجہ کا مقصد یہ تھا، کہ روپیہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک راستہ کے تمام خطرات سے محفوظ رہکر پہنچ جائے، چنانچہ ایک بار ایک شخص نے پانچ ہزار دینار کے سفتجہ کے ساتھ کسی دور دراز مقام کا سفر کیا، اور اوس کے ساتھ صرف ایک راہ نما اور دو ملازم تھے، صوبہ اہواز سے خلیفہ کی والدہ کے لئے تین ہزار

دینار کا ہدیہ بھی سفتجہ کی شکل مین آیا تھا، جدید عرب ماخذون سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان دنون سلطنتِ عباسیہ مین سفتجہ کا رواج عام تھا،

سفتجہ کے ذریعہ سے ترسیلِ زر کا طریقہ نہ صرف غیر سرکاری کاروبار مین رائج تھا، بلکہ اس سے حکومت کے مالیاتی نظام کو بھی مدد ملتی تھی، چنانچہ انھین کے ذریعہ سے سلطنتِ عباسیہ کے صوبون کا محصول بیت المال عامہ مین آتا تھا، ان ماخذون سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۹۱۶ء مین بغداد کے بیت المال سے فارس، اصفہان اور مشرقی صوبون سے اموال سفاتج آتے تھے، علی بن عیسیٰ نے جو اُس وقت مصر و شام کا مہتمم مالیات تھا، ایک لاکھ سینتالیس ہزار دینار محصول سفتجہ ہی کے ذریعہ سے بغداد روانہ کیا تھا، اسی طرح صوبہ جات اہواز، فارس، اور اصفہان کی زمینون کا لگان بھی بیت المالِ عامہ مین سفتجہ ہی کی شکل مین آتا تھا، سفتجہ کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنے کا رواج اسقدر عام تھا، کہ مصنف مفاتیح العلوم اُن اصطلاحات کی شرح کرتے وقت جو حکومت عباسیہ مین رائج تھے، سفتجہ کیلئے صرف "معروفہ" لکھکر خاموش ہو جاتا ہے،

(ج) سرمایہ کی فراہمی — جون جون خلیفہ اور سلطنت کیلئے روپیہ کی ضرورتین زیادہ ہوتی گئین، اس کی فراہمی کی جدید شکلین بھی اختیار کی جانے لگین، عامل مستاجر خلیفہ کو ایک متعین رقم ادا کرتا تھا، اس کے علاوہ وہ حکومت کو کچھ پیشگی بھی دیتا تھا، لیکن بعض قومون پر یہ رقمین ناکافی ثابت ہوتی تھین، اور دوسرے طریقے بھی اختیار کرنا پڑتے تھے، نئے محکمے اور جدید شعبے صرف مالی مقاصد کی بنا پر قائم کئے جاتے تھے، عہدے عمومًا انھی لوگون کو دئے جاتے تھے، جو ان عہدون کے لئے سب سے زیادہ روپئے پیش کرتے تھے، شاہی زمینین فروخت کر دی جاتی تھین، بعض لوگون کی جائدادین ضبط کر لی جاتی تھین، خلیفہ کے خزانۂ خاص مین جو کچھ ہوتا، نکال لیا جاتا، یہانتک کہ کھانے کی ضروریات کے لئے اُس مین کچھ باقی نہ رہتا،

غالبًا ایسے ہی وقتون مین ان یہودی ساہوکارون کی مدد سے حکومت کی مالیات کو مستحکم کرنیکی ضرورت محسوس کی گئی، ہارون بن عمران اور یوسف بن فنیحاس کے جو حالات عرب ماخذون مین دئے ہوئے ہین، اُن

سے معلوم ہوتا ہے، کہ مقتدر کے زمانہ مین یہ دونون سلطنت کے خاص مہاجن تھے، سلطنت کیلئے روپیہ فراہم کرنا ہی اُن کا مخصوص کام تھا، یہ ساہوکار ضرورت کے وقت سلطنت کو قرضے دیتے تھے، تین قرضون کا خاص طور پر ذکر ہے:-

۱- وزیر ابن الفرات نے اپنی پہلی وزارت کے زمانہ مین یوسف بن فنیحاس کو بلاکر قرضہ کا مطالبہ کیا، اور یوسف کو اس کے اصرار سے ایک ماہ کیلئے قرضہ دینا پڑا،

۲- وزیر علی بن عیسیٰ نے ایک روز یوسف اور ہارون کو بلاکر کہا، کہ ہر ماہ کے شروع مین پیدل سپاہ کے مصارف کیلئے مجھے تیس ہزار دیناروں کی ضرورت ہوتی ہے، عموماً میرے پاس اتنی رقم مہینہ کے پہلے یا دوسرے روز موجود نہین رہتی، لہذا مین چاہتا ہون کہ تم ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ڈیڑھ لاکھ درہم قرضہ کے طور پر دیدیا کرو، یہ رقم مہینہ کے اندر ہی تم کو اہواز کی مالگذاری سے مل جایا کرے گی، کیونکہ اہواز کے محاصل کا انتظام تمھارے ہی ہاتھ مین ہے" ان محاصل کے علاوہ جو تمھارے لئے ایک مستقل ضمانت ہین، مین بیس ہزار دینار کا اضافہ مزید ضمانت کے طور پر ادا کرتا ہون، جو ہر مہینہ حامد بن عباس سے واجب الادا ہین، یہ پہلی قسط کا معاوضہ ہوجائے گا" ان دونون ساہوکارون نے شروع مین تو انکار کیا، لیکن بالآخر انھین منظور کرنا ہی پڑا،

۳- وزیر علی بن عیسیٰ نے ۹۱۳ء مین بھی انھی ساہوکارون سے قرضہ لیا تھا، اس قرضہ کیلئے جو طریقہ اختیار کیا گیا، وہ اس سے قبل سلطنتِ عباسیہ کے مالیات مین غالباً کبھی نہین برتا گیا تھا، جب وزیر علی بن عیسیٰ کو مطالبات کی ادائی کے لئے روپیہ کی ضرورت پیش آئی، تو اوس نے تجار سے دس ہزار دینار قرض لئے اور اس قرضہ کی ضمانت سفتجہ سے کی، جو صوبون سے آئے تھے، لیکن جو اُس وقت تک واجب الادا نہ ہوئے تھے، اس قرضہ پر اوس نے ڈیڑھ نقرئی دانق فی دینار سود دینا منظور کیا، جس سے ایک مہینہ مین ڈھائی ہزار درہم ہوجاتے تھے، یہ اقرارنامہ یوسف بن فنیحاس، ہارون بن عمران، اور اون کے جانشینون کے ساتھ سولہ سال کی مدت کے لئے کیا گیا، اس اقرارنامہ مین جواب سے ایک ہزار برس پہلے ہوا تھا، زمانہ حال کی ساہوکاری کے تقریباً تمام اجزاء پائے

جاتے ہین، اُن مین سے خاص حسب ذیل ہین :۔

۱۔ حکومت کی طرف سے قرضہ کی گفتگو،

۲۔ سود کی ادائی،

۳۔ سفتجہ کو ضمانت کے طور پر دینا،

۴۔ حکومت کا ایک یہودی بنک سے قرضہ کا معاملہ کرنا،

(۲) تجارتی کاروبار | ان جہابذۃ الحضرہ کے مالی کاروبار پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اُن کے پاس روپیہ کہان سے آتا تھا، کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سفتجہ کو بھنا کر وہ نقد روپیہ حاصل کر لیتے تھے، پھر بھی اس قدر کثیر نقد سرمایہ کا اُن کے پاس ہر وقت موجود رہنا تعجب سے خالی نہین، آخر اُن کی دولت کے ذرائع کیا تھے، ؟

اُن کی آمدنی کا سب سے پہلا ذریعہ تو یہ تھا کہ جو رقمین حکومت کے عہدہ دار اور وزرا اُن کے پاس جمع کرتے تھے، اُن کو وہ سرمایہ کے طور پر استعمال کرکے فائدہ حاصل کرتے تھے، دوسرا ذریعہ تجارت تھا، یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ یوسف اور ہارون "تجار" کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے، ان ماخذون مین اُن کا ذکر اکثر اسی نام سے آیا ہے، "تجار" اور "جہابذۃ" کے نامون کے فرق سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دونون یہودی تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے، اگرچہ عرب ماخذون مین صرف اُن کے مالی کاروبار کا ذکر ہے، بہرحال یہ خیال کہ وہ تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے محض تجار اور جہابذۃ کے فرق پر مبنی نہین ہے، بلکہ اس کے لئے تاریخی وجوہ بھی موجود ہین، تمام قرون وسطیٰ مین مالی اور تجارتی کاروبار ہمیشہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، مالی کاروبار دراصل تجارتی کاروبار کی ایک ارتقائی شکل ہے، اور قرون وسطیٰ کی تاریخ مین اسکی بہتیری مثالین پائی جاتی ہین، کہ مالیات کی ابتدا تجارت ہی سے ہوئی،

لیکن ایک عرب تاریخی ماخذ سے جو ابھی حال مین شایع ہوا ہے، اور جس سے ان یہودی ساہوکارون

کی حیثیت پر بہت صاف روشنی پڑتی ہے، یہ معلوم ہوتا ہی کہ روپیہ کی فراہمی کیلئے ان کا دار و مدار صرف اپنے ذاتی سرمایہ
دوسرون کی امانت اور اپنے کاروبار کے منافعہ پر نہ تھا، التنوخی کی نشوار المحاضرہ جلد ثانی مین اس اقرارنامہ کے سلسلہ
مین جو علی بن عیسیٰ نے ان ساہوکارون کے ساتھ قرضہ کیلئے کیا تھا حسب ذیل بیان موجود ہی:-

کیونکہ وہ مرتے دم تک اپنی عہدون سے برطرف نہین کئے گئے، وہ عبداللہ بن یحییٰ الخاقانی کے زمانہ مین مقرر کئے گئے تھے، تجار کی نظرون مین جہبذ کے عہدہ کی جاہ برقرار رکھنے کے خیال سے سلطان اُن کو علحدہ کرنا نہین چاہتا تھا، تاکہ تجار ضرورت کے وقت جہبذ کے ذریعہ سے روپیہ قرض دے سکین، اگر کوئی جہبذ نکال دیا جاتا، اور دوسرا اسکی جگہ مقرر کردیا جاتا جس کے ساتھ تاجرون کو اوس وقت تک لین دین کا تعلق نہ ہوتا، تو خلیفہ کا کاروبار معطل ہوجاتا"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہی، کہ خلیفہ کے نزدیک ان یہودی ساہوکارون کی کیسی عزت اور کیا اعتماد تھا، اور وہ دربار کیلئے کسقدر ضروری تھے خلیفہ نے اپنے پچیس[۲۵] سال کے دورِ حکومت مین پندرہ مرتبہ وزیرون کو تبدیل کیا لیکن ان ساہوکارون کو ایک مرتبہ بھی برطرف نہین کیا، اور اُن کو تاحیات برقرار رکھا، اس بیان سے ایک بات اور بھی واضح طور پر معلوم ہوتی ہی، وہ یہ کہ یوسف اور ہارون اپنے وقت کے دوسرے مالدار تاجرون کے اعتماد پر بھروسہ کرسکتے تھے، دربار مین اُن کی مخصوص حیثیت کا راز یہ تھا، کہ وہ اپنے عہدہ، اپنی شہرت، اپنے اعتماد و عزت، اور تجارتی حلقون مین اپنے گونا گون تعلقات کی بناپر وہ رقمین حاصل کرسکتے تھے، جو حکومت اور دربار خلافت کی ضروریات کیلئے درکار ہوتین،

بہرحال مذکورۂ بالا بیانات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ دسوین صدی کی ابتدا مین تاجرون اور ساہوکارون کی ایک باقاعدہ اور مرتب جماعت موجود تھی، جس کا مرکز بغداد تھا، اس جماعت کے سردار یوسف ابن فنخاس، اور ہارون بن عمران تھے، یہ دونون جہابذۃ الحضرۃ تھے، اور بغداد، اہواز اور سلطنت کے دوسرے صوبون کے مالدار تاجرون سے گہرے کاروباری تعلقات رکھتے تھے، یہ سب مل کر خلافت عباسیہ کی ایک اہم معاشیاتی خدمت انجام دیتے تھے، اور بار بار حکومت کی شدید مالی ضروریات کو پورا کرکے اونھون نے اس کو تباہی سے بچانے مین مدد دی،

"ع ز"

یورپین عورتون کی مشرقی سیاحتین اور انکی یادداشتین

عنوان بالا سے الہلال مصر مین ایک مضمون آیا ہے، اس کی تلخیص دلچسپی کیلئے درج ذیل ہے،

اول اول ایک اسپینی لیڈی سلویا (SYLVIA) نے چوتھی صدی عیسوی کے اخیر مین فلسطین کا تعجب انگیز سفر کیا اور اپنے مشاہدات کی ایک یادداشت مرتب کی جسکو ایک اسپینی راہب نے ساتوین صدی کے اخیر مین شائع کیا، اس کے ایک مدت کے بعد ۱۸۸۳ء مین ایک اور پادری نے اوسکی اشاعت کی، یہ لیڈی ایک راہبہ تھی اسلئے اوس نے گرجون، اور مذہبی رسمون اور مشرقیون کے اخلاق وعادات پر نہایت صداقت کے ساتھ لکھا ہے کہ اور یہ پہلی یورپین عورت ہے جس نے مشرق پر قلم اوٹھایا ہے،

اس کے بعد پانچوین صدی سے بارہوین صدی تک کسی یورپین لیڈی کے علمی سفر کا تذکرہ نہین ملتا، لیکن بارہوین صدی کے وسط مین ایک اٹالین عالم عراق مین علمی تحقیقات کیلئے گیا، اور چند دنون بغداد مین قیام کیا، یہان اسکی ملاقات ایک اٹالین لیڈی سے ہوئی، جو بعد کو اس کی بیوی بن گئی، اور یہی لیڈی ہے جس نے مشرق کے اطراف وجوانب کا سفر کیا، اور مشرقی قومون مین رہ کر اون کی زبان اور اخلاق ومعاشرت کا طرز سیکھا، اور ان دونون میان بیوی کے سفر نے یورپین علماء کے سامنے تحقیقات کے نئے نئے دروازے کھول دئے، اور جس طرح قدیسہ سلویا نے مشرق کے متعلق سب سے پہلے مذہبی حیثیت سے لکھا تھا، اوسی طرح اس لیڈی نے سب سے پہلے مشرق کے متعلق علمی اور تاریخی حیثیت سے لکھا،

اس کے بعد ہم درمیان کا زمانہ چھوڑ کر اون لیڈیون کا ذکر کرنا چاہتے ہین جنھون نے اونیسوین صدی عیسوی مین مشرق کا سفر کیا، اور اس سفر کے متعلق علمی آثار چھوڑے،

ان لیڈیون مین مستشرق بلنٹ (BLUNT) کی بیوی سب سے زیادہ نمایان شخصیت رکھتی ہے، جس نے ۱۸۷۸ء مین اپنے شوہر کے ساتھ صحرائے نجد کا سب سے پہلے سفر کیا، اور وہابیون کے مذہب

اور اخلاق کے متعلق یورپین اخبارات مین مضامین لکھے اور اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب اپنی یادگار چھوڑی،

اسی زمانے مین ایک فرنچ لیڈی ڈیولافاے (DIEULA FOY) نے بھی اپنے شوہر کے ساتھ عرب کے شمالی حصہ کا سفر کیا، اور اپنے شوہر کے حکم سے مشرق کی قدیم و جدید زبانین سیکھین،

ایک اور لیڈی الکزنڈرڈیوڈنیل (ALEXANDRA DAVID NEEL) نے بلادِ تبت کا سفر اس وضع کے ساتھ کیا کہ اس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے اور ہاتھ مین ایک درخت کی ٹہنی تھی، جس پر ٹیک لگا کر وہ در در کی دریوزہ گری کرتی پھرتی تھی، اور گھرون کے اندر داخل ہو جاتی تھی، اس طریقہ سے اوس نے بلادِ تبت مین ۱۴ سال بسر کرکے وہان کے باشندون کی زبانین سیکھین، اور ان کی تاریخ اور مذاہب و رسم و رواج کا مطالعہ کرنے کے بعد اس ملک کے متعلق ایک نہایت جامع کتاب لکھی، ایک اور اٹالین لیڈی نے پورے پانچ سال بلادِ اناطولیہ مین بسر کئے، اور اپنی یادداشت مین اس ملک کے متعلق نہایت وسیع معلومات درج کین،

مشہور فرنچ عالم رنیان کی بہن کا نام بھی اس سلسلے مین خاص اہمیت رکھتا ہے جس نے گذشتہ صدی مین ارضِ مقدس کا سفر کیا، اور مشرقی روح، مشرقی خصائل، اور مشرقی ذہانت کے متعلق نہایت بلیغ انداز مین لکھا،

اس کے بعد بیسوین صدی عیسوی مین جنگِ عظیم سے پہلے اور جنگِ عظیم کے بعد بہت سی یورپین لیڈیون نے مشرق کا سفر کیا، لیکن ان کے مقاصدِ سفر مین سخت اختلاف تھا، جن لیڈیون نے جنگِ عظیم سے پیشتر مشرق کا سفر کیا، ان کا مقصد خالص علمی اور ادبی تھا، اور اس مین مذہب اور سیاست کی آمیزش نہین تھی، لیکن جنگِ عظیم کے بعد سیاست ہر چیز مین داخل ہوگئی، اس لئے اس جنگ کے بعد جن یورپین لیڈیون نے اخبار نویسیون کے ساتھ مشرق کا سفر کیا، اونھون نے سب سے پہلے سیاسی اغراض پر قلم اوٹھایا، اور بغض و تعصب سے کام لیکر ان چیزون کو چھپایا، جن کا اظہار سیاسی مصلحت کے خلاف تھا، اور ان چیزون کو نمایان کیا، جن کے اخفا مین کوئی سیاسی مصلحت پوشیدہ نہ تھی، چنانچہ ان لیڈیون مین میڈم جولیٹ آدم، مائرم ہاری، دی سان بوان، روزنیا فورس اور بادش بجز مس میو وغیرہ ہین، جنھون نے مشرق کے متعلق بہت کچھ لکھا، لیکن ان مین سے اکثر کی تصنیفات محض سیاسی مصالح کا آئینہ ہین، "ع"

ادبیات

خونِ جگر

از حضرت جگر مراد آبادی،

ذیل کی سادہ غزل جس مین شاعر نے ہمارے بزرگون کی پرانی بولی مین اظہار مدعا کیا ہے، کس درجہ پُراثر ہی، ضرورت ہی، کہ پُرانے متروکات مین جو الفاظ اور محاورے عمدہ اور شیرین ہین، اون کو پھر سے رواج دیا جائے؛

"اڈیٹر"

کیا بتاؤن عشقِ ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو، جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہی،

جب نہیں تم، تو تصور بھی تمھارا کیا ضرور
اوس سے بھی کہدو کہ یہ تکلیف کیون فرمائے ہی،

ہائے وہ عالم نہ پوچھو اضطرابِ عشق کا
یک بیک جس وقت کچھ کچھ ہوش آجائے ہی،

کس طرف جاؤن کدھر دیکھون کسے آواز دون
اے ہجومِ نامرادی! جی بہت گھبرائے ہی،

تازیانہ

از

جناب اسد ملتانی بی اے

مارچ کے "معارف" مین شاعر کا "ترانۂ شعراء" شائع ہوا تھا، جس مین شعراء کے خصائص کے بیان مین فخریہ پہلو خود بخود نمایان ہوگیا تھا اس خودستائی کے کفارہ کے طور پر شاعر مذکور نے یہ نظم بعنوان "تازیانہ"

لکھی ہے، امید ہے کہ "ترانہ" کے بدمست اس "تازیانہ" سے ہوش مین آجائین گے"،

"اڈیٹر"

کب تک اے غافل یہ بے حاصل خیال آرائیان
ایک گوشے مین پڑے رہ کر فلک پیمائیان

اُڑ کے پہنچے رفعتِ گردون پہ اربابِ عمل
اپنے بستر ہی پہ تو لیتا رہا انگڑائیان

اپنے ہم جنسون کی صحبت سے ہمیشہ اجتناب
اور نجومِ آسمان سے انجمن آرائیان

اک خیال و خواب کی دنیا مین رہنا رات دن
عالمِ ہستی کے ہنگامون سے بے پروائیان

رفتہ رفتہ کرکے زائل قوّتِ سعیِ عمل
تجھ کو لے ڈوبین نہ تیری فکر کی گہرائیان

کب تلک؟ باغِ تصور کا تماشا کب تلک؟
کھول آنکھ اور دیکھ فطرت کی چمن آرائیان

کیون حقیقت کے سمندر کو سمجھتا ہے، سراب؟
اے ترے دم سے فروغِ دینِ سوفسطائیان

تجرباتِ زندگی پر جب نہین ان کی بِنا
سر بسر اوہامِ باطل ہین تری دانائیان

تیری نظرون مین نہ ہو جب تک فضای کائنات
کیا کھُلین تجھ پر خود اپنی ذات کی پہنائیان

تاکہ تیرا دیدۂ باطن کرے کسبِ ضیا،
دیکھ چشمِ ظاہری سے حُسن کی رعنائیان

آہ تو نے حلقۂ الفاظ تک محدود کین،
حُسن کی دارائیان اور عشق کی گیرائیان

اے کہ تو دُنیا مین ہے تفسیرِ کَلّا یَفْعَلُوْنَ،
عاقبت مین بھی تجھے حاصل نہ ہون رسوائیان

بیانِ اثر

از

جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری،

بارشِ نورِ مسلسل جلوہ گاہِ دل مین ہے
کوئی مہوش آج مہمان اس لٹی منزل مین ہے

فطرتِ انسان پرستارِ تجلی کیون نہ ہو، بادۂ عشقِ ازل مینائے آب و گل مین ہے

بیخودی مین امتیازِ دشت و منزل تک نہین کاروان کا کاروان بھٹکا ہوا منزل مین ہے

دیکھتے جاؤ تم انجامِ وفا کو آنکھ سے، پھر چکی ہین پتلیان، کچھ جان ابھی بسمل مین ہے

بزمِ عالم مین نہین گر صاحبِ محفل کا نور کس کا رُعبِ حسن طاری اس بھری محفل مین ہے

کر رہی ہے شمع تفسیرِ رموزِ زندگی ایک چارہ کر دہ ہر ساعت نئی منزل مین ہے

کشتیٔ طوفان زدہ اور بحرِ الفت بے کنار طالبِ ساحل عبث امید لاحاصل مین ہے

نعمتین دونون جہان کی عشق مین سب چھن گئین اک تری تصویر باقی ہے، جو میرے دل مین ہے

خود فراموشی ہی دے گی، اے اثر ان کو جواب

پوچھتے ہین مجھ سے وہ اب کیا تمنا دل مین ہے

سخنِ تاثیر

از

پروفیسر تاثیر، ایم اے لاہور

حُسن کے رازِ نہان شرحِ بیان تک پہنچے آنکھ سے دل مین گئے دل سے زبان تک پہنچے

دل نے آنکھون سے کہی آنکھون نے اُنسے کہدی بات چل نکلی ہے، اب دیکھین کہان تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقین سے واصل انتہا عقل کی یہ ہے، کہ گمان تک پہنچے

کعبہ و دیر مین تو لوگ ہین، آتے جاتے وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغان تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے دل سے ہون دل کی باتین

وائے وہ عرضِ تمنا جو زبان تک پہنچے

مطبوعاتِ جدیدہ

ہندی شاعری از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی، حجم ۲۰۲ صفحے، لکھائی چھپائی ٹائپ کی، کاغذ عمدہ، قیمت عہ، پتہ:- ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد،

کتاب مذکور ایک دیباچہ اور دو بابون مین تقسیم ہے، دیباچہ مین "مسلمان اور ہندی شاعری" اور "ہندی اور اردو زبان" پر اظہارِ خیال ہے، پھر پہلے باب مین بھاشا زبان کی ابتدا، دکھا کر تلسی داس اور ان کی رامائن کے چند ترجمے دئے ہین اور دوسرے باب مین ہندی زبان کے گیارہ بارہ شعرار کا سرسری تذکرہ ہے جنمین پانچ چھ باکمال مسلمان ہندی شعرار کے نام بھی ہین، اس کے بعد ہندی شاعری کا انتخاب چند عنوانون "فلسفۂ زندگی دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی" "حسن و عشق" "فلسفہ اخلاق و حسن معاشرت" "مذمت اہل دنیا" اور "تصوف، معرفت حقیقت" مین درج کیا ہے، لیکن ہمین افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس تالیف سے نہ ہندی شاعری کا صحیح تخیل سامنے آتا ہے، نہ اس کے خصوصیات نگاہ مین آتے ہین، اور کتاب کی ترتیب بھی صحیح مذاق پر نہین ہے، اگر یہ کتاب ہندی شعرار کے تذکرہ مین نہین ہے، اس لئے بھاشا زبان کی تاریخ اور شعرار کے سوانح حیات مین جامعیت موجود نہین، تو ہندی شاعری پر تو نقد و نظر کی ضرورت تھی، اگرچہ مصنف نے چوپایون اور دوہون پر اظہار خیال بھی کیا ہے لیکن بجز بے معنی توصیفی الفاظ کے ان مین کوئی چیز موجود نہین خصوصًا اُن کی تقریبًا ہر ہر چوپائی پر کوئی نہ کوئی بے معنی توصیفی فقرہ موجود ہے، جیسے سبحان اللہ کیا دلآویز تشبیہ ہے، کیا دلکش ہے، وغیرہ، اگر ہر چوپائی اور دوہے کی تعریف و توصیف کرنے کے بجاے اون کی لطافتون کو آشکارا کیا جاتا، خیالات مین جو جدت ہوتی، طرز تعبیر مین جو شیرینی اور مٹھاس ہوتی، اون سب کو نمایان کیا جاتا، تو زیادہ مناسب تھا، ہندی شاعری مین ہجر و فراق کی ستائی ہوئی دکھیاری کی بڑی پُردرد کہانیان اور جذبات ہین، ہندی شاعری سے اس حصہ کو نکال لینے کے معنی اوسکی روح کو

کھینچ لینا ہی لیکن اس کتاب مین بجز بعض جگہ ضمنی تذکرہ کے اسکی تصویر کہین نہین کھینچی گئی، ہمارے نقطۂ نظر سے "منتخبات ہندی کلام" جو اس سے پہلے شائع ہو چکی تھی، وہ بھی اگرچہ نقائص سے خالی نہین جس کا تذکرہ ان صفحات مین آچکا ہے، تاہم وہ ہندی شاعری کی بڑی حد تک صحیح ترجمان ہی، اس موضوع پر یہ موخر الذکر تصنیف اگر اوس سے بلند پایہ نہ ہوتی تو اسے ہم پلہ تو ہونا تھا، پھر بھی ہندی شاعری سے اس وقت تک اُردو دان طبقہ بڑی حد تک نامانوس رہا ہے، اس لئے اوس کے متعلق اردو رسم خط مین جو کچھ بھی ملجائے، اسباغنیمت ہم جناب ڈاکٹر اعظم کریوی کو مشورہ دین گے، کہ وہ چونکہ ایک اچھے ہندی دان ہین، اور اردو کے بھی صاحب قلم ہین، اگر وہ اس قسم کی تصنیف کے بجائے کسی ایک دور کے ہندی شعراء کا تذکرہ اور منتخب کلام مرتب کرین، یا کسی ایک ہندی شاعر کو اردو مین مکمل طور پر پیش کرین، تو وہ ایک مفید خدمت انجام دین گے، اور ایسے کام اردو زبان کے ایسے ہی اہل قلم انجام دے سکتے ہین،

تاریخ عجیب از جناب شیر محمد صاحب کاکوروی حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۴ صفحے، قیمت ۴ر ایس ایچ شیر محمد مشین سانر ویرزہ مرچنٹ، نظیر آباد لکھنؤ،

کہا جاتا ہی کہ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضہ نے کبھی سر کے بال تراشے تھے، اسی مناسبت سے حلاقون کی برادری مین حضرت موصوف کا نام گرامی بطور استاد لیا جاتا ہے، زیر نظر رسالہ اسی تقریب سے موصوف کے مختصر سوانح حیات مین ہی جس مین حجامت کے پیشہ اوس کے لوازم، قیود، شرائط وغیرہ کا تذکرہ بھی آیا ہے، رسالہ کی ترتیب کا مقصود اس انتساب سے اس پیشہ کی وقعت و عزت بڑھانا ہے، اور مسلمانون مین اس پیشہ ور کو جس حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس کو دور کرکے اسلامی مساوات کو پیش کرنا ہے،

سرمایۂ صحت، از جناب حکیم حافظ یوسف حسن خان صاحب سوری، حجم ۱۵ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۴ر مؤلف سے بہار شریف ضلع پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے،

اس رسالہ مین چھوٹے بچون کو حفظان صحت کے اصول، امراض، اور ان سے بچنے کے طریقے بتائے گئے ہین، رسالہ کی زبان کسی قدر اور آسان ہوتی تو مناسب تھا،

ہدایۃ الوریٰ فی تشریح الربوٰ، از مولٰنا محمد تقی صاحب صدر مدرس مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں ضلع ناسک (بمبئی) حجم ۲۶ صفحے، قیمت ۱ر پتہ:- انجمن اصلاح المسلمین مالیگاؤں ضلع ناسک (بمبئی)

اس رسالہ میں سود کی حرمت کو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے، اور آخر میں دکھایا ہے کہ ہندوستان دار الحرب کی تعریف میں داخل نہیں، اس لئے یہاں مسلمانوں کے لئے سودی لین دین جائز نہیں، سب سے آخر میں سود خواری کی وعیدیں نقل کیگئی ہیں،

پانصد دُرِّ نادر، از جناب محمد حسین خانصاحب بی اے، ناشر جناب سید حمید خان بستی نو جالندھر، چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحے، قیمت درج نہیں،

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس مین مختلف صحابہؓ، صوفیہؒ، اور اکابر اسلام کے ایسے پانچ سو مقولے جمع کئے گئے ہین، جو حکمت و موعظت مین ہین، رسالہ کی ترتیب ابواب یا عنوان پر نہین ہے، مقولے ہر قائل کے نام کے نیچے درج کر دئے گئے ہین،

دلیل القاری علی کلام الباری (عربی) از مولوی ابو الوفا صاحب محمود حیدرآبادی، ۸۰ صفحے، قیمت باعتبار کاغذ ۸ر، ۱۰ر، پتہ:- معتمد مجلس احیاء العلوم، حیدرآباد، دکن،

یہ رسالہ علم تجوید وقرأت مین ہے جسمین مختصر طور پر اس کے اصول و قواعد بیان ہوئے ہین،

اربعین عندلیب، از مولوی عبد الوہاب صاحب، عندلیب، ۱۶ صفحے، تقطیع چھوٹی، پتہ، دفتر الواعظ شاہ علی نبڈہ، حیدرآباد دکن،

"اربعین عندلیب" چالیس حدیثون اور اون کے منظوم ترجمون پر مشتمل ہے، رسالہ کے سرورق پر "امتحان و ابتلا، صبر و رضا، انس و محبت" کا عنوان درج ہے، لیکن رسالہ مین مندرجہ احادیث ان سے مختلف موضوع طلب علم، صدق وصفا، اور حسن اخلاق وغیرہ پر ہین، شاید رسالہ کا سرورق بدل گیا ہو،

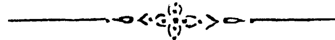
"م"

عدد ۴	ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۳۲

مضامین

شذرات

دار المصنفین سے امسال تین کتابیں چھپکر شائع ہونگی، ایک خیام جسمین خیام کے سوانح اور تصنیفات پر ناقدانہ تبصرہ ہے، اور آخر مین اُس کے چھ فلسفیانہ عربی اور فارسی رسالون اور رباعیات کے ایک مستند نسخہ کا ضمیمہ ہے، ضخامت ۵۰۰ سے کچھ زائد ہوگی، دوسری کتاب سیر الصحابہ کی ساتوین جلد ہوگی، اور اسی پر اس وسیع سلسلہ کا خاتمہ ہوگا، اور تیسری کتاب افکار عصاریہ ہوگی جسمین موجودہ سائنس کے تمام شعبون کے نظریاتی مسائل سہل اور آسان اور دلچسپ عبارت مین لکھے گئے ہین، یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ کی گئی، اور اس خیال سے شائع کیجارہی ہے کہ عربی مدرسون کے نصاب مین داخل ہوسکے، اور عربی خوان طلبہ کو سائنس کے جدید نظریون سے آگاہی ہوسکے،



خوشی کی بات ہو کہ حجاز (مکہ معظمہ) مین "مطبعہ سلفیہ" کے نام سے ایک علمی مطبع قائم ہوا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مفید عربی کتابون کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ازرقی نے جو امام مالک کے ہمعصر ہین، مکہ کی تاریخ لکھی تھی، جو گو یورپ مین چھپ چکی تھی، مگر مدت سے اسکے نسخے مفقود تھے، مطبع مذکور نے اس کے دوبارہ چھاپنے کا اہتمام کیا ہے، حجاز کے مکاتب کے لیے تعلم القرأۃ العربیہ کے نام سے چند ریڈرین چھاپی گئی ہین، اور بعض دوسرے رسالے بھی وہان چھاپے گئے ہین،

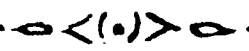


اس سلسلہ مین سب سے اہم خبر یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے امام مالک کی موطا کی جو دو شرحین مسوّٰی (عربی مین) اور مصفّٰی (فارسی مین) لکھی تھین، اور جو ہندوستان مین کئی دفعہ چھپ چکی ہین، مگر اس طرح کہ عربی شرح فارسی شرح کے حاشیہ پر، اب عربی شرح مسوّٰی مستقل طور سے متن مین چھاپی گئی ہے، شروع مین مولانا عبد الوہاب دہلوی مقیم مکہ معظمہ کے قلم سے حضرت شاہ صاحب کے حالات و سوانح لکھے گئے ہین اور مصفّٰی کے شروع مین شارح نے جو مفید مقدمہ فارسی مین

لکھا تھا، اس کا عربی ترجمہ شامل کیا گیا ہے، کہین کہین مولنا عبید اللہ صاحب سندھی سابق ناظم نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے قلم سے مزید حواشی درج ہین، خوبصورت ٹائپ اور مفید حواشی اور ضمیمون کیساتھ اس کتاب کی اشاعت بہترین خدمت ہی، کتاب ۱۲؍ کی قیمت مین شرف الدین کتبی واولادہ کے مکتبہ واقع بھنڈی بازار بمبئی سے ملیگی،



چونکہ اس کتاب کی اشاعت کے ذمہ دار ہندوستان کے علما رہین، اس لئے ان کی خدمت مین یہ گذارش بیجا نہ ہوگی کہ اگر وہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی دیگر فارسی تصانیف کو عربی جامہ پہنا کر شائع کرین تو ہندوستان کی نیکنامی ایک طرف، اس سے زیادہ یہ کہ شاہ صاحب کے علوم سے دنیائے اسلام فیضیاب ہوگی، اور یہ اسلام کی ایک مہتم بالشان خدمت ہوگی، شاہ صاحب کی فارسی شرح مصفّیٰ، درحقیقت ایک مجتہدانہ تصنیف ہے، اس کا ترجمہ بیحد مفید ہوگا، شاہ صاحب کی ازالۃ الخفا نصف عربی اور نصف فارسی مین ہے، اگر یہ کل عربی مین ترجمہ ہو کر کئی جلدون مین شائع ہو تو بڑی خیر و برکت کی چیز ہوگی، شاہ صاحب کی فوز الکبیر فی علم التفسیر کا فارسی متن اکثر ملتا ہی، اور اب عربی مدرسون مین اکثر زیر درس ہی، مگر اسکا فارسی متن عربی طالبعلمون کیلئے وقت طلب ہی، اس کا ایک عربی متن بھی ہی جو ۱۲۹۵ھ مین آج سے ساٹھ برس پہلے مکہ معظمہ مین، مجد فیروزآبادی کی سفر السعادۃ (عربی) کے حاشیہ پر چھپا تھا، اور آخر مین فتح الخبیر شامل تھی، اب اگر مطبعہ سلفیہ ان دونون رسالون کا یہ عربی متن مستقل طور سے چھاپے تو علوم قرآن کی تفہیم و اشاعت کی راہ مین عظیم الشان خدمت ہوگی،



عین اسوقت جب یہ سطرین زیر تحریر تھین مکہ معظمہ مین دار الحدیث کے قیام کی خوشخبری موصول ہوئی، حرم محترم مین حدیث و قرآن پاک کا درس ہمیشہ سے جاری تھا، اور اس فیض کے سرچشمہ سے پوری دنیائے اسلام سیراب ہوتی تھی، جنگ عظیم کے بعد سے حجاز مین فتنون کا جو سیلاب آیا وہ تمام پچھلی روایات کو بہا کر لے گیا، موجودہ حکومت سرمایہ کی کمی کے باوجود ان روایات کو دوبارہ بہتر صورت مین قائم کرنے کے لیے مقدور بھر کوشان رہتی ہی، حرم محترم کے ہر قسم کے مصارف کا بار اوقاف و عطایا و خیرات کی صورت مین کل عالم اسلام اٹھا رہا تھا، اب اس عہد مین اسلامی سلطنتین کچھ تو برباد ہوگئین، اکثر پر عیسائیون نے قبضہ کر لیا، او جو باقی

مین وہان فاسد قومیت و وطنیت کا وہ زور ہے کہ بین الاسلامی تعلقات کا خاتمہ ہوگیا، اب حرم محترم کے مصارف کی ذمہ داری خاص حجاز کی مفلس حکومت اور یا حاجیون کی جیبون پر ہے، اور ان دونون کا سرمایہ حرمین کے ضروری مصارف کا بار اٹھانے کے ناقابل ہے، یہ صورت حال مسلمانان عالم کے غور کے لائق ہے،

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اصل مین یہ کہنا ہے کہ مکہ معظمہ مین حدیث و قرآن پاک کے درس کا انتظام اس حکومت موجودہ کے عہد مین دوبارہ قائم ہو رہا ہے، اور دار الحدیث کے پرانے نام سے ایک نئی درسگاہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ سے قائم کیگئی ہے جسمین علوم حدیث و تفسیر کا باقاعدہ درس جاری ہوگا، صحاح ستہ کا دورہ محدثین سلف کے قاعدہ کے مطابق ہوگا، اور عربی زبان و ادب کی تعلیم بھی ضمناً ہوگی تعلیم کی کوئی فیس نہ ہوگی اور کتابین وغیرہ طلبہ کو مفت ملینگی، بلکہ بعض مستحق طالب علمون کو وظیفے دیئے جائینگے، طریق تعلیم مین محدثین کے پرانے طریق املا، کو زندہ کیا جائیگا، اور طلبہ کو بحث و تحقیق اور تقریر و املا کی مشق کرائی جائے گی، اس کے مہتمم حرم کے امام عبد الظاہر ابو السمح، خزانچی عبد اللہ دہلوی، اور ارکان شیخ محمد نصیف، محمد عبد الرزاق حمزہ، عبید اللہ دہلوی، (سندھی ؟) عبد الوہاب دہلوی، محمد کامل کردی، محمد راضی، محمد نور فطانی محمد سیاد منتخب ہوئے ہین،

ضرورت ہے کہ حساس دل مسلمان ادھر توجہ فرمائین، اور وہ کام جن کے انجام دینے سے آج سلطنتین اغماض کر رہی ہین، ان کو غریب اپنی جھولیون سے انجام دین، ان مفید کامون کے انجام دینے مین حجاز کے مسلک اور سیاست کی الجھنین مسلمانون کو اپنے فرض سے باز نہ رکھین، کہ حرمین کی خدمات کا فرض سیاسیات اور فرقہ داریون سے بلند تر اور اعلیٰ تر ہے، دار الحدیث کے خزانچی عبد اللہ دہلوی صاحب ہین، اور غالباً علی جان صاحب مرحوم کی کوٹھی واقع دہلی کے ذریعہ ہندوستان سے امدادین بھیجی جا سکتی ہین،

تاریخ خطیب پر مولانا شروانی صاحب کا تبصرہ علحدہ رسالہ کی صورت مین چھپ رہا ہے، اس لئے اس کو ضمیمہ کے طور پر آخر مین شائع کیا جا رہا ہے،

مقالات

مسلمانون کی آیندہ تعلیم

(۲)

اخلاق کی تعمیر | تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے، مذہب اور فلسفہ دونون نے اسکو اصولاً مان لیا ہے، کہ انسان بہت سی باتون مین مجبور ہونے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہرحال رکھتا ہے، اور یہی آزادی اوسکی ذمہ داریون کی بنیاد ہے،

غریب کشمکش جبر و اختیار مین ہے،

لیکن انسانون کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہین، اور اُن مین سے ہر ایک یا تو اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھون مجبور محض ہین، اور ان لوازم، خصائص اور اثرات کی بجاآوری پر مضطر ہین جن کے لئے اون کی خلقت ہوئی، آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا، گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی، اور سنکھیا سے موت ہی صادر ہوگی، مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو، اور بدبو، حیات اور ممات دونون صادر ہوسکتی ہین، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہین، اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے،

دوسرے لفظون مین یہ کہیے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرۃً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے، جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے، لیکن انسان تھوڑا اختیار پا کر فعل اور ترک فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اسکی پیدا ہوتی ہے، کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، اور پھر اون کی اغراض کے مطابق اپنے

کام کو پوری مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے، اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام "تربیت" ہے، اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے تعلیم کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کی جائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہون جن کیلئے وہ اس دنیا مین آیا یا بھیجا گیا ہے،

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے، اُسی طرح یہ تمام تر بے اخلاق بھی ہے، ملک مین مسلمانون کی ایک درسگاہ بھی ایسی نہین ہے جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو، اور جس نے اپنی زندگی کا مقصد "با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو، اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہون مین ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، کہ نئی تعلیم کی درسگاہون مین یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تکمیل کے لئے کوشان ہے،

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان مین نہایت محدود ہین، اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود معنی نہین بلکہ اُن سے کہین بڑھ کر وسیع ہے، اخلاق سے مقصود انسان کی قوت نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے، جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کرلے، درس گاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطے کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے، جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب و ہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت ور آب و ہوا کی جگہ ہو، اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی ٹوریم یعنی دار الصحت ہے جہان فاسد جراثیم ہلاک ہو کر بیمار صحیح و تندرست ہو جاتا ہے،

ہمارے گھرون کی اخلاقی و مزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے، کہ ہماری درسگاہون کا ماحول زیادہ صالح، صحیح، اور طاقت بخش ہو تاکہ گھرون کی مسموم فضا سے علحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو، جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق و خصائل کے حامل ہون اور اس طرح ایک دن وہ آئے، کہ پوری قوم کی قوم ان اخلاق و فضائل سے متصف اور مزین ہو جائے،

۱- **سادگی اور صفائی:-** ہماری درس گاہون کا فرض ہے، کہ وہ اپنے بچون کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کرین، صاف ستھرا رہنے کے معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے کے مکان، اور قیمتی فرنیچر اور سامان

کے نہین ہین، افسوس ہی کہ اکثر مسلمانون بچون نے اس کے یہی معنی سمجھے ہین، اس کے دو برے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچون مین پیدا ہین، ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بدلے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہین، اور اس بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گران ہے، اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کوفت بنے ہوئے ہین، دوسرے خود طالب العلم بھی اپنے حوصلے کے مطابق اپنی آمدنی نہ پانے سے ملول و غمگین رہتے ہین جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت برا پڑتا ہے، اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کی یاد اور حل مین صرف ہوتا وہ اُن کے بناؤ سنگار مین، اور جو نہین ہی، اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم مین بسر ہوتا ہی،

ہمارے طالب علمون کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے، ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمھاری عزت تمھارے بیش قیمت کپڑون اور اعلیٰ سامان سے نہین، بلکہ تمھارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہی، طالب علمون کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمایش اور آرایش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو،

مسلمان طالب علمون کو جو مسرف اور نمایش پسند قوم کے افراد ہین خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے، کہ اب وہ وقت نہین کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی مین وہ گران نمایشی زندگی اختیار کرین، جو ہم کو اپنے والدین سے ورثہ مین مل رہی ہی، کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی، اور وہ تمول اب سراب ہی، اس لئے اس کے نمایشی فخر و غرور کے اسباب کو بھی اب ختم ہو جانا چاہئے، ورنہ یہ تعلیم ہمارے افلاس مین روز بروز اضافہ کرتی جائے گی، اور قوم کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی جائیگی، اسکی مثالین آج بہت سے خاندانون مین ملین گی، کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانون کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہی،

دنیا کے دوسرے ملکون سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانون کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہی، کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہین، جو روزمرہ کی زندگی مین صد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے مین بہت کم ہین، بنا برین اس کے پاس ہمارے مقابلے مین دولت کی فراوانی ہی، اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ مین ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہین، ہمسایہ قوم اپنے چند

بچون کو تعلیم دلاتی ہے، پھر دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کامون کے لئے اپنے بزرگون کی متروکہ جائدادون کو قرض مین رہن رکھکر بیچنے پر اور اس کے خریدنے پر مجبور ہین،

آج کل عام طور سے دیکھا جارہا ہے، کہ ہماری درسگاہین اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات مین بیش از بیش نمائش پسندی مین مبتلا ہین، ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد مین ہماری مسجدین ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہماری میزین اور بنچین اور کرسیان تھین، صرف انھی دو مدون کی کفایت کا اندازہ موجودہ گران طریقہ تعلیم سے بآسانی کیا جاسکتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے، کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدون کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس کے بانیون کی ساری محنت زمین اینٹ، اور چونے پر صرف ہوکر رہ جاتی ہے، اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہوجاتا ہے

ہمارے دار الاقامون مین سب سے بہتر دار الاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے، جو اپنے طالب علمون کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے، اور ان کے رہنے کیلئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے، حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے، اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی ہے، جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے،

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ سادگی اور صفائی ہے، ہمارے نوجوانون نے صفائی اچھے کپڑون، فیشن ایبل بالون، خوشبو، عطرون اور تیلون کا نام رکھا ہے، حالانکہ وہ حقیقت مین گھر کی صفائی، کمرون کی صفائی، کپڑون کی صفائی، اور بدن کی صفائی کی اصلی دولت سے محروم ہین، طالب علمون کو اس بات کی عادت سکھانی چاہئے کہ وہ کیونکر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھین جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور صفائی اور ستھراپن جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کرین،

۲- **جفاکشی**، اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان مین مسلمانون کی آیندہ زندگی موقوف ہے، وہ جفاکشی ہے، ہم نے اسلامی اصطلاحات مین جہاد کا نام سن کر اپنی روشن دماغی کے ثبوت مین کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اے عزیزان محترم! اب وقت ہے، کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھین، اور

برت کر دکھائین، جہاد جہد سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہین، حق کی راہ مین ہم جو تکلیف اٹھائین، وہ ہمارا جہاد ہے، دنیا کی زندگی سکون پر نہین دائمی حرکت پر قائم ہے، غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہین، کہ ہم جس قدر سکون پائین گے، اسی قدر آرام اوٹھائین گے، پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا تھا:-

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را — دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن ومردن

لیکن حقیقت مین یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے، راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے:-

فی الحرکۃ برکۃ جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے اور جو آنکھین بیدار رہی ہین، وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہین، اسی طرح محنت ومشقت کے بغیر آرام وراحت کا وجود ہی نہین ہوسکتا جبتک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤن پر نہ ٹپکے گا، جو روٹی ہمارے ہاتھ آئیگی، وہ ہمارے احساس کے ذائقہ کو بھی تسکین نہین دے گی،

سست امیرون کی پر لطف غذائین ہی وہ جراثیم ہین، جو اُن کی بیماریون کو پیدا کرتے ہین، ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے، اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے، وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اوسکی صحت کا خزانہ ہوتا ہے،

مسلمانون کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہئے، ان کی طالب علمانہ زندگی مین یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہئے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضہ مین کر لین تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہراہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے، وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو، ہر ایک مین یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہوسکتا ہے، پچھلی دولت مندی کا خمار اب تک مسلمانون پر چھایا ہوا ہے، ہماری درسگاہون کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علمون کے یہ ذہن نشین کر دین، کہ اب تمھاری زندگی صرف تمھاری محنت جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے، یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے، جس سے نکل کر ساحل تک سلامتی پہنچنا صرف تمھارے ہی ہاتھ پاؤن چلانے پر موقوف ہے،

کون نہین جانتا کہ اس عرصۂ کائنات مین زندگیون کا ایک معرکہ برپا ہو اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے

کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں، افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں، وہی زندہ اور جیتا رہیگا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا، اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے، اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے مین ڈال دے گی، اور افراد اور قومیں اس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی، زندگی کا فلسفہ صرف جدوجہد، محنت اور سخت کوشی ہے، بھوک کی برداشت شکم سیری کا سامان ہے، اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے، فاقتل ثم احیی ثم اقتل فاحیی ثم اقتل فاحیی،

یہ جو کچھ کہا گیا شاعری نہین روزمرہ کی حقیقت ہے، طالب علموں کو اپنے روزانہ کے ورزشی کھیلوں میں کیا یہ راز ہر شام کو علانیہ معلوم نہین ہوتا، کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے، جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا، یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہین، اس میدان مین بھی اسی کی جیت ہے، جو زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش ہے، کامیابی کی راحت انھین کے لئے ہے، جو اپنے کاروبار مین محنت اور جدوجہد کی تکلیف اوٹھاتے ہین،

تمام قوموں مین سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت، اور سب سے زیادہ قابل رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے، جس کے ہاتھوں مین دوسری قوموں کی سلطنت کی باگ ہو، لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو اب پر منکشف نہین کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی، اور یہ قابل رشک ہونے کی صلاحیت اُنکو کتنی محنت، کتنی جفاکشی اور کتنی پے درپے جسمانی تکلیفوں اور اذیتوں کی برداشت کے بعد حاصل ہوئی ہے، محمود نے سترہ حملوں مین پنجاب پر قبضہ کیا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوئے کپڑوں کو تبدیل نہین کیا، بابر نے کامل پندرہ برس پہاڑوں سے سر ٹکرایا، مین نے ان فقروں کو ہمیشہ کہا ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ بدو حنین کی سختیوں کو جھیلے بغیر قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے، جس کو لال قلعے مین شاہجہان کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو، اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیوں مین سر مارنا چاہئے، کوہ کنی کے بغیر "جوی شیر" کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے،

آج یورپ کی قومین دنیا کے طول وعرض مین سلطنت کا تخت بچھائے کوس لمن الملک بجا رہی ہین، لیکن اپنے سپاہیون کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت وجانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت اُن کو نصیب ہوئی ہو، آج تجارتون صنعتون، اور کاریگریون کی زندگی ہے، یہ زندگی کتنی زندگیون کی قربانیون کے بعد حاصل ہوئی ہے، کروڑون مزدور کان کنی مین لگے ہین، لاکھون آلات کے بنانے اور چلانے مین مصروف ہین، لاکھون دن رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگاپو مین مصروف ہین تب جا کر ان کی قوم کے سر پر سلطنت کا تاج ہو، اور ان کے خزانون مین معدنیات، تجارت اور صنعت وحرفت کی دولت ہو،

بابر سے لے کر عالمگیر اوّل تک اور پھر بہادر شاہ اول سے لیکر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ دہلی تک کی زندگیون پر غور و فکر کی نظر ڈالئے، کیا تین سو برس کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہین بتاتی کہ جنھون نے تکلیف کی زحمت اوٹھائی، اونھون نے تختِ سلطنت پر آرام کیا، اور جنھون نے آرام کی خواہش کی اونھون نے عمر بھر زحمتون اور تکلیفون مین بسر کی،

الغرض مسلمان طالب علمون کو اب یہ نکتہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے جو ان کی تعلیمی اور عملی دونون زندگیون مین ان کو کامیاب بنا سکتی ہے، جہان قومی سلطنتین اور قومی تعلیم گاہین ہین، وہان کے نظامِ تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے، کہ ان کے نصابِ تعلیم مین جو اہمیت کتابون کو حاصل ہو، اس سے کم اہمیت ان کے جسمانی کھیلون اور مختلف ورزشون کو حاصل نہین ہے، میدانی کھیلون کے علاوہ پہاڑون پر چڑھنا، دریاؤن مین کشتی چلانا، دھوپ مین دوڑنا، ہواؤن مین اڑنا، وہ کون سی جانفشانی ہے جس کی مشق یہ قومین اپنے حکمران بننے والے افراد کو نہین کراتین، انگلستان کی بہترین درسگاہون کے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور یہ نظر آیا ہے کہ ان ورزشی کھیلون کی اہمیت وہان تعلیم کے برابر ہی برابر ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہان کی عام تعلیم گاہین بھی تقریباً نیم فوجی ہین، اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمامتر نظری رہتی ہے عملی نہین وہان دور ہو جاتا ہے، مسلمانون کو اگر آیندہ ہندوستان کی سلطنت مین حصہ لینا ہو، توان کو یہ نکتہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ آیندہ ان کو صرف نظری نہین بلکہ عملی قوم

بننا چاہئے، اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں،

۳- **خود اعتمادی**، مسلمانون کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے، جس کے بغیر نہ کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہے، اور نہ کوئی قوم خود اعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا، اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام کو شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے، قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظوں مین ادا کیا ہے، اذا عزمت فتوکل علی اللہ، (جب عزم کرے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے، مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو کر گذرنا، اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توحید اور نصرت پر بھروسہ رکھنا،

مسلمانون کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھکر تن تنہا کھڑا ہوتا تھا، اور بحر و بر، دشت و جبل کو طے کرکے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا، ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا، اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر مین علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتون اور درسگاہون سے فیض پاکر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بن کر چمکتا تھا، ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا ساز و سامان لیکر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بن کر نکلتا، اور دولت کے جہاز اور کاروان سے لدا ہند، عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہون مین اترتا، ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لیکر نکلتا اور روے زمین کی فضا کو چیر کر کہین نہ کہین اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا،

مسلمانون کا یہ جوہر اٹھارہوین صدی کے ہندوستان مین ان سے کھو گیا، سُن کر حیرت ہوگی، کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن مین تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار کی فوج سے ہندوستان کو فتح کر ڈالا، اس کی اولاد جب لال قلعے سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے، تو ان مین کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا، کہ کس طرح اپنے ہاتھون سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے؛

والدین اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھتے ہین کہ اس کو تنہا کوئی کام کرنے نہ دین، تنہا راستے مین نہ چلین، راتون کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلین کمرون مین رات کو تنہا سوتے نہ پائین، ایک بڑے عالم باپ کو مین نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہین جانے دیتے تھے کہ یہ کالج مین پڑھنے جانیوالا بچہ کہین آتے جاتے راستے مین موٹرون سے کچل نہ جائے، امیر مسلمانون کے گھرون مین یہ بات دولتمندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے، کہ انائین اور کھلائیان جوان جوان لڑکون سے بھی علحدہ نہ ہونے پائین، ہم نے اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادون کے واقعے سُنے ہین جن کو اس وقت تک نیند نہین آتی تھی جب تک ان کی انا بی بی ان کو پلنگ پر سُلاتی نہ ہون، آپنے ایسے نواب زادون اور امیرزادون کو دیکھا ہوگا، جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے مین جب داخل ہوتے ہین، تو اُن کے ساتھ اُن کو ناگہانی اتفاقات سے بچانیکے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہی،

غریب مسلمانون تک مین یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے، کہ وہ اپنے بچون کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اوٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضامند ہوتے ہین، یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم اور ارادہ کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کمزور ہوتے ہین، اور اس لئے تعلیم کے زمانہ کے اندر اندر بھی وہ اتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہین چل سکتے، اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہین ہو سکتے، الغرض وہ بچپن مین انا اور کھلائی کے، تعلیم مین اتالیق اور ٹیوٹر کے، اور ملازمت مین سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہین، زندگی کے ہر مرحلے مین ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہی، کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلین، ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کر سکتے ہین، کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہین، اُن کی ترقی کا عہد وہ تھا، جب بادشاہ کے زیرِ سایہ امرا کھڑے ہو کر ملک کا انتظام کرتے تھے، اور ان کی تنزلی کا زمانہ جب آیا، تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیرون کے سہارے کھڑے ہو کر تخت پر بیٹھنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیرون نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا، اور بالآخر تخت اور تخت نشین دونون کا خاتمہ ہو گیا،

یورپ کی ترقی یافتہ قومون کے افراد مین آج یہ جوہر ان کی انھین درسگاہون مین پیدا ہوتا ہی، اور اسی کا

یہ نتیجہ ہوتا ہی کہ جس پرزے کو جہان لگا دیجئے، وہین وہ کام دینے لگتا ہے، ایک فرنچ مصنف نے انیگلوسیکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ مین ایک کتاب لکھی ہی، جس کا ترجمہ عربی مین "سر تقدم الانکلیز السکسیونین"، کے نام سے ہوا ہی، اس مین زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہی، کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے، ایک اور فرنچ نے "بیسوین صدی کا امیل" کے نام سے خطوط کی صورت مین ایک کتاب لکھی ہی، اسمین بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے، کہ مان کی گود سے لیکر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکون مین جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کیجائے، وہ خود اعتمادی ہے، ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانون مین خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا، وہی نپولین کے مقابلے مین ہمارے کام آیا،

مسلمان ہندوستان مین جس تعدادی اقلیت مین ہین، اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور عملی طاقت سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہماری درس گاہون کو اس ملک کے مسلمانون کو آیندہ زندگی بخشنے کے لئے ضرورت ہے، کہ وہ اپنے طالب علمون مین یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کرین تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک مین زندہ رہ سکین، اور اس مملکت کے نظامِ حکومت کے قیام اور استواری مین کسی طرح ان سے حکومتِ وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے،

اساتذہ ہماری درسگاہون مین جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہے، وہ استادون کے انتخاب کا مسئلہ ہے، قومی درسگاہون مین اس انتخاب کا معیار یہ ہے، جو کم تنخواہ لے اور سرکاری درس گاہون مین یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذ کی سند رکھے، اور "یورپین کوالفکیشن" تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے، ہندوستان کا کیسا ہی تجربہ کار سے تجربہ کار، ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق ہو مگر اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درس گاہ کے دو لفظ نہ ہون، تو اس کے مقابلے مین بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار اور نوآموز ترجیح پائے گا، ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی، آج انگریز، فرنچ اور جرمن استادون کے نامون کے جادو مین گرفتار ہے، اور اس کو منہ مانگی تنخواہ دینے مین حاتمانہ فیاضی کیلئے تیار ہی،

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہین کیا ہی، بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی

کا کوئی مقصد قرار نہین دیا ہو، اس لئے استادون کے انتخاب کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے، کہ اعلیٰ سند کا کاغذ اور سات سمندر پار کے حکمران اقوام کی گوری شخصیت، انتہا یہ ہو، کہ عربی فارسی اور تصوف کے پڑھانے کیلئے بھی ہم اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہین، جبتک پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر راس کے دستخطون کا کاغذ اس کے پاس نہین،

ہم نے اس سے پہلے مسلمانون کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہو، اگر وہ ذہن نشین ہے تو آپ اسکا فیصلہ کرنے مین ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائین گے، کہ استادون کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھکر ان کی شخصیت مین ان مقاصد کا وجود ہے، جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے، اگر آپ کسی ایسی دو درسگاہون کا باہم موازنہ کرین جنمین سے ایک ایسے اوستادون کا اسٹاف رکھتی ہے، جو اعلیٰ کاغذی سندون کے تو مالک ہین، مگر ان مقاصد سے سر تا سر خالی ہین، اور دوسری گو اعلیٰ کاغذی سندون کے لحاظ سے کم درجہ ہے، مگر اس کے اوستاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہین، جو اس کے تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہین تو یقیناً عملی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہین زیادہ مفید ہوگی، کیا ہماری نئی اسلامی درسگاہین استادون کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہین کہ ان مین سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص، کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت مین مسلمانون کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہو، ؟ کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنائے گا، اور خود اس کا نمونہ بنکر طلبہ کے سامنے آئے گا، ؟ ایسے استادون کے زیر تعلیم و تربیت جنمین سے ہر ایک کا قبلۂ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو، اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک محدود ہو ایسے لڑکون کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہون، قوم پرور ہون، سادہ ہون، جفاکش ہون، اور مسابقت اقوام کی دوڑ مین اپنی برتری دکھاسکین، کہان تک حق بجانب ہے، یہ ویسا ہی ہو، جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتون مین جو بوکر گیہون کاٹنے کی امید رکھے اور اس سے بے خبر ہو، کہ ع

گندم از گندم بروید جو ز جو،

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانون کے سامنے پیش کیا جائے، اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنا لین، وہی درحقیقت استادون کے انتخاب کا معیار ہو،

بوریا باف گرچہ بافندہ است، نہ برندشش بہ بارگاہ حریر،،

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے، کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہین کیا، اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادون کا انتخاب کیا، مثال دیتا ہون، ہم نے عربی پڑھانے کیلئے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا، وہ عربی فیلالوجی اور یورپین عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچون کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوق قومی ہم کو کیونکر عطا کرسکتا ہے، جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہین، بلکہ وہ اس سے منحرف ہے،

ہماری اکثر درسگاہون کے اُستاد صرف پیشہ ور معلم ہین جنھون نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے، ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہین، اور پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہین، کہ وہ آیندہ ہمارے بچون کو ہمارے قومی مقاصد تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کردین گے،

جامعہ ملیہ کو مین مبارکباد دیتا ہون، کہ اوس نے اپنے استادون کے انتخاب مین اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے، اوس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہین، بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو رکھا ہے، فرض کیجئے کہ اگر اس درسگاہ مین ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے اُستاد کو لاکر رکھ دیا جائے، جو گو یورپین اسناد کا بڑا پوٹ اپنے قبضے مین رکھتا ہو، مگر اوس کے تمامتر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہون جن پر اس درسگاہ کی بنیاد ہے، تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب اس کو جامعہ بدر کرنے مین ایک لمحے کیلئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کرین گے؟

پھر کیا ہے کہ ہماری درسگاہون کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تضحیک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین، اور ہمارے وطنی اغراض کی تلبیس کرتے ہین، اور پھر صرف اس لئے یہ گوارا کیا

جاتا ہو، کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے،

جوہر طینتِ آدم زخمیرِ دگر است تو توقع زگل کوزہ گران می داری،

ارکان جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کر دینا ہے کہ ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت اور وطنیت جدید اور قدیم دونوں کی لطیف و معتدل آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہو اس لئے اساتذہ کے انتخاب مین صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہین کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کر دین، یا وطنیت سے انحراف پسند کر لین، اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ مین معلم نہین باقی رہنا چاہئے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کیلئے رواداری کیون برتی جائے، اگر کوئی درس گاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے، تو درحقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلھاڑی مارتی ہے، بہرحال اس بات کے اظہار مین ہم کو کوئی پس و پیش نہین کہ ہماری یہ نوعمر درس گاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے، اور دعا ہے کہ اس کے کارکنون کو اپنے مبدأ کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو،

علوم ہم کو اپنی درس گاہون مین کن علوں کو پڑھنا اور پڑھانا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے، جس پر اب تک مسلمانون نے کیا بلکہ ہندوستانیون نے بھی غور نہین کیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے مین گرفتار ہین، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہین سکتے تھے ہندوستان مین نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے، ان کو بیان کرنے مین برطانی مُدبرین نے کبھی پس و پیش نہین کیا ہو،

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہو کہ ہندوستانیون کے دلون سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے، اس کے لئے اس کی ضرورت تھی، کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے، یہان تک کہ اس مین خدا کا نام بھی نہ آنے پائے،

۲۔ بنگال کی ابتدائی مثالون سے انگریزون کو یہ دھوکا ہوا، کہ یہ نئی تعلیم عیسائیت کی اشاعت مین معین ہو گی، اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولون کی پوری حوصلا افزائی ہوئی، اور ان مین انجیل کی تعلیم داخل کی گئی،

۳- انگریزون کو اپنی حکومت کی تنظیم مین ایسے ماتحتون کی ضرورت تھی، جو اُن کے دفترون کے لئے کچے مواد اور مسالون کو ان کے مطالعۂ تجویز اور فیصلے کے لئے مرتب کر سکین، اور ان کو ان کی زبان مین معاملے کی صورتِ حال کو سمجھا سکین،

ان وجوہ سے جدید درسگاہون کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا، پھر ان مین صرف انھین علوم کو داخل کیا گیا، جو اس قسم کے ادنیٰ تعلیم یافتون کو ان کے لئے مہیا کر سکے، ایسے محرّرون، کلرکون اور ماتحت افسرون کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہئے، تاکہ وہ ان کی زبان مین سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کر سکین پھر ان کو حساب جاننا چاہئے کہ ان کے دفاتر کے حساب وکتاب کو درست رکھ سکین، چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان مین جاری گئی، اُس کی اصلی بنیاد یہی دو چیزین ہین، انگریزی اور حساب، اوس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے، جس سے مقصود صرف اس قطعۂ ارض کا علم ہے، جہان سے آفتاب کبھی نہین ڈوبتا، اور اوس سے اوس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑون کا جوڑ بھی معلوم ہو، چوتھی چیز تاریخ ہے، جس کا مقصد اس ملک کی قومون کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلون مین تازہ رکھنا اور انگریزون نے جیسا کہ وہ کہتے ہین، اس ملک مین ایک منظم، عادل اور متمدن حکومت قائم کرکے اہلِ ملک پر جو احسان کیا ہے، اس کو باربار دہراتے رہنا ہے، چنانچہ حکومت وقت اپنے اس مقصد مین کامیاب ہوئی، اور اوس نے ہندو مسلمانون کے درمیان بغض وعداوت کی وہ آگ بھڑکا دی جو ہماری بہترین کوششون کے باوجود اب تک نہ بجھ سکی،

اعلیٰ تعلیم کے دو حصے ہین، فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس، یہ دونون حصے حد درجہ ناقص ہین، آرٹس مین جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اون کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہون، ابھی حال مین پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد مین جو خطبہ پڑھا، اس مین اونھون نے یہ بالکل بجا کہا ہے:-

"بی، اے یعنی بیچلر آف آرٹس، کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے، وہ کون سا آرٹ ہے جس مین ایک

بی، اے مہارت حاصل کرتا ہو"

لے دے کرایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولیٹیکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی اور وکالت کے خیال سے ہو، اور پھر نظری فلسفۂ علوم مین ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہو کہ "نظریات" کو اہمیت دی جائے، اور "عملیات" سے پہلوتہی کی جائے، ہماری ایک بڑی درس گاہ مین سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے، حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا نہین، حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانین کہ ان مین سے کس کا چمڑا ہم کس طرح کام مین لا سکتے ہین،

غرض ان بے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے، کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی زندگی گذارنے کے لئے حکومت وقت کے دست نگر رہین، تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہو، لکھے پڑھے اپاہجون کی تعداد بھی روزافزون ہے، اور چونکہ ہندوستان مین بے کارون کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہین، اسلئے اس کو اپنے طریق تعلیم مین تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہین ہوتی،

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان مین اور خصوصاً مسلمانون مین تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہو، اور اب انقلابات نے ہماری آنکھون سے یہ پردہ اوٹھادیا ہے، کہ یونیورسٹیون کی یہ تعلیم نوکریون کے حصول مین بھی اب کارآمد نہین رہی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اب تک دوڑے چلے جانا کہان تک صحیح ہے، اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریون کا سہارا بھی ہو، تو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ سرکاری نوکریان قومی افلاس کے دور کرنے کا علاج نہین ہین، وہ علوم وفنون جو حصول دولت کے اصلی ذرایع ہین ان کی تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعاً خارج ہے، عملی کمیسٹری، آلات سازی اور صنائع وحرفت کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دارومدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی تعلیم یہان ہو، تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہان سکھائی جاتی ہو، مگر دواسازی نہین کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤن کی قیمت مین ہندوستان اپنا سرمایہ انگلستان کو دینے پر مجبور کیون ہو،

اسکول کی پوری تعلیم مین سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے، جغرافیہ طبیعی، حفظان صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتون کے سواان کواور کچھ بتایا نہین جاتا، اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اوران کو نہین آتا، کالجون کی اعلیٰ تعلیم مین اونھین خاکون کواور زیادہ ابھار دیاجاتا ہی افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت سے گفتگو کرنے کیلئے مین اپنے مین اہلیت نہین پاتا، اس لئے تفصیلات کواپنے سے زیادہ لائق اشخاص کے سپرد کرکے صرف چند سرسری اشارون پر اکتفا کرتا ہون،

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آیندہ جاری رہنا چاہئے؟ کیا ایسا نصاب تعلیم آپ کیلئے زہر نہین جو مذہب، اخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو، ؟

۲ ۔ کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیار تعلیم کہ ہر ہندوستانی خالص انگریزون کی طرح اس زبان مین لکھ پڑھ سکے، اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے، جس سے اس کے ذریعہ گفتگو، کاروبار اور حصول علم ممکن ہو،

۳ ۔ علوم مین ان سائنسون کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکین،

ہمارے بچون کو یہ پڑھایا جاتا ہے، کہ گھڑی سے وقت کیون کر پہچانین، ٹکٹ لے کر ریل پر کیون کر بیٹھین، اور ایک موٹر کا عام استعمال کیون کر کرین، تار لکھ کر بابو کے ذریعہ تار کیونکر بھیجین، لیکن یہ نہین پڑھایا جاتا، کہ ہم گھڑی کیون کر بنائین، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالین، پھر لوہے کو کیسے صاف کرین، پھر کیون کر ریل کی پٹریان اور گاڑیان اور پہئے اور انجن بنائین، موٹر کے ٹکڑون اور ان ٹکڑون کو کیسے بنا کر جوڑین، اسی مثال پر دوسری باتون کو قیاس کیجئے،

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہین، اور یہ سمجھتے رہے ہین، کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گران قیمت تعلیم

مین ہم اپنے بچون پر جس قدر صرف کرتے ہین، اکثر ایسا ہو رہا ہے، کہ ان لڑکون کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہے،
ہمارے لڑکے بی اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور ولولون کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہین اور ان
کو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس سڑک کے خاتمے پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا، مگر وہ جب وہان پہنچتے ہین، تو دفعۃً
منزل مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے، اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہین، اور اب
سوچتے ہین :-

گذری جو گذرنی تھی اب چاہئے کیا کرنا

غور کرتے ہین تو سرکاری نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہین پاتے، اس سے مایوس ہو کر
بعض لوگ تو ذرا کترا کر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہین یعنی ایم اے کی تیاری مین لگ جاتے ہین، اور بعض
قانون یاد کرتے ہین، یا ٹرننگ کی فکر کرتے ہین، لیکن اب ٹرننگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے، اور قانون کے میدان مین
جو بھیڑ بھاڑ ہے اوس سے کون بے خبر ہے،

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہے، جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے، آیا اون کے لئے اس طریقۂ
تعلیم مین علوم کی تحصیل کا سامان ہے، اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے، کیا انھون نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم مین
اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہے؟

اب اس مسئلے مین ذرا بھی شک کی گنجائش نہین، کہ ان چند لوگون کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہین، یا
علمی اور تعلیمی پیشے مین زندگی گذارنا چاہتے ہین، بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنی چاہئے، اور اعلیٰ تعلیم کا
قریب نہ کھانا چاہئے، اس تعلیم کے بعد اون کو کسی صنعت و حرفت، تجارت، یا اور دوسرے ذرائع معاش کی طرف
توجہ کرنی چاہئے، اعلیٰ تعلیم مین صرف اونھی کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہون، اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہون،
اس مین شک نہین، کہ موجودہ حکومت نے اس اعلیٰ تعلیم کو اپنے چند ملبند عہدون کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کر دیا ہے،
اور ان ہی کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے، مگر غور کے قابل بات ہے کہ یہ چند عہدے جو ہر صوبے مین

وس بیس سے زیادہ نہیں وہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو نہیں مل سکتے، جب چند سال کی دفترگردی کے بعد بالآخر وہیں لوٹ کر آنا ہے، تو پہلے ہی سے وہیں جانے کی تیاری کیوں نہ کیجائے، ؟

ہمارے یہاں تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت ابتک ہے، کہ خواہ لڑکے میں مناسبت ہو، یا نہ ہو، اور ان علوم سے اون کو وابستگی ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ ان کو پڑھنا ہے، اور ان میں ان کو کامیاب ہونا ہے، ورنہ آیندہ وہ کسی لائن میں بھی گھس نہیں سکتے، اس مجبورانہ طریق تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتوں کا اور والدین کے سرمایے کا بے دریغ خون کیا ہے، آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اور مالی فضول خرچی کب تک جاری رہے گی، اور کیا اب بھی وقت نہیں آیا، کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک منظم تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کریں اور ان علوم کو چھوڑیں، جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو، اور ان علوم کو اختیار کریں جن سے قومی تربیت کے بعد حصول زر کا طریقہ سیکھا جائے،

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے جس کا مقصد علم کا حصول ہے، کہ اس کیلئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے، ہم نے ابتک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونوں مقصدوں کو ایک تعلیم کے اندر جمع کر دیں، اور یہ ناممکن ہے، پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہیں ہو سکتی، یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کے ذریعہ سے کوئی بڑا فلاسفر کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا مورّخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ، کوئی بڑا موجد، کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا اسٹرانومر کوئی بڑا متھیمیٹیشین پیدا نہیں کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہیں پائی، کیونکہ علم کی صبر آزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے جھوٹی پالٹیکس اور سرکاری نوکری کے ذریعہ فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے اور علم کا تقاضا ہے، کہ علم کے سوا اوس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو،

تعلیم کی زبان سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے، میں نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے میں اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں، جن کے دُہرانے کی حاجت یہاں نہیں، اب وقت آگیا ہے، کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے

جو ۱۹۳۵ء میں ہم پر مسلط کی گئی آزادی حاصل کریں، یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی و ادبی زبان سیکھنے کی نہین، علوم و فنون خواہ کتنے ہی نئے ہون، اور کسی قوم سے اون کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہین، مسلمانون نے ہندوستان، ایران اور یونان کے سب علوم و فنون سیکھے مگر اس طرح نہین کہ اونھون نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کر دی ہو، بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانون کے علوم و فنون کو خود اپنی زبان مین منتقل کیا، یا دوسرون سے منتقل کرایا، اور اس اپنی زبان کے ذریعے لوگون کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی، آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل ہے، تو کیا کسی پست سے پست یورپین قوم کی مثال دی جا سکتی ہے، جس نے اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری اعلیٰ قومون کی زبانون کو علوم و فنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو، کل بیت الحکمت نے بغداد مین جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دار الترجمہ عثمانیہ مین آج نہین ہو سکتا، جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعے اپنے ہان تعلیم نہین پھیلائی، اور نہ آج ترکستان با این ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنا رہے ہین، کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہین، کہ زبان کو قومیت کی تخلیق مین کیا اہمیت حاصل ہے،

سنہ ۱۹۲۰ء مین فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کر اس پر قبضہ کر رہا تھا، تو اوس وقت اتفاق سے مین فرانس کے شہر ویشی مین تھا، فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کے جو وجوہ بتا رہے تھے، ان مین سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "یہ وہ ملک ہے، جہان فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہین" یہی وہ اسکول ہے، جہان شامی بچون کے دلون مین فرانس کی محبت کا بیج بویا گیا، یہ بیج بڑھا، اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت مین شام مین موجود ہے،

جامعہ کی چار دیواری مین اس اہمیت مین استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہین، جو قومون کی تکوین و تخلیق مین زبانون کو حاصل ہے، مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے، جو پوری قوم کو ایک متحد قوم بناتی ہے، وہ زبان جو کسی قوم مین ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہین ہو سکتی، یہی سبب ہے، کہ جہان تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے، ہماری زبانون کو بہت کم امداد ملی ہے، وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کے خزانون

سے محروم ہے، اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے مین بند ہین، جہان تک رسائی بے اس کے ممکن نہین کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان مین سالہا سال تک مہارت حاصل کرلین، پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک بآسانی اس وقت تک نہین پہنچ سکتے، جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل نہ کرلین، مثال یہ ہے، کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان مین سوال دیتے ہین، بچے کو پہلی مشکل یہ ہے، کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے، پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہین سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان مین سمجھ سکتا ہے، اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان مین دہرانے پر تو یقیناً قدرت نہین رکھتا، کہ اس کے لئے اس کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے، :؛

ہندوستان مین مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان مین علم کی تحصیل سے معذور ہین، بلکہ یہ کہنا چاہئے، کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہین، ہندوستان زبانون کا دنگل ہے، صوبہ وار زبانون کو چھوڑ کر اردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک مین قائم ہے، ہمارے وطنی بھائیون نے اُس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود مین حاصل ہے، یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو پوری مادری نہ سہی تو علمی و ادبی زبان تو ضرور ہی بنالین گے، لیکن مسلمان اب تک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہین، اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے، لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہین، اور دوسری قوم سے مستعار مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہین سمجھ رہے ہین، اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے، تو یہان کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے، اور یہ وہی زبان ہوگی، جس کو ہندو مسلمان کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک مین پیدا کیا ہے،

اب تک ہم اس ساحرانہ فریب نظر مین پھنسے تھے، کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان مین ہو ہی نہین سکتی، مگر یہ سحراب ٹوٹ رہا ہے، اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے

اس جال کے ایک ایک تارپود کو الگ الگ کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہی کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہیں، شراب کو جس پیالے مین بھی پیو وہ شراب ہے، اور تلوار کو جس غلاف مین بھی رکھو، وہ تلوار ہے، سوال ظرف کا نہین مظروف کا ہے،

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو، دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہی کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمھارے پیچھے آئے گی،

ہم کو اس کا احساس ہے، کہ آج کی گفتگو مین کچھ دل خراش باتین بھی ہین، مگر سنجیدگی سے غور اس پر کرنا ہی کہ یہ سچی باتین ہین یا نہین، اگر ہین تو زخمون پر کب تک اس ڈر سے نشتر نہ لگایا جائے کہ اس سے بیمارون کو تکلیف ہوگی،

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین،

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوون پر آٹھ خطبے (لکچرز) دئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے اون کو بے حد پسند کیا، ان آٹھ لکچرون مین نہایت مؤثر الفاظ مین اور تاریخی دلائل کے ساتھ آنحضرت صلعم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی تعلیمات کا عطر اور خلاصہ پیش کیا گیا ہے، یہ اس لائق ہین کہ مسلمانون کے علاوہ وہ غیر مسلمون مین ہدیۃً تقسیم کئے جاوین اور عربی مدرسون اور مکتبون اور انجمنون مین ان کو پڑھایا جائے، ضخامت ۱۵۰ صفحے، طبع دوم قیمت ۱۲؍

رسائل شبلی

مولانا مرحوم کے مختلف علمی مضامین کا پہلا مجموعہ جس مین اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تمدن، مدارس اسلامی شفاخانے، کتبخانۂ اسکندریہ مسلمانون کی گذشتہ تعلیم وغیرہ مضامین ہین، ضخامت ۲۸۰ صفحے، قیمت عہ۔ "منیجر"

نفسیاتِ حکیم ناصر خسرو

از
پروفیسر معتضد ولی الرحمن، ایم، اے، استاذ نفسیات، جامعۂ عثمانیہ، حیدر آباد دکن،

(۱)

جس وقت سے انسان نے اپنی حیات ذہنی مین دلچسپی لینا شروع کی ہو، اس وقت سے اس مطالعہ نے دو راستے اختیار کئے ہین، ایک مابعد الطبیعیاتی اور دوسرا علمی (سائنٹفک)، ان مین سے پہلا طریق تفکر دراصل انسان کی مذہبی ضروریات حیات جاودانی کی خواہش وامید، اور حیات جسمانی کے بعد حیاتِ روحانی پر اعتقاد کا نتیجہ تھا، ذہن کے اس مطالعہ کا نام عقلی نفسیات[۱] رکھا گیا، دوسرا طریقہ انسان کی عقلی فطرت کا نتیجہ تھا، اس مطالعۂ ذہنی نے بالآخر وہ صورت اختیار کی، جس کو اب عرصے سے تجربی نفسیات[۲] کہا جا رہا ہے، ان دونون طریقون کی مزید توضیح یہ کہکر بھی کی جا سکتی ہو، کہ عقلی نفسیاتِ روح کی ماہیت، اور اس کے مبدا و معاد پر بحث کرتی ہے، اس طرح یہ فلسفے کی ایک شاخ ہو، فلسفے مین منجملہ اور مسائل کے مسئلۂ حقیقت پر بھی غور کیا جاتا ہو، فلسفے کی جس شاخ مین یہ بحث ہوتی ہے، اس کو مابعد الطبیعیات کہتے ہین، اب چونکہ روح (اگر یہ فی الواقع موجود ہے) تمام حقائق مین سب اہم ترین ہے، لہٰذا عقلی نفسیات (روح جس کا موضوع بحث ہے) مابعد الطبیعیات کی بڑی شاخون مین سے ہو، اس کے مقابلے مین تجربی نفسیات واقعاتِ حیاتِ ذہنی (جس صورت مین یہ ہمارے تجربے مین آتے ہین،) پر بحث کرتی ہو، یہ روح کی حقیقی و باطنی ماہیت یا اس کے وجود کے مسئلے سے تعلق نہین رکھتی، بلکہ ان سب کو فرض کر لیتی ہے، دوسرے الفاظ مین روح اس کا اصول موضوعہ[۳] ہے، مختصراً یون کہنا چاہئے، کہ ان دونون مین فرق

---

[۱] Rational Psychology
[۲] Empirical Psychology
[۳] Postulate

یہ ہے، کہ عقلی نفسیات تو اس سوال کا جواب ہے، کہ "روح کیا ہے"؟ اور تجربی نفسیات اس سوال کا کہ "ذہن کیا اور کس طرح کام کرتا ہے"؟ اپنے اس امتیاز کو باقی رکھنے کے لئے تجربی نفسیات "روح" کے لفظ کو ترک کر کے "ذہن"، "ذات" یا "شعور" کے الفاظ اختیار کرتی ہے، چنانچہ اس کے موافقین فخراً اور مخالفین طنزاً اس کو "نفسیات بلا روح" کہتے ہیں،

مندرجہ بالا گفتگو سے معلوم ہوا کہ تجربی نفسیات سے مراد وہ مطالعہ ذہن ہے، جو حیات ذہنی کے واقعات کے مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے، نہ وہ جو عام مابعد الطبیعیاتی تخیلات سے مستنبط کیا جاتا ہے، اب چونکہ واقعات مشاہدہ اس کا نقطہ آغاز ہیں، لہذا یہ مطالعہ علمی (سائنٹفک) ہوتا ہے نہ کہ فلسفیانہ،

حیات ذہنی کے مطالعہ کے تجربی طریقے افلاطون و ارسطو کے وقت سے مستعمل ہیں، ان دونوں کی تصانیف میں ذہنی مظاہر کے متعلق قیمتی بیانات ملتے ہیں، ان دونوں نے ذہن کی تحلیل کی ہے، اور نفسی اعمال کے مراتب و مدارج متعین کئے ہیں لیکن تجربی نفسیات پر سب سے پہلا باقاعدہ رسالہ ارسطو نے لکھا، ازمنہ وسطیٰ میں بھی یہ دلچسپی باقی رہی، اگرچہ یہ مابعد الطبیعیاتی نفسیات کے زیر اثر رہی، واقعہ یہ ہے، کہ یہ خصوصیت یونانی، ازمنہ وسطیٰ اور زمانۂ حال کی نفسیات کے بڑے حصے میں پائی جاتی ہے، زمانۂ حال کی تجربی نفسیات کا آغاز کرنا چاہئے، کہ جان لاک سے[1] ہوا، اس کے ہاتھوں میں آکر یہ فلسفہ پر غالب آئی لیکن پھر بھی اس کی نفسیات اس کے فلسفیانہ عقاید ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے، تجربی نفسیات کو اصلی اور آخری آزادی انیسویں صدی کے ربع آخر میں جا کر حاصل ہوئی[2]،

(۲)

مسلمانوں میں بڑے بڑے جید فلاسفہ گزرے ہیں، کہ جنھوں نے ارسطو کے فلسفے کی تشریح میں اپنے اجتہاد

---

[1] جان لاک (John Locke) ۲۹ اگست ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا، اور ۲۸ اکتوبر ۱۷۰۴ء میں انتقال کیا، ایک معنی میں یہ پہلا فلسفی تھا جس نے ماہیت علم کی تحقیق کی طرف توجہ کی جو تحقیق اس نے شروع کی اس کا خاتمہ جا کر کانٹ پر ہوا،

[2] مزید تفصیل کے لیے دیکھو، (Foundations of Psychology) J. S. Moore کی باب اول، اور (Contemporary Psychology Villa) باب اول،

فکر کا ثبوت دیا ہے، اصل مین تو وہ ارسطو کے شارح تھے، لیکن اس شرح مین اونھون نے وہ وہ نکات پیدا کئے اور وہ وہ باتین نکالین، کہ بعض بعض صورتون مین اتن سے بھی آگے بڑھ گئے،[۱] تاہم اس مین شبہ نہین کیا جاسکتا کہ انھون نے فلسفۂ مشائیت کو سمجھنے مین غلطیان کی ہین، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھون نے بعض ایسے مصنفات کو، جو دراصل ارسطو کی نہ تھین، ارسطو کی سمجھا، اور یہ سمجھ کر ان کو اپنی شرح کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ بعض بعض فلاسفہ، مثلاً فارابی، ابن سینا، نے دیدہ و دانستہ یہ کیا کہ بعض بعض مسائل خود گھڑ کر ان کو ارسطو کی طرف منسوب کر دیا، اس جعل سازی کے مختلف وجوہ ہین، کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہین، مولوی محمد یونس فرنگی محلی کا خیال بالکل صحیح ہے، کہ اونھون نے "اکثر مسلمان فلاسفہ و متکلمین کو دھوکے مین ڈالا، اور انھین کی تصنیفات کی بدولت بعض ایسے مسائل بھی ارسطو کی جانب منسوب کر دئے گئے، جن کا نام و نشان بھی ارسطو کی کتابون مین نہین ملتا"[۲] پھر ایسا بھی ہوا ہے کہ افلاطون اور ارسطو چونکہ فلسفے مین اُن کے خدا تھے،[۳] لہذا اونھون نے یہ گوارا نہ کیا، کہ ان کے آپس مین کسی قسم کا تضاد پایا جائے، اس تضاد کو رفع کرنے کیلئے اونھون نے تمام زور تخیل خرچ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس شرح و جانبداری کی وجہ سے متن کا حلیہ بگڑ گیا، حاشا کہ اس سے فلسفہ یا فلاسفۂ اسلام کی تنقیص مقصود نہین، اپنا اپنا طریق فکر ہے، اگر ان کو محض شارح ہی سمجھ لیا جائے، تب بھی ان کی عظمت مین کوئی شبہ نہین، مثل مشہور ہے کہ، "یک من نقل را دہ من عقل باید" کچھ جوہر تو ان مین تھا، کہ یہ شارح بنے اور ایسے شارح بنے، کہ

---

[۱] (Renan مصنفہ Averroes et l'Averroïsme ترجمہ انگریزی ص۲۳۔ [۲] ابن رشد ص۲۹۵ سلسلۂ دار المصنفین، تفصیل کے لئے دیکھو ص۲۹۴، ص۳۰۲۔ [۳] چنانچہ فارابی نے اپنا رسالہ الجمع بین رای الحکیمین افلاطون الالٰہی وارسطوطالیس" ان الفاظ مین شروع کیا ہے:۔ وکان ھذان الحکیمان ھما مبدعان للفلسفۃ ومنشئان لاوائلھا واصولھا ومتممان لاواخرھا وفروعھا وعلیھما المعول فی قلیلھا وکثیرھا والیھما المرجع فی یسیرھا وخطیرھا ومایصدر عنھما فی کل فن انما ھو الاصل المعتمد علیہ لخلوہ من الشوائب والکدر..." پھر تھوڑی ہی دور آگے چلکر کہتا ہے:"...ھذین الحکیمین انھما المنظوران والامامان فی ھذہ الصناعۃ" جیسا کہ رسالے کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے، اس مین فارابی نے افلاطون اور ارسطو کو متحد الخیال ثابت کرنیکی کوشش کی ہے، جس مین وہ ہمارے نزدیک بالکل ناکام رہا ہے،

یونانی فلسفے کو ابدالآباد تک زندہ رکھے گئے،[۱]

لیکن باینہمہ عظمت واجتہاد تقریباً تمام فلاسفۂ اسلام اپنی نفسیاتی تعلیمات مین ارسطو سے آگے نہ بڑھ سکے، ان تمام فلاسفۂ مین سے ابن سینا غالباً اکیلا فلسفی ہے، جس نے اپنے نفسیاتی عقاید کو باقاعدہ طور پر مرتب رسالون کی شکل مین بیان کیا ہے،[۲] لکھنے کو دیگر فلاسفہ نے بھی نفس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ سب "عقلی نفسیات" ہے، "تجربی نفسیات" نہین، ابن سینا کی خصوصیت یہ ہے، کہ اوس نے ماہیتِ نفس پر نہین، بلکہ اعمال واحوالِ نفس پر بحث کی ہے، لیکن اوس نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہم ارسطو کی کتاب کا اردو ترجمہ پڑھ رہے ہین، مطلب یہ ہے کہ اس نے تجربی نفسیات کی حد تک کوئی نئی بات بیان نہیں کی، اس خصوص مین ہمارے نزدیک حجت خراسانی حکیم ناصر خسرو ان سب پر فائق ہے، یہ خیال رہے کہ اس وقت مابعد الطبیعیات کا ذکر نہین، ذکر نفسیات، اور بالخصوص تجربی نفسیات کا ہے، اوراق آئندہ مین ہم حکیم ناصر خسرو کے نفسیاتی عقائد کی توضیح کرین گے، اس کے مطالعہ سے قارئین بطور خود ہمارے بیان کی تصدیق یا تکذیب کر سکین گے،

(۳)

نفس مضمون کی طرف رجوع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ بطور تعارف حکیم ناصر خسرو کے سوانحِ حیات[۳]

---

[۱] اس ضمن مین پروفیسر ویبر کا یہ فقرہ بہت پر معنی ہے، کہ "(He is more learned than original.) دیکھو تاریخ فلسفہ، انگریزی ترجمہ ص ۲۱۰ حاشیہ نمبر ۲ [۲] ابن سینا کے نفسیاتی عقائد کے لئے دیکھو:- (Z.D.M.G.) بابت ۱۸۷۵ء اس مین ڈاکٹر لانڈوئر (Landauer) نے اس کا ایک رسالہ مع جرمن ترجمہ کے شائع کیا ہے، اس کے علاوہ کتاب النجاۃ، کتاب الشفاء، اور شہرستانی کی ملل والنحل (مطبوعہ یورپ ص ۴۱۳، ۴۲۹) سے تمام مفصل عقائد معلوم ہو سکتے ہین، ہم آج کل "نفسیات ابن سینا" پر ایک مبسوط رسالہ بزبان انگریزی تالیف کر رہے ہین، جو عنقریب شائع ہوگا، [۳] حیات ناصر خسرو کے لئے دیکھو:- تاریخ ادبیات ایران مصنفہ براؤن جلد دوم ص ۲۱۸ ومابعد، ریو (Rieu) کی (Catalogue of the Per. Mss. in Br. Museum)

مختصراً بیان کردئے جائیں،

ابو معین الدین ناصر خسرو، یا بقول بعض ابو معین ناصر بن خسرو[1]، القبادیانی المروزی جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، قصبہ قبادیان[2] کا رہنے والا تھا، لیکن پروفیسر اَتہ کا قول ہے کہ اس کا وطن بلخ تھا[3]، دلیل اس دعویٰ کی اس نے یہ پیش کی ہے، کہ وہ بلخ میں سکونت پذیر رہا، پھر بقول ڈاکٹر براؤن مشہور غلط نویس" دولت شاہ کے نزدیک اس کا وطن اصفہان تھا[4]، لیکن سفرنامہ کے شروع ہی میں ناصر خسرو خود اپنے آپ کو "قبادیانی" کہتا ہے[5]، اس کے علاوہ ایک رباعی میں وہ اپنے خراسانی الاصل ہونے کو صاف طور پر بیان کرتا ہے،۔

گرچہ مرا اصل خراسانی است — از پس پیری و مہی و سری،

دوستی عترت و خانۂ رسول — کرد مرا یمگی و مازندری،

(بقیہ حاشیہ ص ۴) پروفیسر اَتہ (Ethe) کی Grundriss der Iranischen Philologie، یا محمود غنی زادہ کا مقدمہ سفرنامہ مطبوعہ کادیانی، مندرجۂ بالا خاکہ اسی مقدمہ سے ماخوذ ہے، اور غنی زادہ کے نام سے تمام حوالے اسی مقدمہ کے ہیں، [1] غنی زادہ ص ج [2] بقول غنی زادہ قبادیان "قصبہ ایست درحوالی مرو شاہجہان (یا مرو کلان، دیکھو "جغرافیہ خلافت مشرقی" مصنفہ لی اسٹرینج، مترجمہ محمد جمیل الرحمن صاحب شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ص۱۱۶) از توابع خراسان" (ص۵) لیکن پروفیسر براؤن کے نزدیک "یہ ترمذ اور جیحون کے قریب ایک شہر اور چھاؤنی کا نام ہے" (ادبیاتِ ایران، جلد دوم ص۲۲۱، حاشیہ) لی اسٹرینج لکھتا ہے "شہر قبادیان اس دریا کے کنارے آباد ہے جو دریائے وخشاب کے مغرب میں سب سے پہلے دریائے جیحون میں گرا ہے" (ایضاً ص ۴۸۲) اس طرح یہ ترمذ کے قریب مشرق کی طرف واقع ہے، لی اسٹرینج کا بیان براؤن کے بیان کے مطابق ہے، لیکن غنی زادہ کا بیان بھی غلط نہیں، دقت صرف یہ ہے کہ مرو شاہجہان ترمذ سے اور آگے مغرب کی طرف واقع ہے، لہٰذا قبادیان کو ترمذ کے قریب کہنا مرو شاہجہان کے قریب کہنے کی نسبت زیادہ قرین صداقت ہے[3]، غنی زادہ ص ح، بحوالہ (Grundriss der Iranischen Philologie ص۲۷۶)

[4] ادبیات ایران ص۲۲۵، [5] سفرنامہ مطبوعہ کادیانی ص۱

لہذا پروفیسر آتہ اور دولت شاہ دونوں کے بیانات بداہتہً غلط ہیں، یہ ۳۹۴ھ مطابق ۱۰۰۳ء میں پیدا ہوا، اس کے تحصیلِ علم کے متعلق ہمیں کچھ معلوم[1] نہیں، زاد المسافرین کے مطالعہ سے اتنا البتہ معلوم ہوتا ہے، کہ اوس کو فلسفے کا بہت شوق تھا، اور فلاسفۂ یونان، خصوصاً سقراط، افلاطون، اور ارسطو کی اکثر کتابیں اس کے مطالعے میں رہتی تھیں، اسی ضمن میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہو، کہ وہ بو علی[2] سینا کی صحبت سے بھی مستفید ہوا تھا لیکن یہ محقق نہیں، سفرنامہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ مکہ کی طرف سفر کرنے سے قبل وہ سلیمان جغر بیگ داؤد بن میکائیل (جو ایران میں سلطنت سلاجقہ کے مؤسس طغرل بیگ کا بھائی تھا،) کے زمانہ میں خراسان میں دیوانی کی کسی خدمت پر مامور تھا، اور شہر کے عمائد میں اس کا شمار ہوتا تھا،[3] اس کے اکثر اشعار سے اندازہ ہوتا ہو، کہ وہ بہت عیش وعشرت اور عزت واحترام کی زندگی بسر کرتا تھا،

اس کا اپنا قول[4] ہے، کہ ۴۳۷ھ میں جوزجان میں اوس نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص اسکو شراب پینے سے (جس کا وہ بہت عادی تھا،) منع کر رہا ہے، ایسی چیز کا شوق دلا رہا ہے، جس سے ہوش وخرد میں ترقی ہو، اور مکہ کی طرف سفر کرنے کی ترغیب دلا رہا ہے، خواب سے بیدار ہونے کے بعد اس نے ہاتھ منہ دھویا، اور جامع مسجد جا کر نماز پڑھی،

[1] واقعہ یہ ہے کہ ناصر خسرو کی شخصیت مختلف افسانوں سے اس طرح ڈھکی ہوئی ہے، کہ اوس کے اصلی سوانح کو معلوم کرنا بہت دشوار ہے، ان تمام افسانوں کا ماخذ، بقول ڈاکٹر براؤن، ناصر خسرو کی وہ جعلی خود نگاشتہ سوانح عمری ہے، جو اسکے دیوان مطبوعہ تبریز کا مقدمہ ہو (ادبیات ایران، جلد دوم ص ۲۱۸) ان ہی افسانوں میں سے ایک دلچسپ افسانہ القزوینی نے اپنی کتاب آثار البلاد میں یمگان کے ذکر میں بیان کیا ہے، اس میں ناصر خسرو کو بلخ کا بادشاہ بتایا گیا ہو، جسکو اس کی رعایا نے باہر نکال دیا تھا، لہذا اوس نے یمگان میں جا کر پناہ لی یمگان پہنچ کر اوس نے نہایت حیرت انگیز حمام، باغات اور طلسمی بت بنوائے، یہ بت اس قسم کے تھے، کہ جو انکی طرف دیکھتا تھا اسکی عقل جاتی رہتی تھی قزوینی کا بیان ہو کہ یہ حمام اسکے وقت تک موجود تھا چنانچہ اوس نے اسکو بالتفصیل بیان کیا ہو،

[2] ابو علی حسین بن عبد اللہ ایران اور مسلمانوں کا مشہور فلسفی ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۴۲۸ھ میں انتقال کیا، [3] سفرنامہ مطبوعہ کاویانی ص ۲

[4] ایضاً ص ۳ اسی خواب کے بعد اوس نے اپنے آپ کو حکیم کہنا اور کہلوانا شروع کیا، کیونکہ خواب میں اسکو متنبہ کیا گیا تھا کہ جو شخص بے ہوشی وبے خودی پیدا کرنے والی اشیاء کا استعمال نہیں کرتا، بلکہ ہوش وخرد کو بڑھانے کی تدابیر کرتا ہے، اوسکو اصلی معنوں میں "حکیم" کہنا چاہیے، وہ بھی خواب کے بعد چونکہ شراب سے تائب ہو چکا تھا، لہذا اس تنبیہ کے مطابق وہ بھی اصلی معنوں میں حکیم بن گیا تھا،

اور شراب ترک کرنے میں حضرت باری تعالیٰ سے مدد چاہی" اس کے بعد جمعرات کے دن ۶ جمادی الاخری ۴۳۷ھ کو راہِ سفر
اختیار کی سب سے پہلے وہ مرو گیا، اپنے عہدے سے مستعفی ہوا، اور ۲۳ شعبان ۴۳۷ھ کو مرو سے روانہ ہوکر ۱۱ شوال کو نیشاپور
پہنچا یہاں اکیس روز قیام کرکے دوسری ذی القعدہ کو پھر روانہ ہوا، اور سمنان، ری، اور قزوین سے ہوتا ہوا، آذربائیجان
آیا، اور تبریز میں قطران شاعر سے ملاقات کی یہاں سے براہ مرند وخوی شہروان پہنچا، اور وہاں سے براہ اخلاط، بطلیس میافارقین
آمد، حران، اور سروج شامات میں وارد ہوا، اور ابھی ابوالعلاء معری[۵] زندہ تھا، کہ معرۃ النعمان میں داخل ہوا، لیکن ابوالعلاء سے ملاقات
نہ کی، اوس نے اپنے سفرنامہ میں ابوالعلاء کا ذکر خوب پرلطف پیرایہ میں کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

"در آن (یعنی معرۃ النعمان) مردے بود کہ ابوالعلاء معری می گفتند، نابینا بود و رئیس شہر او بود، نعمتی بسیار داشت،
و بندگان و کارگران فراوان و خود ہمہ شہر او را چون بندگان بودند و خود طریق زہد پیش گرفتہ بود، گلیمے پوشیدہ
و در خانہ نشستہ نیم من نان جوین راتبہ کردہ کہ جز آن ہیچ نخورد، و من این معنی شنیدم، کہ در سرای باز نہادہ است
و نواب و ملازمان او کار شہر میسازند، مگر کلیات کہ رجوع باو کنند، و وے نعمت خویش از ہیچ کس دریغ ندارد
و خود صائم الدہر و قائم اللیل باشد و بہیچ شغل دنیا مشغول نشود، و این مرد در شعر و ادب بدرجہ است کہ افاضل
شام و مغرب و عراق، مقرند کہ درین عصر کسے بپایہ او نبودہ است، و نیست، و کتابے ساختہ آن را الفصول، و
الغایات نام نہادہ، و سخنہا آوردہ است مرموز و مثلہا بالفاظ فصیح و عجیب کہ مردم بران واقف نمی شوند،
مگر بر بعضی اندک، و آن کسے نیز کہ بروے خوانند، چنانکہ او را تہمت کردند کہ تو این کتاب را بمعارضہ قرآن کردہ،
و پیوستہ زیادت از دویست کس ز اطراف آمدہ باشند و پیش او ادب و شعر خوانند و شنیدم کہ او را زیادت
از صد ہزار بیت شعر باشد، کسی از وے پرسید کہ ایزد تبارک و تعالیٰ این ہمہ مال و نعمت ترا دادہ است، چہ سبب
است، کہ مردم را می دہی و خویشتن نمی خوری جواب داد کہ مرا بیش ازین نیست کہ می خورم او چون من آنجا رسیدم این
مرد ہنوز زندہ بود"[۶]

[۵] ابوالعلاء احمد بن عبداللہ المعری مشہور و معروف عالم ہی ۳۶۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۴۴۹ھ میں انتقال کیا، [۶] سفرنامہ مطبوعہ کاویانی ص ۱۵-۱۶

معرۃ النعمان سے نکل کر طرابلس وصیدا ہوتا ہوا فلسطین پہونچا، اور ۵ رمضان ۴۳۹ھ کو وارد بیت المقدس ہوا، دو ماہ بعد مکہ گیا، اور حج سے فارغ ہوکر پھر بیت المقدس لوٹ آیا، یہان سے چاہتا تھا، کہ دریا کے راستے سے مصر جائے، لیکن ہوا مخالف تھی، لہذا مجبوراً خشکی کے راستے تونس سے ہوتا ہوا مصر پہنچا، یہان خلیفہ فاطمی المستنصر باللہ بر سرِ حکومت تھا، مصر کے شکوہ وعظمت اور خلیفہ کے دبدبہ واحتشام سے بہت مرعوب ہوا، اسی وقت اور یہین یہ فرقۂ اسماعیلیہ مین داخل ہوا، اور عہد کیا کہ ایران جاکر اس کی تبلیغ کریگا،

غرہ ذی القعدہ ۴۳۹ھ کو دوسری مرتبہ بعزم زیارتِ مکہ مصر سے روانہ ہوا، اور مدینہ کی زیارت سے مشرف ہوا، ۱۴ ذی الحجہ کو مکہ پہنچا، لیکن چونکہ وہان قحط پھیلا ہوا تھا، لہذا وہان توقف نہ کیا، بلکہ فوراً ہی مصر واپس چلا آیا، اگلے سال یعنی ۴۴۰ھ مین پھر چونکہ قحط تھا، اور خلیفہ نے حاجیون کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا، لہذا قاضی عبد اللہ (جو خلیفہ فاطمی کی طرف سے غلافِ کعبہ کا حامل تھا) کے ساتھ اس کو تیسری مرتبہ مکہ جانا پڑا، اس سال بھی یہ فوراً ہی مصر واپس آگیا، اگلے سال ۴۴۱ھ مین اوس نے حج نہ کیا، بلکہ ۱۴ ذی الحجہ کو مصر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہکر بماہ جمادی الاخری چوتھی مرتبہ مکہ پہنچا، اس مرتبہ قریب چھ ماہ یہان مقیم رہا، اور ۴۴۲ھ مین آخری حج کرکے مختلف مقامات سے ہوتا ہوا، ۲۰ شعبان ۴۴۳ھ کو بصرہ مین آیا، دو ماہ یہان قیام کرکے پھر اسی طرح سیاحت کرتا ہوا، ۸ صفر ۴۴۴ھ کو اصفہان مین وارد ہوا، بیس دن یہان ٹھہرا، اور پھر اور شہرون کی سیر کرتا ہوا، ۲۶ جمادی الاخری ۴۴۴ھ کو اپنے بھائی ابو سعید کے ہمراہ بلخ پہنچا، اور اپنے دوسرے بھائی ابو الفتح عبد الجلیل سے آملا، اس طرح اوس نے پورے سات سال سیر وسیاحت مین بسر کئے،[۱]

---

[۱] یہان اس نظریے کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا، جس کو ڈاکٹر ریو (Rieu) جیسے فاضل نے پیش کیا ہے، اور جس کو پرتش (Pertsch) اور فاگنان (Fagnan) کی تائید حاصل ہے، اس کے مطابق ناصر خسرو دو تھے، اور ان دونون کی کنیت ابو معین تھی، ان مین سے ایک شاعر، فلسفی اور ساحر تھا اور دوسرا سیاح، لیکن شفر (Schefer) اور ان کی تحقیق کی روشنی مین یہ نظریہ (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۴ پر)

اس ہفت سالہ سیر و سیاحت مین، بقول غنی زادہ، ناصر خسرو نے "فوق العادہ تکالیف" اوٹھائین، چنانچہ اکثر اوس نے "بے آب و علف" بیابانون مین "اعراب بادیہ نشین" کے درمیان نہایت خطرے مین زندگی بسر کی ہے، ایک مرتبہ تو اوس کو فلج نام ایک مقام پر چار ماہ قیام کرنا پڑا، یہ مقام ایک بیابان کے وسط مین اس طرح واقع تھا کہ چارون طرف دو دو فرسنگ تک آبادی کا نام نہ تھا، اس تمام مدت مین اوس نے کھجورین کھا کھا کر اپنی زندگی کے دن پورے کئے، پھر اس کو ایسے راستے طے کرنے پڑے ہین، کہ جہان کے باشندے سالون پانی کی شکل تک نہین دیکھتے، اسی ہیئت، غریبی و مفلسی مین وہ بصرہ پہنچا، بصرہ پہنچنے کے وقت جو حالت اس کی تھی، اوس کو اوس نے اپنے سفرنامہ مین بڑے مزے سے بیان کیا ہے[1]،

ان تمام تکالیف و مصائب اور تنگی و ترشی کا اثر ناصر خسرو پر یہ ہوا کہ اس کے مزاج مین انتہا درجے کی غریبی پیدا ہوگئی، اوس نے تمام دنیا سے قطع تعلق کیا اور بقیہ عمر مذہبی مجادلات کے لئے وقف کر دی، اسی زمانہ مین وہ مصر کے خلفائے فاطمیہ کا "داعی و مبلغ آتشین" رہا، لیکن عجیب بات یہ ہے، کہ اوس نے اپنی کسی تصنیف مین بھی اپنے آپ کو "اسماعیلی" نہین کہا[2]، بلکہ ہر جگہ فاطمی حجت مستنصری حجت خراسانی یا محض "حجت" کہتا ہے، اوس کے دیوان مین اکثر اشعار اس کی تائید مین ہین،

لیکن مصر سے واپسی کے بعد جن خیالات کی تبلیغ ناصر خسرو نے کی وہ "عقائد طائفہ اہل سنت" کے منافی تھے، اس کے علاوہ امرائے خراسان بھی، اکم از کم ظاہراً، خلفائے بغداد کی متابعت کرتے تھے، اور اپنے آپ کو "تولی امیرالمومنین" کہتے تھے، لہذا ناصر خسرو کی یہ تبلیغ کسی کو بھی خوش نہ آئی، پھر اُن کو یہ بھی اندیشہ ہوا، کہ کہین ایسا نہ ہو، کہ اس طرح مصر کے خلفائے فاطمیہ کا اثر و نفوذ یہان زیادہ ہو جائے، نتیجہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۳) قابل قبول نہین (تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد دوم ص ۲۲۴ و ۲۲۵) [1] سفرنامہ ص ۱۲۹،

[2] غالباً یہی وجہ ہی، کہ ڈاکٹر رحمان زاد المسافرین کے مقدمہ مین یہ فقرہ لکھ گئے، کہ "وے اینکہ او از طائفہ شیعہ اسماعیلیہ و مبلغین آنہا بود یا نہ یکے از مشکلات است کہ حلش چندان آسان نیست" ص ح،

اس سب کا یہی ہونا چاہئے تھا، کہ ناصر خسرو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوا یعنی اوس کو جلا وطن کیا گیا، چنانچہ خود لکھتا ہے، :-

"........جہاں امت کہ ما را بہ دین خواندند و بر ما غلبہ کردند واز مسکن و شہر خویش ما را براندند[۱]...."

ایک خیال یہ ہے کہ یہ سب کچھ خلیفہ بغداد کے حکم سے ہوا، چنانچہ اس کے بعض اشعار مین بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہی، علامہ غنی زادہ کی تحقیق یہ ہے، اور اس طرف فضلائے فرنگ مین سے کسی کا ذہن بھی منتقل نہ ہوا کہ خراسان سے جلاوطن ہوجانیکے بعد وہ مدت تک مازندران مین رہا[۲]،

ناصر خسرو کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف آرا ہے، اس کے متعلق جو افسانے زبان زد عوام ہین، ان کے مطابق اس کی عمر ۱۴۰ سال کی ہوئی، اور مرنے کے بعد جنون نے اسکو دفن کیا[۳]، لیکن تقویم التواریخ کے مطابق اس نے ۴۸۱ھ مین انتقال کیا، علامہ غنی زادہ اس سے بھی متفق نہین،

اس کے مصنفات مین سے جن کتابون کے نام ہم تک پہنچے ہین، وہ حسب ذیل ہین، :- سفرنامہ، روشنائی نامہ، سعادت نامہ، زاد المسافرین، دیوان اشعار، وجہ دین، بستان العقول، خوان اخوان، دلیل المتحیرین، ان کے علاوہ بعض تذکرہ نویسون نے منطق اور بقول صاحب آتشکدہ فلسفہ کی کتاب اکسیر اعظم، سحر اور علم فوق العادۃ کی کتاب قانون اعظم، فقہ کی کتاب المستوفی، علم یونان کی ایک کتاب دستور اعظم، ایک رسالہ کنز الحقائق، اور ملاحدۂ باطنیہ کے نقطۂ نظر سے ایک تفسیر القرآن کا بھی ذکر کیا ہی، لیکن آج تک ان مین سے کوئی بھی ہمارے ہاتھ نہین لگی، معلومہ مصنفات مین سفرنامہ، روشنائی نامہ، سعادتنامہ اور زاد المسافرین کو مطبع کاویانی جرمنی نے شائع کیا ہی،

اس تعارف کے بعد اب ہم اپنے نفس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہین، ناصر خسرو نے اپنے فلسفیانہ عقائد کو زاد المسافرین مین بہت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہی، ہم نے بھی اس کے نفسیاتی عقائد کے متعلق جو کچھ لکھا ہی، وہ اسی سے ماخوذ ہے، یہ کتاب باعتبار حجم اس کی تمام مصنفات مین سے سب بڑی ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ بلحاظ مضمون بھی وہ اسکو

---

[۱] زاد المسافرین مطبوعہ کاویانی ص۴۰۱، [۲] ص۵۲، [۳] تاریخ ادبیات ایران مصنفہ براؤن جلد دوم ص۲۱۸،

سب پر فائق سمجھتا تھا، چنانچہ اس کے متعلق لکھتا ہے:۔[۵۱]

زتصنیفات من زاد المسافر | کہ معقولات را اصل ست وقانون
اگر بر خاک افلاطون بخوانند | ثنا خواند مرا خاک فلاطون

یہ کتاب اوس نے ۴۵۳ھ[۵۲] مین خلیفہ فاطمی المستنصر باللہ کے نام سے تصنیف کیا ہی[۵۳] مقصود اس تصنیف کا خود مصنف کے الفاظ مین یہ ہی:۔

"......پیش ازانکہ بقوے رسیم کہ مقصود ما از تالیف این کتاب آنست و آن مقصود بیان است ازانکہ نفس چرا بر مثال مسافر است، اندرین عالم واز کجا ہمی آید و کجا ہمی شود، واندرین سفر زاد او چیست"[۵۴]

اس کو برادر معظم ڈاکٹر محمد بذل الرحمن ایم اے پی ایچ ڈی (کیمبرج) حال پرنسپل اسماعیل کالج اندھیری (بمبئی) کی تصحیح و تحشیہ کے بعد مطبع کاویانی برلین نے ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء مین شائع کیا، اوراق آیندہ کی تدوین کے وقت یہی نسخہ راقم کے پیش نظر رہا ہی،

(۴)

زاد المسافرین مین حکیم ناصر خسرو نے اپنے نفسیاتی عقاید کو یکجا اور مسلسل طور پر بیان نہین کیا، اس کے مضامین کی ترتیب اس کی فلسفیانہ تعلیم کے مطابق ہی، لہذا جو خاکہ اس نے اپنے ذہن مین اپنے فلسفہ کا قائم کیا ہی، اس کے مطابق جوبات جہان موزون معلوم ہوئی، بیان کردی گئی ہی نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کتاب مین تسلسل اور مضامین ومباحث مین منطقی تعاقب تو پیدا ہو گیا، لیکن کسی خاص مبحث کے متعلق اس کے خیالات کو دریافت کرنے کیلئے تمام کتاب کی ورق گردانی لازمی ہو گئی، لیکن چونکہ دماغ سلجھا ہوا، عقیدہ پختہ اور خیالات مین منطقی ربط ہے، لہذا کتاب کے مختلف صفحات مین سے بلا خیال تقدیم وتاخیر جو کچھ بھی یکجا جمع کر لیا جائے، اسمین نہ تو تضاد پایا جاتا ہی، نہ خیالات کے تسلسل مین انقطاع، اس کی نفسیاتی

---

[۵۱] دیوان مطبوعہ طہران ص ۲۳۸ [۵۲] زاد المسافرین، ص ۲۸۰، [۵۳] ایضاً مقدمہ ص زح، [۵۴] ایضاً ص ۱۴، اسی مناسبت سے اس نے اس کا نام زاد المسافرین رکھا ہی،

تعلیمات کے لئے بھی ہم کو یہی کرنا پڑا ہے، کہ مختلف مقامات سے اس کے خیالات کو منتزع کر کے اُن کو ترتیب دیا ہے، اور ایک خاص سلسلے مین ان کو بیان کیا ہے، لہذا یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اوراق آیندہ مین مضامین و مباحث کا جو سلسلہ ہم نے قائم کیا ہے، وہ اصل کتاب سے بالکل مختلف ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے، کہ ہمارے نزدیک ہمارے اختیار کردہ سلسلے سے اس کے نفسیاتی عقائد سہولت کے ساتھ اور واضح طور پر ذہن نشین ہوتے ہین، اور مصنف کے اجتہاد فکر کا سب سے زیادہ بین ثبوت مہیا کرتے ہین، ہم سب سے پہلے ماہیت نفس کو لیتے ہین،

حکیم ناصر خسرو نے نفس کی تعریف اس طرح کی ہے، کہ یہ ایک جوہر ہے کہ جسمین حرکت مطلق ہوتی ہے، جو بذات خود زندہ ہے، صورتون کا امکان ہے، دانش پذیر ہے، جسم کی فنا کے بعد بھی بذات خود قائم رہتا ہے" خداوند علیم" ہے اور جسم نہین[1] اسکا کوئی مکان نہین[2] اور اسکا علم ہمکو بلاواسطہ نہین ہوتا بلکہ اسکے افعال کے ظہور کی وساطت سے ہوتا ہے[3]

اپنی اس تعریف کو اوس نے ماہیت نفس کے متعلق مروجہ نظریہ کا ابطال کر کے ثابت کیا ہے، ماہیت نفس کے متعلق مروجہ نظریہ[4] یہ تھا کہ نفس کوئی ایسی چیز نہین، جو بذات خود قائم ہو، یہ دراصل اعتدال مزاج کا دوسرا نام ہے، اسی اعتدال کی وجہ سے جسم حیوانی زندہ ہے، اور اسی کی بدولت اس سے افعال صادر ہوتے ہین، ثبوت اس نظریہ کا یہ دیا جاتا ہے کہ جب دیوانگی، بیماری، یا مستی، کی وجہ سے اعتدال باقی نہین رہتا، تو تمام افعال ناقص ہو جاتے ہین، اور جانی اور پہچانی ہوئی چیزون کو نہ وہ جان سکتا ہے، نہ پہچان سکتا ہے، اس کا مطلب صریحاً یہی ہے، کہ چونکہ اعتدال کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے علم و عمل دونون بگڑ جاتے ہین، لہذا ان دونون مین ربط علیت ہے، اس کے علاوہ جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ اعتدال مین ذرا سے فتور ہی سے علم و عمل دونون مین کچھ نہ کچھ فتور واقع ہو جاتا ہے، تو نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جب جسم مین انحلال واقع ہوگا، اور

---

[1] زاد المسافرین ص ۴۱، ۴۲-۴۴، ص ۴۴۔ [2] ص ۵۵ [3] ایضاً ص ۳۷ [4] ایضاً ص ۲۲۴، ناصر خسرو نے بیان نہین کیا، کہ یہ کس خاص فلسفی کا نظریہ ہے، صرف اتنا لکھا ہے، کہ گروہے از ضعفائے خلق کہ رنج آموختن علم توانستند کشیدن، و لطائف مرالصورت خویش توانستند کردن، گفتند ..... ص ۵۰

معارف:- یہ اطبائے طب یونانی کا نظریہ ہے،

یہ مٹی ہوجائے گا تو علم و عمل دونوں کلیتہً مفقود ہوجائیں گے، اس طرح ثابت ہوا، کہ حیوانات کا علم و عمل اعتدالِ مزاج کا نتیجہ ہے، اور اعتدال کے ختم ہوتے ہی ان دونوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اسی کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے، کہ جسم کے فنا ہوجانے کے ساتھ ہی نفس بھی فنا ہوجاتا ہے، بالفاظ دگر نفس قائم بذاتِ خود نہیں، بلکہ اپنے قیام کے لئے جسم کا محتاج ہے۔[۱]

اس نظریہ میں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اعتدالِ مزاج کسے کہتے ہیں، ؟ ظاہر ہے کہ اس کی تعریف سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی، کہ ایک جسم کے اجزاء مرکبہ علی السویہ ہوں، جسم چونکہ آب و باد و خاک و "آتش" سے مرکب ہے، لہذا اس تعریف کے مطابق اعتدال اس وقت قائم ہوگا، جب یہ چاروں ایک دوسرے کے برابر ہوں، اور کوئی بھی کسی سے کم نہ ہو، اب چونکہ تمام حیوانات بشمول انسان میں علم و عمل ہوتا ہے، لہذا ان سب کے اجسام میں اعتدال کا ہونا ضروری ہے یعنی لازمی ہے، کہ ان سب میں یہ چاروں عناصر ایک دوسرے کے برابر ہوں، اگر یہی صورت ہے، تو ہونا یہ چاہئے تھا، کہ ان سب کا مزاج بالکل ایک ہی سا ہو، اور اس لئے ان سب کا علم و عمل بھی ایک ہی نہج پر ہو، لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ نہ تو ان سب کا مزاج ایک ہی سا ہوتا ہے، اور نہ ان کا علم و عمل ہی ایک نہج پر ہوتا ہے، انسانوں ہی میں کسی کے مزاج میں گرمی و خشکی کا غلبہ ہوتا ہے، اور کسی کے مزاج میں سردی و تری کا، ہم کو یہ بھی معلوم ہے، کہ مزاج کا یہ اختلاف ان ہی عناصر کی کمی و بیشی کا نتیجہ ہوتا ہے، لہذا ظاہر ہے کہ انسانوں کے مزاج میں اعتدال نہیں پایا جاتا، یہی حال اعلیٰ اور ادنےٰ درجے کے حیوانات کا ہے، چنانچہ بعض حیوانات برف میں پیدا ہوتے ہیں اور بعض آگ میں بعض ہوا میں زندہ رہتے ہیں، اور پانی میں مرجاتے ہیں اور بالعکس بعض پانی میں زندہ رہتے ہیں، اور ہوا میں مرجاتے ہیں، و قس علی ہذا یعنی ان کے اجسام میں بھی اعتدالِ عناصر نہیں ہوتا، نظریہ زیرِ تنقید کے مطابق اعتدال ہی ان کو زندہ رکھنے والا ہے، اور وہ اسی اعتدال پر ان کا علم و عمل موقوف ہوتا ہے، اور یہ اعتدال، جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہے، غیر موجود ہے، لہذا یہ حیوانات نہ تو زندہ رہنے چاہئیں، اور نہ ان میں علم و عمل ہونا چاہئے، لیکن باوجود اس

---

[۱] زاد المسافرین ص ۵۹،

عدم اعتدال کے زندہ بھی رہتے ہین، اوران مین علم وعمل بھی ہوتا ہے، نتیجہ بداہتہً یہ ہے کہ ان کو زندہ رکھنے، اوران مین علم وعمل پیدا کرنے کیلئے اعتدال مزاج کافی نہین ہوتا، بلکہ اس کیلئے کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے، یہ اجسام چونکہ نفس کی وجہ سے ذی حیات بنتے ہین، اوراسی سے ان مین علم وعمل پیدا ہوتا ہے، لہذا نفس اعتدال مزاج کا ہم معنی نہین ہوسکتا، اس کے علاوہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اعتدال مزاج حیوانات کو زندہ رکھنے والا ہے، اور یہ ہر حیوان مین پایا جاتا ہے، توظاہر ہے کہ یہ اعتدال مزاج عرض ہوگا، نہ کہ جوہر، اگر یہ نظریہ صحیح ہے؛ توصورتِ حال یہ ہوئی کہ عرض جوہر کو زندہ رکھنے والا ہے، اور حرکت دینے والا ہے، اگر ایسا ہے، توعرض جوہر ہے؛ اور جوہر عرض، لیکن یہ غلط اور محال ہے، لہذا ثابت ہوا کہ نفس اعتدال طبائع نہین[۱]؛

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے، کہ اس نظریے کے ثبوت مین یہ واقعہ پیش کیا گیا ہے، کہ جب دیوانگی، بیاری یا مستی کی وجہ سے اعتدال مین فساد واقع ہوتا ہے، توعلم ناقص ہوجاتا ہے، لیکن اس ثبوت کو پیش کرتے وقت یہ واقعہ نظرانداز کردیا گیا ہے، کہ صحت وہوش کے عود کرآنے سے جب اعتدال دوبارہ قائم ہوجاتا ہے، توغائب شدہ علم بھی عود کرآتا ہے، اور ناقص علم کا نقص رفع ہوجاتا ہے، اب اگر ہم اعتدال کو نفس کا ہم معنی، اوراس لئے "خداوندعلم" فرض کرلین، تو پھر صحت وہوش کے عود کرآنے کے وقت صورتِ حال کچھ ایسی ہوگی :- اعتدال خراب ہوجانے کا مطلب یہ ہے، کہ طبائع حیوانی کے عناصر مین سے بعض فاسد ہوگئے ہین، لہذا جوعناصر کہ صحیح وسالم رہے، وہ اس اعتدال کے بگڑجانے کی وجہ سے بے علم ہوگئے، صحت وہوش کے عود کرآنے سے اعتدال ودوبارہ قائم ہوجانے کا مطلب صرف اسی قدر ہوسکتا ہے، کہ فاسد عناصر کی جگہ نئے عناصر پیدا ہوگئے، یہ نئے عناصران عناصر کے علم سے بداہتہً بے خبر ہین، جوفاسد ہوگئے تھے، اس سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ پہلے اعتدال کے وقت جوعلم موجود تھا، وہ نئے اعتدال کے وقت نہ ہونا چاہئے، لیکن ہمارا تجربہ ومشاہدہ اس کے خلاف ہے، یعنی بیار شخص اپنی بیاری سے صحت پانے کے بعد اپنے گذشتہ علم کو بجنسہ پالیتا ہے، یہی حالت دیوانہ ومست کی ہوتی ہے، ان تمام باتون کو پیش نظر رکھنے سے ظاہر ہے، کہ ہم اعتدال کو نفس نہین کہہ سکتے،

---

[۱] زادالمسافرین ص ۵۹ ۔ ۶۰ ؛

صرف اتنا البتہ کہہ سکتے ہیں، کہ اعتدال نفس کا ایک خادم ہے، اور یہ تمام علم اعتدال میں نہیں، بلکہ نفس میں تھا، اور یہی نفس معقول و مصنوع کی تمام لطیف صورتوں کا معدن ہے، اس لحاظ سے اعتدال کے بگڑ جانے سے علم کا ناقص یا غائب ہو جانا، اور اعتدال کے دوبارہ قائم ہو جانے سے علم کا عود کر آنا ایسا ہی ہے، جیسا کہ ہمارا کوئی خادم بیمار ہو جاتا ہے، تو جو کام کہ اس کے تفویض ہے، وہ ناقص یا ختم ہو جاتا ہے، اور اس خادم کے تندرست ہو جانے کے بعد وہ خاص کام پھر ٹھیک ہونے لگتا ہے، یہ امر تو ثابت شدہ ہے، کہ نفس اپنے معلومات کو کسی وجہ سے گم کر دینے کے بعد دوبارہ حاصل کر لیتا ہے یہی امر اس حقیقت پر دال ہے کہ بیماری وغیرہ کی وجہ سے ذاتِ نفس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ اگر یہ خلل واقع ہوتا تو گم شدہ علم ہمیشہ کیلئے تباہ ہو جاتا، اب بیماری ایک درجے کی موت ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ موت سے بھی نفس کا علم تباہ نہیں ہوتا یعنی یہ کہ نفس میں کوئی فساد نہیں ہوتا، اس کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ فسادِ جسم سے ذاتِ نفس میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا، نفس بذاتِ خود قائم ہے، اور اعتدال کا ہم معنی نہیں[1]

پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے، کہ جسم حیوان میں برابر تحلیل جاری رہتی ہے، اسی وجہ سے سیری کے بعد بھوک لگتی ہے پس ایک ایسی چیز کہ جس کے اجزا برابر کم ہوتے رہیں کس طرح معتدل رہ سکتی ہے لیکن دہری کہتا ہے کہ جو اعتدال جسم حیوانی میں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ تحلیل ہی سے پیدا ہوتا ہے، اب اگر ایسا ہے، تو لازم آتا ہے کہ کبھی تو حیوان میں زندگی کم ہو، اور کبھی زیادہ اور یہ محال ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ بھوک کے وقت جو حالت انسان کی ہوتی ہے، وہ اس حالت سے مختلف ہوتی ہے، جو سیری کے وقت اس کی ہوتی ہے، اب اگر حالتِ سیری حالتِ اعتدال ہے، تو حالتِ گرسنگی لازماً حالتِ عدمِ اعتدال ہو گی، اب چونکہ اعتدال ہی سے حیوانات کی زندگی قائم رہتی ہے، لہٰذا بحالتِ سیری تو ان میں زندگی ہو گی اور بحالتِ گرسنگی عدمِ زندگی یعنی بھوک کی حالت میں وہ حیوان مردہ ہو گا، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ حیوان بھوک کی حالت میں زندہ رہتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ نفس اعتدالِ طبائع کا دوسرا نام نہیں[2]

اسی سلسلے میں ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے، اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ اعتدالِ طبائع ہی نفس ہے، تو ایک سوال

---

[1] زاد المسافرین صفحہ ۱۰۶، [2] ایضاً صفحہ ۶۲،

یہ پیدا ہوتا ہے، کہ آخر وہ کون سی چیز ہے کہ جو اجزائے طبائع کو اس طرح برابر کر دیتی ہے کہ وہ معتدل ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے کل سے بھی جدا نہیں ہوتے؟ جواباً اگر کہا جائے کہ یہ اجزائے طبائع خود بخود جدا ہو جاتے ہیں، اور پھر خود بخود ہی ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں، تو پھر ہونا یہ چاہئے کہ تمام طبائع فی الجملہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں، کیونکہ یہ تمام اجزار کلیات میں سے ہیں، اور کل جسم خود اپنے اجزار کے سوا اور کیا ہے،؟ لیکن فی الواقع ہوتا یہ ہے کہ کل طبائع میں سے بعض اجزا، تو مل جاتے ہیں، اور بعض بدستور جدا رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اجزا کو ملانے والی کوئی اور قوت ہے،

توضیح اس کی یوں کی جاسکتی ہے، کہ سب جانتے ہیں کہ آدمی کی صورت نطفہ ہی میں بن جاتی ہے، اور نطفہ مفعول ہے، اب ہر مفعول کیلئے اس کی اپنی ذات کے علاوہ کسی اور ذات فاعل کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ یہ محال ہے، کہ ایک ہی ذات خود اپنی ہی فاعل ہو اس وجہ سے کہ اس طرح جو چیز کہ زمانۂ آیندہ میں آنے والی ہے، وہ اپنے وجود سے قبل موجود ہو جاتی ہے یعنی ایک ہی چیز موجود بھی ہو جاتی ہے اور معدوم بھی، جو بداہتہً محال ہے، پس واجب ہے کہ نطفہ میں ایک ایسی قوت ہے، جو ذاتِ نطفہ کے ہر جزو کی نگہداشت کرے، اوسکو ایک خاص صورت دے، اور ایک موزون مقام میں اوسکو جگہ دے کر اس کے لائق غذا مہیا کرے، اور اس طرح اس کو زندہ رکھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ قوت جسم نہ ہوگی، بلکہ اس جسم (نطفہ) کی نگہبان اور صورت گر ہوگی، اس دعوی پر دلیل یہ لائی جاسکتی ہے، کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ نطفہ بذاتِ خود اپنی ذات کا صورت گر ہے، کیونکہ یہ ایک ہی جوہر کے اجزار سے مرکب ہے، اور ان میں سے کوئی بھی جزو اس قابل نہیں کہ دوسرے باقیماندہ اجزار کی صورت گری کر سکے، پھر یہ بھی روا نہیں کہ اس کے تمام اجزار خود اپنی ذات کے لئے فاعل بھی ہوں اور منفعل بھی، کیونکہ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے، یہ محال ہے، ماحصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ تمام کا تمام نطفہ مفعول اور صورت پذیر ہے، اسی سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ نطفہ میں کوئی ایسی چیز لازمی ہے، جو اس کے لئے فاعل اور صورت گر ہے، اور اسی سے یہ بھی لازم آتا ہے، کہ یہ چیز جسم نہ ہوگی، کیونکہ اگر یہ جسم ہے تو یہ اسی نطفہ کا ایک جزو ہے، اور اس لئے مفعول ہے،

اس طرح آخری نتیجہ یہ ہے کہ نطفہ میں جو صورت گر ہے، وہ جسم تو نہیں لیکن جوہر ضرور ہے، کیونکہ عرض جسم میں کوئی صورت پیدا نہیں کر سکتا، اس وجہ سے کہ عرض قائم بالذات نہیں ہوتا، اور جو چیز کہ قائم بالذات نہیں، اس کا کوئی فعل نہیں ہوتا

لیکن جو چیز کہ نطفہ کو صورت دیتی ہے اس کا فعل ہوتا ہے، لہذا یہ عرض نہیں، اور چونکہ یہ عرض نہیں لہذا یہ لازماً جوہر ہے، اگر مندرجۂ بالا بیانات سے معترض کو تشفی نہ ہوتی ہو یعنی اوس کو شبہہ ہو کہ انسان یا دیگر حیوانات کے نطفہ میں ایک جوہر ایسا ہوتا ہے جو اس نطفہ کو صورت دیتا ہے، اوسکی نگہداشت کرتا ہے، اسکی غذا مہیا کرتا ہے، اور اس کو زندہ رکھتا ہے، تو اوس کو چاہئے کہ نباتات کے بیجوں اور اُن کی جڑوں پر غور کرے، کیونکہ ان میں بھی اسی قسم کی قوت ہوتی ہے، اور اُن میں یہ قوت ایک جوہر ہے، جو اُس جسم کو صورت دیتا ہے جس کے ساتھ وہ پیوست ہے،[۱]

اس طرح یہ ثابت ہوا کہ حیوانات کے نطفہ میں یا نباتات کے بیجوں اور اُن کی جڑوں میں ایک جوہر ہوتا ہے، ہم اس جوہر کو ہم نفس کہتے ہیں، یہ جوہر یعنی نفس ابداعی ہوتا ہے،[۲] اب جو چیز کہ ابداعی ہوتی ہے، وہ کسی اور چیز کا جزو نہیں ہوتی، اور اس کی قوت بھی مُتناہی نہیں ہوتی، اس کا ثبوت بھی نطفہ اور بیجوں پر غور کرنے سے ملتا ہے، ان دونوں میں یہ قوت بے نہایت ہوتی ہے، چنانچہ گندم کے ایک دانہ سے اتنی گندم پیدا ہوتی ہے، کہ اوس سے زمین اور آسمان پُر ہو سکتے ہیں، اور اس تمام گندم کے ہر دانے میں وہی قوت ہوتی ہے، جو اس پہلے دانے میں تھی، جس سے کہ یہ سب گندم پیدا ہوئی، اب اگر نفس اعتدال ہے اور اعتدال نہ گرم ہوتا ہے نہ سرد، نہ تر ہوتا ہے، نہ خشک نہ گران ہوتا ہے نہ سبک، تو ظاہر ہے، کہ جانوروں میں اعتدال نہیں ہوتا، کیونکہ ان سب کا حال جُدا جُدا ہے، لہذا اُن میں نفس بھی نہیں ہوتا، اور اگر ان میں نفس نہیں ہوتا، تو ان میں یہ جوہر ابداعی بھی نہیں ہوتا لیکن یہ سب خلاف واقعہ ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو ان میں توالد و تناسل بھی نہ ہوتا،[۳]

اس نظریۂ اعتدال میں اس پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ اگر جانوروں کے طبائع متکافی الاجزاء ہوتے، تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ

۱؎ زادالمسافرین ۶۲، ۶۴، ۲؎ دیکھو ۲۹ جہاں ناصر خسرو نے تفصیل کے ساتھ نفس کے جوہر ابداعی ہونے کو ثابت کیا ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے، کہ اس صفحہ پر جو بحث ناصر خسرو نے نفس کے جوہر ابداعی ہونے کے متعلق کی ہے، اس میں نفس مطلق (تعریف کیلئے دیکھو ۲۲۹) کو نہیں، بلکہ نفس ناطقہ کو جوہر ابداعی کہا ہے، حالانکہ اوپر جو بحث ماہیت نفس کے متعلق ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ صرف نفس ناطقہ نہیں بلکہ نفس مطلق جوہر ابداعی ہے، ۳؎ ایضاً ۶۴،

وہ نہ زمین پر ہوتے، نہ آسمان پر، اُن کو نہ تو خاک پر قرار آنا چاہئے تھا، نہ پانی میں، نہ آگ میں، نہ ہوا میں، کیونکہ ان عناصر میں سے ہر ایک کی طبیعت اعتدال کے منافی ہے، لیکن خود ہمارا یہ حال ہے کہ ہم خاک پر رہتے ہیں، اس کا مطلب مرتجا یہ ہے کہ ہم میں اجزائے خاکی کا غلبہ ہے یعنی ہم میں اعتدال نہیں، پھر اگر جانوروں کے طبائع متکافی الاجزا ہوتے تو اُن میں سے بخارات بھی خارج نہ ہونے چاہئے تھے، کیونکہ بخارات صرف اس وقت پیدا ہوتے ہیں، جب پانی پر آگ کا غلبہ ہو جاتا ہے، یہی اس بات کی دلیل ہے، کہ اُن کے مزاج میں گرمی تری پر غالب ہے، اس حالت میں ان میں اعتدال کس طرح قائم رہ سکتا ہے، اسی طرح اگر نفس اعتدال ہے، تو اور جانوروں کے طبائع متکافی الاجزا، ہیں، تو پھر حیوانات محض چھونے سے گرم کیوں ہو جاتے ہیں، ؟ کیا وجہ ہے کہ زمین تو ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اور ہوا، آگ اور پانی اُن کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے، ؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان میں بادی اور آتشی اجزار تو کم ہیں اور آبی اور خاکی اجزار زیادہ ؟ اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے، تو یہ معتدل اور ان کے طبائع کے اجزار متکافی کس طرح ہو سکتے ہیں، ؟ لہذا معلوم ہوا کہ نفس اعتدال نہیں، ان تمام باتوں کے علاوہ اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اگر نفس اعتدال ہے، اور ہر جانور (بشمول انسان) کی طبیعت معتدل ہے، تو حالت یہ ہے کہ انسان تو بات کرنے والا اور عقلمند ہے لیکن دوسرے جانوروں میں بات کرنے کی قابلیت ہو اور نہ ان میں عقل ہے، اگر نفس اعتدال ہوتا، تو ہر جانور میں بلا امتیاز یہ صفات پائی جانی چاہئے تھیں، اب اگر بات کرنے والے اور عقلمند جانور (انسان) کی طبیعت کو معتدل کہا جائے تو ظاہر ہے کہ بے سخن اور بے عقل حیوان کی طبیعت معتدل نہیں ہو سکتی، لیکن حالت یہ ہے کہ معتدل اور غیر معتدل دونوں طبیعت والے جانور زندہ ہیں، لہذا ظاہر ہے کہ ان کو زندہ رکھنے والا اعتدال نہیں، بلکہ کوئی اور چیز ہے یہی کوئی اور چیز نفس ہے[1]

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جسم حیوانی میں کوئی مخصوص جگہ ایسی نہیں، جسے طبیعت کا ظرف یا مستقر کہا جا سکے، یہ اس کے تمام جسم میں پراگندہ ہوتی ہے، کسی جگہ گرمی زیادہ ہوتی ہے، مثلاً دل میں کہ معدنِ حرارت جسمانی ہے، کسی

---

[1] زاد المسافرین ص ۶۵، ۶۶

جگہ سردی کا غلبہ ہوتا ہے، مثلاً انگلیوں کے سروں پر جہاں سردی کی وجہ سے ناخن سخت ہو گئے ہیں، کسی جگہ تری غالب ہوتی ہے، مثلاً معدے میں جہاں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے کسی جگہ خشکی کی زیادتی ہے، مثلاً ہڈیوں میں، اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس جسم کی ترکیب اس قدر متفاوت ہو، اور جس کے طبائع کے اجزا اس قدر مختلف و متفرق ہوں، اس کو معتدل کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے، پھر چونکہ تمام جسم حیوانی میں یہ طبائع پیدا ہوتے ہیں، اور تحلیل کی وجہ سے یہ مٹ بھی جاتے ہیں لہذا ظاہر ہے کہ کوئی چیز ہونی چاہئے، جو ان طبائع کی ترکیب و تقسیم کرے خود طبائع کا ایک جز و تقسیم کرنے کا اتنا ہی کم اہل ہے جتنا کہ اس تقسیم کو قبول کرنے کا، اس کے علاوہ یہ بھی محال ہے، کہ قاسم و مقسوم ایک ہی جوہر سے ہوں، اگر کہا جائے کہ گرمی وہ چیز ہے، جو ان طبائع کو تمام جسم میں تقسیم کرتی ہے، تو سوال ہوتا ہے کہ گرمی کو کون سی چیز تقسیم کرتی ہے، ؟ و قس علیٰ ہذا، مختصر یہ کہ اس طرح پھر لازم آتا ہے، کہ ایک ہی جسم یا ذات، فاعل بھی ہو، اور مفعول بھی، اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، کہ یہ محال ہے، نتیجہ یہ ہے کہ کوئی چیز ہے، جو ان طبائع کو تقسیم و ترکیب کرتی ہے، اور یہ چیز طبائع کے علاوہ کوئی اور جوہر ہے، اس وجہ سے کہ جسم کے اندر طبائع تو مفعول ہے، لہذا کسی وقت ہو سکتا ہے، کہ یہ جوہر جسم سے خارج ہو جائے، اور اس طرح یہ طبائع پراگندہ ہو جائیں[1]،

یہاں تک جو گفتگو نفس کے متعلق ہوئی ہے، اس سے بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، کہ نفس اعتدالِ طبائع نہیں، اب ثبوت طلب امر یہ ہے کہ زندگی ہمارے اجسام کے لئے عرضی ہے، عرضی وہ چیز ہوتی ہے، جو کبھی تو ایک چیز میں موجود ہو، اور کبھی نہ ہو، اب ہمارے جسم کبھی تو زندہ ہوتے ہیں، اور کبھی زندہ نہیں ہوتے، لہذا ہماری تعریف کے مطابق اجسام کی زندگی عرضی ہے، پھر کسی چیز کے عرضی یعنی ایسی چیز سے پیدا ہوتے ہیں، کہ وہ معنی اس دوسری چیز میں جوہری ہوں، چنانچہ جب ٹھنڈا لوہا آگ میں رکھا جاتا ہے، تو گرم ہو جاتا ہے، اب گرمی آگ کیلئے جوہری ہے، جب لوہا آگ میں ڈالا جاتا ہے، تو اس میں یہ عرضی گرمی پیدا ہو جاتی ہے، جو آگ کے لئے جوہری ہے، بعینہٖ یہی حال ہمارے اجسام کا ہے، جب ہمارے اجسام زندہ ہوتے ہیں، تو ان میں ایک ایسی چیز ہوتی ہے، جس کیلئے زندگی جوہری ہے، اسی چیز کی جوہری زندگی سے ہمارے

---

[1] زاد المسافرین ص ۷۹، ۸۰

اجسام اپنی عرضی زندگی اخذ کرتے ہیں، ہم اسی چیز کو جس کے لئے زندگی جوہری ہے نفس کہتے ہیں، اس طرح ہم کو ایک ایسی چیز مل جاتی ہے، جو نہ صرف بذاتِ خود زندہ ہے، بلکہ جو ایک جوہر کو زندگی بخشنے والی بھی ہے، اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ چیز جوہر ہے نہ کہ عرض، پھر ہم نے دیکھا کہ جس چیز کیلئے زندگی عرضی ہے، وہ تو فانی ہے، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کیلئے زندگی جوہری ہے، وہ غیر فانی ہے، یہ بھی اس سے قبل[1] واضح کیا جاچکا ہے کہ جسم میں حرکتِ قسری[2] کے سوا اور کوئی حرکت نہیں ہوتی، اور یہ حرکت کسی ایسی چیز سے پیدا ہوتی ہے، جو بذاتِ خود متحرک بالارادہ[3] ہے، لہذا معلوم ہوا کہ جسم کی حرکتِ قسری نفس سے پیدا ہوتی ہے جس کی حرکت ارادی[4] ہے اس کے علاوہ زندہ جوہر متحرک ہوا کرتا ہی، اور نفس چونکہ زندہ ہی، لہذا لازم آیا کہ حرکتِ مطلق صرف اُس نفس کیلئے ہی جس کیلئے زندگی جوہری ہے،[5]

انسان "صورتہائے نطقی وکتابتی وصنعتی" کو اُن کے مخصوص ہیولیٰ پر پیدا کرتا ہے، محسوس صورتوں کو قوتِ متخیلہ کے ذریعہ اس ہیولیٰ سے منتزع کرکے قوتِ حافظہ میں محفوظ کرتا ہے، اور معلومہ صورتوں کو اپنے نفس میں اس طرح جگہ دیتا ہے، کہ ایک معلومہ صورت، اور کسی دوسری معلومہ صورت میں غلط ملط نہیں ہوتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس مجرد صورتوں کا مستقر و مکان ہے، اس قول کی توضیح اس طرح بھی ہوسکتی ہے، کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے، تو اس کو پہچانتا نہیں، اس وجہ سے کہ اس کی قوتِ متخیلہ نے اس صورت کو اس کے ہیولیٰ سے مجرد نہ کیا تھا، اور اس لئے اس کے حافظے نے اس کو محفوظ نہ کیا تھا، لیکن جب وہ اس کو دوبارہ دیکھتا ہے، تو اس کو پہچان لیتا ہے "اس سبب کہ پہلے تجربے کے بعد اس نے اس کی مجرد صورت کو محفوظ کرلیا تھا، دوسرے تجربے کی مجرد صورت کو چونکہ وہ پہلے تجربے کی مجرد صورت کے مشابہ پاتا ہے، لہذا وہ کہتا ہے، کہ یہ وہی چیز ہے" اسکو وہ شناخت کہتا ہے، دوسرے الفاظ

---

[1] دیکھو زاد المسافرین ص ۴۵ [2] یعنی وہ حرکت جو اندر مطبوعات آید، و مر آن را بر خلاف طبع آن بجنبانند چون حرکت سنگے کہ ما اورا سوے ہوا بر اندازیم تا بقہر سوے ہوا بر شود و بطبع فرود آید، (ایضاً ص ۳۹، ۴۰) [3] حرکت قسری را پدید آرندہ حیوانست کہ متحرک است، بحرکت ارادی (ایضاً ص ۴۵) [4] اما حرکت ارادی مر حرکت جانوران را گفتند کہ ایشان بحرکات مختلف متحرک اند، (ایضاً ص ۴۰) [5] (ایضاً ص ۷۶، ۷۷)،

ہین نفس حواس کی وساطت سے معلومہ صورتون کو قبول کرتا ہے، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے، کہ نفس "صورتہائے علمی" کے لئے ہیولی ہی بعینہٖ اس طرح جیسے جسم "صورتہائے صناعی" کیلئے ہیولیٰ ہے، پھر جسم مختلف صورتین قبول کرتا ہے، چنانچہ پانی، آگ، ہوا، خاک، افلاک، کواکب وغیرہ جسم ہی کی مختلف صورتین ہین، لیکن جسم کی یہ مختلف صورتین بغیر حرکت کے پیدا نہین ہوتین، اوراس سے قبل واضح کیا جاچکا ہے کہ جسم مین بذاتِ خود کوئی حرکت نہین ہوتی، لہذا ظاہر ہے کہ جسم کو حرکت دینے والی ایک ایسی چیز ہے جسمین بذاتِ خود حرکت ہوتی ہے، یہ بھی دکھایا جاچکا ہے، کہ نفس ہی ایسی چیز ہے، جسمین حرکت ذاتی ہوتی ہے، اور یہ حرکت ارادی ہوتی ہے، لہذا کہا جاسکتا ہے کہ نفس جسم کو صورت دیتا ہے یعنی نفس "خداوندِ صنعت" ہی پھر چونکہ جسم مین حرکت نہین ہوتی، اور نفس معدنِ حرکت ہے، لہذا ثابت ہوا کہ نفس جسم نہین[1]۔

اس تمام لمبی چوڑی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مین ایک جوہر ہے، جو بذاتِ خود زندہ ہے، اور مرنے والا نہین جس کی حرکت ذاتی ہے، جو مجرد صورتون کا مکان ہے، "خداوندِ صنعت" ہے، "دانش پذیر" ہے جسم کی فنا کے بعد باقی رہنے والا ہے، اور جسم نہین، اسی جوہر کو ہم نفس کہتے ہین[2]۔ (باقی)

---

[1] زاد المسافرین صفحہ ۶۹، ۷۰، [2] ایضاً ص ۱۷،

نفسیات ترغیب

کسی انسان کو کسی کام، یا چیز، یا تحریک کے لئے ہم کیونکر آمادہ کر سکتے ہین، اوراس کو ترغیب اور شوق دلا سکتے ہین، اس کے نفسیاتی اصول کیا ہین، اس کتاب مین انھین اصول کی تشریح ہے، تجارت، اشتہارات اور تقریر و وعظ مین ہر جگہ ان اصول کی رعایت کی ضرورت ہے، اس لئے تجارت کے مشتہرین، واعظین، مدرسین، اور وکلا سب کو اس کتاب کی ضرورت ہے، ضخامت ۲۱۱ صفحے، قیمت ؏

گجراتی زبان اور اوس کی تاریخ،

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی،)

(۲)

زبانِ گجراتی کے قواعد

زبان اور قواعد ایک دوسرے سے جدا نہین کئے جا سکتے ہین، گرامر (قواعد) زبان کی کنجی ہے، اس مختصر مضمون مین ہم گجراتی زبان اور گجراتی لٹریچر کا ذکر کر رہے ہین، اور اگر ہم اس کی گرامر کے متعلق کچھ لکھین تو بیجا نہ ہوگا، ابتدا مین گجراتی زبان کی کوئی گرامر نہ تھی، بہت پُرانے زمانہ مین سدھراج "جے سنگھ" کے زمانہ مین ہیمچند نے گرامر لکھی تھی، لیکن وہ پُرانی گجراتی زبان، یا اپابھرنست کے لئے تھی، اس کا موجودہ گرامر سے بہت کم تعلق ہے، گجرات مین ہم تو سیع تعلیم کیلئے پادریون یعنی (مشنریون) کے ممنون ہین، پُرانی کتابون کو جمع کرنا، اور اُن کی طباعت واشاعت یہ سب اُنھین لوگون کے محنت و مشقت کا نتیجہ ہو، گجراتی زبان کی سب سے پہلی گرامر بھی ایک انگریز مشنری کی محنت کا نتیجہ ہے، گجراتی ابجد کے حروف سنسکرت زبان سے لئے گئے ہین، پہلے حروف پر لکیر کھینچی جاتی تھی، جیسا کہ "دیوناگری" مین کرتے ہین، مثلاً "گائے کالی چھے، (یہ گائے کالی ہے) الفاظ بھی جدا جدا نہین لکھے جاتے تھے، لکیر کھینچنے کی عادت رفتہ رفتہ غائب ہوتی گئی، لیکن بنیون کی اب تک یہ عادت ہے کہ وہ تجارتی حروف اور بہی کھاتون مین لکیر کھینچتے ہین،

گجراتی ابجد کے حرفِ علت اور صحیح حسب ذیل ہین، الفاظ،

اَ، آ، اِ، اُ، اُو، اے، اَے، او، اَو، اَم، اَہا،

حروفِ صحیح،

ک، کھ، گ، گھ، انگ، + چ، چھ، جہ، جھ، نا + ٹا، ٹھ، ڈ، ڈھ، انا، ت، تھ، د، دھ، ڑان + پا، پھ، ب، بھ، ما،

یا، را، لا، وا، سا کھا، شا، ہا، چھتر گیان،

حروفِ علت" دو قسم کے ہین، طویل اور مختصر، اے، ای، اُو، او، ام، اہ مختصر حروفِ علت ہین اور باقی طویل ہین

گجراتی زبان کی شاعری،

گجراتی مین شاعری کا بھی بڑا حصہ ہے، اور پندرہوین صدی عیسوی سے لیکر آج تک بہت سے گجراتی کے شاعر پیدا ہوئے ہین

گجراتی کے قدیم شاعرون کے نام نرسینھ، میران اور بھالان ہین،

نرسینھ کے "شرنگیر" کے بعض مقامات قابلِ اعتراض ہین، اور میران کی نظمین زیادہ تر اخلاقی ہین،

میران اور نرسینھ کا ایک اور ہمعصر بھالان نامی تھا، یہ گو اتنا مشہور نہ تھا، جتنا کہ وہ دونون تھے، تاہم وہ بڑا عالم تھا، ایسے زمانہ مین جب کہ ہندوستان کے کسی صوبہ کی زبان کو سنسکرت تصانیف کے ترجمہ کا فخر حاصل نہ تھا، بھالان نے سنسکرت کے مشہور و معروف، آرمان، یا آنا، بھاٹ کی کادمبری، کا ترجمہ گجراتی نظم مین کیا تھا، اس مین کوئی شک نہین کہ سنسکرت نثر کا ترجمہ گجراتی نظم مین کرنا، بہت دشوار کام تھا، بھالان کی تصانیف بہت ہین،

اس عہد کے چند اور شاعر بھی ہین، مثلاً بھیما، (۱۴۸۵ء) اور پدمنابھا، وغیرہ، پدمنابھا نے ایک تاریخی نظم لکھی ہے جسے "کھانڈے پربھاندھا" کہتے ہین، اور گجراتی لٹریچر مین بہت بے نظیر ہے، یہ تصنیف حال ہی مین دستیاب ہوئی ہے، اور شائع کر دی گئی ہے، اس مین علاءالدین خلجی کا گجرات پر حملہ کرنا، کھانادکا اوس کو اپنے ملک مین سے گذرنے دینے سے انکار کرنا، اور اوس کے بعد جنگ کا ہونا، کھانادکے لڑکے ویرام اور شہزادی کے عشق کی ابتدا، اور فوجون کے کوچ کرنے کی تفصیلات، شہر کا فتح ہونا، مسلمان عورتون کا اپنی شکست پر آہ وزاری کرنا، شہزادی فیروزہ کی ناکامی، یہ تمام واقعات تفصیل وار اور پرجوش طریقہ پر بیان کئے گئے ہین، زبان "بھالان" سے زیادہ پرانی معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تصنیف مقبول ہونے سے اس کی اصلی شکل ایک دوسرے سے بیان کرنے مین گم نہ ہونے پائی، یہ تصنیف حال ہی مین دستیاب ہوئی ہے[1]

---

[1] اس مین واقعات سب فرضی ہین، ابوظفر،

سولہوین صدی کا زمانہ مقابلۃً ایسا زمانہ ہے، جسمین کوئی لٹریری تصنیف نہ تھی، سولہوین صدی گجراتی لٹریچر مین ضعیف ترین اور بدترین زمانہ ہے، لیکن اس کے بعد سترہوین صدی کا زمانہ گجراتی کی تاریخ مین بہترین زمانہ سمجھا گیا ہی، فلاسفر آکھولا، پریمانند .... اور شرامن "قصہ گو جیسے بڑے شاعرون نے اسی صدی مین ترقی کی ہے،

"آکھو" احمد آباد کے ایک مالدار سُنار (زرگر) نے سوسائٹی سے تنگ آکر اپنی تمام زندگی اصلی "گرد" کی جستجو کیلئے وقف کر دی، جب کبھی اور جہان کہین وہ سادھوون کی جماعتون مین گیا، اوس نے اوس کو ذلیل ترین حالت مین پایا، اور اوسے کوئی اصلی "گرو" نہ مل سکا، اس کی جو کچھ آرزو تھی، وہ یہ تھی، کہ اوسے ایسا نیک اوستاد ہاتھ لگے، جو اوسے صحیح راستہ دکھائے، اور وہ اسی تلاش مین روانہ ہوا، بنارس اور الہ آباد کی جاترا کو جاتے ہوئے راستہ مین اوس نے جے پور مین گوکل ناتھ کے یہان قیام کیا، جو وشنو کے ولبھ چاریا مندر کے سردار تھے، چونکہ مالدار تھا، اوس کی آؤ بھگت (خاطر تواضع) خوب ہوئی، لیکن یہ عالم بزرگ نقلی باد شاہون سے دھوکا نہین کھا سکتا تھا اُس کی روحانی خواہشین تشنہ لب تھین، وہ وشنو نقطۂ نظر کے سادھوؤن سے واقف تھا اوسے ایک قابل گرو کے نہ ملنے سے مایوسی ہوئی، ایک دفعہ بنارس کے قریب ایک جھونپڑی مین اوس نے ایک سنیاسی کو صرف ایک ہی طالب علم کو ویدانتا فلاسفی کے اصول بیان کرتے ہوئے سُنا، ایک ایسے پُر (مقدس) شہر مین جہان چھوٹے سے چھوٹا گرو بھی ایک سو چیلے جمع کر سکتا ہے، یہ بہت ہی غیر معمولی واقعہ تھا، "آکھو" تعلیم کے وقت جھونپڑی کی پتلی دیوارون کے پیچھے چھپ کر اُس کے لکچر (وعظ) کو بہت توجہ کے ساتھ سننے لگا، اس طرح سے کئی دن گذر گئے، اس کے شاگرد کا یہ معمول تھا، کہ پڑھنے والے کے الفاظ کا جواب ہُن ہُن کر یا سر ہلا کر دیدیا کرے، اور اور اس طرح سے اس کی ہمت افزائی ہو، اور اوسے یہ بتایا جائے کہ اوس کا شاگرد بیدار ہے، اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اوسے وہ سُن اور سمجھ رہا ہے، اوسکی تمام کوششون کے باوجود یہ خاص سامع روز سوجایا کرتا تھا، اور چونکہ یہ ضروری تھا کہ پڑھنے والے کی دلچسپی کو قائم رکھا جائے، آکھو دیوار کے پیچھے سے اوس کا جواب دیدیا کرتا تھا، اس حرکت نے گرو کو چوکنا کر دیا، اور تلاش کرنے پر اوس نے دیکھا کہ "آکھا" ہے، اُس سے اس عجیب حرکت کی وجہ دریافت کی گئی، اور

اوس نے جو کچھ واقعہ تھا، بیان کیا، اور درخواست کی کہ اوسے شاگرد بنا لیا جائے، اپنی اس خواہش کے ثبوت مین اوس نے وہ تمام کتھا (قصہ) کہہ سنایا، جو اوس نے گذشتہ بارہ[۱] مہینون تک سنا تھا، سوامی کو اس کا یقین ہوگیا، کہ اوس سے اوس کو عقیدت بہت ہے، اوس نے اوس کو اپنا چیلہ بنا لیا، آکھا نے ویدانتک فلاسفی پر ملکہ حاصل کرلیا، احمدآباد واپس لوٹتے وقت وہ اپنے پرانے گرو، گوکل ناتھ سے جو ایک متمول وشنو مہاراج تھا، ملنے گیا، اس ملاقات سے اُس کا مقصد یہ دیکھنا تھا، کہ اب جب کہ وہ دنیاوی دولت سے جدا ہوچکا ہے، اور صرف تعلیم ہی کی دولت اوس کے پاس تھی، اوس کی آؤبھگت کیسے ہوتی ہی، اُس کا خیر مقدم پہلے جیسا نہین کیا گیا، اور مہاراج نے تو اوسے پہچانا تک بھی نہین کہ وہ آکھا ہے، آکھا اس سے بہت ہی برہم ہوا اور اوس نے حسب ذیل نظم لکھی،

"مین نے گوکل ناتھ کو اپنا گرو بنایا، اور یہ ایسا تھا جیسے پرانے بیل پر لگام لگانا، جو کچھ تاضرور ہے، لیکن اس آنکس کا جواب نہین دیتا، ہوا اوسے لگا یا جاتا ہی، گرو تمھاری دولت کو تم سے لے لیتا ہے، مگر تمھارے قلب کی بےچینی و بیقراری کا کوئی علاج نہین کرتا ہے، ایسے گرو سے کیا نیکی کا کام ہوسکتا ہے"

وہ اس دنیا کی مکاری اور فریب سے تنگ آگیا تھا، اوس نے اس دنیا کو حقیقی ہستی کی تلاش کرنے کیلئے ترک کردیا، اوس نے بہت سے پاڑھے لکھے ہین جن مین اوس نے دنیا اور اوس کے طریقون کے متعلق بہت سے مفید سبق سکھائے ہین، اوس نے ویدانتک فلاسفی کے اصولون کو نظم کرنے کی کوشش کی، یہ دراصل ایک بہت مشکل کام تھا، اس کے مضمون کو نظم کرنے سے مشکل سے اوس کے طرز ادا مین کوئی دلفریبی پیدا ہوئی ہو، اوس کی زبان توشستہ ہی نہ صحیح اس کی زبان مین نزاکت و لطافت نہین ہے، اوسے زبان سے کوئی خاص انس نہین ہے، وہ نہین چاہتا تھا، کہ اُسے کوئی شاعر کہے، ۱۶۳۶ء اور ۱۷۳۴ء مین بڑودہ مین گجراتی کا ایک اور فدائی گذرا ہے، گجرات کی زبان اور لٹریچر کو گمنامی کی دلدل سے نکالنے والا دراصل وہی ہے، "نرسنہ" کی طرح یہ بھی چودہ یا پندرہ سال کی عمر تک ان پڑھ تھا، اسکا نام پریمانند تھا، ابتدا مین پریمانند اپنے مضامین کو ہندی زبان مین لکھتا تھا، ہندی اوس وقت کے زمانہ کے عالمون اور تہذیب یافتہ لوگون کی مانی ہوئی زبان تھی، اس کے گرو رامچرن نے اوسے اپنی مادری زبان گجراتی مین نظمین لکھنے

کی ہدایت کی، یہ اوسے بہت ناگوار گذرا، اور اس وقت اوس نے یہ عہد کرلیا، کہ جب تک وہ گجراتی زبان "چارٹکے کی زبان" کے دھبّے کو اپنی مادری زبان کے سر سے مٹا نہ دیگا، اور اوس کو ترقی نہ دے لیگا، سر پر پگڑی نہ رکھے گا، ان ایام مین برہمنون کے لئے پگڑی سر پر نہ رکھنا بہت بدتہذیبی تھی، پریمانند کو اپنی زبان کو ترقی دینے کا عشق ہو گیا تھا، اوس نے اپنے اس عہد پر ہر حالت مین پابند رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا، جو کام پریمانند نے گجراتی لٹریچر کے لئے کیا، وہ آج تک بہت قیمتی اور بے نظیر ہے، اوس نے ایک ادبی مجلس قائم کی، اور خود اس کا صدر بنا، اس مجلس کے ہر ایک ممبر کے ذمہ خاص کام تھا، ہندوستان کی ہر ایک زبان کی خصوصیات کو شامل کرنے کیلئے اوس نے ملکی زبانون کے مطالعہ کا کام اپنے جماعت کے چیدہ چیدہ ماہرون کے سپرد کیا، چند عورتین بھی جو ہمدردی کا مادہ رکھتی تھین، اس مجلس کی ممبر تھین،

ان کام کرنے والون مین سے چھ اشخاص اپنا نام کر گئے ہین، ان مین سے ایک خود شاعر کا لڑکا ویر ولبھ تھا، باپ اور بیٹے دونون کو اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کا بہت ہی عشق تھا، ولبھ اپنے باپ کو اپنا گرو سمجھتا تھا، اور اپنی تصانیف کی افتتاحیہ نظمون مین شکریہ مین اس کا نام درج کرتا تھا، وہ اپنے اور گرو کی مدح سرائی اس قدر کرتا تھا، کہ وہ اوس کو نہ صرف ایک بڑا بلکہ افضل ترین شاعر کہتا تھا، "ولبھ" کے سپرد ہندی زبان کی خوبیون کو شامل کرنے کا کام تھا،

اس کے شاگردون مین سے دوسرا شاگرد تنیشور تھا، جو سنسکرت زبانون کے مطالعہ کرنے اور اس کی خصوصیات کو گجراتی زبان مین شامل کرنے مین مصروف تھا، اوس نے بعض سنسکرت تصانیف کا ترجمہ کیا ہے، مثلاً "آکھا" پریمانند بھی نہین چاہتا تھا، کہ لوگ اسے شاعر کہین، اوس نے اپنی نظمون مین کبھی اپنے کو شاعر نہین لکھا ہے، وہ اپنے کو سادہ طور پر صرف بھٹ پریمانند کہتا تھا، کہا گیا ہے کہ پریمانند نے اپنی آخری عمر مین (بھگوت گیتا) کا (دسوان باب) وساما اسکندھا کے ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا، چونکہ اوسے یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قوا روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہین، اور یہ کام ناتمام رہے گا، اس لئے اوس نے اپنے چار سب زیادہ ترقی یافتہ شاگردون کو بلا کر باقی حصہ کے ترجمہ کرنے کا کام اُن کے سپرد کیا، اُن کا امتحان لیا گیا، تمام شاگردون نے اپنے اپنے ترجمے شاعر کو پیش کئے، لیکن ترجمہ کے آخر مین، اُن مین سے ہر ایک نے سوائے "سندر" کے اپنے تئین شاعر لکھا، کیونکہ اس وقت کے نظم لکھنے والون کی ہمیشہ یہی عادت تھی، "سندر" کے حق مین فیصلہ ہوا، گو کہ اُس کا ترجمہ بہت

کم درجہ کا تھا، اس کے مشہور و معروف اوستاد کی دمِ مرگ وصیت ترجمہ کی تکمیل کا کام اس کے سپرد کیا گیا، اُن ایام مین جیسا کہ آج بھی ہے، لیکن اتنی اچھی حالت مین نہین، پُرانے پڑھنے والون کی جماعت تھی، جو گاگریا بھٹ" یا "مان بھٹ" کہلاتی تھی، یہ پڑھنے والے برہمن ہوتے ہین، جو پڑھتے وقت تال دینے کے لئے ایک تنگ گلے کے تانبے کو جسے گاگر" یا "مان" کہتے ہین، بجاتے ہین، ایسی کتھا یا بیان شرحون اور مثالون کے ساتھ سادہ اور دلچسپ زبان مین بڑے مجمع کے سامنے گلیون مین پڑھا جاتا ہے، عوام پران کتھاؤن کا اثر بہت ہوتا تھا، ان پڑھ عوام کو پُران کی تعلیم اسی طرح دیجاتی تھی، "مہابھارت" اور "رامائن" کا جو کچھ تھوڑا بہت علم عوام کو ہے، وہ مان بھٹ ہی کی شخصیت کا نتیجہ ہے، پریمانند، خود "مان بھٹ" تھا، وہ کتھا کے لئے نظمین لکھتا تھا، اور بڑے مجمع کے روبرو انھین پڑھتا تھا، وہ مہابھارت اور بھگوت سے مضامین انتخاب کرکے خود اپنے آکھیان یا کتھا نظم کرتا تھا، "رانایگوا، آرکھا، ہرن نالاکھین" وغیرہ اس کی بعض اس قسم کی تصانیف ہین، جن کے مضامین پُران کے کتھا مین سے انتخاب کئے گئے ہین، اس کی تمام تصانیف مین سے "نالاکھیان" بہت زیادہ مقبول عام تصنیف ہے، نہ صرف یہی کہ وہ مقبولِ عام ہے، بلکہ گجراتی شاعری کی تصانیف مین سے بہترین تصنیف ہے، چیتر مہینے مین "اوکھاہرن" کے پڑھنے کی آواز اگر ہر ایک گھر مین نہین تو قریب قریب ہر ایک قصبہ اور گاؤن مین سنائی دیتی ہین، مختلف مقامات سوسائٹی کے رسوم و رواج، حرکت کرنے والی اور غیر حرکت کرنے والی دونون چیزون کی تصویر لفظون مین کھینچنا، اور مردون اور عورتون کے کیرکٹر کی تشریح کرنے کے متعلق پریمانند کے جو بیانات ہین، وہ تمام تشبیہات اور استعارون سے جڑے ہوے اور "النکار" (بدائع) سے پُر ہین، اس مین اس کا کوئی ثانی نہین ہوا اور وہ گجراتی زبان پر مستقل طور پر حکمرانی کرتا ہے، پریمانند کی زبان نہایت ہی شیرین اور نازک ہے، اب تک کوئی شخص اس کی طرزِ تحریر کی نقل اُتارنے مین کامیاب نہین ہوا ہے، اوس نے خدا کی حمد اور بہت سے بزرگون کی تعریف مین نظمین لکھی ہین، اوس نے نرسنھ کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہو، پریمانند بہترین شاعرون مین سے اعلیٰ درجہ کا شاعر ہے،

"سامل بھٹ"، جو پریمانند کا حریف اور ہمعصر تھا، ونیگنگر کا (جسے اب گومتی پور کہتے ہین) جو احمد آباد کے قرب و جوار مین ہے، باشندہ تھا، بحیثیت شاعر کے وہ پریمانند کے مقابلے مین دوسرے درجہ کا شاعر ہے، یہ دونون شاعر

ایک دوسرے کے بڑے حریف تھے، پریمانند کی یہ عادت تھی، کہ وہ پرانے "پرانون" سے مضامین انتخاب کرتا تھا، اور سامل نے خود اپنی خیالی قصون کو نظم کیا تھا، ان دونون شاعرون کے درمیان ادبی بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے، پریمانند خود تو ان مین حصہ نہ لیتا تھا، مگر اس کے لڑکے ولبھ کو ان سے بہت دلچسپی تھی، سامل ہی نے گجراتی زلٹریچر مین قصہ نویسی کا طریقہ جاری کیا ہے، یہ بیجا نہ ہوگا، اگر ہم اوسے گجرات کا سوفٹ (SUFET) کہین، قصے ناول کے پیش خیمہ ہوتے ہین، سامل کے مضمون کی خواتین کا کیرکٹر، نازک، عالمانہ اور ظریفانہ ہے، سامل کے قصون مین رقاصہ عورتون کا بہت کچھ حصہ ہے، وہ مذہبی جماعتون کے درمیان کوئی فرق نہین سمجھتا ہے، اور سوسائٹی کے آپس کے رشتون کی پروا نہین کرتا ہے، لیکن وہ اس قایل ہے، کہ اخلاقی قواعد کی سختی کے ساتھ پابندی کرے، ایک نبیا بغیر روک ٹوک کے کسی رقاصہ سے شادی کر سکتا ہے اور اوس پر بھی اس کے کیرکٹر اور چال چلن مین کوئی دھبہ نہین آتا، وہ اپنی چارون بیویون کا مساویانہ طور پر خیال رکھتا ہے اور وہ اس کی خدمت بہت ہی اچھی طرح کرتی ہین، چار بیویان آپس مین ایک دوسرے کو بہن خیال کرتی ہین، وہ مردون کی طرح بہادر اور نڈر ہوتی ہین، عورتون کے کیرکٹر مین مردون کی اصلی فطرت دکھائی گئی ہے، سامل کی عورتین گو جوان ہین مگر بوڑھون کی سی عقل رکھتی ہین، اس کے مرد اور عورتون کے ویسے ہی جذبات ہوتے ہین، جب کہ وہ ایک دوسرے کے عاشق ہوتے ہین، اور اون کے عشق کا انجام یہ ہوتا ہے، کہ اُن کی شادی ہو جاتی ہے، اور وہ جب شادی کرتے ہین، تو یا تو محض ذوق کے خاطر یا حسن یا سچے عشق کی وجہ سے ایسا کرتے ہین، لیکن وہ اکثر والدین کی مرضی کے خلاف ایسا کرتے ہین، "انگد وستی" "بدماوتی" "نند بتریسی" "سنہاسن بتریسی"، یہ اسکی بعض بہت مقبول کتابین ہین، اس کی زبان سادہ ہے، لیکن بہت ہی پُراثر ہے، اوس نے گجراتی زبان پر گہرا نقش چھوڑا ہے، اس کے "چھپّن" (ایسی نظم جسمین چھ مصرعہ ہوتے ہین) نے اوس کی یاد کو ہمیشہ کے لئے قائم کردیا ہے، اوس کی طرز تحریر خود اوس کی طرز تحریر ہوتی ہے یعنی اوس کی زبان سادہ، مصرعے سادہ، نیک عادات کے متعلق سادہ کہانیان وہی سچا شاعر ہے، جو سادہ زبان مین تعلیم دے سکتا ہے، ایک مالدار کنبی ٹیل رکھیلداس نام "سامل" کا مربی تھا،

اوس صدی کے چھوٹے چھوٹے شاعرون کی تعداد اس قدر تھی، کہ اُن کو نظر انداز نہین کیا جا سکتا، اٹھارہوین

صدی کی ابتدا مین ایک شاعر گذرا ہے جس کا نام ونیہ بھٹ تھا اور جو بہادیوی کا فدائی تھا، اوس نے بھی چار اہہا کے نام سے بہت سے گربے لکھے ہین، وہ پڑھا لکھا نہ تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "بہادیوی" اس کے پُر خلوص عقیدت سے اس قدر خوش ہوئی، کہ اُس دیوی نے اپنی دیوی شکتی سے اُسے علم کی نعمت سے سرفراز کر دیا، اُس صدی مین کوئی مشہور و معروف شاعر نہین ہوا ہے،

"بھوجا بھگتا" ایک بھگت شاعر تھا، جو انیسوین صدی مین گذرا ہے، اس کا جنم پٹے دار یا کُنبی گھر مین ہوا ہے، جو علم سے بے بہرہ تھا، وہ بھگت تھا، اوس نے بہت سے صوفیانہ بھجن لکھے ہین، اوس نے اپنے زمانہ کے تمدنی رسم و رواج پر بہت ہی سختی سے نکتہ چینی کی ہی، سائل کے چیتے پر تیم داس کے باڑے نرسنگھ کے صبح کے ترانے (بھاٹیان) اور بھوج کے بھجن یہ سب بہت شہرت رکھتے ہین، اوس نے تجرد اور مکر کی کو بہت ہی بیدردی کے ساتھ بدنام کیا ہے، اوس کی زبان شہریون کی طرح شائستہ نہین ہے لیکن پر خلوص ضرور ہے، وہ نہ تو پڑھا لکھا تھا، نہ شائستہ و مُہذب تھا،

ایک اور شاعر گردھار ہے، وہ ۱۷۸۶ء مین پیدا ہوا، اور ۱۸۵۲ء مین مرگیا، راماین کو گجراتی زبان مین لکھنے والا وہی ایک مقبول شخص مانا جاتا ہے، اور اوس کی اس گجراتی زبان مین راماین کو بہت سے لوگ پڑھتے ہین،

سچانند سوامی نے جو جماعت گجرات اور کاٹھیاواڑ مین قائم کی، اور (جو دراصل اجودھیا سے آئی تھی) گو وہ بہت پُرانی جماعت ہے، لیکن دونون صوبون مین اس کے بہت زیادہ پیرو ہوگئے تھے، سچانند کے عقیدے کے اس صدی مین ہمین بہت لوگ ملتے ہین، اور ادن مین دو اشخاص برہمانند اور نشکولانند بہترین لوگون مین سے ہین، برہمانند کی قوالی کو آج بھی لوگ بہت ذوق و شوق کے ساتھ گاتے ہین،

(باقی)

ایک یورپین اہل قلم کی نہرہ سرائی

خالد اور لیلیٰ کا مفروضہ افسانہ عشق،

از مولنیا شاہ معین الدین احمد صاحب رفیق دار المصنفین،

یورپین اہل قلم کا یہ نہایت قدیم اور خوشگوار مشغلہ ہے کہ جب وہ اسلامی تاریخ پر قلم اوٹھاتے ہین، توان کی باریک بین نظر عموماً اونھین بے سروپا افسانون اور مشتبہ واقعات پر پڑتی ہے، جنھین تھوڑی سی حاشیہ آرائی اور ردوبدل سے اسلام اور مسلمانون کے خلاف کوئی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہو، اس خوشگوار مشغلہ کے ماتحت حال مین ایک اہل قلم مسٹر گرہیم لوئیس نے جو شرقیات پر ایک سلسلۂ مضامین ارقام فرما رہے ہین، ۲۷ اگست ۱۹۳۳ء کے السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا مین ایک مختصر مضمون کے ساتھ اسلام کے فاتح اعظم حضرت خالد بن ولیدؓ اوران کی فرضی معشوقہ لیلیٰ کا ایک مرقع دیا ہے،

اس مرقع مین حضرت خالدؓ ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرہ مین جو اپنی سجاوٹ کے اعتبار سے کسی مشرقی بادشاہ کا ایوان نشاط معلوم ہوتا ہے ایک مکلف کوچ پر تشریف فرما ہین، پیرون کے نیچے ایک نفیس پا انداز ہے، کمرہ کے دروازون پر نہایت مکلف پردے اور چھت مین قندیلین آویزان ہین، بخورات کا دھوان کمرہ کی فضا، کو معطر کر رہا ہے پاس ہی ایک وضع علی شاہی پیچوان لگا ہوا ہے، اور ایک منقش میز پر فواکہات اور (غالباً) شراب کی صراحی اور بلوری جام قرینہ سے رکھے ہوے ہین، اور خالد کے بالمقابل ان کی معشوقہ نیم استادہ ہے، اور دونون ایک دوسرے کو مست و مخمور نگاہون سے دیکھ رہے ہین،

اس مرقع کے نیچے ایک طویل نوٹ یا مختصر مضمون کی شکل مین اس مرقع کی تشریح ہے، اس کا خلاصہ آگے آتا ہے پہلے مین مسٹر گرہیم کی اس خوش مذاقی کی داد دیتا ہون کہ اونھون نے ایک خشک اور جنگجو عرب سردار کو جو تہذیب و معاشرت کی نفاستون کا کیا ذکر ان کی ابجد سے بھی واقف نہین ہے، اور جس کی ساری زندگی میدان جنگ کے خارزارون مین گذری ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ مین جو اپنی سجاوٹ اور سامان آرایش کے لحاظ سے جہانگیر کی بزم نشاط معلوم ہوتا ہے، بٹھادیا ہے، صرف

اسی پر بس نہین کیا، بلکہ ایک پیوان بھی جس کا اس زمانہ مین وجود بھی نہ تھا، محض لطفِ مجلس کے لئے تازہ کرکے لگا دیا، اگر خالد کے بجائے اونھون نے ہندوستان کے مغل فرمانرواؤن یا بغداد کے عباسی خلفار مین سے کسی کو مرقع مین دکھایا ہوتا تو کب بھی جاتا، خالد کو اس رنگ مین دکھانا ایسا ہی ہے، جیسے مسیح کے کسی حواری کو ہوائی جہاز مین بٹھا کر پیرس کی سیر کرا دینا،

بہرحال اس کے نیچے جو تشریحی مضمون دیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان مالک بن نویرہ خالد بن ولید کے ساتھ شریک جنگ ہے، پھر آپس مین بگڑ جاتی ہے، اور دونون اپنی اپنی جماعت بنا کر ایک دوسرے سے لڑ جاتے ہین، خالد مالک کو شکست دیکر مع اسکی حسین وجمیل بیوی لیلیٰ کے گرفتار کرکے قید کر دیتے ہین، لیلیٰ شوہر کی رہائی کی سفارش لیکر خالد کے خیمہ مین آتی ہے، خالد اسکے حسن وجمال کو دیکھکر مسحور ہو جاتے ہین، اور مالک کو قتل کرکے لیلیٰ کے ساتھ شادی کر لیتے ہین، اور اس فریفتگی کے نتیجہ مین عکبرا کے معرکے مین شکست کھا جاتے ہین،

اس افسانہ کو تقویت دینے کیلئے ایک اور افسانہ شامل کیا جاتا ہے، کہ لیلیٰ کی اسیری کے زمانہ مین ایک بدو سردار موجہ بھی اس کا شریک قید ہے، بدو اس کے چھڑانے کو آتے ہین، اور لیلیٰ کو قتل کر ڈالنا چاہتے ہین، لیکن موجہ لیلیٰ کے تیرِ عشق کا نشانہ بن چکا ہے، اس لئے بدوؤن کو روک دیتا ہے، اور لیلیٰ کی شمع جمال سے نظر افروزی کے لئے قید کو رہائی پر ترجیح دیتا ہے، رفتہ رفتہ لیلیٰ کے حسن وجمال کا شہرہ دور دور تک پھیل جاتا ہے، اور اوس کے حسن وجمال پر عبد الرحمٰن (ابن ابی بکر) فریفتہ ہو جاتے ہین، اور اسے حاصل کرکے اس مین اتنا محو ہوتے ہین، کہ اپنی تمام بیویون سے رُخ پھیر لیتے ہین، اور لیلیٰ کو گھر کی ملکہ بنا دیتے ہین، لیکن لیلیٰ اپنے مقتول شوہر کی یاد مین روز بروز نڈھال ہوتی جاتی ہے، اور اس کا سارا حسن وجمال رخصت ہو جاتا ہے، اس وقت عبد الرحمٰن کا طرزِ عمل اس کے ساتھ بدلجاتا ہے، اور اس کے ساتھ بے اعتنائی شروع کر دیتے ہین، اور لیلیٰ اپنے گھر لوٹ جاتی ہے، اور بقیہ زندگی گوشۂ عزلت مین بسر کرتی ہے،

اس فرضی افسانہ سے حسب ذیل نتائج مضمون نگار کے پیش نظر ہین،

(۱) تاریخِ اسلام کا نامور سپہ سالار اور فاتحِ اعظم جو رسول اللہ صلعم کا صحابی ہے، اپنے ایک شریک جنگ سے لڑ جاتا ہے (۲) اور اوس کی بیوی کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو کر شوہر کو قتل کرکے بیوی سے شادی کر لیتا ہے، (۳) اور ایک عورت کے حسن وجمال مین اپنے منصبی فرائض کو بھول جاتا ہے، اور عکبرا کے معرکہ مین اسے شکست ہوتی ہے، (۴) پھر ایک دوسرے صحابی

عبدالرحمٰن خالد کے رقیب بنتے ہین، اور لیلی پر قبضہ کر لیتے ہین، (۵) لیکن ان کا عشق لیلی کے ظاہری حسن و جمال پر تھا، اس لئے جب اوس کے حسن پر زوال آتا ہے، تو عبدالرحمٰن کا عشق بھی زائل ہو جاتا ہے، اور لیلی ان کی بے اعتنائی سے دل شکستہ ہو کر بقیہ زندگی عزلت مین بسر کرتی ہے، اس طرح ایک حسین عورت کی زندگی دو مسلمانون کی بوالہوسی سے برباد ہو جاتی ہے،

لیکن اوپر کے واقعات مین سے ایک واقعہ بھی صحیح نہین ہے، بعض تو بالکل بے بنیاد ہین، بعض مین کسی قدر واقعیت ہے لیکن انھین مسخ کرکے بہت مہتم بنا دیا گیا ہے، بعض غلط مقدمات قائم کرکے اس سے غلط نتائج نکالے گئے ہین، اور بعض مختلف واقعات کو محض بدنما بنانے کیلئے باہم ملا دیا گیا ہے، اب ان سب کی حقیقت ملاحظہ ہو،

مالک بن نویرہ جس پر اس افسانہ کی ساری عمارت کھڑی کیجاتی ہے، درحقیقت مقتول ہونے کے وقت مسلمان ہی نہ تھا، اور اگر تھا بھی تو خالد کے علم و یقین مین تھا، اسکی تاریخ یہ ہے، کہ وہ بنی حنظلہ کے سردارون مین تھا، آنحضرت صلعم کے آخری زمانہ مین مشرف باسلام ہوا، آپ نے اس کے رتبہ اور اعزاز کو برقرار رکھنے کیلئے بنی حنظلہ کا محصل زکوٰۃ و صدقات مقرر فرما دیا، اور وہ اپنے قبیلہ سے صدقات اور زکوٰۃ وصول کرکے مدینہ بھیجتا تھا، (اصابہ ج ۵ ص ۳۶)

اس کے قبول اسلام کے سلسلہ مین یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مالک ان مسلمانون مین نہ تھا، جو اسلام کے ضعف اور غربت کے زمانہ مین اسلام لائے تھے، بلکہ اوس کا شمار مؤلفۃ القلوب یعنی ان مسلمانون مین تھا، جو اوس زمانہ مین مسلمان ہوئے، جب بغیر اسلام قبول کئے ہوئے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تھا جیسا کہ خود اس نے ایک موقع پر جسکا ذکر آگے آئیگا اُس نے اپنی تاخیر اسلام کا اعتراف کیا ہے،

قبول اسلام کے بعد چند دنون تک مالک بن نویرہ بنی حنظلہ کے صدقات بھیجتا رہا، آنحضرت صلعم کی وفات اور حضرت ابوبکرؓ کی مسند نشینی کے بعد جب ارتداد کا فتنہ اوٹھا، اور مرتد قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، اوس وقت مالک بن نویرہ نے بھی زکوٰۃ بھیجنی بند کر دی، بظاہر نظر یہ سوال ہوتا ہے کہ اوس نے تنہا زکوٰۃ بند کی تھی، لیکن اسلام پر قائم رہا ہوگا، لیکن اولاً اس کی کوئی صورت نہین، اسلام کے ہر رکن کا انکار اسلام کا انکار ہے، اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے منکرین زکوٰۃ اور مرتدین مین کوئی فرق نہین کیا، اور دونون کے خلاف یکسان جہاد کیا، لیکن مالک کے متعلق حافظ ابن حجر نے یہ تصریح لکھا ہے کہ اوس نے زکوٰۃ وصول کرنی بند کر دی اور اپنے قبیلہ والون سے صاف صاف کہدیا کہ مجھکو زکوٰۃ وصول کرنے سے کوئی تعلق نہین، تم جانو تمھارا کام جانے اور جس قدر وصول شدہ

رقم اوس کے پاس جمع تھی، وہ اپنے قبیلہ مین واپس کر دی، اور ان اشعار مین اپنے ارتداد کا اظہار کیا،

فقلت خذوا اموالکم غیر خائف ولا ناظر فیما یجیئ من الغد

پس مین نے اپنے قبیلہ والون سے کہا کہ تم بلا خوف و خطر اور بلا کل کو سوچے ہوئے اپنا مال واپس لے لو،

فان قام بالدین المحوق قائم اطعنا وقلنا الدین دین محمد،

اگر کل کوئی اس جھاڑے پچھڑے دین کو لیکر پھر کھڑا ہوا، تو ہم مطیع ہو جائین گے اور دین محمدی کی صداقت کا اقرار کرلین گے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تنہا منکر زکوٰۃ ہی نہ تھا، بلکہ اسلام سے بھی برگشتہ ہو گیا تھا (دیکھو اصابہ ابن حجر جلد ۵ ص۳۰۷)

مالک نے ارتداد پر بھی اکتفا نہین کی، بلکہ فتنۂ ارتداد کے سلسلہ مین جب عرب کے بعض حصون مین مدعیان نبوت اٹھے، اور ایک خام عقل اور خیرہ سر عورت سجاح بنت حارث نے نبوت کا دعوی کیا، اور قبیلہ بنی ہذیل نے اس کا ساتھ دیا، اوس وقت مالک بھی سجاح کی دعوت پر اس کے ساتھ ہو گیا، (طبری ص۱۹۱۱) سجاح نے مشہور مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے شادی بھی کر لی تھی لیکن اسکے ساتھ نبھ نہ سکی، ایک عورت اتنے بڑے دعوی کو کبتک نباہ سکتی تھی، اس لئے چند ہی دنون کے بعد وہ یہ تماشہ ختم کرکے اپنے قبیلہ مین لوٹ گئی، اس وقت مالک کو اپنے کئے پر بڑی پشیمانی ہوئی، اور وہ سخت گھبرایا (طبری ص۱۹۱۱) اسکے بعد مورخین کے بیانات مختلف ہو جاتے ہین بعض مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے، کہ مالک اسی حالت مین مارا گیا، چنانچہ مورخ بلاذری لکھتا ہے کہ خالد بن ولید جو فتنۂ ارتداد کے استیصال پر مامور تھے، بہت سے قبائل کو مطیع بناتے ہوئے، بطاح اور بعوضہ بنی حنظلہ کی آبادیون مین پہنچے، اور ان سے لڑکر ان کی جماعت منتشر کی، اور مالک بن نویرہ مارا گیا، پھر مالک بن نویرہ کا تعارف کراتے ہین، کہ وہ رسول اللہ صلعم کی جانب سے بنی حنظلہ کے صدقات کا عامل تھا، رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد اوس نے کام چھوڑ دیا، اور بنی حنظلہ سے کہا تم جانو تمھارا کام جانے اس روایت کے بعد دوسری روایت یہ لکھتے ہین کہ خالد کو بطاح اور بعوضہ مین کوئی نہین ملا، اس لئے مرتدین کی تلاش مین اونھون نے تھوڑی تھوڑی فوج ادھر ادھر بھیجدی، ایک دستہ ضرار بن ازور کی ماتحتی مین بھیجا، یہ دستہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھ ایک جماعت کو گرفتار کرکے لایا، خالد نے اونھین قتل کرادیا، (بلاذری ص۱۰۵)

اوپر کا بیان بلاذری کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک حالتِ ارتداد یا کم از کم انکار زکوٰۃ کے سلسلہ مین مارا گیا،

دوسری روایت طبری کی ہے، اوس کے مطابق مالک سجاح کی واپسی کے بعد پشیمان ہوکر پھر مسلمان ہوگیا، لیکن جن اسباب کی بنا پر اور جن حالات مین دوبارہ وہ اسلام لایا وہ طبری ہی کے الفاظ مین سنو، وہ لکھتے ہین، کہ سجاح کی واپسی کے بعد جب مالک بن نویرہ کا کھیل بگڑ گیا، اس وقت مالک نے اپنے قبیلہ کو یہ کہکر منتشر کردیا کہ ہم کو جب شروع مین اسلام کی دعوت دی گئی اوس وقت بھی ہم نے اُس کے قبول کرنے مین تاخیر کی، اور اس تاخیر سے ہم نے کوئی فلاح نہین پائی، مین نے اس پر غور کیا، مجھے نظر آرہا ہے کہ مسلمانون کے حالات بغیر سیاست برتے ہوئے ان کے موافق ہوجائین گے، اور جب بغیر سیاست برتے ہوئے کسی قوم کے حالات اس کے موافق ہوتے جارہے ہون، تو ان کا مقابلہ نہ کرنا چاہئے، اس لئے تم لوگ منتشر ہوجاؤ، اور اس امر (مذہب اسلام) مین داخل ہوجاؤ، (طبری ص ۱۹۲۴)

طبری اور ابن اثیر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ مالک اپنی ناکامی کے بعد بھی برضا و رغبت اور تائب ہوکر اسلام نہین لایا تھا، بلکہ جب اوس نے دیکھا کہ مسلمان فتنۂ ارتداد کے دبانے مین کامیاب ہوتے جاتے ہین، اور اس پر اڑے رہنا ہلاکت ہے، تو وہ ع کافر نتوان گشتن ناچار مسلمان شو کے اصول پر مسلمان ہوگیا،

بہر حال مالک کے دوبارہ اسلام لانے کی صورت مین بروایت طبری اس کے مقتول ہونے کا واقعہ یہ ہے، کہ جب خالد بن ولید فزارہ، غطفان اور اسد و طے وغیرہ کے قبائل سے نپٹتے ہوئے بطیحہ جہان مالک کا قبیلہ آباد تھا پہنچے، اوس وقت مالک ان سب کو منتشر کرچکا تھا، خالد نے یہان پہنچکر مختلف سمتون مین فوجی دستے پھیلادئے اور ہدایت کردی، کہ جو لوگ اسلام نہ لائین، اونھین گرفتار کرلیا جائے، اور جو مزاحمت کرے اوسے قتل کردیا جائے، حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت تھی، کہ اسلامی فوجین جہان منزل کرین، وہان پہلے اذان دین، اگر مرتد قبائل سے اوس کے جواب مین اذان کی آواز آئے، تو مسلمان ہاتھ روک لین، اور اگر اذان کی آواز نہ آئے تو حملہ کردین، جو لوگ اسلام قبول کرلین ان سے زکوٰۃ مانگی جائے اگر وہ زکوٰۃ ادا کردین تو ان کا اسلام صحیح سمجھا جائے، ورنہ اُن سے جنگ کی جائے؛

بطائح مین اسلامی فوجین منتشر ہونے کے بعد ایک دستہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھ چند بنی ثعلبہ کو گرفتار کرکے خالد کے پاس لایا، لیکن ان قیدیون کے اسلام کے بارہ مین لوگون کی شہادت مختلف تھی، ابوقتادہ انصاری کی شہادت تھی کہ یہ لوگ مُسلمان ہین، اور اونھون نے اذان دیکر نماز پڑھی ہے، لیکن دوسری شہادتین اوس کے خلاف تھین، رات کا وقت تھا، اس لئے

اس اختلاف کا فیصلہ خالد نے صبح تک کے لئے ملتوی کر دیا، اور جو لوگ گرفتار ہو کر آئے تھے، وہ قید کر دئے گئے رات کو ٹھنڈک زیادہ تھی، خالد نے قیدیون کو سردی سے بچانے کیلئے فوج مین منادی کرادی کہ ادفئوا اسراکم یعنی اپنے اپنے قیدیون کو گرم کرو، دفٔ کے معنی گرمی پہنچانے کے ہین، اور بعض قبیلون کی لغت مین دف قتل کے استعارہ مین بھی استعمال ہوتا تھا، اس لئے لوگون کو غلط فہمی ہوئی، کہ قتل کرنے کی منادی ہے، اس غلط فہمی مین مالک اور ان کے چند ساتھی قتل کر دیئے گئے، خالد شور سن کر خیمہ سے باہر نکلے تو انھین اس غلط فہمی کا علم ہوا، اس وقت بجز حسرت و افسوس کے اور کیا کر سکتے تھے، چنانچہ یہ کہکر خاموش ہو گئے کہ قضائے الٰہی کو کوئی نہین روک سکتا، (طبری ص ۱۹۲۴، ۱۹۲۵)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مورخین مالک کے دوبارہ اسلام لانے کے بھی قائل ہین، وہ بھی اس کے غلط فہمی مین مارے جانے کے معترف ہین، اس لئے عورت کو وجہ قتل قرار دینا قطعاً صحیح نہین ہے، کسی مورخ یا ارباب سیر نے اس کا تذکرہ نہین کیا ہے، بعض بڑے بڑے محدثین اور ارباب سیر پہلی یعنی حالتِ ارتداد مین مارے جانے کے قائل ہین، حافظ ابن عبدالبر کا بھی یہی فیصلہ ہے، اسی لئے اونھون نے اپنی کتاب استیعاب فی معرفۃ الاصحاب مین مالک کے حالات نہین لکھے ہین، مالک کے بھائی متمم کے حالات مین ضمناً صرف اسقدر لکھدیا ہے، کہ اوس کے بھائی مالک کے حالتِ اسلام اور ارتداد مین مارے جانے کے بارہ مین اختلاف ہے، لیکن وہ خود حالتِ ارتداد ہی مین مارے جانے کے قائل ہین، ورنہ مالک کے حالات ضرور لکھتے، جن جن ارباب سیر نے اس کے حالات لکھے ہین، اونھون نے موافق اور مخالف دونون قسم کی روایتین جمع کر دی ہین، اس سے کم از کم مالک کا اسلام مختلف فیہ ضرور ثابت ہوتا ہے،

اب رہ گیا مالک کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کا سوال تو یہ کوئی اہمیت نہین رکھتا، ان کا یہ فعل نہ صرف یہ کہ قابلِ مذمت نہین ہے بلکہ لائقِ ستایش ہے، اگر مالک کے حالتِ ارتداد مین مارے جانے کی روایت تسلیم کر لی جائے، تو ظاہر ہے کہ حضرت خالدؓ کا مقصد اس شادی سے یہ تھا، کہ اس خاندان کو اسلام پر مضبوط کیا جائے اور مالک کے اثراتِ بد کا ازالہ کیا جائے اگر کوئی یہ شبہہ کرے کہ خالد ہی نے کیون شادی کی کسی اور مسلمان کے ساتھ کیون نہ کر دی، تو اوسے مالک کی بیوی کے رتبہ پر غور کرنا چاہئے، مالک بنی حنظلہ کا سردار تھا، اس لئے اس کی بیوی کے لئے سردار ہی سے رشتہ موزون تھا، جس کا اسلام نے ہمیشہ

لحاظ رکھا، اسی لئے خالد نے اُسے اپنے حبالۂ عقد میں لینا مناسب سمجھا، بہرحال ان تاریخی حقائق نے خالد کے حسن و عشق کے افسانہ کو بالکل باطل کر دیا،

غالباً اس حسن و عشق کی کہانی کی بنیاد مرقسطہ کے ایک مسلمان مصنف ثابت بن عاصم کی کتاب الدلائل پر قائم کیجاتی ہے جس کو چوتھی صدی ہجری میں اندلس میں مرتب کیا گیا تھا، اور جس کا مرتب شرابی تھا (معجم البلدان ذکر سرقسطہ) حافظ ابن حجر نے اس حکایت کو تردید کے لئے اپنی کتاب اصابہ میں نقل کیا ہے، اور اس کا بے بنیاد ہونا ظاہر کیا ہے، وہ حکایت یہ ہے کہ ثابت کہتا ہے کہ جب خالد نے مالک کی حسین و جمیل بیوی کو دیکھا تو مالک نے بیوی سے کہا کہ تو نے مجھے مار ڈالا، یعنی میں تیری وجہ سے قتل کیا جاؤں گا، یہ روایت نقل کرکے حافظ ابن حجر اس کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں کہ خالد نے کسی عورت کی وجہ سے مالک کو قتل نہیں کیا تھا، یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ مالک کے سوء ظن کے بعد اس کے قتل کا واقعہ پیش آگیا، (اصابہ جلد ۵ ص ۳۶)

اور اگر اس حکایت کی روایتی حیثیت معلوم ہو جانے کے بعد کسی کو اس کی صداقت پر اصرار ہو، تو بھی خالد پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا اسلئے کہ مالک نے ایک سوء ظن کا اظہار کیا تھا اتفاق سے مالک کے قتل کا واقعہ پیش آگیا اس سے حقیقۃً خالد کی بدنیتی کہاں سے ثابت ہوتی ہے،

درحقیقت اس واقعہ کو بدنما بنانے میں مالک کے بھائی متمم کے دلدوز مرثیوں کو بڑا دخل ہے، متمم کو مالک کے ساتھ بڑی محبت تھی اس کی موت نے متمم کو دیوانہ بنا دیا تھا، اور اس عالمِ دیوانگی میں اوس نے مالک کے ایسے دردانگیز مرثیے لکھے، کہ سننے والے بیقرار ہو جاتے تھے، اسی زمانہ میں حضرت عمرؓ کے محبوب بھائی حضرت زیدؓ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کو ان کی موت کا شدید قلق تھا، اس اشتراکِ غم کی وجہ سے حضرت عمرؓ متمم کے مرثیوں سے بہت متاثر ہوئے،

ایک مرتبہ متمم حضرت عمرؓ کے پاس آیا، حضرت عمرؓ نے اوس کی دردانگیز حالت دیکھ کر فرمایا، تم کو بھی اپنے بھائی کی موت کا کس قدر شدید قلق ہے، مالک نے کہا: مرض کی وجہ سے ایک آنکھ کے آنسو خشک ہو گئے تھے، مالک کے غم میں جب سے وہ اشکبار ہوئی ہے آجتک آنسو نہیں تھمے، حضرت عمرؓ نے فرمایا، یہ غم والم کی آخری حد ہے، کوئی مرنے والے کا اتنا غم نہیں کرتا، اگر میں بھی شاعر ہوتا تو زید کا مرثیہ کہتا، متمم نے کہا کہ امیر المومنین اگر میرا بھائی بھی یمامہ کی جنگ میں شہید ہوا ہوتا، تو میں کبھی نہ روتا، اوس کی اس تعزیت پر حضرت عمرؓ کو بڑی تسلی ہوئی، (ابن سعد ج ۳ ق اول ص ۲۷۵) متمم کے ان دلدوز مرثیوں نے حضرت عمرؓ کو اتنا متاثر کیا، کہ مالک کی بیوی کے ساتھ خالد کے عقد کا معاملہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہوا، آپ نے رفعِ شر کے خیال

سے خالد کو اس کے علٰحدہ کرنے کا حکم دیا، یہ اصل واقعہ ہے جس کو آب و رنگ دے کر کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے، بدؤون کے سردار موجہ کے عشق کا افسانہ بھی فرضی ہے، اور محض خالد کے افسانہ کو تقویت دینے کے لئے گڑھا گیا ہے، عکبرا کی جنگ کی شکست بھی بے بنیاد ہے، فتح و شکست کا سوال الگ رہا، اس نام کی سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی، جن شاذ لڑائیوں مین خالد کو عارضی شکست بھی ہوئی، وہ کسی عورت کی وجہ سے نہیں بلکہ فطری تھی جہاں انھوں نے بہت سے میدان سر کئے ایک آدھ مین شکست بھی کھا گئے

اس مضمون کا دوسرا ٹکڑا کہ مالک کی بیوی کے حسن و جمال کا شہرہ اتنا بڑھا کہ مدینہ مین عبد الرحمٰن بن ابی بکر اس پر فریفتہ ہوگئے، وغیرہ وغیرہ اس شکل مین جو مضمون نگار نے لکھی ہے، بالکل غلط ہے لیلیٰ نامی ایک عورت سے عبد الرحمٰن کی محبت کا واقعہ حکایات عرب مین ضرور ملتا ہے لیکن اولاً وہ چندان قابل وثوق نہین ہے، اس لئے کہ یہ واقعہ زبیر بن بکار کی زبانی مروی ہے، (استیعاب ج ۲ ص ۴۰۵ و اصابہ جلد ۴ ص ۱۷۱) زبیر بن بکار جاہلیت اور عرب کے اخبار و ایام و حکایات اور کہانیون کے مصنف ہین[۱]، وہ کوئی مستند مورخ، یا ثقہ محدث نہین ہین، ان کی روایات زیادہ تر ایام و انساب عرب کے متعلق ہین، محدثین مین اون کا کوئی پایہ نہین، وہ واقدی اور مدائنی اور کلبی سے کچھ اونچے ہین، اونکے بیان مین بہت سی منکر روایتین بھی شامل ہو جاتی تھین، (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۱۲) ایسی حالت مین عبد الرحمٰن اور لیلیٰ کی محبت کی روایت پر پورا اعتماد نہین کیا جا سکتا، تاہم اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی دونون واقعون یعنی جو مضمون نگار نے لکھا ہے، اور جو زبیر کے افسانہ مین ہے کوئی مناسبت نہین، عبد الرحمٰن کو جس لیلیٰ سے محبت تھی، وہ مالک کی بیوی نہ تھی، بلکہ ایک دوسری عورت تھی، معلوم نہین مضمون نگار نے مالک کی بیوی کا نام لیلیٰ کہان سے لکھا ہے، اس کا نام لیلیٰ کسی تاریخ مین نہین ملتا، طبری اور ابن اثیر وغیرہ نے ام تمیم لکھا ہے، اور اس کے باپ کا نام منہال تھا، اور عبد الرحمٰن کو جس عورت کے ساتھ محبت بیان کی جاتی ہے، اوس کا نام لیلیٰ اور اس کے باپ کا نام جودی تھا، دونون کے وطن بھی مختلف ہین، منہال کا وطن بطیحہ عراق تھا، اور جودی دمشق کا ایک عرب غسانی سردار تھا، ان دونون کو ایک لکھنا، انتہا درجہ کی خیانت اور بد دیانتی ہے،

بہر حال عبد الرحمٰن اور لیلیٰ کی محبت کے واقعہ کی صحت کی صورت مین اس کا واقعہ یہ ہے کہ عبد الرحمٰن تجارت کے سلسلہ مین شام آیا جایا کرتے تھے، اسی زمانہ مین ان کی نظر لیلیٰ پر پڑ گئی، لیلیٰ بہت حسین و جمیل عورت تھی، عبد الرحمٰن کو اوس سے

[۱] زبیر بن بکار کے لیے دیکھو تہذیب التہذیب، ابن ندیم اور ابن خلکان و یاقوت در معجم الادباء،

محبت ہوگئی، ان کی محبت حضرت عمرؓ کو بھی معلوم تھی، اس لئے جب شام پر فوجکشی ہوئی، توآپ نے ہدایت کردی کہ اگر لیلیٰ بنت جودی ہاتھ آئے تو عبدالرحمٰن کے حوالہ کردی جائے، چنانچہ جب دمشق فتح ہوا تو لیلیٰ عبدالرحمٰن کو دیدی گئی، متقدمین زبیر نے صرف اسی حد تک یہ واقعہ لکھا ہے، (دیکھو استیعاب ج ۲ ص ۴۰۵) اور اس میں کوئی بدنمائی نہیں ہے،

اس کے بعد جس قدر زمانہ گذرتا گیا، اس واقعہ کے آب و رنگ میں اضافہ ہوتا گیا، چنانچہ اصابہ میں اس کی یہ شکل ہوگئی، کہ لیلیٰ بنت جودی کے حاصل ہونے کے بعد عبدالرحمٰن کو اس کے ساتھ اتنی شیفتگی بڑھی، کہ اوس کو اپنی دوسری بیویوں پر ترجیح دینے لگے، حضرت عائشہؓ نے عبدالرحمٰن کو اس پر ملامت کی، لیکن اونھوں نے کوئی توجہ نہیں کی، پھر کچھ دنوں کے بعد عبدالرحمٰن کا طرزِ عمل لیلیٰ کے ساتھ بدل گیا، اور اوس پر زیادتی کرنے لگے، لیلیٰ نے حضرت عائشہؓ سے شکایت کی، اونھوں نے عبدالرحمٰن سے کہا تم نے دونوں حالتوں میں افراط و تفریط سے کام لیا، (اصابہ ج ۴ ص ۱۷۵)

ابن اثیر جزری اس پر اور اتنا اضافہ کرتے ہیں، کہ جب لیلیٰ نے حضرت عائشہؓ سے عبدالرحمٰن کی بدسلوکی کی شکایت کی، تو اونھوں نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ تم نے لیلیٰ کے ساتھ محبت اور نفرت دونوں میں افراط اور تفریط سے کام لیا، یا تم اوس کے ساتھ منصفانہ سلوک کرو، ورنہ اوس کو اس کے گھر پہنچا دو، عبدالرحمٰن نے لیلیٰ کو اس کے گھر پہنچا دیا (اسد الغابہ جلد ۳ ص ۳۰۶)

بہرحال تین کتابوں میں یہ واقعہ تین طریقوں سے ملتا ہے، اور ان میں جو اقدم ہے، اس میں صرف محبت کا ذکر ہے، باقی محبت میں افراط و تفریط اور اوس کے بعد لیلیٰ سے بے اعتنائی، اور اس کے گھر پہنچانے وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے یہ سب متاخرین کی حاشیہ آرائی معلوم ہوتی ہے، بہرحال اگر ان میں سے پہلا صحیح مانا جائے، جو تقدم زمانی کے اعتبار سے یقیناً سب میں زیادہ مستند ہے، تب تو کوئی اعتراض کی گنجایش ہی نہیں رہ جاتی، عبدالرحمٰن کو ایک عورت سے محبت ہوئی، اور اوس کے ساتھ اُنھوں نے شادی کرلی، اس میں کوئی مذہبی یا اخلاقی قباحت نہیں ہے، اور اگر آخری روایت بھی صحیح مان لی جائے، تب بھی عبدالرحمٰن پر کوئی مذہبی الزام عائد نہیں ہوتا، ان کو ایک عورت سے محبت تھی اس کے ساتھ اونھوں نے شادی کرلی، لیکن پھر کسی سبب سے نبھ نہ سکی، اور پہلی محبت باقی نہ رہی، اور اپنی بہن کے کہنے پر لیلیٰ کو اس کے گھر پہنچا دیا،

تلخیص و تبصرہ

برطانوی انجمن ترقی سائنس کا سالانہ اجلاس

برطانوی انجمن ترقی سائنس کا سالانہ اجلاس ۷ ستمبر ۱۹۳۳ء کو لیسسٹر (انگلستان) مین منعقد ہوا، اس کے صدر سر فریڈرک ہاپکنس (Sir Frederick Hopkins) تھے، اس اجلاس کی متعدد نشستین ہوئین جنھین مختلف ماہرین سائنس نے اپنے جدید خیالات اور نظریے پیش کئے، اس اجلاس مین تقریبًا ۲۰ ہزار سائنس دانون نے شرکت کی، اس اجلاس کی مختصر روداد، اور خطبون کے مختصر خلاصے اسٹیٹسمین مین آئے ہین، جنھین ذیل مین ملخص پیش کیا جاتا ہے،

صاحب صدر نے اپنے خطبہ کے آخری حصہ مین علم الحیوان (Biology) کی اہمیت پر زور دیا، اور بتایا کہ بہبود انسانی سے اس کا کیا تعلق ہے، اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا، کہ آج کل جو کتابین سائنس پر شائع ہوتی رہتی ہین، ان مین سے اکثر و بیشتر مین علم الحیوان کا یا تو ذکر ہی نہین آتا، یا اگر آتا بھی ہے، تو محض نام کیلئے اس علم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے صدر موصوف نے فرمایا،:-

سر والٹر فلیچر نے جنکی وفات سے قوم گذشتہ سال ایک روشن خیال صاحب فکر سے محروم ہوگئی ہے، اپنے اس قول سے لوگون کو حیرت مین ڈال دیا تھا کہ ہم اسی حد تک امن و ترقی حاصل کر سکتے ہین جس حد تک فن مملکت کے طریقون مین علم الحیوان کی حقیقت کی رہنمائی اختیار کرین، فن مملکت اور علم الحیوان کا باہمی تعلق اکثر سامعین کے لئے ایک نئی چیز تھا، چند سال ہوئے کیمبرج کے فلسفی ڈاکٹر براڈ (Broad) نے سائنس کی غیر مساوی ترقی پر افسوس کا اظہار کیا تھا، یعنی غیر نامیاتی (Inorganic) نیچر پر تو ہمین بہت کچھ قابو حاصل

ہو گیا ہے، لیکن علم الحیوان اور نفسیات سے ہم نسبتہً بے خبر ہین، بہر حال ضرورت ہے، کہ فرد اور مملکت دونون کی رہنمائی کیلئے علم الحیوان کی حقیقت پر آج بھی زور دیا جائے، اپنے پرمغز اور بلیغ خطبۂ صدارت مین سر الفرڈ ایونگ نے خاص طور پر زور دیکر ہمین یہ بتایا تھا، کہ انسان کے ہاتھ مین نیچر کی حکومت دیدی گئی ہے قبل اس کے کہ وہ اپنی ذات پر حکومت کرنا معلوم کرے، اسمین جو خطرات شامل ہین، موصوف نے ہمین اُن سے متنبہ کر دیا تھا، اور اس مین جو صداقت موجود ہے، اس سے وہ حضرات ناواقف نہین ہین جنکی کوششون سے انسان نیچر پر روز بروز زیادہ قدرت حاصل کرتا جاتا ہے۔

انجمن کے اجلاس کی ایک دوسری نشست مین جس مین بیس ہزار سائنس دان موجود تھے، ایک ماہر سائنس مسٹر ڈفٹن (A. F. Dufton) نے اس دلچسپ نظریہ کا اعلان کیا، کہ جو لوگ اپنے والد کے سن کہولت مین پیدا ہوتے ہین، اون کی استعداد بہ نسبت دوسرے لوگون کے زیادہ اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے، موصوف نے اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان کیا کہ جن والدین کی عمرین (۴۵) سال سے زیادہ تھین شہرت کے اعتبار سے اُن کے بچون کا تناسب دوسرے بچون کے مقابلہ مین دُگنا تھا، اسی طرح ۶۰ سال سے زیادہ عمر والون کے بچون کا تناسب لیاقت اور شہرت کے لحاظ سے دس گنا، اور (۷۰) سال سے زیادہ عمر والون کے بچون کا پچاس گنا تھا، اس نظریہ کی جانچ کی غرض سے مسٹر ڈفٹن نے رائل سوسائٹی، اور پارلیمنٹ کے ممبرون، اور مدارس نسوان کی اُستانیون کو خطوط لکھے تھے، ان سب کے جوابات کا خلاصہ یہی تھا، کہ ممتاز اشخاص کا بڑا حصہ انھی لوگون پر مشتمل ہے، جن کے والدان کی پیدایش کے وقت پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے، چنانچہ اس نظریہ کی تصدیق مین موصوف نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی مثال پیش کی اور بتایا کہ آپ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر (۱۰۰) سال اور حضرت سائرہ کی (۹۰) سال تھی،

اسی طرح ڈاکٹر ہنری کیمبل (Dr. H. Campbell) نے اپنے خطبہ مین تعدد ازدواج کے مسئلہ پر سائنس کے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی، اور فرمایا کہ سردارون مین جو لوگ سب سے زیادہ شجاع اور ذہین ہوتے تھے، وہی سب سے زیادہ شادیان کرتے تھے، اور اپنے بعد سب سے زیادہ اولاد چھوڑ جاتے تھے، موجودہ تہذیب مین تعدد ازدواج کو قائم کرنے مین دقتین ضرور ہین، لیکن بہتر اولاد پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے اسکی حمایت مین بہت کچھ کہا جا سکتا ہے،

بڑے آدمیون کی بہت زیادہ لڑکیان شادی نہین کرتین، اور ممتاز اشخاص کی بہت بڑی تعداد لاولد مرجاتی ہے، کچھ عرصہ سے لوگون کے قوائے ذہنی مین انحطاط نمایان ہو رہا ہے، جسکی وجہ یہ ہے، کہ جو لوگ دماغی حیثیت سے بلند ہین اُن مین اوسطاً پیدائش کم ہوتا جاتا ہے، اور جن کے قوائے ذہنی اعلیٰ نہین ہین، اُن مین بڑھتا جاتا ہے، ڈاکٹر ہرسٹ (HURST) نے اس رائے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ذہین خاندانون مین اوسطاً پیدائش کی روزافزون تخفیف کے باعث موجودہ تہذیب خطرہ مین ہے، موصوف کی رائے ہے، کہ حکومت کو اس معاملہ مین مداخلت کرنی چاہیے، اور ایسے خاندانون کیلئے وظیفے مقرر کر دینے چاہئین، تاکہ جو ذہین بچے پیدا ہون، والدین اُنکی پرورش کی طرف سے مطمئن ہو جائین،

"ع ز"

عہدِ حکومت ایوبیہ کی دو علامات قبر

پہلی صدی ہجری مین قبرون پر علامتین سنگ مرمر وغیرہ کی لمبی لمبی تختیون کی صورت مین قائم کی جاتی تھین، اسی لئے آج بھی ان کو لوحِ مزار کہا جاتا ہے، چنانچہ اس قسم کے چار ہزار لوحِ مزار دار الآثار عربیہ مین موجود ہین جن مین ایک قدیم ترین لوحِ مزار ۳۱ھ کی اور دوسری ۱۷۴ھ کی ہے، چالیس لوحِ مزار دوسری صدی کے اخیر کی ہین، جن کی تاریخین ۱۷۴ھ، ۱۹۱ھ، ۱۹۲ھ سے لیکر سلطنتِ فاطمیہ کے آخری زمانہ یعنی ۵۶۷ھ تک ختم ہوتی ہین، اسی طرح اس دار الآثار مین بہ ترتیب ہر سنہ کی ایک یا اس سے زیادہ لوحِ مزار ہے، جن سے خط کوفی کی ترقی کی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے،

لیکن سلطنتِ فاطمیہ کے زمانہ مین لوح کے بجائے سنگ مرمر کے ستونون کا رواج ہوا، جن پر تحریرین یا تو کھود دی جاتی تھین، یا ابھرے ہوئے حروف مین لکھ دی جاتی تھین، چنانچہ دار الآثار عربیہ مین اس قسم کی قدیم ترین علامتِ قبر احمد بن علی بن حسن الهواری کی ہے جس کی تاریخ ۴۰۹ھ ہے، اس کے بعد اگرچہ لمبی لمبی تختیون کا رواج کلیۃً موقوف نہین ہوا، تاہم سلطنتِ ایوبیہ اور اوس کے بعد سلطنتِ ممالیک مین ستونون نے بہت زیادہ رواج پایا، اور اس قسم کے دو ستون جون ۱۹۳۲ء مین زمین کے اندر سے کھود کر نکالے گئے ہین، جن مین پہلا ستون ۲ میٹر اور بیس سنیٹمیٹر بلند ہے، اور اوس کا قطر تیس سنیٹمیٹر کا ہے، اور اوس کے ایک طرف ۱۴ سطرون مین خط نسخ ایوبی

مین یہ عبارت منقوش ہی :-

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، (۲) کل من علیہا فان ویبقا (کذا) (۳) وجہ ربک ذو الجلال، (۴) والاکرام ھذا قبر (۵) المعتز بشبابہ المو خوذ (کذا) (۶) من بین اہلہ واترابہ الحسن (۷) الصبوح الحسن السیرۃ (۸) الحسن السریرۃ الامیر الاجل، (۹) زین الدین ابن الامیر المجاہد المرابط (۱۰) الحاج الی بیت اللہ حسام الدین (۱۱) الحاجب لولو توفی یوم الاحد (۱۲) ثالث عشر صفر سنہ ثمان تسعین (۱۳) و خمس مائۃ رحمہ اللہ ورحم من ترحم علیہ۔

دوسری طرف خطِ کوفی شجر کے ابھرے ہوئے حروف مین ایک سطر مین یہ عبارت منقوش ہے، " الدائم الباقی اللہ" اس کے نیچے ایک ہار کے وسط مین ایک طاق لٹکا ہوا ہے، جس کے نیچے اسی قسم کے خط مین یہ عبارت ہے " الملک للہ"

دوسرے ستون کی بلندی ایک میٹر اور اسی سنٹیمٹر کی ہی، اور اس کا قطر ۲۰ سنٹیمٹر ہے، اور اوس کے ایک طرف خطِ نسخ ایوبی کے ابھرے ہوئے حروف مین ۱۷ سطرون کی یہ عبارت ہے :-

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۲) للہ العزۃ والبقاء ولہ (۳) ما ذرا وما برا وعلی خلقہ (۴) کتب الفناء وفی رسول (۵) اللہ اسوۃ وعزاء، فمن کان (۶) یرجوا (کذا) لقاء ربہ فلیعمل (۷) عملا صالحا و لا یشرک (۸) بعبادۃ ربہ احدا، ھذا، (۹) قبر الفقیر الی رحمۃ ربہ (۱۰) الزکی عبد الوہاب (۱۱) ابن عبد الکریم بن محمد (۱۲) بن الشغیوت، (؟) الدمشقی (۱۳) توفی ثالث ربیع الآخر (۱۴) سنہ ست وستمائۃ (۱۵) رحم اللہ من قرا ولا (۱۶) ودعا لہ بالرحمہ (۱۷) والمغفرۃ ولجمیع المسلمین،

دوسری طرف ابھرے ہوئے خطِ کوفی مین دو سطرون مین یہ عبارت ہی :-

(۱) النعیم المسکن (۲) لمن احسن۔

ان دونون کے نیچے ایک کھدا ہوا طاق ہے، جس کے نیچے خطِ ایوبی مین یہ آیت کھدی ہوئی ہے،

" کل نفس ذائقۃ الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامۃ فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ

فقد فاز وما الحیوٰة الدنیا الا متاع الغرور"

پہلے ستون کی تاریخ ۵۹۵ھ اور دوسری کی ۶۰۶ھ ہے، اس لئے یہ دونون سلطنت ایوبیہ کے زمانے کے ہین اور بطور علامت قبر کے قائم کئے گئے ہین،

ان مین پہلے ستونون پر فنی اور تاریخی دونون حیثیون سے بحث کیجا سکتی ہے، فنی حیثیت سے اس ستون مین دو قسم کی تحریرین ہین، ایک طرف تو نقاش نے تاریخی عبارت خط نسخ ایوبی مین لکھی ہے، اور دوسری طرف کو کوفی تحریر سے ترتیب دیا ہے جسکی وجہ یہ ہے، کہ سلطنت فاطمیہ کے زمانے مین خط کوفی نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی لیکن جب ایوبیون نے اون پر غلبہ پایا، تو سلطان صلاح الدین نے شیعیت کو مٹاکر صرف احیائے سنت ہی نہین کیا، بلکہ اون کے طرز حکومت مین بھی بہت سی تبدیلیان کین، اور اوس کا اثر فنون لطیفہ تک پہنچا، اور خط کوفی مشجر خط نسخ ایوبی کی شکل مین بدل گیا،

لیکن اس ستون مین یہ دونون خط استعمال کئے گئے ہین، معمولی تحریرین تو خط نسخ ایوبی کا استعمال کیا گیا ہے اور زیب و زینت کا کام خط کوفی سے لیا گیا ہے،

تاریخی حیثیت سے اس ستون پر جو عبارت جنائزیہ اور تعظیمی القاب منقوش ہین، اون پر حسب ذیل نظر ڈالی جاسکتی ہے پہلی صدی کی علامات قبر پر اس قسم کی جو عبارتین منقوش ہوتی تھین، اون سے توحید، رسالت جنت و دوزخ اور حشر و نشر وغیرہ کی تصدیق کا اظہار ہوتا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا، کہ متوفی مسلمان ہے، اور شریعت کے تمام اصول و عقائد کو مانتا ہے، لیکن جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلام عام طور پر پھیل گیا، تو یہ طرز عبارت بدل گیا، اور اس قسم کی عبارتین منقوش ہونے لگین، جو متوفی کی مدح و ثنا، اور تعظیمی القاب پر بھی مشتمل ہوتی تھین، اور اون سے متوفی کے اعزہ و اقارب کو تسلی حاصل ہوتی تھی، سب سے پہلی علامت قبر جس پر اس قسم کے تسلی بخش الفاظ موجود ہین، دار الآثار عربیہ مین ۲۷۰ھ کی موجود ہے،

اگر متوفی بچپن یا جوانی مین انتقال کرتا تھا، تو علامت قبر پر ایسی عبارتین منقوش کی جاتی تھین جن سے اوس کے

بچپن یا جوانی کا اظہار ہوتا تھا، مثلاً "اللھم ان فلانا توفی طفلا علی فطرۃ الاسلام" و "ھذا قبر المغترب بشبابہ" اس کے بعد اوس کی اور اسکے والد کی مدح وثنا ہوتی تھی، اور خوش قسمتی سے اس علامتِ قبر میں تعظیمی القاب ایسے شخص کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، جو تاریخی حیثیت سے بالکل گمنام ہے، البتہ اس کا باپ لولو حاجب ایک تاریخی حیثیت رکھنے والا آدمی ہے، اور مقریزی نے اوس کا تذکرہ کیا ہے، اور اوس کے حالات لکھے ہیں،

دوسری علامت قبر پر بھی جو عبارت منقوش ہے، وہ خطِ نسخ ایوبی میں ہے، اور اس خط کی امتیازی خصوصیتیں اوس سے صاف طور پر نمایاں ہیں، اور اوس کی عبارت خبائزیہ سے متوفی کی شانِ تقشف ظاہر ہوتی ہے، مثلاً "الفقیر الی رحمۃ ربہ" یا "رحم اللہ من قرأ و دعا بالرحمۃ" وغیرہ فقرون سے ظاہر ہوتا ہے، کہ متوفی ایک زاہد و متورع شخص تھا، اگرچہ تاریخون میں اوس کا تذکرہ نہیں ملتا، اور اوسکی شہرت و گمنامی کا حال معلوم نہیں ہوتا،

قرآن مجید کی جو آیتیں اس پر منقوش ہیں، اون سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اون سے عمل صالح و تقشف اختیار کرنیکی ترغیب ہوتی ہے، مثلاً "فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا" و "کل نفس ذائقۃ الموت" یہ آیتیں ایک مناسبت خاص سے انتخاب کیگئی ہیں، اور وہ مناسبت متوفی کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، غالباً وہ صوفیہ میں سے ہونگے،

"ع"

چند الفاظ کی اصلیت

لفظ دیپ کے مشتقات

دفتر، دبیر، دوات، دبستان، دیوان،

دفتر، دبیر، دوات، دبستان اور دیوان عربی، فارسی، ترکی، اور دوسری مشرقی زبانون میں، بلکہ دبستان کو چھوڑ کر بقیہ سب الفاظ ہماری زبان میں بھی مستعمل ہیں، اب تک ان لفظون کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان میں کا ہر لفظ الگ مادہ سے مشتق ہے، اور یہ خود مستقل ہیں، عربی میں یہ تمام الفاظ یقیناً فارسی سے آئے ہیں، مگر خود فارسی میں بھی انکی ٹھیک اصلیت کا پتہ نہیں چلتا تھا، قدیم فارسی زبان کی تحقیقات اور علم لغت (فیلالوجی) نے جو ترقی کی ہے، اوس سلسلہ میں ان الفاظ کی اصلیت کا بھی پتہ چلا لیا گیا ہے، فارسی رسالہ ایرانشہر کے سال اول شمارہ ۹ میں انکی ایک تحریر چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، اوس کی تلخیص درج ذیل ہے، :-

فارسی قدیم مین جو شاہان ہخامنشی کے زمانہ مین رائج تھی، "دیپ" کے معنی لکھنے اور خط کھینچنے کے تھے اور یہ لفظ سنسکرت کے لیپ اور لیپی کا مرادف تھا جن کے یہی معنی ہین، داریوش (دارا) کے کتبون مین اوسکو "دیپیس" لکھا ہے جس سے کتبون کے خطوط مراد لئے گئے ہین اگرچہ یہ خطوط خط میخی (مسماری) مین ہین، جو لکھے نہین گئے، بلکہ کھود دئے گئے ہین لیکن چونکہ اوس زمانہ مین دستور تھا، کہ خطوط کھود کر ان مین سونے کا پانی یا رنگ بھر دیتے تھے، اور اس طرح گویا خطوط کو دوبارہ لکھ دیتے تھے، اس لئے "دیپیس" کا لفظ خط اور نوشتہ کے معنی کیلئے مناسب تھا، جو داریوش نے استعمال کیا،

اب دیکھو "دیپ" سے کتنے الفاظ مشتق ہوتے ہین،

۱- دفتر، یہ لفظ عربی نہین بلکہ فارسی ہے، اور اسی دیپ سے نکلا ہے، قدیم یونانی مورخون نے اسکو دیپتر (۱) اور "دفترا" لکھا ہے، کتزیاس ایک یونانی مؤرخ جو ۴۱۵ ق م مین گرفتار ہوکر ایران آیا، اور سترہ سال تک ایرانی دربار مین طبیب رہا تھا، اوس نے تاریخ ایران مین (جس کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے،) لکھا ہے، کہ ایرانی سلطنت کے سالنامون کو "دفترا" کہتے ہین، مشہور یونانی نے بھی لکھا ہے کہ یہ لفظ مغربی ایشیا مین کتاب اور خط کے معنی مین استعمال ہوتا تھا،

۲- دبیر- (لکھنے والا) ابتداءً اوس شخص کو کہتے تھے، جو لکھنے سے آشنا ہوتا تھا، کیونکہ قدیم زمانہ مین لکھنا بہت عام نہ تھا، مین جب لکھنے کا زیادہ رواج ہوا تو دبیر اوس کو کہنے لگے جو لکھنے کے علاوہ مضمون آفرینی پر بھی قادر ہو، (یعنی منشی) اور "دبیرستان" کے معنی "مکتب" کے ہین، (مکتب کا مطلب وہ جگہ ہے، جہان لکھنا سکھایا جاتا ہو،)

۳- دوات (لکھنے کا سامان) یہ غور کرنے کی بات ہے، کہ عثمانی ترک دوات کو "دویت" لکھتے اور پڑھتے ہین جو اصل لفظ (دیپ) سے بہت

۴- دبستان (مکتب) بعض ناواقف سمجھتے ہین کہ دبستان، ادبستان یا ادبستان کا مخفف ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، اوس جگہ کو کہتے ہین، جہان لکھنا سکھایا جاتا ہو، اور اس طرح یہ "مکتب" کا مرادف ہے،

یہ نکتہ خیال مین رہنا چاہئے کہ قدیم زمانہ مین مدارس مین صرف لکھنا اور پڑھنا بتلایا جاتا تھا، کتاب نہین ہوتی تھی، جس سے درس دیا جاتا، کیونکہ علوم بھی مدون و مرتب نہ تھے، اس لئے اگر کوئی شخص نوشت و خواند سے آشنا ہو جاتا، صاحب ہنر و صنعت سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بعض قومون مین ابتدائی مدارس کا ایسا نام موجود ہے، جس سے صرف لکھنے کے معنی ظاہر ہوتے ہین،

تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا، سرحدِ عقل سے گذرے تو یہان تک پہنچے،

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے، دیکھنے والے کہان سے ہین کہان تک پہنچے،

کھل گیا آج نگاہین ہین نگاہین اپنی جلوے ہی جلوے نظر آئے جہان تک پہنچے،

آہ! وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے، ہائے وہ بات کہ رک رک کے زبان تک پہنچے،

کس کا دل ہے کہ سنے قصۂ فرقت میرا کون ہے جو مرے اندوہ نہان تک پہنچے،

خلش انگیز تھا، کیا کیا تری مژگان کا خیال ٹوٹ کر دل مین یہ نشتر رگِ جان تک پہنچے،

نہ پتہ سنگِ نشان کا نہ خبر رہبر کی ،! جستجو مین تری دیوانے یہان تک پہنچے،

نہ غبارِ رہِ منزل ہے، نہ آوازِ جرس، کون مجھ رہروِ گم کردہ نشان تک پہنچے،

صاف تو ہین ہے یہ دردِ محبت کی حنیفؔ، حسن کا راز ہو، اور میری زبان تک پہنچے،

اسرارِ توحید

از مولوی حکیم امداد حسین صاحب توحید ندوی منشی فاضل اوٹی ہیڈ اورنٹیل ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ

کہتے ہین مجھے خموش رہتا ہون مین، چپ چاپ سبو بدوش رہتا ہون مین،

(۱)

دل دورِ تلاش مین نکل جاتا ہے، پھر منتظرِ سروش رہتا ہون مین،

موجین اٹھتی ہین، دل مین طغیانی ہے، یارب میرا آس پاس برفانی ہے،

(۲)

آہون مین اثر عطا ہو، گھلا دون مین، دنیا دیکھے یہ شعلہ افشانی ہے،

اسلام سے درگذر نہین ہونے کا، تم لاکھ بچو، مفر نہین ہونے کا،

(۳)

ہے پیش اسمبلی مین قانونِ طلاق، فطرت ہے اگر مگر نہین ہونے کا،

آؤ کرین مل کے آشنا کی باتین، کچھ دل کی ہون کچھ ہون دلربا کی باتین،

(۴)

سنتا رہتا ہون اُن کو مل جاتا ہے کرتے رہتے ہین جو خدا کی باتین،

مطبوعاتِ جدیدہ

اسلامی عقائد اور اون کے ماخذ (بزبان انگریزی) از پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے، اسلامیہ کالج کلکتہ، حجم ۱۶۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی، خوشخط ٹائپ مین، قیمت مجلد للعہ، پتہ: جناب سید ظہیر الدین بی اے، نمبر ۴ سید اسمعیل لین کلکتہ،

یہ رسالہ انگریزی زبان مین مسلم تھاٹس اینڈ اٹس سورس کے نام سے ہے، اس مین اسلام کے مختلف فرقون اور مسلکون، معتزلہ اور اشاعرہ، صوفیہ، اور فلاسفہ کے عقائد اور خیالات محققانہ اور سلیس انداز مین بیان کئے گئے ہین، نیز دلائل سے اون مستشرقین کی تردید کی گئی ہے جنھون نے اسلام اور اسلامی فرقون پر دوسرے مذاہب اور دوسرے غیر مسلم گروہون کے عقائد کی خوشہ چینی کا الزام لگایا ہے، امید ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کی انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کے سنجیدہ علمی حلقون مین وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیگی، کتاب کی قیمت کسی قدر کم رکھی جاتی تو مناسب تھا،

چہار مقالہ (فارسی) تالیف نظامی عروضی، ناشر رام نراین لال، کٹرا روڈ، الہ آباد، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۴۴ صفحے، لکھائی چھپائی خوشخط ٹائپ مین، قیمت مجلد ۱۲/

نظامی عروضی کی چہار مقالہ، محمد بن عبد الوہاب قزوینی کے وسیع وطویل حواشی کے ساتھ ۱۹۰۹ء مین ایک ضخیم جلد مین گب میموریل کی جانب سے شائع ہوئی تھی، لیکن قیمت کی زیادتی اور نسخہ کے بآسانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے طلبہ کو اس کے عام بازاری نسخون سے کام لینا پڑتا تھا، مولوی محمد رفیع صاحب (فاضل دیوبند) شکریہ کے مستحق ہین، کہ قزوینی کے شائع کردہ نسخے مین سے نفس اصل متن کو ایک مختصر کتابی شکل مین چھپوانے کا اہتمام کیا، اب وہی نسخہ سستے دام مین دستیاب ہو سکتا ہے، مولوی صاحب موصوف نے قزوینی کے تعلیقات مین سے اختلافِ نسخ کے حصہ کو اس مین شامل کر لیا ہے، اور ابتدا

مین دو مضمون کا دیباچہ لکھا ہی جسمین نظامی کے سوانح حیات اور چہار مقالہ کا سرسری تعارف ہی،

موازنۂ ہلال وصلیب، مولفہ جناب محمد عبدالسمیع خان صاحب نکہت، شاہ جہان پوری، بی اے

حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۰۷ صفحے، قیمت:- ۸ر، مولف سے بتوسط اسسٹنٹ سکریٹری انجمن اسلام ہارنبائی روڈ، فورٹ نمبرا بمبئی سے طلب کرین،

موازنۂ ہلال وصلیب' ہمارے نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنی رجحانات مین خوشگوار تبدیلی پیدا ہونیکے آثار کے طور پر دیکھی جاسکتی ہی، اس رسالہ مین نوجوان مؤلف نے اسلامی تمدن اور یورپ پراوس کے اثرات کو دلپذیر انداز مین پیش کیا ہے، اوراس سے مقصود یورپ کی موجودہ خیرہ کن تمدنی ترقیون سے مبہوت مسلمانون کو بیدار کرنا ہے کہ آج یورپ مین علم وفن کے جو چکا چوندھ پیدا کردینے والے مناظر مین دکھائی دے رہے ہین، وہ ہماری ہی تعمیر کی ہوئی عمارت پر مزید نقش ونگار ہین، مؤلف نے اوس کو عیسائی دنیا کے ممتاز مؤرخین، لیبان، میکب، ارنلڈ، جوزف ہیل اوراسکاٹ وغیرہ کی تالیفات سامنے رکھکر مرتب کیا ہے، اوراون کی شہادتون سے اسلامی تمدن کے برکات دکھائے ہین، کتاب آٹھ دس ابواب مین ہی جنمین تقریباً اسلامی مدنیت کے اکثر شعبون کا اجمالی خاکہ سامنے آگیا ہی،

افسانۂ نواب جمیل الشان، از جناب عبدالرؤف صاحب عباسی اڈیٹر حق لکھنؤ، حجم ۸۰ صفحے،

قیمت ۸ر، پتہ:- منیجر حق برقی پریس اشتیاق منزل نمبر ۳۴ ہیوٹ روڈ لکھنؤ،

نواب جمیل الشان' لکھنؤ کے ایک وثیقہ دار نواب ہین، نوابی کے کارخانے بگڑ چکے ہین، پرآن بان ابھی تک قائم ہی، عیش ونشاط کے اوسی طرح دلدادہ ہین، مصاحبین کا جمگھٹ بھی رہتا ہے، پیری مین عشق کی سوجھتی ہی، لکھنؤ کی ایک طوائف کے گرویدہ ہوتے ہین، بدایون کے ایک "سرکار" رئیس سے مقابلہ ہوتا ہی، اسی ضمن مین نواب صاحب کے ایک ہم عمر عزیز خاں اور بچپن کے ساتھی نواب بنیاد حسین سے تعارف ہوتا ہی، یہ بڑے داؤ پیچ کے آدمی نکلتے ہین، ان مین اور پولیس مین خوب خوب داغی مقابلہ ہوتا ہی، اور عیارون اور سازشون کے عجیب عجیب دلچسپ واقعات سامنے آتے ہین، جسمین لکھنؤ کی اس طوائف کی ذہانت کے دلچسپ مظاہرے بھی ہوتے ہین، انجام بوالہوسی وہوسناکی کے نتائج بد سامنے آتے ہین، وہی طوائف درس نصیحت دیتی ہی، اور فریب کا پردہ آپ سے آپ چاک ہوجاتا ہی، قصہ کے پلاٹ کا زیادہ حصہ گو غیر الوقوع

واقعات پر مبنی ہو انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے، اس افسانہ پر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے شروع میں دو تین صفحوں میں دیباچہ لکھا ہے

کیمیاگر اور دوسرے افسانے

از جناب محمد مجیب صاحب بی اے آکسن حجم ۵۰ ۲ صفحے قیمت درج نہیں، پتہ، منیجر صاحب جامعہ ملیہ بک ڈپو، قرول باغ، دہلی،

جناب محمد مجیب صاحب نے اپنے اون افسانوں کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں کیمیاگر اور دوسرے افسانے" کے نام سے مرتب کیا ہے، ان مختلف افسانوں میں معاشرتی زندگی کے کسی نہ کسی ایک خاص پہلو یا معاشرتی زندگی کے کسی ایک اصلاحی خیال کو کسی ایک مرتب واقعہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور یہی ان افسانوں کی نمایان خصوصیت ہے، یون عمومی دلچسپی کے لحاظ سے بعض افسانے اچھے خاصے دلچسپ اور سبق آموز ہیں، لیکن کہین پر محض اپنے اصلاحی خیالات سمجھانے کیلئے افسانہ میں اونکو اس اصرار اور تکرار کے ساتھ موضوع گفتگو بنایا ہے، کہ جمالیاتی پہلو غائب ہونیکے علاوہ شاید نظریاتی عنوان بحث بھی گم ہو کر رہ گیا ہے،

تاریخ الاسلام کا پہلا نمبر

از جناب مولوی سید محمد میان صاحب دیوبندی، ناشر منیجر کتب خانہ اعزازیہ دیوبند ضلع سہارنپور، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے، لکھائی چھپائی بچون کے مناسب، قیمت درج نہیں،

مؤلف نے مختصراً اسلامی تاریخ پر رسائل کا ایک سلسلہ طلبہ کیلئے لکھنا شروع کیا ہے، اوس کا یہ پہلا حصہ ہے، اس مین آنحضرت صلعم کی ہجرت تک کے واقعات بیان کئے گئے ہین، رسالہ درسی کتاب کے طور پر مکالمہ کی شکل میں قلمبند کیا گیا ہے، پھر ہر سبق کا خلاصہ چند سطرون مین دیدیا گیا ہے، رسالہ بچون کیلئے مفید ہوگا،

کلید عربی و کلید قرأت

(پہلا حصہ) مولفہ مولوی قاری خلیل احمد صاحب لکھنوی (فاضل دینیات) حجم بہ ترتیب چھوٹی تقطیع کے ۳۹ و ۴۵ صفحے قیمت ہر ایک ۳ ر پتہ:- بشیری بکڈپو نمبر ۳۱، کتابت خانہ شریف، موتی روڈ، مدراس،

مولوی قاری خلیل احمد صاحب نے عربی زبان کے سکھانے کیلئے انگریزی ریڈرون کے طرز پر کلید عربی کے نام سے اس کے چند حصے لکھے ہین، جن مین کا پہلا حصہ پیش نظر ہے، اسمین جملون کے ذریعہ سے عربی بنانے اور صرف و نحو کے مسائل مستحضر کرنیکی کوشش کیگئی ہے، اس پہلے حصہ مین ثلاثی مجرد صحیح کو استعمال کرایا گیا ہے، اور آخر مین نحو و صرف کے چند قواعد اور گردانین درج ہین،

کلید قرأت فن تجوید مین ہے، اس مین اولاً قرآن مجید کو ترتیل سے پڑھنے اور فن تجوید کے حاصل کرنیکی ضرورت دکھائی گئی ہے، پھر اس فن کے عمومی قواعد سلیس انداز مین سمجھا کر بیان کئے گئے ہین،

"ص"

ضمیمہ

تاریخ خطیب بغدادی

ابو حنیفہ النعمان بن ثابت

گذشتہ سے پیوستہ

از نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی

النعمان[1] بن ثابت، ابو حنیفہ تیمی امام صاحب الرای، فقیہ اہل عراق، انس بن مالکؓ کو دیکھا[2]، عطا بن ابی رباح نافع مولی ابن عمر، حماد بن ابی سلیمان، ہشام بن عروہ، علقمہ بن مرثد وغیرہم سے سماعت حدیث کی، عبداللہ بن المبارک وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون، ابو یوسف القاضی، محمد بن حسن وغیرہم نے اُنسے روایت کی، نسب کی بابتہ منجملہ دیگر مختلف روایتون کے امام صاحب کے پوتے اسمٰعیل بن حماد کی روایت ہے کہ ہم ابنای فارس سے ہین، غلامی نے کبھی ہم کو مس نہین کیا (اہل البیت ادری بما فی البیت، شروانی)

ولادت ۸۰ھ، حلیہ میانہ قد، خوشرو، خوش لباس، عطر کا استعمال بکثرت کرتے کہ مکان سے برآمد ہونے پر فضا معطر ہو جاتی، نیک صحبت، بڑے کرم کرنے والے، اپنے بھائیون کے دلی غمخوار، خوش بیانی مین فائق ہمتیرین آواز بلند ہمت

---

[1] واضح ہو کہ خطیب بغدادی نے امام صاحب کے حال مین پورے تو صفحے لکھے ہین، مضمون ذیل مین مذاق حال کے مناسب مضامین اقتباس کرکے لکھے گئے ہین (شروانی) [2] دیکھو اسکی تائید مین تذکرۃ الحفاظ امام ذہبیؒ جلد اول، تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر العسقلانیؒ الجزء العاشر مرآۃ الجنان امام یافعیؒ امام یافعی چار صحابۂ کرام کی روایت کے قائل ہین، (شروانی)

علم | فقہ خاصکر سیکھی، حماد بن ابی سلیمان کے حلقۂ درس مین ان کے سوا کوئی اور استاد کے سامنے نہ بیٹھتا، دس برس انکی صحبت مین رہے، ایک موقع پر اپنی جگہ ان کو بٹھا کر حماد باہر گئے، یہ لوگون کے سوالون کا جواب دیتے رہے، ایسے مسئلے بھی آئے جو استاد سے نہ سُنے تھے، استاد کی واپسی پر مسائل مذکور خدمت مین پیش کئے جو ساٹھ تھے، استاد نے چالیس سے اتفاق کیا، بیس سے اختلاف، شاگرد نے قسم کھائی کہ ساری عمر حاضر رہونگا، چنانچہ استاد کی وفات تک ساتھ رہے، کل زمانۂ رفاقت اٹھارہ برس تھا، استاد کے بیٹے اسمٰعیل کہتے ہین کہ ایک بار والد سفر مین گئے اور کچھ دن باہر رہے، واپسی پر مین نے پوچھا، ابا جان! آپ کو سب سے زیادہ کس کے دیکھنے کا شوق تھا (ان کا خیال تھا کہین گے بیٹے کے دیکھنے کا) کہا ابوحنیفہ کے دیکھنے کا، اگر یہ ہوسکتا کہ مین کبھی نگاہ ان کے چہرہ سے نہ اٹھاؤن تو یہی کرتا،

محمد بن فضیل عابد بلخی نے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ نے بیان کیا کہ مین امیرالمومنین خلیفہ منصور کے پاس گیا تو پوچھا تم نے علم کس سے حاصل کیا، مین نے کہا حماد سے انھون نے ابراہیم (نخعی) سے انھون نے عمرؓ بن الخطاب، علیؓ بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن العباسؓ سے منصور نے سنکر کہا خوب خوب، ابوحنیفہ تم نے بہت مضبوط علم حاصل کیا، وہ سب کے سب طیبین وطاہرین تھے، سب پر اللہ کی درود،

دوسری روایت مین ہے کہ خلیفہ منصور سے عیسیٰ بن موسیٰ نے کہا کہ یہ (ابوحنیفہ) آج دنیا کے عالم ہین، پوچھا نعمان! علم کس سے حاصل کیا، جواب دیا، اصحاب عمرؓ سے عمرؓ کا، اصحاب علیؓ سے علیؓ کا، اصحاب عبداللہ سے عبداللہ کا، او ابن عباس کے زمانہ مین اُن سے بڑھکر عالم روئے زمین پر نہ تھا،

اعمش نے ایکبار ابو یوسف سے پوچھا تمھارے رفیق ابوحنیفہ نے عبداللہ کا قول "عتق الامۃ طلاقہا" کیون ترک کیا، جواب دیا کہ اس حدیث کی بنا پر جو آپنے بواسطۂ ابراہیم و اسود عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ بریرہ جب آزاد کی گئین تو ان کو اختیار دیا گیا، اعمش یہ سنکر تعجب مین رہ گئے اور کہا ابوحنیفہ بہت زیرک ہین، ان اباحنیفۃ لفطن،

عبادت وورع | عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ مین نے کوفہ پہنچکر پوچھا کہ کوفہ والون مین سب سے زیادہ پارسا کون ہے، لوگون نے کہا ابوحنیفہ، ان کا یہ بھی قول ہے کہ مین نے ابوحنیفہ سے زیادہ کوئی پارسا نہین دیکھا، ما رأیت احدا

اورع من ابی حنیفۃ - تیسرا قول ہے کہ مین نے کسی کو ابوحنیفہ سے زیادہ پارسا نہین پایا، حالانکہ درون سے، مال و دولت سے اُن کی آزمایش کیگئی (اپنے زمانہ مین امام صاحب کے سب سے زیادہ عابد و پارسا ہونے کی تائید مین اور بھی متعدد قول خطیب نے نقل کئے ہین) سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ ہمارے وقت مین کوئی آدمی مکہ مین ابوحنیفہ سے زیادہ نماز پڑھنے والا نہین آیا، اُن کا یہ بھی قول ہے کہ وہ نماز اول وقت ادا کرتے تھے، ابومطیع کا قول ہے کہ مین قیام مکہ کے زمانے مین رات کی جس ساعت مین طواف کو گیا ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کو طواف مین مصروف پایا، ابوعاصم کا قول ہے کہ کثرتِ نماز کی وجہ سے ابوحنیفہ کو لوگ میخ (وتد) کہنے لگے تھے،

شب بیداری و قرآن خوانی یحیی بن ایوب الزاہد کا قول ہے کہ کان ابوحنیفۃ لا ینام اللیل، ابوحنیفہ شب بیدار تھے، اسد بن عمر کا قول ہے کہ ابوحنیفہ شب کی نماز مین ایک رکعت مین پورا قرآن ختم کر دیتے تھے، ان کے گریہ وزاری کی آواز سُنکر پڑوسیون کو رحم آنے لگتا تھا، ان کا یہ بھی قول ہے کہ یہ روایت محفوظ ہے کہ انھون نے جس مقام پر وفات پائی وہان سات ہزار کلام مجید ختم کئے تھے، ابوالجویریہ کا قول ہے کہ صحبتُ حماد بن ابی سلیمان و محارب بن دثار و علقمۃ بن مرثد و عون بن عبد اللہ و صحبتُ ابا حنیفۃ فما کان فی القوم رجل احسن لیلا من ابی حنیفۃ، لقد صحبت اشہرا فما منہا لیلۃ وضع فیہا جنبہ، مین حماد بن ابی سلیمان، محارب بن دثار، علقمہ بن مرثد اور عون بن عبداللہ کی صحبت مین بیٹھا ہون اور ابوحنیفہ کی صحبت مین بھی رہا ہون مین نے اس جماعت مین کسی کو ابوحنیفہ سے بہتر شب گذار نہین پایا، مین مہینون ان کی صحبت مین رہا، اس تمام زمانے مین ایک رات بھی پہلو لگاتے نہین دیکھا، مسعر بن کدام کا قول ہے کہ مین ایک رات مسجد مین داخل ہوا، تو کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز کان مین آئی، جس کی شیرینی دل مین اتر گئی، جب ایک منزل ختم ہوئی تو مجھ کو خیال ہوا کہ اب رکوع کرین گے، انھون نے ایک تہائی قرآن پڑھ لیا، نصف ختم کیا، اسی طرح پڑھتے رہے کہ کلام مجید ایک رکعت مین ختم ہوگیا، مین نے دیکھا تو وہ ابوحنیفہ تھے، خارجۃ بن مصعب کہتے ہین کہ خانۂ کعبہ مین چار امامون نے پورا قرآن پڑھا ہے، عثمان بن عفان، تمیم داری، سعید بن جبیر، اور ابوحنیفہ، زائدہ کہتے ہین کہ ایک رات مین نے ابوحنیفہ کے ساتھ عشا کی نماز مسجد مین پڑھی

آدمی نماز پڑھ کر چلے گئے، ابو حنیفہ کو معلوم نہ ہوا کہ مین مسجد مین ہون، حالانکہ تنہائی مین ایک مسئلہ مین اُن سے پوچھنا چاہتا تھا، انھون نے کھڑے ہوکر نماز مین قرآن مجید پڑھنا شروع کیا، مین انتظار مین کھڑا سنتا رہا کہ فارغ ہون تو مسئلہ پوچھون، پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہنچے (فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ) تو اس کو بار بار پڑھنا شروع کیا، اسی آیت کی تکرار مین صبح ہوگئی، یہانتک کہ مؤذن نے فجر کی اذان دیدی، یزید بن الکمیت جو برگزیدہ لوگون مین سے ہین (دکان من خیار الناس) کہتے ہین، کہ ابو حنیفہ کے دل مین اللہ تعالیٰ کا خوف شدید تھا، ایک رات امام نے عشا کی نماز مین سورۂ اذا زلزلت پڑھی، ابو حنیفہ جماعت مین تھے، جب نماز ختم کرکے آدمی چلے گئے، تو مین نے دیکھا کہ ابو حنیفہ فکر مین غرق بیٹھے ہین، تنفس جاری ہے، مین نے دل مین کہا چپکے سے اٹھ چلو، ان کے شغل مین خلل انداز نہ ہو، چنانچہ قندیل روشن چھوڑ کر مین چلا آیا، اس مین تیل تھوڑا تھا، طلوع فجر کے وقت جب مین مسجد مین پھر آیا تو مین نے دیکھا کہ ابو حنیفہ اپنی داڑھی پکڑے کھڑے ہین، اور کہہ رہے ہین، یا من یجزی بمثقال ذرۃ خیر خیرا و یا من یجزی بمثقال ذرۃ شر شرا، اجر النعمان عبدک من النار و ما یقرب منھا من السوء وادخلہ فی سعۃ رحمتک، اے ذرہ بھر نیکی کا اچھا بدلہ دینے والے اور اے ذرہ بھر برائی کا بدلہ دینے والے اپنے بندہ نعمان کو آگ سے اور اسکے لگ بھگ عذاب سے بچائیو، اور اپنی رحمت کی فضا مین داخل کیجیو، مین نے اذان دی، آکر دیکھا تو قندیل روشن تھی اور وہ کھڑے ہوئے تھے، مجھکو دیکھکر کہا کیا قندیل لینا چاہتے ہو، مین نے کہا صبح کی اذان دے چکا، کہا جو دیکھا ہے اس کو چھپانا، یہ کہکر صبح کی سنتین پڑھین اور بیٹھ گئے، مین نے تکبیر کہی تو جماعت مین شریک ہوئے، ہمارے ساتھ صبح کی نماز اول شب کے وضو سے پڑھی، القاسم بن معین کا بیان ہے کہ ایک رات ابو حنیفہ نے نماز مین یہ آیت پڑھی (بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر) بلکہ ان کا وعدہ قیامت پر ہے، اور قیامت بڑی آفت اور بہت تلخ ہے، تمام رات اس کو دہراتے رہے، اور شکستہ دلی سے روتے رہے،

عبادت شب اور کلام کی تلاوت کے متعلق خطیب نے اور بھی بہت سی روایتین لکھی ہین، نمونہ کے لئے

اوپر کے بیان کافی ہیں، یہ بھی خیال ہے کہ ہم پست ہمت مردہ دل ان کو اپنے حال پر قیاس کرکے مبالغہ اور بے اصل تصور نہ کر بیٹھیں،

قیس بن ربیع کا قول ہے کہ ابوحنیفہ پرہیزگار، فقیہ، محسود خلائق تھے، جو اُن کے پاس التجا لیجاتا اس کے ساتھ بہت سا سلوک کرتے، بھائیون کے ساتھ بکثرت احسان کرتے، انھی کا قول ہے کہ ابوحنیفہ مال تجارت بغداد بھیجتے، اس کی قیمت کا مال کوفہ منگواتے، سالانہ منافع جمع کرکے شیوخ محدثین کے لئے ضرورت کی چیزین خریدتے خوراک اور لباس غرض جملہ ضروریات کا انتظام کرتے اس سے جو روپیہ بچتا وہ نقد جملہ سامان کیساتھ یہ کہکران کے پاس بھیجتے کہ" اس کو خرچ کرو اور سوائے اللہ کے کسی کی تعریف نہ کرو اس لیئے کہ مین نے اپنے مال مین سے تم کو کچھ نہیں دیا، یہ اللہ کا تمھارے معاملے مین مجھ پر فضل ہے، کہ تمھاری قسمت کا نفع ہوا، یہ وہ فیض ہے جو اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے تم کو پہنچاتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ بخشتے اس مین دوسرے کی قوت کا کیا دخل ہو سکتا ہے" ابو یوسف کا قول ہے کہ ابوحنیفہ ہر سائل کی حاجت پوری کرتے تھے، ابوحنیفہ دربار کے عطیون سے ہمیشہ بچتے رہے، خلیفہ منصور نے ان کو بدفعات تیس ہزار درہم دیئے، انکار مین برہمی کا اندیشہ تھا، کہا امیرالمومنین مین بغداد مین غریب الوطن ہون، اجازت دیجئے کہ خزانہ شاہی مین یہ رقم میرے نام سے جمع ہوتی رہے، منصور نے منظور کیا، وفات تک یہ رقم خزانے مین رہی، بعد وفات جب منصور نے یہ حال سنا اور یہ بھی سنا کہ امام صاحب کی حفاظت مین لوگون کے پچاس ہزار درہم امانت کے تھے جو بعد وفات بجنسہ واپس دیئے گئے، تو اس نے کہا ابوحنیفہ میرے ساتھ چال چل گئے، امانت داری مسلم تھی، وکیع کا قول ہے، کان واللّٰہ ابوحنیفۃ عظیم الامانۃ وکان اللّٰہ فی قلبہ جلیلا وکبیرا، واللہ ابوحنیفہ بڑے امین تھے، اللہ کی جلالت اور کبریائی ان کے دل مین بھری ہوئی تھی، ان کا یہ بھی قول ہے کہ جب ابوحنیفہ اپنے بال بچون کیلیئے کپڑے بناتے تو ان کی قیمت کے برابر صدقہ کر دیتے، اور جب خود نیا کپڑا پہنتے تو اسکی قیمت کی برابر شیوخ علما کے لئے لباس تیار کراتے جب کھانا سامنے آتا تو اوّل اپنی خوراک کی مقدار سے دونا نکال کر کسی محتاج کو دیدیتے، صفائی معاملہ اس واقعہ سے معلوم ہوگی، ایک بار کپڑے

کے تھانون مین سے ایک تھان مین نقص تھا، اپنے شریک حفص کو ہدایت کی کہ جب یہ تھان بیچو تو اس کا عیب جتا دینا، وہ بھول گئے، سارے تھان بک گئے، یہ بھی یاد نہ رہا کہ عیب والا تھان کسکے ہاتھ فروخت کیا، ان کو معلوم ہوا تو سارے تھانون کی قیمت خیرات کردی، خود حفص کے بیٹے علی نے یہ روایت کی ہے، ابن صہیب کا قول ہے کہ ابو حنیفہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے،

عطاء ذی العرش خیر من عطائکم — وسیبہ واسع یرجی وینتظر

انتم یکدر ما تعطون منکم — واللہ یعطی بلا من ولا کدر

عرش کے مالک کی بخشش تمھاری بخشش سے بہتر ہے، اور اس کا جود بہت وسیع ہے کہ سب اس کے امیدوار و منتظر ہین، تمھاری بخشش کو تمھارا احسان جتانا مکدر کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا مین نہ احسان رکھنا ہے نہ کدورت،

وفور عقل، زیرکی اور باریک نظری

یہ عنوان خطیب نے مستقل قائم کیا ہے، عبداللہ بن مبارک نے سفیان ثوری سے کہا کہ اے ابو عبداللہ! ابو حنیفہ غیبت سے کسی قدر دور بھاگتے ہین، مین نے کبھی ان کو کسی کی غیبت کرتے نہین سنا، سنکر کہا، واللہ ابو حنیفہ کی عقل اس سے بڑھکر ہے، کہ وہ اپنی نیکیون پر ایسی بلا مسلط کرین جو ان کو فنا کردے، علی بن عاصم کا قول ہے کہ اگر ابو حنیفہ کی عقل روئے زمین کے آدھے آدمیون کی عقل سے تولی جائے تو اس کا پلہ بھاری رہیگا، خارجہ بن مصعب نے ایک موقع پر ابو حنیفہ کے ذکر کے سلسلے مین کہا کہ مین نے ایک ہزار علما دیکھے ہین ان مین تین یا چار عاقل پائے، ان مین سے ایک ابو حنیفہ ہین، یزید بن ہارون کا قول ہے کہ مین نے بہت آدمی دیکھے کسی کو ابو حنیفہ سے زیادہ عاقل زیادہ فاضل اور زیادہ پارسا نہین پایا، محمد بن عبداللہ انصاری کا قول ہے کہ ابو حنیفہ کی عقل ان کے کلام، ارادہ، نقل و حرکت سے عیان ہوتی تھی، کان ابو حنیفۃ یتبین عقلہ من منطقہ ومشیتہ ومدخلہ ومخرجہ،

ایک بار ابو حنیفہ خلیفہ منصور کے پاس گئے، حاجب ربیع نے (جسکو ان سے مخالفت تھی) کہا ابو حنیفہ حاضر ہین جو خلیفہ کے دادا عبداللہ بن عباس کی مخالفت کرتے ہین، ان کا قول تھا کہ قسم کھا کر انسان اگر ایکدن

یا دو دن کے بعد استثنار کر دے تو جائز ہے، یہ کہتے ہین کہ نہین وہی استثنار جائز ہوگا جو قسم کے ساتھ کیا جاوے، ابو حنیفہ نے کہا، امیر المومنین! ربیع کا خیال فاسد یہ ہے کہ آپکی فوج پر آپکی بیعت کی پابندی نہین، اس لئے کہ وہ آپ کے سامنے عہد کرتے ہین، گھر جاکر اس سے استثنار کر لیتے ہین، لہذا بیعت کا حلف باطل ہو جاتا ہے، منصور یہ سنکر ہنس پڑا اور کہا دیکھ ربیع! ابو حنیفہ کے منہ مت لگ، باہر نکل کر ربیع نے شکایت کی کہ تم نے تو میرا خون ہی بہا یا تھا، ابو حنیفہ نے کہا تم نے میرے قتل کا سامان کیا تھا مین نے تم کو بھی بچا لیا، اور اپنی جان بھی بچائی، عبد اللہ بن المبارک کا قول ہے کہ مین نے حسن بن عمارہ کو دیکھا کہ ابو حنیفہ کی رکاب تھامے ہوے کھڑے تھے، واللہ ہم نے کوئی انسان نہین دیکھا کہ جو فقہ مین تم سے زیادہ بالغ النظر ہو یا زیادہ صابر ہو یا زیادہ حاضر جواب ہو، تم اپنے وقت کے مسلم پیشوا ہو، تم پر جو اعتراض کرتے ہین وہ حاسد ہین،

حق پر استقامت | سہل بن مزاحم کا قول ہے کہ دنیا ابو حنیفہ کے قدمون پر گری، انھون نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، اس کے لینے پر کوڑون کے ذریعہ سے مجبور کئے گئے، مگر قبول نہ کیا، دو مرتبہ ابو حنیفہ نے حق کی حفاظت پر جسمانی تکلیفین برداشت کین، اول مرتبہ بنو امیہ کے زمانے مین، جب ابن ہبیرہ عامل کوفہ نے کوفہ کی قضا کا عہدہ قبول کرنے پر ان سے اصرار کیا، انکار پر ان کو کوڑے لگوائے، بالآخر چھوڑ دیا، ہر روز دس کوڑے مارے گئے، ایکدن کوڑے لگنے کے دوران مین روئے، چھوٹنے کے بعد رونے کا سبب کسی نے پوچھا تو کہا کہ مجھ کو اپنی والدہ کے صدمہ کا خیال آیا جو کوڑون سے زیادہ ایذا رسان تھا، اس پر رو یا، احمد بن حنبل اپنی مصیبت کے بعد جب ابو حنیفہ کی مصیبت کا ذکر کرتے روتے اور ان کے لئے رحمت کی دعا کرتے، دوسری مرتبہ خلیفہ منصور نے اسی عہدہ کے قبول کے لئے بغداد بلایا اور اصرار کیا، ابو حنیفہ انکار کرتے رہے، خلیفہ نے قسم کھا کر کہا کہ کرنا ہوگا، انھون نے انکار پر قسم کھائی، یہ بھی مکرر ہوا، حاجب ربیع نے موقع پاکر کہا کہ ابو حنیفہ امیر المومنین بار بار قسم کھاتے ہین، پھر بھی تم انکار کئے جاتے ہو، جواب دیا، امیر المومنین کو قسم کا کفارہ دیدینا مجھ سے زیادہ آسان ہے، بالآخر منصور نے قید کا حکم دیدیا، دوران قید مین ایکدن بلاکر پھر فرمایش کی، انھون نے کہا" اصلح اللہ امیر المومنین ما انا اصلح للقضاء، خدا امیر المومنین کو

بھلا کرے، مین عہدۂ قضا کی صلاحیت نہین رکھتا، منصور نے کہا تم جھوٹے ہو، جواب دیا خود امیر المومنین نے میری تصدیق کر دی، کہ مجھ کو جھوٹا کہا، اگر مین فی الواقع جھوٹا ہون تو عہدۂ قضا کے قابل نہین، اور اگر سچا ہون تو مین کہہ چکا کہ مجھ مین یہ صلاحیت نہین، منصور نے یہ سنکر پھر قیدخانہ بھیجدیا، اسی قیدخانہ مین چھ دن علیل رہکر ۱۵۰ھ مین وفات پائی، ستر برس کی عمر تھی، ابن جریج نے خبر وفات سنکر انا للہ پڑھی، اور کہا ای علم ذھب کیسا علم اُٹھ گیا،

فقہ ابو حنیفہ | اس کا بھی مستقل باب ہے،

حدیث:۔ لا تقوم الساعة حتی یظہر العلم" کی تفسیر مین حسن بن سلیمان نے کہا ہے کہ وہ علم ابو حنیفہ کا علم ہے، اور وہ شرح جو انھون نے احادیث کی کی ہے، خلف بن ایوب کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا، آپنے صحابہ کو پہنچایا، صحابہ نے تابعین کو، تابعین کے بعد ابو حنیفہ اور اُن کے اصحاب کو ملا اس پر کوئی خوش ہو یا ناراض،

ابن معینہ کا قول ہے کہ میری آنکھ نے ابو حنیفہ کا مثل نہین دیکھا،

ایک موقع پر عبداللہ بن مبارک نے کہا ابو حنیفہ اللہ کی ایک نشانی تھے، کسی نے کہا خیر کی یا شر کی؟ کہا خاموش، شر کے واسطے غایۃ اور خیر کے واسطے آیۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ کہکر یہ آیت پڑھی" وجعلنا ابن مریم وامه آية" ابن مبارک کا یہ قول بھی ہے، کوئی مجلس ابو حنیفہ سے زیادہ باوقار نہ تھی، اُنکی شان فقہا کی تھی، نیک طریقہ، خوبصورت، خوش لباس تھے، ہم ایک روز جامع مسجد مین تھے، ایک سانپ ابو حنیفہ کی گود مین آپڑا، لوگ ڈرکر بھاگ گئے، ان کو مین نے دیکھا کہ بدستور بیٹھے رہے، سانپ کو جھٹکر پھینکدیا، اُن کا یہ قول بھی ہے کہ اگر اللہ نے میری مدد ابو حنیفہ اور سفیان کے ذریعے سے نہ کی ہوتی تو مین عام آدمیون کی طرح ہوتا، لولا ان اللہ اغاثنی بابی حنیفة وسفیان کنت کسایر الناس، عبداللہ بن مسعود کے پڑوتے قاسم سے کسی نے کہا کہ کیا تم ابو حنیفہ کے تلامذہ مین داخل ہونا پسند کرتے ہو، جواب دیا ان کی محفل سے

زیادہ فیض رسان کوئی مجلس نہین ہے، چلو تم بھی چلکر دیکھ لو، چنانچہ وہ شخص ان کے ساتھ گیا، مجلس مین بیٹھا تو وہین کا ہو رہا اور کہا مین نے اس سے بہتر صحبت نہین پائی،

عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ مین اوزاعی سے ملنے شام گیا، بیروت مین اُن سے ملاقات ہوئی، مجھ سے کہا کہ اے خراسانی کوفہ مین یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے، یہ سنکر مین مکان پر آیا، ابوحنیفہ کی کتابین نکالین اوران مین سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر نکالے، اس مین تین دن لگ گئے، تیسرے روز ان کے پاس پھر گیا، وہ مسجد کے مؤذن بھی تھے، امام بھی، میرے ہاتھ مین کتاب دیکھکر کہا یہ کیا ہے، مین نے ہاتھ بڑھاکر حوالہ کر دی، انھون نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی جسپر لکھا تھا، قال النعمان، اذان کہکر کھڑے کھڑے پہلا حصہ پڑھ لیا، پڑھکر کتاب آستین مین رکھ لی، پھر تکبیر کہکر نماز پڑھی، نماز پڑھکر کتاب نکالی اور سب پڑھ لی، دیکھکر کہا یہ نعمان بن ثابت کون ہین، مین نے کہا ایک شیخ ہین جن سے عراق مین ملاقات ہوئی تھی، کہا بڑی شان کے شیخ ہین، جاؤ اور اُن سے بہت سا فیض حاصل کرو، مین نے کہا یہ وہی ابوحنیفہ ہین جن سے مجھکو آپ نے روکا تھا، مسعر بن کدام کا قول ہے، کوفے مین صرف دو آدمیون پر مجھکو حسد ہے ابوحنیفہ پر اُن کے فقہ کی وجہ سے اور حسن بن صالح پر اُن کے زہد کی وجہ سے، ابراہیم سے روایت ہے، کہ ایک بار ہم مسعر بن کدام کے پاس بیٹھے تھے کہ ابوحنیفہ وہان سے گذرے، تھوڑی دیر ٹھہر کر مسعر کو سلام کیا، اور چلے گئے، کسی نے کہا ابوحنیفہ کس قدر جھگڑالو ہین، یہ سنکر مسعر سنبھلکر بیٹھ گئے، اور کہا سمجھکر بات کرو، مین نے ابوحنیفہ کو جس کسی سے بحث کرتے دیکھا اوسی کو غالب پایا، اسرائیل کا قول ہے کہ نعمان اچھے آدمی تھے، اُن سے زیادہ کسی کو وہ حدیثین یاد نہ تھین جنمین فقہ ہے، نہ ان سے زیادہ کسی نے کاوش کی تھی، نہ اُن سے زیادہ حدیث کی فقہ کا کوئی جاننے والا تھا، انھون نے حدیثین حماد سے یاد کی تھین، اور خوب یاد کی تھین، اسی لئے خلفا و امراء و وزراء نے ان کی عزت کی، جو شخص فقہ مین ان سے بحث کرتا اس کی جان مشکل مین پڑ جاتی، مسعر کا قول تھا کہ جو کوئی اپنے اور اللہ کے درمیان ابوحنیفہ کو واسطہ کریگا، مجھکو امید ہے کہ اس کو خوف نہ ہوگا، اور اُس نے احتیاط کا حق ادا کر دیا ہوگا، عبدالرزاق کا بیان ہے کہ ہم معمر کے پاس تھے کہ ابن المبارک پہنچے، ان کے آنے پر معمر نے کہا، مین کسی شخص کو نہین جانتا جو فقہ پر ابوحنیفہ

سے زیادہ معرفت کے ساتھ کلام کر سکے، یا اُن سے زیادہ قیاس پر اور لوگون کے لئے فقہ کی راہین کھولنے پر قادر ہو، نہ مین نے ان سے زیادہ کسی کو اسپر خائف پایا کہ اللہ کے دین مین کوئی بات بے تحقیق داخل کرین، ابو جعفر کا قول ہے کہ مین نے ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ اور پارسا کسی کو نہین دیکھا فضیل بن عیاض کا قول ہے، ابوحنیفہ مرد فقیہ تھے، فقہ مین معروف پارسائی مین مشہور، بڑے دولتمند، ہر صادر و وارد کے ساتھ بہت سلوک کرنے والے، شب و روز صبر کے ساتھ تعلیم مین مصروف رہتے، رات اچھی گذارنے والے، خاموشی پسند، کم سخن، جب کوئی مسألہ حلال یا حرام کا پیش آتا تو کلام کرتے، اور ہدایت کا حق ادا کر دیتے، سلطانی مال سے بھاگنے والے، ابن صباح نے ابن مکرم کی حدیث پر فضیل بن عیاض کا یہ قول اور زیادہ کیا ہے، جس وقت کوئی مسئلہ اُن کے سامنے آتا تو اس کے باب مین اگر کوئی صحیح حدیث ہوتی تو اس کی پیروی کرتے، اگرچہ وہ صحابہ یا تابعین کی حدیث ہوتی ورنہ قیاس کرتے اور بہت اچھا قیاس کرتے، ابو یوسف کا قول ہے، مین نے حدیث کے معنی یا حدیث کے فقہی نکات جاننے والا ابوحنیفہ سے زیادہ نہین دیکھا، ان کا یہ بھی قول ہے کہ مین نے جس مسألہ مین ابوحنیفہ سے مخالفت کی اور پھر غور کیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ ان کا مذہب آخرت کی نجات کے واسطے زیادہ کار آمد تھا، مین اکثر حدیث کی جانب جھکتا حال یہ تھا کہ وہ حدیث صحیح مین مجھ سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے، ان کا یہ بھی قول تھا کہ مین ابوحنیفہ کے لئے اپنے باپ سے پہلے دعا کرتا ہون، حماد بن زید کا قول ہے کہ مین نے حج کا ارادہ کیا، اور ایوب کے پاس رخصت ہونے گیا، انھون نے کہا، مین نے سنا ہے کہ اہل کوفہ کے فقیہ مرد صالح یعنی ابوحنیفہ، اس سال حج کو آئین گے، جب ان سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا، ابوبکر بن عیاش کا قول ہے کہ سفیان کے بھائی عمر بن سعید کا انتقال ہوا تو سفیان کے پاس ہم تعزیت کے لیے گئے، مجلس آدمیون سے بھری ہوئی تھی، عبداللہ بن ادریس بھی وہان تھے، اسی عرصے مین ابوحنیفہ مع اپنی جماعت کے وہان پہنچے، سفیان نے ان کو دیکھا تو اپنی جگہ خالی کی، کھڑے ہو کر ان سے معانقہ کیا، اپنی جگہ اُن کو بٹھایا، خود سامنے بیٹھے، یہ دیکھکر مجھ کو سخت غصہ آیا، ابن ادریس نے مجھ سے کہا، کمبخت دیکھتا نہین، ہم یہانتک بیٹھے رہے کہ آدمی متفرق ہوگئے، اب مین نے سفیان سے کہا کہ اے ابو عبداللہ آج آپنے ایک ایسا کام کیا جو مجھکو برا معلوم ہوا، نیز ہمارے دوسرے ساتھیون کو، پوچھا کیا بات، مین نے کہا، آپکے

پاس ابوحنیفہ آئے اُن کے لئے آپ کھڑے ہوئے اپنی جگہ بٹھایا، ان کے ادب مین مبالغہ کیا یہ ہم لوگون کو ناپسند ہوا، کہا تم کو یہ کیون ناپسند ہوا، وہ علم مین ذی مرتبہ شخص ہین، اگر مین اُن کے علم کے لئے نہ اٹھتا توان کے سن وسال کے لئے اٹھتا، اوراگران کے سن وسال کے لیے نہ اٹھتا توان کی فقہ کے واسطے اٹھتا، اگر فقہ کے لئے نہ اٹھتا توان کے تقوی کے واسطے اٹھتا، راوی کا بیان ہے کہ انھون نے مجھکو ایسا ساکت کیا کہ جواب نہ بن آیا، ابومطیع کا قول ہے کہ مین نے کسی محدث کو سفیان ثوری سے زیادہ فقیہ نہین دیکھا، ابوحنیفہ ان سے بھی زیادہ فقیہ تھے، یزید بن ہارون نے اس سوال کے جواب مین کہ دونون مین کون زیادہ فقیہ ہے، کہا سفیان ثوری حفظ حدیث مین بڑھے ہوئے ہین، ابوحنیفہ فقہ مین، ایسا ہی ایک قول ابوعاصم نبیل کا ہے،

ابن المبارک کا قول ہے کہ اگر حدیث معلوم ہو اور رائے کی ضرورت ہو تو مالک، سفیان، اور ابوحنیفہ کی رائے ماننی چاہئے، ابوحنیفہ کی نظر زیرکی مین ان سے بہتر اور باریک تر ہے، فقہ مین زیادہ گہری جاتی ہے، اور وہ ان تینون مین زیادہ فقیہ ہین، ان کان الاثر قد عرف واحتیج الی الرای فرای مالک وسفیان وابی حنیفة، وابو حنیفة احسنہم وادقہم فطنة واغوصہم علی الفقہ وھو افقہ الثلاثة،

محمد بن بشر کا قول ہے کہ مین ابوحنیفہ اور سفیان ثوری دونون کے پاس جاتا تھا، جب ابوحنیفہ کے پاس جاتا پوچھتے کہان سے آئے، سفیان کا نام سنکر کہتے، تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو کہ اگر آج علقمہ اور اسود زندہ ہوتے تو سفیان کے محتاج ہوتے، جب سفیان سوال کے جواب مین سنتے کہ ابوحنیفہ کے پاس سے آیا ہون، تو کہتے تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو جو روئے زمین پر سب سے زیادہ فقیہ ہے، عبداللہ بن داؤد الخریبی کا قول ہے کہ اہل اسلام پر واجب ہے کہ نماز کے بعد ابوحنیفہ کے حق مین اس حفاظت کے صلے مین جو انھون نے سنت اور فقہ کی کی ہے، دعائے خیر کرین، نضر بن شمیل کا قول ہے کہ لوگ علم فقہ سے غافل تھے، ابوحنیفہ کی عقدہ کشائی تشریح و تلخیص نے چونکا دیا، یحیی بن معین کا قول ہے کہ مین نے یحیی القطان کو کہتے سنا، ہم اللہ کا نام لے کر جھوٹ نہ بولینگے ہم ابوحنیفہ کی رائے مین سے اکثر چیزین اختیار کر لیتے ہین، یہ بھی ان کا قول یحییٰ بن معین نے نقل کیا ہے کہ ہم

خدا کا نام لیکر جھوٹ نہ بولین گے، ابو حنیفہ سے بہتر رائے ہم نے کسی کی نہین پائی، اور ہم نے ان کے اکثر اقوال اختیار کرلیے ہین، یحییٰ بن معین کہتے ہین، کہ یحییٰ بن سعید (قطان) فتویٰ مین کوفیون کے قول کی جانب جاتے تھے، اور کوفیون کے اقوال مین سے ابو حنیفہ کا قول لیتے تھے، اور اُن کے معاصرون مین سے ان کی رائے کا اتباع کرتے تھے، امام شافعی کے حسب ذیل اقوال فقہ حنفی کے متعلق نقل کئے ہین،

الناس عیال علی ابی حنیفۃ فی الفقہ — لوگ فقہ مین ابو حنیفہ کے محتاج ہین،

ما رأیت افقہ من ابی حنیفۃ۔ — مین نے ابو حنیفہ سے بڑھکر فقیہ نہین دیکھا،

جو شخص فقہ مین متبحر ہونے کا ارادہ کرے وہ ابو حنیفہ کا محتاج ہے،

کان ابو حنیفۃ ممن وفق لہ الفقہ، — ابو حنیفہ ان لوگون مین سے تھے جنکو فقہ مین حق کے ساتھ موافقت بخشی گئی ہے،

جو شخص فقہ سیکھنا چاہے اسکو ابو حنیفہ اور ان کے شاگردون کا دامن پکڑنا چاہئے، اس لئے کہ سارے انسان فقہ مین ابو حنیفہ کے محتاج ہین،

یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ میرے نزدیک قرأت حمزہ کی قرأت ہے اور فقہ ابو حنیفہ کی فقہ ہے، سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ میرا گمان یہ تھا کہ ۲ چیزین کوفے کے پل کے ادھر نہ جائینگی، مگر وہ آفاق پر چھا گئین، حمزہ کی قرأت، اور ابو حنیفہ کی رائے، جعفر بن الربیع کا قول ہے، پانچ سال مین ابو حنیفہ کے پاس رہا اُن سے زیادہ خاموش آدمی مین نے نہین دیکھا، جب کوئی مسئلہ پیش آتا اس وقت کھلتے اور سیل دریا کی طرح روان ہوتے حکم بن ہشام الثقفی سے کسی نے ابو حنیفہ کی نسبت رائے پوچھی تو انھون نے کہا، ابو حنیفہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلے سے نہین نکالتے تھے جب تک کہ وہ خود اسی دروازہ سے نہ نکل جائے، جس سے وہ داخل ہوا تھا، وہ بہت بڑے امین تھے، ہمارے سلطان نے چاہا کہ اُن کو خزانے کی کنجیان سپرد کردے، نہ ماننے کی صورت مین دُرون کی دھمکی دی، انھون نے انسانی عذاب کو بمقابلہ اللہ کے عذاب کے پسند کیا، ابن مزاحم کا قول ہے، ابو حنیفہ اکثر یہ کہا کرتے

تھے، اللھم من ضاق بنا صدرہٗ فان قلبی بنا قد اتسعت له، بار الہا جو لوگ ہماری طرف سے تنگدل ہین، ہمارے دل ان کے لئے کشادہ ہین" حسن بن زیاد اللولوی کا قول ہے، مین نے ابو حنیفہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہمارا قول رائے ہی، اور وہ ہماری قدرت کی بہترین صورت ہے، جو اس سے بہتر بیان کرے وہ ہم سے زیادہ باصواب ہے

وکیع کا قول ہے کہ ایک روز مین ابو حنیفہ کے پاس گیا تو وہ سر جھکائے ہوئے غور کر رہے تھے، مجھ کو دیکھکر کہا کہان سے آئے، مین نے کہا، شریک کے پاس سے، یہ سنکر سر اٹھایا اور یہ شعر پڑھے،

ان یحسدونی فانی غیر لائمھم قبلی من الناس اھل الفضل قد حسدوا

فدام لی ولھم مابی ومابھم ومات اکثرنا غیظاً بما یجد

اگر لوگ مجھ پر حسد کرتے ہین تو کرین مین انکو ملامت نہین کرنے کا، مجھ سے پہلے بھی انسانون مین سے اہل فضل پر حسد کیا گیا ہے، وہ اپنے حال پر قائم رہین، مین اپنے حال پر، ہم مین سے اکثر حالات پر غصہ کھا کر مر گئے ہین، یہ بیان کرکے وکیع نے کہا کہ میرا گمان ہے کہ شریک کی طرف سے کوئی بات ابو حنیفہ کے کان تک پہنچی تھی،

ایک اور قول جو اس موقع کے مناسب ہے ہم تاریخ خطیب کے ایک دوسرے مقام سے (امام ابو یوسف کے حالات مین سے) یہان نقل کرتے ہین،

ایک روز وکیع کی مجلس مین کسی نے کہا ابو حنیفہ نے خطا کی، وکیع نے کہا ابو حنیفہ کس طرح خطا کر سکتے ہین حالانکہ ابو یوسف و زفر جیسے صاحب قیاس، اور یحیی بن زائدہ اور حفص بن غیاث اور حبان اور مندل جیسے حافظان حدیث اور القاسم بن معن سا لغت اور ادب کا جاننے والا، اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و پارسا ان کے ساتھ ہین جس کے ایسے ہمنشین ہون وہ غلطی نہین کر سکتا اگر کبھی غلطی کر جائے اس کے جلیس رد کر دینگے،

جرح ۴۴ صفحات پر مناقب بیان کرنے کے بعد خطیب نے وہ اقوال لکھے ہین جو امام صاحب کے خلاف کئے گئے ہین، ان اقوال کو نقل کرنے سے پہلے خطیب نے یہ تمہید بیان کی ہے،

والمحفوظ عند نقلۃ الحدیث عن ھؤلاء المذکورین منھم فی ابی حنیفۃ خلاف

ذلک وکلام مهم فیه کثیر لامور شنیعة حفظت علیه یتعلق بعضها باصول الدیانات وبعضها بالفروع نحن ذاکروها بمشیئة الله ومعتذرون علی من وقف علیها وکره سماعها بان اباحنیفة عندنا مع جلالة قدره اسوة غیره من العلماء الذین دونا ذکرهم فی هذا الکتاب واوردنا اخبارهم وحکینا اقوال الناس فیهم علی تباینها والله الموفق للصواب

"ناقلانِ حدیث کے یہان ائمہ مذکورین کے ایسے اقوال بھی ابوحنیفہ کے متعلق محفوظ ہین جو بیانِ بالا کے خلاف ہین، اور انھون نے ان کی بابتہ کلام بہت کیا ہے، اس کلام کے باعث وہ امور شنیعہ ہین جو ان کے متعلق محفوظ ہین ان مین سے بعض تو اصول دین کے متعلق ہین، بعض فروع کے متعلق، ہم انشاءاللہ ان کا ذکر کرینگے، جو لوگ اسکو سنکر ناپسند کرین ان سے ہم معذرت کرتے ہین کہ ہم ابوحنیفہ کی جلالتِ قدر کے قائل ہین تاہم ان کو اس بارہ مین دوسرے علمار کی طرح سمجھتے ہین کہ ان کے خلاف جو باتین بیان کی گئی ہین، ان کو بھی ہم بیان کر دین، جیسا کہ ہم نے دوسرے علما کے ذکر مین کیا ہے،

اس تمہید کے بعد اقوال خلاف بیان کئے گئے ہین جو ۵ صفحات پر پھیلے ہوئے ہین،

یہ امور شنیعہ جیسا کہ خود خطیب نے بیان کیا ہے بعض تو ان مین سے عقائد کے متعلق ہین بعض فروع کے متعلق عقائد کے متعلق حسب ذیل اقوال ہین،

یہودی، مشرک، زندیق، دہری، صاحب ہوا، اُن سے کفر سے دوبار توبہ کرائی گئی، مرجیہ جہمی، خلق قرآن کے قائل، اصحاب ابوحنیفہ کا شبہ بالنصاری ہونا،

فروع کے متعلق حسب ذیل اقوال ہین،

خروج علی السلطان، تقیہ کرنا، زنا کا حلال کردینا، ربوٰ کا حلال کردینا، خون ریزی حلال کردی، سنن کی کساد بازاری کی، علیٰ ہذا القیاس،

یہ واضح رہے کہ جرحین سب کی سب غیر مفسر اور غیر مبین السبب ہین، اُن کے راویون کی عدالت کی توثیق

خطیب نے نہین کی ہے، یہ دونون امر اصولاً لازم ہین،

مناسب ہوگا، کہ امام صاحب پر جو جرحین کیگئی ہین اس موقع پر ایک تحقیقی نظر اُن پر ڈالی جائے، بحث کے دو پہلو ہوسکتے ہین، نقلی و عقلی، نقلی بحث یہ ہے کہ خود خطیب ان جرحون کی ذمہ داری لینے پر تیار نہین، چنانچہ انکے نقل کرنے سے پہلے جو تمہید لکھی ہے وہ اس کی شاہد ہے، جرحین نقل کرنے کی معذرت یہ کی ہے کہ چونکہ وہ روایت کیگئی ہین اور تمام علما کے متعلق وہ موافق و مخالف امور کی نقل کرتے آئے ہین، اسلئے ان اقوال کو بھی نقل کرتے ہین، اسکے ساتھ امام صاحب کی جلالتِ قدر کو مانتے ہین، ظاہر ہے کہ اگر مذکورۂ بالا جرحون مین سے فروع یا عقائد کے متعلق ایک جرح بھی ان کے نزدیک ثابت ہوتی تو جلالتِ قدر درکنار امام صاحب کی قدر بھی ان کے دل مین نہ ہونی چاہئے تھی، اس کے علاوہ جرحین نقل کرنے کے ساتھ ساتھ جابجا ان کے تردیدی اقوال بھی نقل کرتے جاتے ہین، حالانکہ جرح مین تعدیل کے ذکر کا موقع نہ تھا کہ باب تعدیل و مناقب ختم ہو چکا تھا، مثلاً خلقِ قرآن کے عقیدہ کے روایت بیان کرنے کے بعد امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا ہے، لم یصح عندنا ان ابا حنیفۃ کان یقول القرآن مخلوق، ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہین کہ ابو حنیفہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل تھے، اس کے بعد جوزجانی اور معلی بن منصور کا قول نقل کیا ہے "یقولان ما تکلم ابی حنیفۃ ولا ابی یوسف ولا زفر ولا محمد ولا احد من اصحابھم فی القرآن وانما تکلم بشر المریسی وابن ابی داؤد فھؤلاء شانوا اصحاب ابی حنیفۃ۔ ان دونون کا قول تھا کہ نہ ابو حنیفہ نے نہ ابو یوسف نے نہ زفر نے نہ محمد نے اور نہ اور کسی نے ان مین سے قرآن مین کلام کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ بشر مریسی اور ابن ابی داؤد نے کلام کیا ہے، اور اصحاب ابو حنیفہ کو بدنام، خود امام صاحب کا ایک قول نقل کیا ہے، ایک بار عبد اللہ بن المبارک ابو حنیفہ کے پاس گئے، پوچھا کہ تم لوگون مین یہ کیا چرچا ہو رہا ہے، جواب دیا ایک شخص جہم نامی کا چرچا ہے، پوچھا کیا کہتا ہے، کہا کہتا ہے، القرآن مخلوق، انھون نے سنکر یہ آیت پڑھی، کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا، جنت اور نار کے غیر موجود ہونے کی جرح نقل کر کے خطیب کہتے ہین کہ قولِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ خود راوی

ابو مطیع اس کا قائل تھا، ابو حنیفہ نہ تھے، امام احمد بن حنبل کی طرف جو جرح امام صاحب کے کذاب ہونے کی منسوب ہے اس کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یحیی بن معین سے پوچھا گیا کہ آیا ابو حنیفہ ثقہ ہیں، قال نعم ثقة ثقة، کہا ہاں ثقہ ہیں ثقہ ہیں، دوسرا قول اُن کا یہ نقل کیا ہے، کان ابو حنیفة ثقة لایحدث بالحدیث الا ما یحفظ ولا یحدث بما لا یحفظ، ابو حنیفہ ثقہ تھے، وہی حدیث روایت کرتے جو ان کو بخوبی یاد ہوتی اور جو بخوبی یاد نہ ہوتی، اسکو روایت نہ کرتے، ان مراتب پر غور کرنے کے بعد صرف یہی راے قائم ہو سکتی ہے کہ خطیب نے مخالف اقوال نقل کر کے مین اپنا مورخانہ فرض ادا کیا ہے، خود اُن کے وہ قائل نہ تھے، یا یہ کہئے کہ وہ خود ان کی رائے نہ تھی،

اس کے بعد ہم اصول حدیث کی مستند کتابون سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہین۔ کتاب المغنی[1] للشیخ طاہر پٹنی صاحب مجمع البحار کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو، جو جرح بالا کا جواب شافی ہے، یہ واضح رہے کہ یہ نیز بعد کے آنے والے جوابات کسی حنفی کے لکھے ہوے نہیں ہین، سب غیر حنفیون کے ہین، ترجمہ ملاحظہ ہو،

"امام ابو حنیفہ کی طرف ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہین جنسے ان کی شان بالاتر ہے، وہ اقوال خلق قرآن، قدر، ارجا، وغیرہ ہین، ہم کو ضرورت نہین کہ ان اقوال کے منسوب کرنے والون کے نام لین، یہ ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہ کا دامن ان سے پاک تھا، اللہ تعالی کا ان کو ایسی شریعت کا دینا جو سارے آفاق مین پھیل گئی، اور جسنے روئے زمین کو ڈھک لیا، اور ان کے مذہب و فقہ کا قبول عام ان کی پاکدامنی کی دلیل ہے، اگر اسمین اللہ تعالی کا سر خفی نہ ہوتا، نصف[2] یا اس کے قریب اسلام ان کی تقلید کے جھنڈے کے نیچے نہ ہوتا، یہان تک کہ ہمارے زمانے تک جسکو ساڑھے چار سو برس ۴۵۰ ہو چکے،

---

[1] شیخ موصوف نے یہی عبارت مجمع البحار کے خاتمے مین بھی نقل کی ہے،

[2] ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح مین اپنے زمانے کے (یعنی گیارہوین صدی کے) حنفیون کا اندازہ بر بنا ر آبادی روم اور ماوراء النہر اور ہندوستان کے کل اہل اسلام مین دو ثلث ہونے کا کیا ہے، اور یہ قرین قیاس ہے، (دیکھو کتاب مذکور کا میرے یہان کا قلمی نسخہ ورق ۱۳ صفحہ دوم)

(معلوم ہوتا ہے کہ کاپی نویس نے تسعمائۃ کو اربعمائۃ کر دیا ہے) ان کے فقہ کے مطابق اللہ کی عبادت ہو رہی ہے، اور اُن کی رائے پر عمل ہو رہا ہے، اس مین انکی صحت کی اوّل درجے کی دلیل ہے، اور ابو جعفر طحاوی نے (جو ان کے مذہب کے سب سے زیادہ اخذ کرنے والون مین ہین) ایک کتاب مسمّی بہ عقیدہ ابو حنیفہ لکھی ہے، یہی عقیدہ اہل سنت کا ہے، (خاکسار شروانی کہتا ہے کہ عقائد نسفی بھی اس کی تائید مین پیش کیجا سکتی ہے، جو آج عقائد کی مدار علیہ کتاب ہے) اس مین کوئی عقیدہ ان عقیدون مین سے موجود نہین جو ابو حنیفہ کی طرف منسوب کئے گئے ہین، طحاوی نے اس کا سبب بھی لکھا ہے کہ کیون وہ قول اُن کی طرف منسوب کئے گئے، ہم کو ان کے ذکر کرنے کی اسلئے حاجت نہین کہ ابو حنیفہ کی شان کا آدمی اور ان کا مرتبہ جو اسلام مین ہے اس کا محتاج نہین کہ انکی طرف سے کوئی معذرت کیجائے۔" (المغنی صفحہ ۳۱ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی، حاشیہ تقریب التہذیب)

خیالِ بالا کی تائید خود خطیب نے بھی کی ہے، وہ اپنی اصولِ حدیث کی کتاب الکفایہ فی علم الروایہ مین جرح کے قاعدہ کے تحت امام مالک بن انس و امام سفیان ثوری سے شروع کر کے یحییٰ بن معین تک ایک طبقہ قائم کرتے ہین، اس کے بعد لکھتے ہین، "اور جو اصحاب بلندیِ ذکر، استقامتِ حال، اور صداقت کی شہرت اور بصیرت و فہم مین اصحاب بالا کی مثل ہون اُن کی عدالت کی بابتہ سوال نہین کیا جا سکتا" اسی سلسلے مین یہ روایت لکھی ہے کہ امام احمد بن حنبل سے اسحٰق بن راہویہ کی بابتہ سوال کیا گیا تو جواب مین کہا کہ کیا اسحٰق بن راہویہ کی شان کے آدمی کی نسبت سوال کیا جا سکتا ہے، ایسا ہی ایک قول یحییٰ بن معین کا ابو عبید کے بارہ مین روایت کیا ہے، (دیکھو الکفایہ فی علم الروایۃ صفحہ ۱۱۳ و ۱۴۴، میرے کتابخانے کا قلمی نسخہ) کتاب مذکور مین خطیب نے یہ روایت کر کے کہ جرح وہی مقبول ہوگی جو مشرح ہو لکھا ہے کہ یہی قول ہمارے نزدیک صحیح ہے، اور یہی مذہب حفاظ حدیث مین اماموں کا ہے، یہ لکھکر امام بخاری و امام مسلم وغیرہما کے احتجاج کی مثالین دی ہین (دیکھو الکفایہ صفحہ ۱۰۸) اب اس قاعدے کی کسوٹی پر اگر ان جرحون کو آپ کسین گے جو خطیب نے تاریخ مین امام اعظم کے متعلق غیر مشرح نقل کی ہین تو صاف عیان ہو جائیگا کہ وہ خود ان کے نزدیک قابل قبول نہین، اسلئے کہ جب اس طبقے کی عدالت سوال سے بالاتر ہے جس مین اسحٰق بن

راہویہ ہین تو امام صاحب کی عدالت تو اس سے بڑھا بالا تر ہے، جب اسحٰق بن راہویہ کی شان کے آدمی کی نسبت بقول
امام احمد بن حنبل سوال نہین کیا جا سکتا ہے تو امام اعظم کی شان تو اس سے بہت زیادہ ارفع ہے،

شیخ الاسلام سبکی نے کتاب طبقات الشافعیہ مین ایک لطیف بحث جرح و تعدیل کے متعلق لکھی ہے، جسکا خلاصہ
یہ ہے، "جرح و تعدیل کا ایک ضروری و نافع قاعدہ...... ہمارے نزدیک قول صواب یہ ہے کہ جس کی امامت
و عدالت ثابت ہو اور جسکی تعدیل و تزکیہ کرنے والے بہت ہون، جرح کرنے والے نادر اور اس بات کا قرینہ ہو کہ سبب
جرح تعصب مذہبی وغیرہ ہے، تو ہم جرح کی طرف التفات نہ کرین گے، تعدیل کو مان لین گے، ورنہ اگر یہ دروازہ
کھولدیا جائے اور ہم جرح کو تعدیل پر علی الاطلاق مقدم کرنا شروع کر دین تو کوئی امام ائمۂ دین مین سے اسکی زد سے نہ
بچیگا، اس لئے کوئی امام نہین جس پر طعن کرنے والون نے طعن نہ کیا ہو اور اسکی وجہ سے ہلاک ہونے والے ہلاک
نہ ہوئے ہون، عبد البر کہتے ہین، صحیح اس معاملے مین یہ ہے کہ جس شخص کی عدالت اور علم مین اسکی امامت اور علم کی
جانب توجہ ثابت ہو اس کے متعلق ہم کسی کے قول کیجانب التفات نہ کرین گے، اگر اس صورت مین کہ صاف عادلانہ
جرح قانون شہادت کے مطابق مستند ہو، ان کا استدلال یہ ہے کہ سلف مین بعض کا کلام بعض پر رہا ہے بعض
حالتون مین وہ تعصب یا حسد پر مبنی ہے، بعض صورتون مین تاویل و اختلاف اجتہاد اسکا باعث ہوا ہے، حالانکہ
جس کی نسبت کلام کیا جاتا ہے وہ اس سے پاک ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ تاویل و اجتہاد کی بنیاد پر ایک نے دوسرے
پر تلوار چلوادی ہے،

اس کے بعد ابن عبد البر نے معاصرین کی جماعت کے ایک دوسرے کی نسبت کلام کرنے کا ذکر کیا ہے
اور کہا ہے کہ اسکی طرف التفات نہ کیا جائے، اسی بحث مین یحییٰ بن معین کی جرح کا ذکر آتا ہے جو امام شافعی پر ہے
اور کہا ہے کہ یہ ابن معین کے لیے ناپسندیدہ اور عیب تھا، اسی سلسلے مین یحییٰ بن معین کے متعلق امام احمد بن حنبل کا یہ
قول نقل کیا ہے "ھو لا یعرف الشافعی ولا یعرف بالقول الشافعی ومن جھل شیئاً عاداہ" وہ نہ
شافعی کو جانتے ہین اور نہ شافعی کے کلام کو سمجھتے ہین، اور قاعدہ ہے کہ انسان جو نہین سمجھتا اس کا دشمن ہو جاتا ہے،

آگے جاکر لکھتے ہیں کہ کسی نے ابن المبارک سے کہا کہ فلاں شخص ابوحنیفہ پر اعتراض کرتا ہے، انھوں نے یہ شعر پڑھا،

حسدوان رأوک فضلک اللہ بما فضلت بہ النجباء

لوگوں نے یہ دیکھکر تجھ سے حسد کیا کہ اللہ نے تجھ پر وہ نوازش کی جو شرفا، پر ہوتی ہے،

اور یہ وہ اصول ہے جس پر تمام علما کا اجماع ہے، چنانچہ ان کا قول ہے کہ جرح جب تک مفسر نہ ہو مقبول نہ ہوگی، شیخ الاسلام سید المتاخرین تقی الدین ابن دقیق العید نے اپنی کتاب الاقتراح میں لکھا ہے کہ اعراض المسلمین حفرۃ من حفر النار وقف علی شفیرھا طائفتان من الناس، المحدثون والحکام؛ مسلمانوں کی عزتیں جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہیں جس کے کنارہ پر دو گروہ کھڑے ہوئے ہیں، ایک محدثین دوسرے حکام، ہمارے پاس دو اصول ہیں جنکو ہم پکڑے رہیں گے، جب تک کہ ان کے خلاف قطعی یقین نہ ہوجائے، ایک اصول اس امام مجروح کی عدالت ہے جس کی عظمت قائم ہوچکی ہے، دوسرا اصول جارح کی عدالت جو جرح کرتا ہے، لہذا ایسے امام کی جرح کی جانب توجہ نہ کیجائیگی نہ اس جرح سے وہ مجروح کیا جائے گا، اس قاعدہ کو یاد رکھو کہ بہت ضروری قاعدہ ہے" انتہی طبقات الشافعیہ خلاصۃً۔ جز اوّل (مطبوعہ مصر مطبع الحسینیہ) ص ۱۸۸-۱۸۰،

امام سبکی کے آخر الذکر قاعدے کی تائید امام نووی نے بھی اپنے رسالۂ اصول حدیث التقریب کی نوع الثالث والعشرین میں کی ہے، حافظ ابن صلاح نے لکھا ہے "جکی عدالت اہل نقل یا ان کی امثال اہل علم میں مشہور ہو اس کے ثقہ اور امین ہونے کی تعریف عام ہو تو اس کی عدالت پر کسی کی شہادت کی ضرورت نہیں، یہی مذہب صحیح شافعی کا ہے، اور اسی پر فن اصول فقہ میں اعتماد ہے، ابوبکر خطیب نے یہی قول اہل حدیث کا نقل کیا ہے، اور ایسے بزرگوں کی مثال میں مالک، شعبہ، سفیانین، اوزاعی، لیث، ابن المبارک، وکیع، احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین، وامثالہم کے نام لئے ہیں، صرف ان لوگوں کی عدالت سے سوال کیا جائیگا جنکا حال مخفی ہو، .... رہی جرح وہ صرف ایسی مقبول ہوگی جو مشرح ہو اور طالبین کے لیے اس کا سبب بیان کیا گیا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس میں مختلف الخیال ہیں، کہ کون سی بات جارح ہے اور کونسی نہیں، ان میں سے کوئی کسی ایسی وجہ کی بنیاد پر جرح کردیتا ہے

جس کا وہ معتقد ہوتا ہے، حالانکہ فی الواقع وہ وجہ جرح نہین ہوتی، پس لازم ہے کہ سبب جرح بیان کیا جائے، تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آیا وہ جرح ہے بھی یا نہین، یہ کھلا ہوا اصول فقہ اور اصول فقہ مین مسلم ہے،

خطیب نے کہا ہے کہ یہی مذہب حفاظ حدیث مین اماموں کا ہے، جیسے کہ بخاری و مسلم وغیرہما ہین، اسی لئے بخاری نے ایسی ایک جماعت سے روایت کی ہے جس پر ان سے قبل جرح ہو چکی تھی، مثلاً عکرمہ مولی ابن عباس رضی اللہ عنہما یہی عمل مسلم و ابوداؤد کا ہے، انتہی (مقدمہ ابن صلاح نوع ۲۳)

اصولِ مذکورۂ بالا کی بنیاد پر ائمۂ رجال نے اپنی کتابون مین امام اعظم کے متعلق جرح کو غیر مقبول قرار دیکر اس کا نقل کرنا بالکل متروک کر دیا ہے، چنانچہ ذیل کے مستند ائمۂ رجال کی کتابین اسکی شاہد ہین،

۱۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ مین امام اعظم کے صرف حالات و مناقب لکھے ہین، جرح ایک بھی نہین لکھی، جو مختصر مناقب موضوعِ کتاب کے مطابق لکھ سکے ان کو لکھکر کہتے ہین کہ مین نے امام اعظم کے مناقب مین ایک کتاب جداگانہ لکھی ہے،

۲۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب مین جرح نقل نہین کی، حالات و مناقب لکھنے کے بعد ختم کلام اس دعا پر کیا ہے، مناقب ابی حنیفۃ کثیرۃ جداً فرضی اللہ عنہ و اسکنہ الفردوس آمین ۔" امام ابوحنیفہ کے مناقب بہت کثرت سے ہین، ان کی جزا مین اللہ ان سے راضی ہو اور فردوس مین ان کو مقام بخشے، آمین "

۳۔ امام ممدوح نے تقریب التہذیب مین بھی کوئی جرح نقل نہین کی،

۴۔ حافظ صفی الدین خزرجی نے خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال مین صرف مناقب لکھے ہین، جرح کا ذکر نہین امام صاحب کو امام العراق و فقیہ الامہ کے لقب سے یاد کیا ہے، واضح ہو کہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال کے مطالب چار کتابون کے مطالب ہین، خود خلاصہ، تذہیب امام ذہبی، تہذیب الکمال امام ابوالحجاج المزی، اور الکمال فی اسماء الرجال امام عبدالغنی المقدسی۔ اس طرح یہ مسلک جرح و تعدیل کے چار اماموں کا متفقہ مسلک ہے،

کتاب الکمال کی بابت حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب کے خطبے مین لکھتے ہین: کتاب الکمال فی اسماء الرجال...... من اجل المصنفات فی معرفۃ حملۃ الآثار وضعاً واعظم المعونات فی بصائر ذوی الالباب وقعاً۔ خطبے کے آخر مین مؤلف الکمال کی بابت لکھا ہے، ھو واللہ العدیم النظیر المطلع النحریر۔ تہذیب الاسماء واللغات مین امام نووی نے سات صفحے امام صاحب کے حالات مین لکھے ہین جنکا اکثر حصہ تاریخ خطیب بغدادی سے ماخوذ ہے، صرف مناقب لکھے ہین، جرح کا ایک لفظ نقل نہین کیا، مرآۃ الجنان مین امام یافعی شافعی نے امام صاحب کے حالات مین جرح نہین لکھی، حالانکہ تاریخ خطیب کے حوالے متعدد دیئے ہین، اس سے صاف واضح ہے کہ خطیب کی منقولہ جرح ان کی نظر مین ثابت نہ تھی، فقیہ ابن العماد الحنبلی نے اپنی کتاب شذرات الذہب مین صرف حالات و مناقب لکھے ہین، جرح نقل نہین کی،

خلاصہ۔ مذکورۂ بالا مستند پندرہ کتابون کے، (جنمین سے پانچ اصول حدیث کی ہین اور دس رجال کی) بیان سے صاف واضح ہے کہ جن امامون کی عدالت اور جلالت مرتبہ اہل علم واہل نقل کے نزدیک ثابت ہے ان کے مقابلے مین کوئی جرح مقبول و مسموع نہین، ایسے ائمہ کا جو طبقہ مثالاً پیش کیا گیا ہے وہ امام مالک سے لے کر امام اسحق بن راہویہ تک ممتد ہے، اصول حدیث کے فیصلے کا ماخذ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، حافظ ابن عبدالبر، و شیخ الاسلام ابن دقیق العید کے اقوال ہین، یہ بھی تصریح ہے کہ یہی مذہب و مسلک فن اصول فقہ مین معتمد اور اہل حدیث و حفاظ حدیث کا مقبول عام مذہب ہے، اسی اصول کے اثر سے متاخرین ائمۂ رجال نے امام اعظم کے متعلق جرح کا ذکر اپنی کتابون مین بالکل متروک کر دیا،

غالباً اس قدر بحث نقلی پہلو کے اثبات کے لیے کافی ہے نقلی بحث کے بعد عقلی و مورخانہ بحث ملاحظہ ہو،

ہم اوپر بیان کر چکے ہین کہ امام صاحب کے متعلق خطیب بغدادی نے جس قدر جرحین نقل کی ہین، ان کا مآل کار خود ان کے قول کے مطابق صرف دو پہلو ہین، اصول دین کے متعلق یا فروع کے متعلق، ان جرحون کا وزن و اثر آپ نقلی بحث مین پڑھ چکے ہین، امام صاحب کے جو حالات و واقعات زندگی خطیب نے نقل کئے

ہین ان کی نسبت کسی کی جرح نقل ہی نہین کی، لہذا وہ واقعات و حالات بجاے خود قائم ہین،

کسی تاریخی ہستی کی نسبت راے قائم کرنے کی مضبوط ترین بنیاد اس کے واقعات و حالات ہو سکتے ہین، اسی اصول پر ہم یہان بحث کرتے ہین،

امام صاحب کے جو حالات خطیب نے لکھے ہین، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصرین مین بہت سے اوصاف کے لحاظ سے فائق تھے، سب سے بڑا شرف اُن کی تابعیت تھی، اس کے بعد ان کی وہ عقل و فہم تھی جو قدرت نے ان مین مہمات دین حل کرنے اور نکاتِ شریعت سمجھنے کی ودیعت رکھی تھی، دیکھو خطیب نے انکی "وفور عقل، تیز فہمی و باریک نظری" کے بیان کے لیے جداگانہ باب قائم کیا ہے، علی بن عاصم کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ اگر ابو حنیفہ کی عقل نصف اہل دنیا کی عقل سے تولی جائے تو ادنہی کا پلہ بھاری رہتا۔ خارجہ ابو مصعب ایک ہزار عالمون سے مل کر یہ فیصلہ کرتے ہین کہ ان مین جو تین یا چار عاقل تھے ان مین ایک ابو حنیفہ تھے، یزید بن ہارون بہت سے انسانون کو دیکھنے کے بعد کہتے ہین کہ مین نے ابو حنیفہ سے زیادہ عاقل کوئی نہین پایا، اوپر تم سن چکے کہ امام اعمش نے انکی تیز نظری کا اعتراف کیا تھا، ان کے کاروبار تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا، اس سلسلہ مین ان کی امانت، حوصلہ حسن معاملہ، تدبیر، وغیرہ اوصاف تاجرانہ کی تصدیق واقعات کرتے ہین، "حسن معاملہ" کا باب مستقل خطیب نے قائم کیا ہے، خشیتِ الٰہی ثابت ہے، اپنے زمانہ مین سب سے زیادہ پارسا اور عابد ہونا ان کا مسلم ہے، حسنِ معاشرت، پاکیزہ صحبت، جود و سخاوت، بلند نظری، اولوالعزمی، مخلوق کی ہمدردی و غمخواری، اظہارِ حق مین جرأت، سلطانی عطایا سے بے نیازی، علم و علما کی بے غرضانہ خدمت عظیم، اور اس خدمت کی بدولت اپنے استاد امام وقت حماد بن ابی سلیمان کی نظر مین اولاد سے زیادہ عزیز ہونا، یہ وہ اوصاف ہین جنین کسی نے کلام نہین کیا، انہی اوصاف کے اجتماع نے ان کو معاصرین کے طبقے مین بہت بلند کر دیا تھا، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ وہ محسود الخلائق تھے، اور یہ ان کی محسودیت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ ان کے حالات مین اس کا ذکر نمایان و مستقل ہے، قیس بن الربیع ان کے ذکر مین کہتے ہین، کان ابو حنیفۃ رجلاً ورعاً فقیہا محسوداً

ابوحنیفہ مرو بار سافتیہ و محسود تھے، تم حضرت ابن المبارک کا پڑھا ہوا شعر امام مکی کے بیان مین پڑھ چکے جس مین معترض کے اعتراض کا منشا حسد ظاہر فرمایا ہے، خود امام صاحب نے جو شعر پڑھے تھے وہ شاہد ہین کہ ان کے پاکیزہ قلب مین حاسدین کے حسد کا صدمہ تھا، حسن بن عمارہ کا قول ہے کہ لوگ ابوحنیفہ کی نسبت جو کلام کرتے ہین، ان کا منشا حسد ہے، تفقہ مین ان کی فضیلت مسلم تھی، حضرت عبداللہ بن المبارک نے حسن بن عمارہ کا وہ قول نقل فرمایا ہے، جو وہ امام صاحب کی رکاب تھامے ہوئے کھڑے تھے، اس مین یہ بھی تھا کہ تم سے زیادہ بلیغ کلام فقہ مین کسی نے نہین کہا، امام شافعی کے اقوال اس بارہ مین آپ پڑھ چکے، امام محمد بن حسن کے حالات مین امام احمد بن حنبل کا اعتراف پڑھ چکے، کہ دقت نظر امام محمد سے حاصل کی،

ان اوصاف کا دوگونہ اثر ہوا، امام صاحب کی احکام شرعیہ کی تحقیق اور ان کا اجتہاد معاصرین کی فہم سے بالاتر ثابت ہوا، فہم کی نارسائی باعث ہوئی اختلاف کا، اختلاف نے جرح کا رنگ اختیار کیا، اسی پر مبنی ہے، وہ جرح جو اہل حق نے امام صاحب کے متعلق اصول دین و فروع کی بنیاد پر کی ہے، تم اوپر اصول حدیث کا مسلمہ قاعدہ پڑھ چکے کہ اختلاف اجتہاد جس جرح کا منشا ہو وہ جرح نامقبول ہے، امام احمد بن حنبل نے فیصلہ فرما دیا، ومن جهل شيئاً عاداه ؎

دوسرا اثر حسد کے رنگ مین نمایان ہوا، اصول حدیث نے دوسرا فیصلہ یہ صادر کیا کہ جو جرح حسد کے اثر سے ہو وہ بھی غیر مسموع ہے،

نظر کو بلند تر کیجئے کہ کیا امت مرحومہ کا سواد اعظم (جس کی تعداد کا اندازہ نصف یا دو ثلث اہل اسلام کیا گیا ہے) ایک یہودی زندیق یا مشرک کے تابع ہو گئی اور اپنی دنیا و آخرت کو اس کے دامن سے باندھ دیا، اگر معاذ اللہ ایسا ہوا تو خود اسلام کے اثر پر کلام کرنا ہو گا،

کوئی فہم سلیم جو نارسائی یا حسد سے مکدر نہ ہو کبھی باور نہ کریگی کہ ہزار ہا علمائے ربانی اس ڈیڑھ ہزار برس کے زمانے مین امت مرحومہ مین اس تعلیم کے اثر سے پہلے جو ایک ایسے شخص کے دل و دماغ سے نکلی جس کے

اوصاف جارحین نے بیان کئے ہین، ہمارا قلم بار بار ان کے اعادہ سے تحاشی کرتا ہے، علماء ربانی سے بڑھکر گروہا گروہ اولیائے کرام تعلیم بالا پر عمل کر کے مراتب قرب پر فائز ہوئے، ولایت کے دو بڑے سلسلون چشتی اور نقشبندی کے اکابر مذہب حنفی کے پیرو تھے،

سب سے بالاتر یہ بحث ہے کہ امام محمد سے لیکر علامہ ابن عابدین تک فقہا کی ہزارون کتابین فروع حنفی مین اور امام طحاوی، امام نسفی وغیرہما کی تصانیف عقائد مین حاضر ہین، ان کی بنیاد پر ثابت کیا جائے کہ جو عقائد و مسائل مجروحہ امام صاحب کی جانب منسوب کئے گئے ہین وہ کہان ہین، آج کرڑون حنفی مختلف ممالک مین موجود ہین ان مین سے کوئی خلق قرآن، ارجاء وغیرہ عقائد یا حلت زنا وغیرہ مسائل فروعی کا قائل ہے؟ جواب یہی ہے کہ ایک بھی نہین، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بنیاد جرح یا غلط فہمی ہے یا حسد اور ان دونون بنیادون پر جو عمارت قائم ہوگی ظاہر ہے وہ قائم و دیرپا نہین رہ سکتی تھی، چنانچہ یہی ہوا، سوء فہم اور حسد کے غبار کے چھٹ جانے کے بعد اصول حدیث و علم رجال دونون نے بالاتفاق ان جرحون کے بے اصل اور غیر مقبول ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا،

موقع ہے کہ اس سلسلے مین فقہ حنفی کی تاریخی حقیقت سے بھی بحث کیجائے، آپنے اوپر خلف بن ایوب کا قول پڑھا کہ اللہ تعالیٰ سے علم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا، حضرت سید المرسلین سے صحابۂ کرام کو، صحابۂ کرام سے تابعین کو، تابعین سے امام ابوحنیفہ کو،

حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین من رب العالمین مین اس کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے، اس کے مطالب خلاصۃً لکھے جاتے ہین،

"علمائے امت دو قسم مین منحصر ہین، ایک حفاظ حدیث . . . . جنھون نے دین کے خزانون کی حفاظت کی اور اس کے چشمون کو تکدر و تغیر سے پاک صاف رکھا، انھی کی کوششون کا اثر تھا کہ جن لوگون کی طرف اللہ پاک کی جانب سے بہتری بڑھی وہ پاک چشمون پر وارد ہوئے . . . . . . دوسری قسم فقہائے اسلام ہین جنکے اقوال پر مخلوق مین فتوی کا دار مدار ہے، یہ گروہ استنباط احکام کے ساتھ مخصوص ہے، انھون نے قواعد

حلال وحرام کے انضباط کا اہتمام کیا وہ زمین پر آسمانوں کے تارون کی مثال ہین کہ ان کی وجہ سے تاریکی مین بھٹکنے والے ہدایت پاتے ہین، کھانے پینے سے بھی زیادہ انسان اُن کے محتاج ہین، اور اُن کی اطاعت نص کے روسے ماں باپ سے بھی زیادہ فرض ہے، ایک روایت مین اولی الامر سے مراد علما ہین دوسری مین امرا، سب سے اول سید المرسلین نے تبلیغ کے منصب شریف کو ادا کیا، آپ کے بعد صحابہ نے، اس بارہ مین بعض صحابہ مکثر تھے بعض متوسط، بعض مقل صحابہ مین سے جن کے فتوی محفوظ ہین وہ ایک سو کچھ اوپر تیس تھے، ان مین مرد اور بی بی دونون شامل ہین، انہین سے جن کے فتوے کثیر ہین وہ (حضرات) عمرؓ بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عائشہ ام المومنین، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباسؓ، اور عبداللہ بن عمر ہین، ان مین سے ہر ایک کے فتوون سے ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے،

مسروق کا قول ہے کہ مین صحابہ کی صحبت مین رہا، ان کا علم چھ کو پہنچا، علی، عبداللہ، عمر، زید بن ثابت، ابو الدرداؓ، اُبی ابن کعب (رضی اللہ عنہم اجمعین) ان چھ کا علم دو کو پہنچا، علی وعبداللہ[1]،

یہ بھی مسروق کا قول ہے کہ صحابہ کی مثال پانی کے تالابون کی ہے، ایک ایسا تالاب ہے جس سے ایک سوار سیراب ہو، ایک ایسا جس سے دو سوار سیراب ہون، ایک ایسا جس سے روے زمین کے آدمی سیراب ہو جائین عبداللہ (ابن مسعود) انھی مین سے ہین، جن چار سے قرآن حاصل کرنے کا ارشاد نبوی ہوا ان مین ابن ام عبد کا نام اوّل لیا، اعمش نے ابراہیم سے یہ روایت نقل کی ہے، کہ جب کسی معاملے مین (حضرت) عمرؓ وعبداللہ جمع ہو جاتے تھے تو وہ اونکی برابر کسی کو نہ سمجھتے تھے، اگر دونون مین اختلاف ہوتا تو عبداللہ کے قول کو زیادہ پسند کرتے، اس لئے کہ وہ زیادہ باریک بین تھے، لانہ کان الطف،

ابن مسعودؓ کے متعلق (حضرت عمر کا) قول ہے، کنیف مُلاء علما۔ علم سے بھرا ہوا ایک تھیلا ہے،

ابو موسیٰ کا قول ہے کہ عبداللہ کی ایک مجلس مین بیٹھنا ایک سال کے عمل سے زیادہ میرے نفس مین تاثیر کرتا ہے،

---

[1] امام نووی التقریب اصول حدیث مین لکھتے ہین، صحابہ کا علم چھ پر منتہی ہوا، عمرؓ، علیؓ، اُبی۔ زید بن ثابت، ابو الدرداؓ، ابن مسعودؓ، اس کے بعد ان چھ کا علم علی وعبداللہ پر منتہی ہوا، (دیکھو التقریب النوع ۲۳)

...... علی بن ابی طالب علیہ السلام کے احکام وفتاوی پہلے مگر ان شیعون کو.... کرے انھون نے ان کا بہت سا علم ان پر جھوٹ باندھکر فاسد کردیا، اس لیے صحیح روایتون مین ان کی وہی حدیث یا فتوی معتبر خیال کرتے ہین جو اہلبیت یا اصحاب عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ سے پہنچا ہے، خود حضرت کو اس کا شکوہ تھا کہ اُن کے علم کے حامل نہین، کما قال ان ھھنا علما لو اصبت لہ الحملۃ، یہان بڑا علم ہے اگر لینے والے اس تک پہنچین [1]، محمد بن جریر طبری کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ کے اصحاب مین سے ایک بھی ایسا نہ ہوا جس نے ان کے فتاوی اور مذاہب فی الفقہ لکھے ہون سوائے ابن مسعود کے، وہ اپنا قول اور مذہب قول عمرؓ کے مقابلے مین ترک کر دیتے تھے، ان کی مخالفت کسی مسئلے مین نہین کرتے تھے، دین اور مذہب امت مین اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ، اصحاب زید بن ثابت، اصحاب عبداللہ بن عمرؓ اور اصحاب عبداللہ بن عباسؓ سے پھیلا، انہی چار کے اصحاب سے سارے آدمیون کو علم پہنچا ہے، صحابہ کے بعد انکے تلامذہ..... کوفہ مین علقمہ بن قیس النخعی، اسود، عمرو بن شرحبیل، مسروق الہمدانی، قاضی شریح... تھے، یہ سب کے سب اصحاب علیؓ وعبداللہ بن مسعودؓ ہین، اور اکابر تابعین سے ہین، اکابر صحابہ کی موجودگی مین فتوی دیتے تھے اور وہ اسکو جائز رکھتے تھے،

اس طبقے کے بعد ابراہیم نخعی، عامر الشعبی وسعید بن جبیر.... ہوئے، ان کے بعد حماد بن ابی سلیمان، سلیمان المعتمر، سلیمان الاعمش اور مسعر بن کدام، ان کے بعد محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی...... سفیان ثوری، ابو حنیفہ ہوئے..... ان کے بعد حفص بن غیاث، وکیع بن الجراح اور اصحاب ابو حنیفہ مثل ابو یوسف القاضی، زفر بن ہذیل، حماد بن ابو حنیفہ، حسن بن زیاد القاضی اور محمد بن حسن قاضی رقہ ہوئے" (انتہی اعلام الموقعین خلاصۃً)

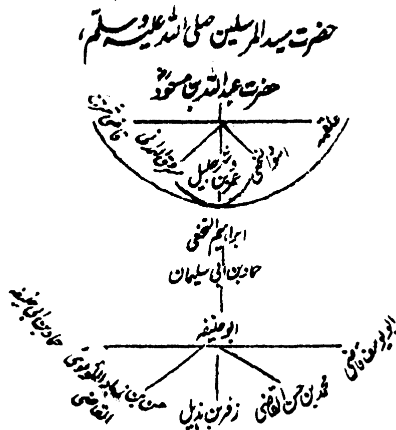
شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے بھی حجۃ اللہ البالغہ مین یہ بحث لکھی ہے، حافظ ابن قیم اور شاہ صاحب کی بحث مین تفصیل اور اجمال کا فرق ہے،

---

[1] اس قول کی تائید امام مسلم نے مقدمۂ صحیح مسلم مین کی ہے، لکھا ہے کہ المغیرہ ان روایتون مین سے جو حضرت علیؓ سے کیجاتین صرف وہ روایت قبول کرتے جو اصحاب عبداللہ بن مسعود کی سند سے ہوتی، یہ بھی لکھا ہے کہ اصحاب علی نے ان کا علم فاسد کر دیا

(دیکھو مقدمہ صحیح مسلم حاشیہ قسطلانی ج ا صفحہ ۱۱۲)

اقوالِ بالا کی بنیاد پر فقہ حنفی کا سلسلہ حسب ذیل بصورت شجرہ قائم کیا جا سکتا ہے،



فقہ حنفی پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ رجالِ فقہ موصوف کے حالات مختصراً بیان کر دیئے جائیں جن سے ان حضرات کا مرتبہ علمی و عملی معلوم ہو سکے،

یہ آپ معلوم کر چکے ہیں کہ فقہ کے مرجع کل آنحضرتؐ کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ[1] کنیت ابو عبدالرحمن، قدیم الاسلام، اُن سے پہلے صرف پانچ حضرات اسلام لا چکے تھے اسلام لانے کے وقت عمر کا تخمینہ بیس سال کے قریب ہوتا ہے، مشرف باسلام ہونے کے وقت ہی تعلیم قرآن کی التجا پیش کی ارشاد ہوا انک لغلام معلم، بے شک و شبہہ تم نوجوان معلم ہو، ستر سورتیں خود ذات اقدس سے حفظ کیں، پہلے شخص ہیں جنھوں نے آنحضرتؐ کی طرف سے کفار قریش کو قرآن مجید (سورۃ الرحمن) حرم میں سنایا، سخت زحمت اٹھائی، کفار منہ پر ضربیں مارتے تھے اور یہ سورۃ الرحمن سنائے جاتے تھے، کسی نے اس تکلیف پر اظہار افسوس کیا تو فرمایا کہو تو پھر سنا دوں اب کفار سے زیادہ کوئی میری نظر میں ناچیز نہیں، یہ گویا پہلا سبق معلمی کا تھا،

اسلام سے مشرف ہونے کے بعد بھی حضرت سرورِ عالمؐ نے انکو اپنی خدمت سے مخصوص کر لیا تھا، اذن عام تھا کہ پردہ اٹھا کر خدمت میں چلے آئیں، راز کی باتیں بھی سنیں، مگر چپ کہ روک دیئے جائیں، باہر تشریف آوری کے

[1] ان حالات کا ماخذ، طبقات ابن سعد، تاریخ الخطیب، اسد الغابہ، الاستیعاب، الاصابہ، اعلام الموقعین، اور نزہۃ الابرار فی الاسامی والاخبار میں، شیروانی،

وقت نعلین مبارک پہناتے، عصا لیکر داہین جانب آگے چلتے، مجلس کے قریب پہنچکر نعلین مبارک اتار کر بغل مین
رکھ لیتے، عصا پیش کرتے، مراجعت کے وقت بھی یہی عمل ہوتا، واپسی پر اول حجرہ مین داخل ہوتے، وضو کے وقت
مسواک پیش کرتے صحابۂ کرام مین صاحب النعلین والسواک والسواد اُن کا لقب تھا، یعنی نعلین مبارک، مسواک
اور راز کے محافظ، سفر مین بستر مبارک، طہارت کا پانی، مسواک، نعلین مبارک ان کی تحویل مین رہتین، حضرت
ابو موسیٰ اشعریؓ جب یمن سے مدینہ طیبہ پہنچے ہین، تو کثرت باریابی دیکھکر حضرت ابن مسعودؓ اور ان کی والدہ کو اہلبیت
سمجھے، دو بار ہجرت کی، ایک بار حبشہ کو، دوبارہ مدینہ منورہ کو، تمام غزوون مین شریک ہوے، بدر مین ابوجہل
کا سر خود اس کی تلوار سے کاٹا، جو صلے مین عطا ہوئی، ضعیف الجثہ تھے، ایک موقعہ پر ان کی باریک پنڈلیان
دیکھکر صحابۂ کرام ہنس پڑے، تو آپ نے فرمایا عبد اللہ قیامت کے دن میزان مین احد سے بھی زیادہ بھاری
ہونگے، دوسری روایت مین ہے کہ عبد اللہ کا ایک پانون اُحد سے زیادہ بھاری ہوگا، جنت کی بشارت پائی
۳۲ھ مین مدینہ منورہ مین وفات پائی، حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، بقیع مین دفن ہوئے
حضرت ابو درداءؓ نے خبر وفات سنکر کہا، ما ترک خلفہ مثلہ اپنا مثل نہین چھوڑ گئے، عمر کچھ اوپر ساٹھ برس کی ہوئی
لباس عمدہ سپید پہنتے تھے، عطر بہت لگاتے، رات مین عطر کی خوشبو سے پہچان لئے جاتے، دولتمند تھے،
نوّے ہزار درہم ترکے مین چھوڑے، بیس ہزار درہم خزانۂ خلافت مین جمع تھے، وہ بھی ورثا کو ملے،
حضرت سرور عالم اُن سے قرآن مجید پڑھوا کر سنتے تھے، حیات مبارک کے سال آخر مین جب حضرت
جبرئیل نے رمضان مین دوبار کلام مجید آپ کو سنایا تو یہ بھی حاضر تھے، اسطرح اخیر نسخ و تبدیل سے آگاہی کا موقع
ملا۔ ارشاد نبوی ہے، کہ جس کو یہ محبوب ہو کہ قرآن اسی طراوت و تازگی سے پڑھے جیسا کہ وہ نازل ہوا ہے تو اسکو
چاہئے کہ ابن ام عبد کی قرأت سے پڑھے، ارشاد ہے وتمسکوا بعہد ابن ام عبد، ابن مسعودؓ کی ہدایت
اور حکم کو مضبوط پکڑے رہو، جن چار صاحبون سے قرآن سیکھنے کا حکم فرمایا گیا ان مین اول ان کا نام لیا، باقی تین
صاحب یہ ہین، (حضرت) معاذ بن جبلؓ، اُبی بن کعبؓ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ، حافظ قرآن تھے صحابۂ کرام مین

ان کا اقرب الی اللہ وسیلہ ہوتا، اور اقربہم زلفی (سب سے زیادہ اللہ سے قریب) ہونا مسلم تھا ہیئت ظاہری، سیرت اور طریقے میں اور شان و وقار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ تھے، اسیطرح علقمہ حضرت ابن مسعودؓ سے مشابہ تھے

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں حضرت عمارؓ بن یاسر کو امیر کوفہ اور ان کو وزیر و معلم بنا کر بھیجا۔ اہل کوفہ کو اس موقع پر لکھا، میں ان دو صاحبوں کو بھیجتا ہوں جو نجباء صحابہ سے ہیں، اور اہل بدر سے ہیں ان کی اقتدا اور اطاعت کرو اور حکم مانو، عبد اللہ بن مسعودؓ کو میں نے قسم ہے رب کی اپنے اوپر ایثار کر کے تمہارے پاس بھیجا ہے، ان کی نسبت حضرت عمرؓ کا قول ہے، کُنیف ملاء علماً۔ ایک تھیلا ہیں علم سے بھرے ہوئے یہ قول تین بار مکرر فرمایا، حضرت علیؓ کا قول ہے "قرأ القرآن فاحل حلاله وحرم حرامه فقيه الدين عالم السنة"۔ ابن مسعود نے قرآن پڑھکر جو اس میں حلال تھا اس کو حلال کیا اور جو حرام تھا اسکو حرام دین کے فقیہ ہیں، سنت کے عالم، امام شعبی کا قول ہے، ماكان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم افقه من صاحبنا عبد الله بن مسعود، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمارے استاد عبد اللہ بن مسعودؓ سے بڑھکر کوئی فقیہ نہ تھا،

روایت حدیث بہت کم کرتے تھے، الفاظ حدیث میں سخت احتیاط کرتے تھے جس وقت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے نکلتا کانپ اٹھتے، فرماتے تھے ليس العلم بكثرة الرواية ولكن العلم الخشية، علم کثرت روایت کو نہیں کہتے بلکہ علم خدا سے ڈرنے کو کہتے ہیں، عمرو بن میمون کا قول ہے کہ میں ایک برس عبد اللہ بن مسعود کے پاس رہا، ایک دن بھی انھوں نے رسول اللہ کی حدیث روایت نہیں کی، نہ یہ کہا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، صرف ایک بار حدیث بیان کی اور ان کی زبان پر لفظ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم جاری ہوا، بیقرار ہوگئے، میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا، الفاظ بالا لکھکر یہ الفاظ کہے، انشاء اللہ اما فوق ذاك واما قريب من ذاك او دون ذاك انشاء اللہ یا اس سے بڑھکر یا اس کے قریب یا اس سے کم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے حدیث سنی، حضرات ابن عباسؓ، ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ نے منجملہ دیگر صحابہ کے ان سے حدیث سنی، تابعین میں علقمہ، اسود، مسروق، ابو وائل شقیق، شریح وغیرہم نے

حالات بالا پر ایک نظر | حضرت ابن مسعودؓ کے حسب ذیل اوصاف نمایان ہین، قدیم الاسلام ہونا، ابتدا سے انتہا تک ذات اقدس سے قرب تام اور شرفِ خدمت معتمد و محرم اسرار ہونا، وفورِ علم وشانِ معلمی و خوبیِ تعلیم، حافظ و اعلم بکتاب اللہ ہونا، علم وفقہ وسنت مین فوقیت اور تفقہ مین باریک نظری، قرب الہٰی و وسیلہ الی اللہ ہونے مین امتیاز، ہیئت ظاہری، سیرت اور طریقے مین اور شان ووقار مین سب سے زیادہ آپ سے مشابہ ہونا، آنحضرتؐ کا ارشاد، تمسکوا بعھد ابن ام عبد ابن مسعود کی ہدایت اور حکم کو مضبوط پکڑے رہو، حضرت عمرؓ کا ان کے علم وتفقہ پر اعتماد کلی، اہل کوفہ کو ان کی اقتدا اطاعت اور ان کے حکم ماننے کا امر، حضرت علیؓ کی ان کے علم کتاب وفقہ وسنت کی توثیق، فقہ مین باریک نظری، روایت حدیث کی تقلیل اور حفاظتِ الفاظ مین احتیاط،

یہ تم سُن چکے کہ تمام صحابۂ کرام کے علم کے حامل چھ حضرات تھے، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین، یہ بھی سُن چکے ہو کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا علم حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے شاگردون کے پاس رہا، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ان سے حدیث سنی، مسروق کا قول پڑھ چکے کہ چھ کا علم دو کو پہنچا، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کو، یہ بھی سُن چکے کہ حضرت علیؓ کا علم وہی محفوظ رہا جو اہل بیتِ اطہار کے سینون مین رہا یا حضرت ابن مسعودؓ کے، نتیجہ ظاہر ہے کہ علم صحابہ کے مرجع اخیر اور خزینہ دار حضرت ابن مسعودؓ تھے، رضی اللہ عنہ،

اس خلاصۂ حالات سے حضرت ابن مسعودؓ کے وجود کی عظمت علم وتعلیم کی جلالت ثابت ہوتی ہے، اسی کا اثر تھا جو خطیب نے لکھا ہے کہ فبث عبد اللہ فیھم علما کثیرا وفقہ منھم جما غفیرا، عبد اللہ نے اہل کوفہ مین علم بکثرت پھیلایا، اور گروہ کثیر کو فقیہ بنا دیا، حضرت ابن مسعودؓ کے شاگردون کی بابتہ حافظ ابن قیمؒ کا قول پڑھ چکے کہ اکابر تابعین سے تھے، اور اکابر صحابہ کی موجودگی مین فتوی دیتے تھے، جس کو وہ حضرات جائز رکھتے،

علقمہ بن قیس | نخعی ہین، التابعی الکبیر الجلیل الفقیہ البارع، بڑی شان کے جلیل القدر تابعی فقیہ عقل و دانش مین فائق، کان من الربانیین، علماے ربانی مین سے تھے، اجمعوا علی جلالتہ وعظم محلہ

و وفور علمہ وجمیل طریقتہ، ان کی جلالتِ شان، عالی قدری اور خوبیِ طریقہ پر اجماع ہے، ابراہیم النخعی کا قول ہے، کان علقمۃ یشبہ بابن مسعود، علقمہ ابن مسعود سے مشابہ تھے (تہذیب الاسما نووی)

دیکھو عہد اسلام کی سیر حاصلی، ان کے دو بھتیجے، اسود اور عبد الرحمٰن بلند مرتبہ تابعی ہین، اور ایک نواسہ ابراہیم نخعی، ایک گھر مین چار عالی قدر تابعی!

مسروق الھمدانی | اتفقوا علی جلالتہ وتوثیقہ وامامتہ، ان کی جلالت، امامت اور ثقہ ہونے پر اجماع ہے، حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھی، حضرت عمرؓ وحضرت علیؓ سے ملاقات کی، امام شعبی کے استاد ہین (" " ")

اسود النخعی | تابعی فقیہ امام صالح، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کو دیکھا، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ وغیرہم سے روایت کی، اتفقوا علی توثیقہ وجلالتہ۔ ان کے ثقہ ہونے اور جلالت پر اتفاق ہے، اسی حج اور عمرے علحدہ علحدہ کئے، (" " ")

عمرو بن شرحبیل | الھمدانی، امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اُن سے روایت کی، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے روایت کی، (خلاصہ تذہیب) ثقۃ عابد تھے (تقریب التہذیب)

شریح القاضی | زمانۂ نبوت پایا، حضوری سے مشرف نہ ہوئے، حضرت عمرؓ نے ان کو قاضی کوفہ مقرر کیا، وہان ساٹھ برس تک قاضی رہے، حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا انت اقضی العرب تم عربون مین قضا مین فائق ہو، ان کی روایتون کے حجت ہونے اور اُن کے ثقہ ہونے اور دین وفضل پر اور ذکاوت پر اتفاق ہے، نیز ان کے سب سے زیادہ عالم قضا ہونے پر (تہذیب الاسما)

ابراہیم النخعی | تابعی جلیل القدر، حضرت عائشہؓ کی خدمت مین باریاب ہوئے، ان کے ثقہ ہونے، جلالت شان اور فقہ مین فائق ہونے پر اتفاق ہے، شعبی نے اُن کی وفات کے وقت فرمایا ما ترک احدًا اعلم منہ وافقہ، انھون نے اپنے آپ سے زیادہ عالم اور فقیہ نہین چھوڑا، اعمش کا قول ہے، کان النخعی صیرفی الحدیث، نخعی حدیث کے نقاد تھے، (" " ")

حماد بن ابی سلیمان، اشعری کوفی ہین، ابو اسمٰعیل کنیت، حضرت انس اور ابن المسیب اور ابراہیم سے روایت کی ہے، ان سے . . . . ابو حنیفہ اور شعبہ نے، ثقہ امام مجتہد سخی وجواد تھے، ابو اسحٰق کا قول ہے کہ وہ شعبی سے فقہ مین فائق تھے، (الکاشف للذہبی)

فقہ حنفی پر ایک نظر،

(۱) بیان بالا سے واضح ہو چکا کہ جس علم صحابۂ کرام کے مرجع آخر و خزینہ دار حضرت ابن مسعودؓ تھے، وہ تابعین کبار کو پہنچا، ان سے ابراہیم نخعی کو، ان سے حماد بن ابی سلیمان کو، ان سے امام ابو حنیفہ کو، ان سے ابو یوسف و محمد بن حسن وغیرہما تلامذہ کو، یہی وہ علم تھا جس کی تدوین و ترویج کا اہتمام اکابر صحابۂ کرام نے اہتمام کتاب اللہ کے بعد اس زمانے مین کیا جبکہ روایت حدیث قلیل تھی، بلکہ روکی جاتی تھی، خلفائے راشدین کا دور اسی کے اہتمام مین صرف ہوگیا، امام اعظم اور انکے تلامذہ کی کوششون نے اس علم دین کو مدون و مرتب کرکے ایک ایسا آئین شریعت ملک و ملت کے سامنے رکھدیا جو حق و ہدایت کی قوت سے دنیاے اسلام کی عبادات و معاملات کی ضرورتون اور حاجتون کو روا کرتے اور دنیاے اسلام مین پھیلنے کے لیے تیار اور آمادہ تھا، اس علم کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ چار پشت تک تابعین کے سینون مین رہنے کے بعد امت کو ملا، اس کا نتیجہ بدیہی یہ ہے کہ امام اعظم کا علم صحابۂ کرام کے علم کا مجموعہ ہے اور وہ فقہ حنفی ہی ہے،

(۲) مذہب اسلام روئے زمین کے انسانون کے لیے آخری دین الٰہی ہے، اس کا اعلان ہے کہ اللہ اور اس کے رسول غالب رہین گے، یہ بھی اس کا اعلان ہے کہ وہ تمام ادیان پر حق وہدایت کی قوت سے غالب رہیگا، اور یہ بھی کہ حزب اللہ کا طرۂ امتیاز غلبہ ہے،

اسلام کے فرق باطلہ کے باطل ہونے کی بڑی دلیل اسمین ہے کہ وہ کبھی دیرپا غلبہ روئے زمین پر نپا سکے، ان کا کارنامہ یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح انھون نے اپنے وجود کو قائم رکھا، مثال کے لیے دیکھو فرقۂ باطنیہ کی تاریخ،

مذاہب حقہ مین سب سے زیادہ غلبہ مذہب حنفی کو ابتدا سے آج تک حاصل رہا ہے، مورخین و محدثین اس کے شیوع کو زمین پر چھاجانے سے تعبیر کرتے ہین، امام سفیان بن عیینہ کا قول تمنے پڑھا ہے کہ ابو حنیفہ کی رائے آفاق مین پہنچ گئی، وقد بلغ الآفاق، خطیب نے امام ابو یوسف کے حالات مین لکھا ہے، وبث علم ابی حنیفۃ فی اقطار الارض

انھون نے ابوحنیفہ کا علم زمین کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارے تک پہنچادیا،

تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ شیخ طاہر پٹنی صاحب مجمع البحار نے المغنی مین فقہ حنفی کا وصف سارے آفاق مین پھیلنا اور روئے زمین کو ڈھک لینا لکھا ہے، ان کے الفاظ ہین۔" العلم المنتشر فی الآفاق وعلم طبق کالارض "

یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مذہب و فقہ حنفی مین اللہ تعالیٰ کا سرِخفی نہ ہوتا تو نصف یا اس کے قریب اسلام اُس کے تقلید کے جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہوجاتا، ملا علی قاری نے دو ثلث اہل اسلام کا گیارہوین صدی ہجری مین حنفی ہونا لکھا ہے،

اس کی قوتِ ظہور اور خوبیِ تدوین و کمالِ ترتیب کا اندازہ اس سے کرو کہ امام اعظم کی وفات کے ٹھیک ۱۶ سولہ برس بعد خلیفۂ بغداد ہادی کے عہد مین امام ابویوسف ۱۶۶ھ مین قاضی مقرر ہوتے ہین، وہ قوت ان کے علم مین ہو کہ عہدِ اسلام مین اول مرتبہ قاضی القضاۃ کی طیلسان ان کے وجود پر راست آتی ہے، اور فقہ حنفی روئے زمین پر کارفرما بنجاتی ہے، ہارون الرشید کی خلافت کے شایان قاضی القضاۃ اول امام ابویوسف ہی ٹھہرے، خلافت عباسیہ کے بعد جتنی ایسی قوتین برسرکار آئین جنکی قوت اور غلبہ کو بین الاقوام اور بین الممالک مرتبہ حاصل ہوا وہ قریبًا سب کے سب حنفی تھین، مثلاً آل سلجوق، آل عثمان، عالمگیری ہندوستان بجائے خود ایک بڑا علم تھا، یاد تازہ کرو حافظ ابن قیم کے اس بیان کی کہ مسروق کا قول ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کا علم وہ خلیج ہے کہ اگر اس پر روئے زمین کے تشنہ کام وارد ہوجائین تو سیراب ہوسکین، ملاؤ اس کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی کا کشف کہ نظر کشفی مین دوسرے مذاہب حیاض و جداول کی شکل مین منکشف ہوتے ہین، مذہب حنفی بشکل دریاے زخار جو عرش سے گر رہا ہے، دوسرے مذاہب حقہ عمومًا یا ملک سے مخصوص رہے یا نسل سے، بین الاقوامی مرتبہ کمتر پا سکے،

اسلام کی قوت و حقانیت کی کھلی ہوئی دلیل اس مین ہے کہ اس کے احکام مین مختلف ممالک و مختلف نسلہاے انسانی کی ضرورتون کا لحاظ پایا جاتا ہے، اور ان کے حامل مذاہب حقہ ہین، اگر کبھی یہ بحث لکھی جائے کہ مذاہب اربعہ مختلف ممالک اور مختلف نسلون مین کس مناسبت سے پھیلے تو علم نفسیات کا دلچسپ باب ہوگا،

دیکھو تابعین و تبع تابعین کے دور مین ہزارون نہین تو سینکڑون صاحبِ مذہب امام و مجتہد تھے جنکے

مذاہب پھیلے، اور مضمحل ہو گئے، بالآخر متبوع چار ہی رہے،

ان مین بھی جو شیوع وغلبہ مذہب حنفی کو رہا ظاہر ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مین غلبہ وظہور کی جو قوت و برق حق وہدی کی مدد سے تھی اس کا وافر حصہ مذہب حنفی مین ودیعت تھا، اور یہی وہ خفی سرّ الٰہی ہو جس کو شیخ طاہر پٹنی مذہب حنفی کی کامیابی وغلبہ کا سبب بتاتے ہین، ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، عام طور پر مذہب حنفی اور مذہب مالکی کی کامیابی کا سہرا امام ابو یوسف اور امام یحییٰ بن یحییٰ المصمودی کے سر باندھا جاتا ہے کہ ان کا وجود نہ ہوتا تو شیوع حاصل نہ ہوتا، یہ صحیح ہے کہ یہ دونون امام ان دونون مذہبون کے شیوع ورواج کا زبردست ذریعہ بنے، لیکن یہ صحیح نہین کہ ان کے شیوع اور ترویج کی علت تامہ وہ دونون ہین، اس پر غور کرنا چاہئے کہ تعلیم سے شاگرد پیدا ہوتے ہین، تصانیف پیدا ہوتی ہین نہ یہ کہ استاد کی تعلیم کی خوبی شاگرد پیدا کرتا ہے، شخصی کوششون سے فروغ ورواج تعلیم ضرور ہوتا ہے مگر عالمگیر غلبہ وظہور جو صدیون تک قائم وباقی رہے وہ خود اس تعلیم کی اندرونی قوت واثر ہی سے ہو سکتا ہے، بالآخر کامل شاگردون کا وجود بھی تو قوت وخوبی تعلیم کا منت کش ہے، امام ابو یوسف اور امام یحییٰ بھی مذہب حنفی ومالکی کی قوت کا ثبوت ہین[1]۔

نتیجۂ واقعات بالا یہ ہے کہ محدثین کرام کی شہادت وتوثیق کے بموجب امام ابو حنیفہ کا علم حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا علم تھا جو تیئیس برس کی ضمنیت تام اور قرب خاص مین مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست حاصل کیا گیا، اور جو بالآخر تمام صحابۂ کرام کے علم کا مجموعہ بنا، اور چار پشت تک تابعین کبار وکرام کے سینون سے گذر کر امام اعظم کے تلامذۂ رشید کو پہنچا اور انھون نے عالم اسلام کو پہنچایا، اور جو آخر تک فقہاے عظام کی کوششون سے ایک عالم کے واسطے سرمایۂ اعمال حسنہ بنا ہوا ہے، اور چونکہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اقرب الی اللہ وسیلۃً تھے لہذا خالق اکبر جل جلالہ کی بارگاہ مین اس کے عاجز بندون کے لے وسیلۂ عظمیٰ ہو، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک،

(باقی)

[1] خاکسار اس حصۂ مضمون وحصہ جرح کی نگارش مین مفتی سید عبد اللطیف صاحب استاد جامعہ عثمانیہ کے مشورہ کا دل سے ممنون ہے اگر وہ مشورہ نہ ہوتا تو حق یہ ہے کہ حق بحث اس جامعیت سے ادا نہ ہوتا، شروانی،

جلد ۳۲ | ماہ رجب المرجب ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۳ء | عدد ۵

مضامین

شذرات

ناظرین یہ سنکر خوش ہونگے کہ اعلیحضرت فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کی سرکارِ عالی مقدار نے دار المصنفین کو یہ اعزاز بخشا ہو کہ اسکو اپنی ضرورت کے لیے فقہ حنفی کے رو سے ایک ضابطۂ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین کا حکم دیا ہو، چنانچہ حکم والا کی تعمیل کیگئی، اور سابق دولت عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح، یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مستند کتب فقہ حنفی کے حوالون سے مرتب کیا گیا ہو، اب عنقریب اُسکا مسودہ صاف ہوکر سرکار عالی کے ملاحظہ مین پیش ہوگا، اور اس کے بعد شاید منتخب مجلس علمار کے سپرد ہو، کہ وہ اس پر نظر ثانی کرے،

اعلیحضرت نادر خان شاہ افغانستان کے عہد مین جو تعلیمی و علمی ترقیان افغانستان مین روز افزون ہیں، اب ان کی ترتیب و تنظیم کی تجویز زیر غور ہے، اور ایک کابل یونیورسٹی کی تکمیل عمل مین آرہی ہو، اور ساتھ ہی تراجم و تالیفات کے دائرے بھی وجود مین آرہے ہین، اور غالباً انھین امور مین مشورہ کی غرض سے ہندوستان سے چند اصحاب کو دار السلطنت آنے کی دعوت افغانستان کی حکومت کی طرف سے دی گئی ہے،

یہ تعلیمی و علمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اور اڈیٹر معارف کو موصول ہوئی ہو، خدا کرے کہ اس علمی وفد سے اس دولت خدا داد کی جسکا خدا داد ہونا کئی دفعہ تاریخ مین ثابت ہوچکا ہے، کوئی مفید خدمت انجام پاسکے، اور جس طرح اس کا ملک خدا داد ہے اسکا علم و تمدن بھی خدا داد ثابت ہوسکے،

یہ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کی بعض اہم تصنیفات اس وقت شائع ہوئین، جب وہ ہندوستان سے باہر تھا،

سیرۃ عائشہؓ جب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تو لندن میں تھا، سیرۃ النبی کی دوسری جلد جب شائع ہوئی، تب بھی لندن میں تھا، چنانچہ اس کا مقدمہ بھی وہیں بیٹھکر لکھا گیا ہے، سیرۃ النبی کی تیسری جلد جب چھپی ہے تو مؤلف سلطان ابن سعود اور شریف علی کے محاذ جنگ جدہ میں تھا، اور اسکا مقدمہ وہیں سے لکھکر ہندوستان بھیجا گیا، اب جب خیام کی اشاعت کی باری آرہی ہے تو پھر جلا وطنی کے سامان ہیں، کیا حسنِ اتفاق کے سوا ان دو واقعوں میں کوئی منطقی ربط و لزوم بھی ہے؟



آجکل بعض جماعتوں نے مسئلہ قضا کی تحریک و اشاعت کی کوششیں ازسرِ نو شروع کی ہیں، یہ حسنِ اقدام مبارک ہے، لیکن اس سے پہلے کہ اس کیلئے قدم اٹھایا جائے ضرورت اسکی ہے کہ مسلمان مجالس اور انجمنوں کے اتحاد و تعاون کی طرف قدم اٹھایا جائے، حکومت صرف قومی قوت کو مانتی ہے، اور قوم میں قوت صرف اتحاد سے پیدا ہوسکتی ہے، ڈر ہے کہ اتنی اہم اور ضروری تحریک بھی ہمارے اختلافاتِ باہمی کے نذر ہوجائے،



جہانتک اس تحریک کی تاریخ کا تعلق ہے، یہ سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں معارف کے صفحات میں مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے وقت پیش کیگئی اور اسکے بعد جمعیۃ العلماء کے خطبۂ صدارت کلکتہ اور جمعیۃ العلماء کی تجاویز اور معارف کے شذرات میں بار بار پیش کیجاتی رہی، یو پی گورنمنٹ نے ۱۹۲۱ء میں (سرجسٹس سلیمان کی صدارت میں بعض مسلمان ارکان کونسل اور بعض علماء کی مجلس اس غرض سے قائم کی تھی کہ نکاح و طلاق کے درج رجسٹر ہونے کے امکان پر غور کیا جائے اس مجلس نے متعدد نشستوں میں اس کام کو انجام دیا، اور صوبہ کے اکثر ممتاز علماء اور معززین کی شہادتیں قلمبند کیگئیں، اس کمیٹی کے ایک ممبر ڈاکٹر شفاعت احمد خان بھی تھے، علماء میں مولنا کفایت اللہ صاحب، مولنا قطب الدین عبدالوالی صاحب، مولنا نعیم الدین صاحب مرادآبادی اور یہ خاکسار اور بعض دوسرے اصحاب بھی تھے، اس سلسلہ میں کمیٹی کے ممبروں میں کچھ اختلافات تھے، جنکی بنا پر ہم میں سے بعض اصحاب نے اپنا اختلافی نوٹ الگ پیش کیا تھا،



اختلافی نوٹ کی تحریر کی خدمت خاکسار کو سپرد ہوئی تھی، اور مولنا کفایت اللہ صاحب، مولنا قطب الدین عبدالوالی صاحب اور چودھری رشید الدین صاحب رئیس بارہ بنکی نے اسکی تائید فرمائی تھی، اس اختلافی نوٹ میں مسئلہ قضا کی اہمیت ضرورت اور

اس کے قیام کی تدابیر پر مدلل بحث تھی، یہ تحریر رپورٹ مین شامل ہوکر گورنمنٹ مین پیش ہوئی، مگر تعجب ہے کہ پھر ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے اور نہ کونسل نے اپنی اس تحریک و تجویز کی خبر لی، ممکن ہوا تو آیندہ معارف مین ہم اس تحریر کو پیش کرنے کی کوشش کرینگے، تاکہ مسئلہ مذکور کے اکثر پہلو سامنے آجائین،

فلسطین مین ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سال دو سال سے چل رہی ہو، اور سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جو فلسطین کے اسلامی جسم کا دماغ اور روح ہین، وہ اس تجویز کو عمل مین لانے کیلئے پوری طرح منہمک ہین، اور کئی مہینون سے ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہین، موصوف سے ہمکو موتمر اسلامی مکہ معظمہ کے زمانہ سے ذاتی تعارف حاصل ہو، اور انکے اخلاص اور دردِ ملت مین ذرہ برابر بھی شک نہین، لیکن انکی خدمت مین صرف یہ عرض کرنا ہو کہ ہندوستان مین انگریزی سلطنت کے استیلاء کے بعد مسلمانون کو ایک اسلامی یونیورسٹی کے تخیل مین ہر ملکی ضرورت اور سیاسی تغیر سے الگ ہوکر تعلیم کے وادی تیہ مین چالیس برس تک سرگردان رکھا گیا، کہین تاریخ کا اعادہ اسی طرح بنی اسرائیل کے بدلہ مسلمانانِ فلسطین کو تو (جو اب ہماری ہی طرح انگریزی تحت و اقتدار مین ہین) ہر طرف سے موڑکر اس وادی مین نہین لے چل رہا ہے، فَتَنَبَّہ،

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے گذشتہ اجلاس مین ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ اس یونیورسٹی کے کالجون مین لڑکون اور لڑکیون کی مخلوط تعلیم کی اجازت دیجائے، وائس چانسلر صاحب کی تحریک سے یہ تجویز علمی مجلس کے سپرد کردی گئی ہو کہ وہ اسکا مناسب فیصلہ کرے، وہ فیصلہ کیا ہوگا، اس کی خبر نہین،

اس موقع پر یہ گذارش بیجا نہ ہوگی کہ ہم اپنے طور و طریق اور طرز تمدن کو خیرباد کہکر جن قومون کی ریس کرنا چاہتے ہین پہلے انھین سے پوچھنا چاہئے کہ آیا وہ اسکو اپنے تمدن کے حق مین زندگی سمجھ رہی ہین یا موت، بہرحال جو کچھ ہونا ہو وہ ہوکر رہیگا، تاہم ہماری چیخ پکار اگر سنگدل کو رحمدل نہین بنا سکتی ہو، تب بھی جبتک جسم مین زندگی ہو چوٹ لگنے پر دل سے آہ! تو ایکدفعہ نکل ہی جائیگی،

خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی نے اردو امتحانات اور ڈگریون کے مسئلہ مین ایک قدم آگے بڑھایا ہے، ایکدن یہ حقیقت بھی تسلیم کرلیجائے گی کہ اردو زبان بھی دوسری زبانون کی طرح یہ حق رکھتی ہو کہ اسکو بھی اعلیٰ معیاری امتحانون مین جگہ دیجائے

مقالات

قاضی ابو یوسفؒ

بسلسلۂ تبصرہ تاریخ خطیب بغدادی،

یعقوب بن ابراہیم ابو یوسف القاضی شاگرد ابوحنیفہ، نسب یہ ہے، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بحیر بن المعاویۃ الانصاری (حضرت سعدؓ صحابی ہین، اون کی مان حبتہ صحابیہ، سعد احد کے دن (حضرت) رافع بن خدیجؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ مین پیش ہوئے، کم سنی کی وجہ سے بھرتی نہین ہوئے

تحصیل علم | ابو یوسف ۱۱۳ھ مین پیدا ہوئے، گھر مفلس تھا، حدیثؒ اور فقہ کی تحصیل کا شوق تھا، حدیث کی روایت منجملہ دیگر مشائخ کے یحییٰ بن سعید الانصاری، سلیمان الاعمش، ہشام بن عروہ، عطا بن السائب لیث بن سعد سے کی، محمد بن حسن احمد بن حنبل یحییٰ بن معین وغیرہم نے ان سے روایت کی، بغداد مین سکونت اختیار کرلی تھی،

ایک دن ابو حنیفہ کی محفل مین بیٹھے تھے کہ انکے والد وہان پہنچے، باپ کے ساتھ ہولئے، باپ نے کہا کہ ابو حنیفہ کے قدم بر قدم مت رکھو، ان کو تو پکی پکائی ملتی ہے تمھین پیٹ پالنے کی ضرورت ہے، انھون نے یہ سنکر طلب علم مین کمی کردی، ان کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ نے میری جستجو کی، بیٹھ رہنے کے بعد پہلی بار مین ان کے پاس پہنچا تو پوچھا آنا کیون چھوڑ دیا

ہشام بن عروہ ابو اسحٰق شیبانی عطا بن السائب اور انکے طبقے سے سماع حدیث کیا اکبر شیوخ حصین بن عبد الرحمن ہین، اون سے محمد بن حسن احمد بن حنبل، بشر بن الولید یحییٰ بن معین اور بہت لوگون نے سماعت حدیث کی،

یحییٰ بن معین کا قول ہے، ابو یوسف صاحب حدیث وصاحب سنت تھے، (امام) احمد کا قول ہے ابو یوسف حدیث مین صاحب انصاف تھے، ذہبی کا قول ہے کہ مین نے ابو یوسف اور محمد بن حسن کے حالات علٰحدہ کتابون مین لکھے ہین، تذکرۃ الحفاظ للذہبی

مین نے کہا کہ پیٹ کی فکر اور باپ کی فرمانبرداری کی وجہ سے، یہ کہکر مین بیٹھ گیا، آدمی چلے گئے، تو ایک تھیلی مجھ کو دی اور کہا اس کو خرچ کرو، جب ختم ہو جائے تو اطلاع کرنا، پڑھنا مت چھوڑو، مین نے دیکھا تو سٗو درم تھے اب مین نے پابندی سے پڑھنا شروع کیا، چند روز کے بعد سٗو درم اور عنایت ہوئے، حالانکہ مین نے اشارۃً بھی ختم ہونے کا ذکر نہین کیا تھا، اسی طرح بے طلب عنایت ہوتی رہی، یہانتک کہ مین آسودہ حال ہو گیا، ایک روایت کے بموجب باپ نے چھوٹا چھوڑا تھا، مان درس سے اٹھالی جاتی تھین، ایک روز ابو حنیفہ نے اون سے کہا، نیک بخت! جا، یہ علم سیکھ کر فالودہ روغن پستہ کے ساتھ کھائے گا، یہ سنکر وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئین، جب قاضی القضاۃ ہو گئے تو ایک بار خلیفہ ہارون رشید کے دسترخوان پر فالودہ پیش ہوا، خلیفہ نے اون سے کہا، یہ کھاؤ، یہ روز روز نہین تیار ہوتا ہے، پوچھا، امیر المومنین کیا ہے، کہا فالودہ اور روغن پستہ، یہ سنکر ابو یوسف ہنس پڑے، خلیفہ نے پوچھا، کیون ہنسے، کہا بخیر، امیر المومنین کو اللہ تعالیٰ زندہ وسلامت رکھے، ہارون الرشید نے اصرار کیا تو اونھون نے واقعۂ بالا بیان کیا، سنکر خلیفہ کو حیرت ہوئی اور کہا علم دین و دنیا مین عزت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ابو حنیفہ پر رحمت فرمائے، وہ عقل کی آنکھون سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو ظاہری آنکھون سے نظر نہین آتا،

امام اعظم کی صحبت مین

سترہ برس تک ابو حنیفہ کی صحبت مین حاضر رہے، ایک بار اس زمانہ مین سخت بیمار ہو گئے، امام صاحب نے آکر دیکھا تو واپسی مین اُن کے دروازے پر متفکر کھڑے ہو گئے، کسی نے سبب پوچھا، تو کہا یہ جوان مر گیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اوٹھ جائے گا،

ابو یوسف کا قول ہے کہ دنیا مین کوئی چیز مجھکو ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کی مجلس سے زیادہ محبوب نہ تھی، ابو حنیفہ سے بڑھکر فقیہ اور ابن ابی لیلیٰ سے اچھا قاضی مین نے نہین دیکھا،

خطیب کا قول ہے کہ ابو حنیفہ کے شاگردون مین دو شاگرد سب سے زیادہ ممتاز تھے، ابو یوسف اور زفر، عمار کا قول ہے کہ ابو حنیفہ کے شاگردون مین ابو یوسف کی مثال نہ تھی، اگر وہ نہوتے تو نہ کوئی ابو حنیفہ کو جانتا، نہ ابن ابی لیلیٰ کو، وہی تھے جنھون نے ان کا علم پھیلایا، اور اون کے اقوال کو دور دور پہنچایا، طلحہ کا قول ہے، ابو یوسف کی شان

مشہور علم و فضل بلند تھا، ابو حنیفہ کے شاگرد تھے، فقہ مین اپنے معاصرین مین سب سے بڑھکر، اون سے بڑھکر اون کے زمانے مین کوئی نہ تھا، علم و حکمت در یاست و قدر مین انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، وہ پہلے شخص ہین جنھون نے ابو حنیفہ کا علم زمین کے کنارون تک پہنچا دیا، اصول فقہ کی کتابین لکھین، مسائل کا نشر املا کے ذریعے سے کیا،

ایک بار اعمش نے اون سے ایک مسئلہ دریافت کیا، جواب سُنکر کہا، یہ کہان سے کہتے ہو، کہا فلان حدیث سے جو آپ سے روایت کی ہے، اعمش نے ہنسکر کہا کہ یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، کہ تمھارے باپ کی شادی بھی نہ ہوئی تھی، معنی اوس کے آج معلوم ہوئے،

امام مزنی سے کسی نے اہل عراق کی بابت پوچھا، ابو حنیفہ کی بابت کہا "سیدہم" اون کے سردار، ابو یوسف کی بابت کہا اتبعہم للحدیث اون مین سب سے زیادہ حدیث کے پیرو، محمد بن حسن سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے، زفر سب سے زیادہ قیاس مین تیز،

ہلال بن یحیٰی کا قول ہے، کہ ابو یوسف تفسیر، مغازی، ایام عرب کے حافظ تھے، فقہ ان کے علوم مین اقل العلوم تھی،

ایک بار ابو حنیفہ کے سامنے ابو یوسف اور زفر نے کسی مسائے پر بحث کی، ظہر تک جاری رہی، اور ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرتا رہا، ظہر کے وقت ابو حنیفہ نے زفر کی ران پر ہاتھ مار کر کہا جس شہر مین ابو یوسف ہون، اوس کی ریاست کی ہوس مت کرو،

ایک بار ابو حنیفہ نے اپنے شاگردون کی بابت کہا، یہ چھتیس مرد ہین، اون مین سے اٹھارہ عہدہ قضا کی اہلیت رکھتے ہین، چھ فتوی دینے کی، دو ایسے ہین جو قاضیون کو پڑھا سکتے ہین، یہ کہکر ابو یوسف اور زفر کی طرف اشارہ کیا،

ایک بار ابو حنیفہ (جو فراست مین ممتاز تھے،) نے داؤد طائی سے کہا کہ تم عبادت کے ہو رہو گے، ابو یوسف سے کہا، تم دنیا کی طرف مائل ہو گے، اسی طرح زفر وغیرہ کی نسبت رائے ظاہر کی، جو کہا تھا، واقعات نے وہی ثابت کیا،

لطیفہ:۔ ایک شخص ابویوسف کی صحبت مین خاموش بیٹھے رہتے تھے، ایک بار اونھون نے کہا تم بولتے کیون نہین، کہا بہت اچھا، روزہ کب افطار کرنا چاہیئے، کہا جب آفتاب غروب ہو، بولے، اگر آفتاب آدھی رات تک غائب نہو تو یہ سُنکر ابویوسف ہنس پڑے، اور کہا تمھارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا، تمھاری زبان کھلوا کر مین نے خطا کی،

عہدۂ قضاء خلیفہ ہادی نے ۱۶۶ھ مین بغداد کا قاضی مقرر کیا، ہارون الرشید نے اپنی خلافت مین بحال رکھا اسلام مین وہ اوّل شخص ہین، جو قاضی القضاۃ ہوئے، سترہ برس تک قاضی القضاۃ رہے،

اُن کے قاضی ہونے کے عہد مین ایک بار امیر المومنین ہادی کے ایک باغ پر کسی نے اُن کی عدالت مین دعویٰ کیا، بظاہر خلیفہ کا پہلو زبردست تھا، مگر واقعہ اوس کے خلاف تھا، امیر المومنین نے کسی موقع پر اُن سے پوچھا، کہ تم نے فلان باغ کے معاملے مین کیا کیا، جواب دیا، مدعی کی درخواست یہ ہے، کہ امیر المومنین کی حلفیہ شہادت اس پر لیجائے کہ اون کے گواہون کا بیان سچا ہے، ہادی نے پوچھا کیا اون کی یہ درخواست واجبی ہے، جواب دیا کہ ابن ابی لیلیٰ کے فیصلے کے مطابق صحیح ہے، خلیفہ نے کہا اس صورت مین باغ مدعی کو دلا دو، یہ ابویوسف کی ایک تدبیر تھی،

وفات ۵ ربیع الاوّل یا ربیع الآخر باختلاف قولین ۱۸۲ھ مین انتقال کیا، انتقال کے وقت انہتر برس کی عمر تھی،

وفات کے وقت کہا، کاش مین اوس فقر کی حالت مین مرتا، جو شروع مین تھی، اور قضاء کے کام مین نہ پھنستا، خدا کا شکر ہے اور اسکی یہ نعمت ہے کہ مین نے قصداً کسی پر ظلم نہین کیا، اور نہ ایک فریق معاملے کی، دوسرے کے مقابلے مین پروا کی، خواہ وہ بادشاہ تھا یا بازاری، وفات کے وقت یہ قول بھی منقول ہے، بارالہا! تو خوب جانتا ہے، کہ مین نے کسی فیصلے مین جو تیرے بندون کے درمیان کیا خود رائی سے کام نہین لیا، تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کی پیروی کی کوشش کی، جہان مجھکو اشکال پیش آیا، ابوحنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان

[1] ابن عبدالبر کا قول ہے، میرے علم مین کوئی ایسا قاضی سوائے ابویوسف کے نہین، جس کا حکم مشرق سے مغرب تک سارے آفاق مین روان رہا ہو، شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی،

مین واسطہ کیا، اور واللہ وہ میرے نزدیک اون لوگون مین سے تھے، جو تیرے حکم کو پہچانتے تھے، اور کبھی جانکر حق کے دائرے سے نہین نکلتے تھے، یہ بھی موت کے وقت ان کی زبان پر تھا، بارالہا! تو جانتا ہے، کہ مین نے جانکر حرام نہین کیا اور نہ جانکر کوئی درم حرام کا کھایا،

اون کی علالت کے دوران مین معروف کرخی نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ مین نے سنا ہے، ابویوسف زیادہ علیل مین، تم اون کی وفات کی خبر مجھکو دینا، راوی کا بیان ہے کہ مین دار الرقیق کے دروازہ پر پہنچا، تو ابویوسف کا جنازہ نکل رہا تھا، دل مین کہا کہ اب معروف کرخی کو خبر کرنے جاتا ہون تو نماز جنازہ نہ ملیگی، چنانچہ نماز مین شریک ہوکر اون کے پاس پہنچا اور خبرِ وفات سنائی، اون کو سخت صدمہ ہوا، بار بار اناللہ پڑھتے تھے، مین نے کہا یا ابا محفوظ! آپ کو نماز جنازہ مین شریک نہ ہونے کا اس قدر صدمہ کیون ہے، کہا مین نے خواب مین دیکھا کہ مین جنت مین داخل ہوا ہون دیکھتا ہون کہ ایک محل تیار ہوا ہے، اس کا بالائی حصہ مکمل ہو چکا، پردے آویزان کر دیے گئے، غرض ہر طرح پورا ہو چکا، مین نے پوچھا یہ کس کے لئے تیار ہوا ہے، لوگون نے کہا ابویوسف کے واسطے، مین نے کہا یہ مرتبہ اونھون نے کیون کر پایا، جواب ملا اچھی تعلیم دینے اور اوس کے شوق کے صلے مین اور لوگون نے جو اذیت پہنچائی اوس کے صلے مین،

شجاع بن مخلد کا قول ہے کہ ہم ابویوسف کے جنازے مین شریک ہوئے، عباد بن العوام بھی ہمارے ساتھ تھے، مین نے اون کو یہ کہتے سُنا، کہ اہلِ اسلام کو چاہئے کہ ابویوسف کی وفات پر ایک دوسرے کے ساتھ تعزیت کرین[1]

---

[1] خلیفہ ہارون الرشید جنازہ کے آگے آگے چلتے تھے نماز جنازہ خود اونھون نے پڑھائی، مقابر قریش مین ام جعفر زبیدہ کی قبر کے پاس دفن کیا، محمد بن جعفر کا قول ہے، ابویوسف کی شان مشہور فضل ظاہر تھا، اپنے زمانے مین سب سے زیادہ فقیہ تھے، اون سے بڑھکر کوئی نہ تھا، علم، حلم، ریاست، قدر و جلالت مین انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، العبر مین لکھا ہے، ابویوسف جواد اور سخی تھے ابوحاتم کا قول ہے، ان کی حدیث لکھی جائے انتہیٰ ابن اہدل کا قول ہے کہ اکثر علماء ابویوسف کی فضیلت و عظمت کے قائل ہین ابن عبد البر کا قول ہے، ابویوسف فقیہ عالم حافظ تھے کثیر الحدیث ۱۲ شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی ج ۱،

وفات سے پہلے کہتے تھے کہ سترہ برس ابوحنیفہ کی صحبت مین رہا، سترہ برس دنیا کے کام مین رہ چکا، میرا گمان ہے کہ اب میری موت قریب ہے، اس قول کے چند مہینے کے بعد وفات پائی،

ان کے بیٹے یوسف غربی بغداد کے قاضی تھے،

مناقب و جرح ابن کامل کا قول ہے، کہ یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اور علی مدینی اون کے ثقہ فی النقل ہونے پر متفق ہین یحییٰ بن معین کا قول ہے، کہ ابویوسف اصحاب حدیث کی جانب مائل تھے، اور اون کو دوست رکھتے تھے اور مین نے اون سے حدیثین لکھی ہین، امام احمد بن حنبل کا قول ہے، کہ حدیث مین میرے پہلے استاد ابویوسف ہین، اون کے بعد مین نے اوروں سے حدیث لکھی، ابن مدینی کا قول ہے، کہ ابویوسف صدوق تھے،

خطیب بغدادی نے اپنا مورخانہ فرض امام ابویوسف کے حالات مین بھی جرح کے متعلق ادا کیا ہے، اور متواتر روایتین جرح کی نقل کی ہین، اسی کے ساتھ اثنائے بیان مین بعض جرحون کا جواب بھی دیا ہے، جرح سب کی سب غیر مفسر اور غیر مبین السبب ہین، مواد جرح وہی ہے، جو امام اعظم اور امام محمدؒ کی نسبت جرحون کا ہے، یعنی مرجئی ہونا وغیر ذالک، مذکور الصدر دونون اامون کے ذکر مین اس پر جو بحث مجمل و مفصل ہو چکی وہی یہان بھی کی جا سکتی ہے، اعادہ تحصیل حاصل، یالا حاصل، متاخرین ائمہ رجال نے امام ابویوسف کے متعلق بھی جرح متروک کر دی ہے، صرف مناقب و تعدیل لکھی ہے،

مثلاً دیکھو تذکرۃ الحفاظ امام ذہبیؒ، اور شذرات الذہب ابن عماد الحنبلیؒ،

متقدمین مین سے امام ابن قتیبہ نے معارف مین نہ امام اعظم پر جرح کی ہے اور نہ ابویوسف پر، حالانکہ دوسرے رجال پر جرح کرتے ہین،

نفسیاتِ حکیم ناصر خسرو

(۲)

از

پروفیسر معتقد ولی الرحمٰن ایم اے، استاد نفسیات جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن،

(۵)

یہ نفس جس کی تعریف کی کوشش ادھر کی گئی ہے، تین مدارج میں پایا جاتا ہے، اوّل نفس نباتی دوم نفس حیوانی، اور سوم نفسِ ناطقہ[1]، نفس نباتی میں غذا حاصل کرنے، اپنی نسل کی افزائش کرنے، اور اپنے ہی طرح کے بچے پیدا کرنے کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ ان ہی تین قوتوں کے مجموعے کو نفس نباتی کہتے ہیں، نفس حیوانی حیوانات میں ہوتا ہے، اس میں محسوسات کے اخذ کرنے، صورتوں کا تخیل کرنے، اور خود اپنے اختیار سے حرکت کرنے کی قوتیں ہوتی ہیں، ان تینوں قوتوں کے مجموعے کو نفس حیوانی کہا جاتا ہے، نفس ناطقہ کی وجہ سے اجسام انسانی میں نطق، تدبیر، احتراز، تمیز وغیرہ کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں، یہ قوتیں انسان کیلئے مخصوص ہیں، ان کے مجموعے کو نفسِ ناطقہ کہتے ہیں، ان نفوس میں سے ہر ایک نفس میں تولید بالمثل کی قوت ہوتی ہے، اس کے علاوہ آخری نفوس میں اپنی مخصوص قوتوں کے علاوہ ماقبل کے نفس کی قوتیں بھی ہوتی ہیں، چنانچہ نفس حیوانی میں محسوسات کو اخذ کرنے وغیرہ کی قوتوں کے علاوہ نفس نباتی کی بھی تمام قوتیں ہوتی ہیں، اسی طرح نفسِ ناطقہ میں اپنی مخصوص قوتوں کے علاوہ نفس حیوانی کی تمام قوتیں بھی ہوتی ہیں، یعنی یہ کہ نفس ناطقہ نفس کی تمام امکانی قوتوں کا حامل ہوتا ہے، اب ہم ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ غور کریں گے[2]

---

[1] ان کو حکیم ناصر خسرو نے علی الترتیب نامی، حسی اور ناطقہ بھی کہا ہے، دیکھو ص ۲۲۹. [2] زاد المسافرین ص ۲۹۰، ص ۱۹۱،

جو مزاج کہ گرمی، سردی، خشکی و تری کی وجہ سے اجسام انسانی مین پیدا ہوتا ہے، وہ نفس نباتی کے لئے بمنزلۂ بنیاد و ہیولیٰ کے ہے، اور تمام قوائے نباتی یعنی غذا کا حاصل کرنا، افزایش نسل، اور تولید بالمثل، اجرام فلکی کی تاثیر کا نتیجہ ہین، ثبوت اس کا یہ ہے کہ یہ قوتین جو اس مزاج مین ہوتی ہین، کلیات یعنی ارکان چہار گانہ مین موجود نہین، لہذا یہ کلیات سے نہین، بلکہ کسی اور چیز سے حاصل ہوتی ہین، اب اجرام علوی کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز نہین کہ جس کے آثار اور جسکی قوتین ان طبائع کلیات تک پہنچتی ہون، اور جن کا رخ ان کی طرف ہو، یہی اجرام ہین، جو اجسام سفلی کو محیط ہین، اور جو اپنی قوتون کو نیچے کی طرف ان تک ایصال کرتے رہتے ہین، چنانچہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، کہ سورج کی شعاعین اور گرمی زمین تک پہنچتی ہے، ان ہی اجرام علوی کی حرکت کا ثبات مذکورۂ بالا تین قوائے نباتی کے ہم معنی ہے، اور خود یہ حرکت غیر محسوس اور جسم کو حرکت دینے والی ہے، لہذا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان تین قوتون کا وجود اجرام علوی اور اجرام سفلی مین ان اجرام علوی کی حرکات کا نتیجہ ہے، یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر کلیات طبائع اس تاثیر کو قبول کر لیتے، تو تمام طبائع نباتی ہو جاتے، کیونکہ اگر ایک چیز "الف" کا ایک جزو، دوسری چیز "ب" کے ایک جزو کو قبول کر لیتا ہے، تو کل چیز "الف" کل چیز "ب" کو قبول کر لیتی ہے، لیکن معترض نے شاید اس بات پر غور نہین کیا کہ احاطۂ افلاک اور اجرام علوی دونون "معدن لطائف" ہین، اور اجرام سفلی پر ان کا اثر ہوتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ ان مین کوئی ایسی قوت ہو، جو ان تمام اجسام تک پہنچے، نہ ایسی جو بعض تک تو پہنچے اور بعض تک نہ پہنچے، "مدبر حکیم" اور "صانع علیم" نے ان اجسام کو "مکانہائے معلوم" مین ایک خاص ترتیب سے مرتب کیا ہے، اور ان ہی کی وساطت سے ان مین سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا ہے، اجرام علوی سے آنے والے اثرات اُس مزاج کی تلاش کرتے ہین، جو عدل سے حاصل ہوا ہے، اور مزاج کی قابلیت قبول کے مطابق اس کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہین، یہ نہین ہوتا کہ اس مزاج کے بعض حصون کے ساتھ تو یہ اثرات پیوست ہون، اور بعض کے ساتھ نہ ہون، کیونکہ اگر یہ اثرات ایک جزو کے ساتھ پیوست ہون، اور دوسرے کے ساتھ نہ ہون، تو جب یہ اجزاء ایک ترکیب مین جمع ہوتے ہین، تو مقدم الذکر جزو موخر الذکر جزو پر ظلم کرتا ہے اور یہ صانع حکیم کے عدل کے منافی ہے، پھر اگر کسی مزاج کے اجزائے طبائع متکافی نہین ہوتے، تو روح (جو غایت الٰہی

کا اثر ہے،) اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوتی، کیونکہ یہ روا نہیں کہ عدل و اثر و عنایتِ الٰہی" سے کوئی چیز ان طبائع کے ساتھ پیوست ہونے کے لئے مرکزِ عالم کی طرف آئے، اور ایک چیز دوسری کے مقابلے میں زیادہ حصہ حاصل کرے اور اسکو حاصل کرنے میں ایک دوسری پر ستم کرے، اس کے علاوہ جب کسی مزاج کے اجزائے طبائع متکافی نہیں ہوتے، تو قوی ضعیف پر ستم کرتا ہے، لہٰذا اس ستم کی وجہ سے "عنایتِ الٰہی" اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ مزاج طبائع (جو انسان کے جسم کے لئے بنایا گیا ہے) کے اندر روحِ نباتی اجرامِ علوی سے آتی ہے، اور یہی مزاج اس روح کیلئے بمنزلہ بنیاد و ہیولی کے ہے[1]، یہ بھی دکھایا جاچکا ہے کہ جب مزاج معتدل نہیں ہوتا، تو روح اس کے ساتھ کیوں پیوست نہیں ہوتی، روحِ نباتی[2]، جس کو یہ تینوں قوتیں حاصل ہیں، اس مزاج کو ہیکلِ مردم کے بنانے کے لئے پیدا کرتی ہے، اور یہی روحِ نباتی روحِ حیوانی کے لئے بمنزلۂ بنیاد و ہیولیٰ کے ہو جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ روحِ حیوانی میں بھی روحِ نباتی کے ذریعہ اجرامِ علوی کی تاثیر سے یہ خاص مزاج پیدا ہوتا ہے، یعنی یہ کہ روحِ نباتی روحِ حیوانی میں حس، خیال، اور خود اپنی مرضی کے مطابق حرکت کا باعث ہوتی، اور روحِ حسی کہلاتی ہے[3]۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مزاج میں روحِ حیوانی کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ روحِ حیوانی روحِ ناطقہ کیلئے موزون بنتی ہے، یا نہیں، اور یہ کہ اس مزاج میں روحِ ناطقہ کی پیدائش بھی اجرامِ فلکی کی تاثیر سے ہوتی ہے، یا نہیں، پھر ایک اور دریافت طلب امر یہ بھی ہے، کہ ایک ایسے مزاج میں "جو ہیکل مردم" کی اصل ہے، ان تینوں ارواح میں سے ہر ایک ایک خاص نسبت میں پائی جاتی ہے، یا ہیکل مردم" میں روحِ ناطقہ کے پیدا ہونے کا حال روحِ نباتی اور روحِ حیوانی کے پیدا ہونے کے حال سے مختلف ہے، اصلیت یہ ہے کہ روحِ نباتی اور روحِ حیوانی، دونوں غذا حاصل کرنے، اپنی افزائش کرنے، اور خود اپنے مثل کو پیدا کرنے کے لحاظ سے تو ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ روحِ حیوانی میں حرکتِ انتقال ہوتی ہے، یہ اپنے دشمن کو بھی پہچانتی ہے

---

[1] حکیم ناصر خسرو کا یہ تمام استدلال صاف نہیں، [2] آیندہ ہر جگہ خیال رکھنا چاہئے کہ ناصر خسرو کے ہاں الفاظ "روح" اور "نفس" مترادفات ہیں، لہٰذا کہیں وہ لفظ روح استعمال کرتا ہے اور کہیں نفس [3] زاد المسافرین ص ۲۹۲، ۲۹۳ [4] ایضاً ص ۲۹۴، ۲۹۵،

اور اپنی غذا سے لذت حاصل کرتی ہے، روحِ نباتی مین یہ باتین نہین ہوتین[1]

اوپر کے بیان سے یہ خیال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کہ روحِ نباتی اور روح حیوانی مین ایک فرق اور بھی ہے جس کو ہم نے فراموش کردیا ہے، یعنی یہ کہ حیوان تناسل و توالد کے لئے مخالف جنس کے فرد کا محتاج ہوتا ہے، اور نباتات مین یہ بات نہین ہوتی، لیکن یہ خیال غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ نباتات کی یہ خصوصیت حیوانات کے مقابلے مین استوار تر اور درست تر ہوتی ہے، چنانچہ دانون مین سے بعض نر ہوتے ہین، اور بعض مادہ، درخت صرف اسی وقت پیدا ہوتے ہے جب نر و مادہ ملتے ہین، پھر اگر ایک خاص نر اور ایک خاص مادہ کو ملایا جائے، اور اس کے بعد پھر ان کو الگ الگ کر کے دوسری مادہ یا دوسرے نر کے ساتھ ملا دیا جائے، تو کوئی درخت پیدا نہین ہوتا، یعنی یہ کہ نباتات کی حالت یہ ہو کہ کوئی دانہ اپنے جفت کو نہین بدلتا، اگر یہ بدل دیا جاتا ہے، تو کوئی درخت پیدا ہی نہین ہوتا، برخلاف اس کے حیوانات کا حال یہ ہے، کہ ان کا نر ایک مادہ کو چھوڑ کر دوسری سے ملاپ پیدا کرتا ہے، اور پھر بھی توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اسی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحِ نباتی کی قوت سے جو خاصیت جفت پکڑنے کی دانون مین ہوتی ہے، وہ اس خاصیت کے مقابلے مین مستقل تر ہوتی ہے، جو روحِ حسی کی وجہ سے حیوانات مین ہوا کرتی ہے[2]

لیکن روحِ حیوانی اور روحِ ناطقہ مین فرق یہ ہے کہ روحِ ناطقہ خود اپنے جسم کی مشارکت کے بغیر حرکت کرسکتی ہے، اور روحِ حیوانی مین مشارکتِ جسم کے بغیر کوئی حرکت نہین ہوسکتی، چنانچہ حیوانات تناسل کی غرض سے طلب جفت مین پھرتے ہین، اپنے دشمنون سے بھاگتے ہین، مختلف مقامات مین اپنی غذا تلاش کرتے ہین وغیرہ، اس کے مقابلے مین نفس ناطقہ مین ان تمام حرکات کے علاوہ وہ حرکات بھی ہوتی ہین، جن مین جسم کی مشارکت کی ضرورت نہین پڑتی، یہ نفس اپنے طبیعی قوا کی مخالفت کرتا ہے، مثلاً یہ اپنی قوتِ شہوانی کو دباتا ہے، اپنے غصے کو روکتا ہے، اپنی بھوک کو مارتا ہے، اور دیگر اخلاق ناپسندیدہ سے باز رہتا ہے، اس طرح اوس کے قوائے طبیعی حدِ اعتدال سے آگے نہین بڑھتے، پھر بعض اوقات جسم سے بالکل آزاد ہوجاتا ہے، چنانچہ یہ قیاسی مقدمات قائم کرتا ہے، اون سے نتائج

---

[1] زاد المسافرین ص ۲۹۳، ۲۹۴، [2] ایضاً ص ۲۹۴، ص ۲۹۵،

برآمد کرتا ہی اور ان نتائج کو نئی قیاسات کے مقدمات بناتا ہی، اسکا مطلب ہوجاتا ہی کہ نفسِ ناطقہ فاعل بھی ہی اور منفعل بھی، لو سوال یہ ہے کہ یہ کیسے مطلع ہو سکتا ہے

جواباً کہا جا سکتا ہے کہ نفسِ ناطقہ فاعل تو اس لحاظ سے ہی کہ یہ بدیہیاتِ عقل[1] سے مقدمات وضع کرتا ہے، چنانچہ یہ کہتا ہی کہ

ہر جسم مکان گیر ہوتا ہے، اور ہر مکان گیر حرکت پذیر ہوتا ہے، ان دونوں مقدمات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے، کہ کوئی جسم حرکت دینے والا

نہیں ہو سکتا یعنی یہ کہ جسم کو حرکت دینے والی چیز مکان گیر نہیں ہو سکتی، اور چونکہ یہ مکان گیر نہیں لہذا یہ جسم نہیں، اس طرح اس

فعل میں یہ خود اپنا مفعول بن جاتا ہے، اتنی ہی مختصر گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہی کہ ہر چند نفسِ نباتی و نفسِ حیوانی حرکت دینے پر

قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کا حرکت دینا ویسا نہیں، جیسا کہ جسم کا حرکت دینا ہے، اسی سے واضح ہو جاتا ہی کہ نفسِ ناطقہ میں

ایک قوت ایسی ہے کہ جس سے یہ جسم کو بھی حرکت دیتا ہے، اور خود اپنے آپ کو بھی یہ نفسِ حیوانی کو خشم، شہوت، حسد وغیرہ سے روکتا ہے

اور یہی وہ قوتیں ہیں، جو نفسِ حیوانی کو حرکت دیتی ہیں[2]

اب مقدماتِ قیاسی سے نتائج حاصل کرنے میں جو حرکت نفسِ ناطقہ خود اپنے آپ کو دیتا ہے وہ قوتِ عقل کے ذریعہ

ہوتی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ نفسِ ناطقہ کی قوتِ جنبانندہ بے نہایت ہوتی ہے، یہ اس لحاظ سے نہیں کہ یہ آرام نہیں

کرتا، اور اکتسابِ مقدمات اور استخراجِ نتائج میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ اُن اعراض و حرکات

کو قبول کرنے میں نہیں تھکتا، جو اس کے لائق ہیں، اسی قبول کرنے کو علم کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں اجسام اُن اعراض

کو قبول کرنے میں تھک جاتے ہیں، جو اُن کے لائق ہیں، چنانچہ اگر کوئی چیز سیاہ ہوتی ہی تو پھر بعد میں وہ اور سیاہی کو قبول نہیں کرتی

نفسِ ناطقہ کا حال یہ ہے کہ جس قدر زیادہ علم یہ حاصل کر لیتا ہے اسی قدر زیادہ قابل یہ اس نئے علم کو حاصل کرنے کے ہو جاتا ہی،

جو اب تک اس کو حاصل نہیں ہوا، اجسام کا حال یہ نہیں چنانچہ جب کوئی جسم سیاہی قبول کر لیتا ہے، تو مزید سیاہی کو کم قبول

کرتا ہے، اور جتنی زیادہ سیاہی قبول کرتا جاتا ہے، اس کی قابلیتِ سیاہی پذیری اسی قدر کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک

کہ یہ قابلیت بالکل ختم ہو جاتی ہے، مختصر یہ کہ نفسِ ناطقہ کی قوت بے نہایت ہوتی ہے، یہ اپنی ذات کیلئے فاعل ہی،

---

[1] زاد المسافرین ص ۲۹۵، [2] ایضاً ص ۲۹۶ زمانۂ حال کی نفسیات اسی کو اس طرح بیان کریگی کہ نفس (ناطقہ) احساسی تہیجات کو وصول بھی

کرتا ہی، اور استدلال بھی کرتا ہے، پہلی حالت میں یہ منفعل ہے، اور دوسری میں فاعل،

اور اوس کی ذات اوس کے لئے منفعل[۵۱]، اس کا حال روح نباتی، یا روح نمائی، اور روح حیوانی یا روح حسی سے مختلف ہی، حالانکہ یہی دونون ارواح باعتبار وجود اس پر مقدم ہین، اسی سے منتج ہوتا ہے، کہ ہیکل مردم مین اس کی پیدائش بھی ان دونون کی پیدائش سے مختلف ہی[۵۲]

خلاصہ اس تمام طویل بحث کا یہ ہے کہ نفس نباتی، نفس حیوانی اور نفس ناطقہ، تینون مین یہ بات مشترک ہے، کہ ان کی پیدائش اور ابتدا مزاج جسدی کے سوا اور کہین نہین ہو سکتی، لیکن مقدم الذکر دو نفوس (طلقسی عنصری) مزاج مین اجرام فلکی کی تاثیر سے پیدا ہوتے ہین، اور نفس ناطقہ کی پیدائش اس سے مختلف ہوا کرتی ہے، چنانچہ "دین حق" (اسلام) کے حکما، اور متقدمین فلاسفہ مین سے وہ جن کو "متالہین" کہا جاتا ہی، دونون اس پر متفق ہین، کہ نفس ناطقہ الٰہی اور ابداعی جوہر ہے[۵۳]، اور صفات الٰہی کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اسی کو بقائے ابدی ہے، یعنی جسم کو فنا کے بعد بھی یہ بذات خود قائم رہتا ہے[۵۴]، اس کے برخلاف

---

۵۱ ناصر خسرو کی اصل عبارت یہ ہے:- ...... "وفاعل است مر ذات خویش را، و ذات او مر او را منفعل است" (ص۲۹) یہ جملہ ابہام انگیز ہی، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ناصر خسرو کے نزدیک نفس ناطقہ بحیثیت فاعل اور نفس ناطقہ بحیثیت منفعل، یا خود اس کے الفاظ مین اوس کی ذات دو علحدہ علحدہ اور قائم بالذات چیزین ہین، اصلیت یہ نہین، ناصر خسرو کے نزدیک نفس ناطقہ ایک ہی ہی، یہی فاعل بھی ہی، اور منفعل بھی یعنی فعل و انفعال اس کے دو شئون ہین، اس کو ہم چند سطرین قبل ہی واضح کر چکے ہین، زمانۂ حال کے فلاسفہ و ماہرین نفسیات بھی اسکو تسلیم کرتے ہین، چنانچہ کانٹ ذات فاعل کو "خالص ایغو" (Pure ego) اور ذات منفعل کو "تجربی ذات" (Empirical self) کہتا ہے، ولیم جمیس ان کو علی الترتیب ذات بحیثیت عالم (Knower) اور بحیثیت معلوم (Known) یا مختصراً علی الترتیب "مین" ("The I") اور "مجھ" ("The me") کے نام سے موسوم کرتا ہے، فی زمانہ یہ عقیدہ بہت سے نئے مسائل کی تخلیق کا باعث ہوا ہے، ۵۲ زاد المسافرین ص۲۹۶، ۲۹۷، ۵۳ دیکھو حاشیہ ص ۴۲ ۵۴ حکیم ناصر خسرو شاید بھول گئے، کہ وہ ص۵۵ اور ص۵۱ ہر نفس مطلق، نہ کہ نفس ناطقہ کے متعلق کہ آئے ہین، کہ "آن جوہر بذات خویش زندہ است، (ص۵۵) اور "پس ظاہر کردیم کہ اندر ما گوہریست کہ بذات خویش زندہ است، ...... و پس از فنائے جسد باقی ست"، (ص۵۱) اصل یہ ہے کہ ماہیت نفس کی تمام بحث مین اونھون نے نفس (یا روح) کے ان تین مدارج کو پیش نہین رکھا ہی، ماہیت نفس کے متعلق اونھون نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس مین نفس سے اُن کی مراد غالباً "نفس ناطقہ" ہے، لیکن بحث کے دوران مین انھون نے

مقدم الذکر دونوں روحوں کا ثبات وجود کالبد کے ثبات وجود پر موقوف ہوا اور کالبد کا ثبات وجود اجرام فلکی کی تاثیر سے ہے[۱]

(۶)

نفس ناطقہ میں دو بڑی بڑی قوتیں ہوتی ہیں، ایک قوت علم اور دوسری قوت عمل، قوت علم کا پہلا کام اس اعتقاد کے ساتھ چیزوں کا تصور کرنا ہے، کہ یہ چیزیں ایسی ہی ہیں، افضل ترین علم جو نفس کو اس قوت سے حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ توحید پر اس کا اعتقاد مبنی بر صدق و یقین ہو، قوت عمل کا پہلا کام یہ ہے، کہ اس چیز کے طلب کی آرزومند ہو، جو اس کے جوہر میں مرکوز ہے، اور یہ طلب بقائے ابدی کی خاطر ہو، جس نفس میں دونوں قوتیں اور یہ دونوں فعل نہیں ہوتے وہ نفس بہیمی ہوتا ہے، اور جو نفس کہ دونوں کاموں سے نہیں تھکتا، وہ نفس فرشتگی ہوتا ہے، اس لحاظ سے نفس و جسم کا اتحاد اسی وجہ سے ہے کہ یہ دونوں قوتیں فعلیت میں آجائیں، چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ جسم نفس کیلئے ایک عمدہ سواری ہے جس کے ذریعہ وہ (نفس) منزل قوت سے دنیا فعل کی طرف آتا ہے[۲]،

(۷)

اوپر نفس کی دو بڑی بڑی قوتوں کا ذکر ہوا ہے ایک قوت علمی اور دوسری قوت عملی ان میں سے قوت علمی میں حواس کی وساطت سے فعلیت ہوتی ہے، یہ حواس پھر دو قسموں کے ہوتے ہیں، اول حواس ظاہری، اور دوم حواس باطنی، بالفاظ دیگر یہی دو قسموں کے حواس ہمارے ہر قسم کے علم کے ذرایع ہیں، اوراق آیندہ میں انھی حواس پر علٰحدہ علٰحدہ بحث ہوگی، پہلے ہم حواس ظاہری کو لیتے ہیں،

حواس ظاہری پانچ ہوتے ہیں، لامسہ، ذائقہ، سامعہ، شامہ، اور باصرہ[۳]، یہ نفس کے گویا پانچ جسمانی آلات ہیں جن سے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶) نفس نباتی اور نفس حیوانی کو بھی شامل کر دیا ہے، اسی سے بعض جگہ غلط مبحث پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ ص ۸ پر نفس کے متعلق کہا ہے، کہ "آن جوہر بذات خویش زندہ است" اور ص ۹ پر اندر رانا کے الفاظ اضافہ کر کے نفس کو نفس ناطقہ کے ہم معنی کر دیا، پھر ادھر جو کچھ بھی کہا ہے وہ صراحۃً نفس ناطقہ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ نفس مطلق سے[۱] زاد المسافرین ص ۲۹۰-۲۹۲ [۲] ایضاً ص ۴۲۹،
[۳] حکیم ناصر خسرو کی ادبی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں تا بحد امکان عربی الفاظ سے اجتناب

کہ وہ چیزون کا علم حاصل کرتا ہی، ان حواس مین سے بعض دوسرون کے مقابلے مین شریف تر ہوتے ہین، اوران کا یہ شرف اس منفعت اور مضرت کے مطابق ہوتا ہے جس کو یہ حواس پیدا کرتے ہین، اس لحاظ سے جس جس مین منفعت زیادہ ہو وہ شریف تر ہے، لیکن بے سخن حیوانات مین یہ شرف ذرا مختلف اصول پر ہوتا ہی،

ان حواس مین سے حاسۂ لمس عام ترین ہی، اس وجہ سے بھی کہ یہ تمام حیوانات مین ہوتا ہے، اور اس لحاظ سے بھی کہ لمس کی قابلیت اس کے تمام جسم مین ہوتی ہی، حیوان کیلئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ جو درد و رنج اس کیلئے مہلک ہوتا ہی، اسکو اس حاسہ سے معلوم کرکے اس سے پرہیز کرتا ہے، پھر مجامعت کی لذت کے سبب سے اپنے جوڑے کو اسی حاسہ کی مدد سے تلاش کرتا ہے، تاکہ اپنی نوع کو فنا ہونے سے محفوظ کرے، اسی طرح حاسۂ ذوق مین حیوان کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اسی کی وجہ سے اپنی غذا کی طرف رغبت کرتا ہی، بے سخن حیوانات مین حاسۂ لمس حاسۂ ذوق کے مقابلے مین افضل ہوتا ہی، اسی وجہ سے کہ ان مین حاسۂ ذوق ضعیف ہوتا ہے، اور اس سے اوسکو لذت بھی کم حاصل ہوتی ہے، اس کے علاوہ غذا کی طرف حیوان کو رغبت ہوتی ہی، وہ بھوک کی وجہ سے ہوتی ہے، نہ اس وجہ سے کہ وہ خوش ذائقہ اور بدذائقہ غذا مین تمیز کرتے ہین، چنانچہ پرندے عام طور پر دانون کو بغیر توڑے کھاتے ہین، لہذا وہ ان کے ذائقے کو محسوس ہی نہین کر سکتے، اس کے مقابلے مین لمس سے وہ درد و رنج سے اجتناب کرتے ہین، اپنے جوڑے کو حاصل کرتے ہین، اور اپنی نوع کی نگہداشت کرتے ہین، حاسۂ سمع مین حیوانات کے لئے بہت کم منفعت ہوتی ہے، دلیل اسکی یہ ہے، کہ اکثر حیوانات مین یہ حاسہ ہوتا ہی نہین، چنانچہ سانپ، مچھلی، چیونٹی، چوہا، مکھی، اور بعض پرندے اس سے محروم ہوتے ہین[۱] اس محرومی کے باوجود ان کی پیدائش

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۷) کرتے ہین، چنانچہ زاد المسافرین مین اونھون نے کثرت و تعدد کیلئے بسیاری، موجد یا خالق کیلئے باشانندہ، صاعد کیلئے برشوندہ، ماہیت کیلئے چہ چیزی، علت کیلئے چرائی، عرض، طول، عمق اور ارتفاع کیلئے علی الترتیب پہنا، درازا، ژرفا اور بالا! قوت ارادہ کیلئے خواست وغیرہ استعمال کئے ہین، اپنے اسی میلان کے زیر اثر اونھون نے ان حواس ظاہری کے عربی نامون کی بجائے فارسی نام وضع کئے ہین، چنانچہ وہ لامسہ کو بسابندہ، ذائقہ کو چشیدہ، سامعہ کو شنوندہ، شامہ کو بویندہ اور باصرہ کو نگرندہ کہتے ہین، ڈاکٹر غنی نے کتاب کے آخر مین ان الفاظ کا ایک مختصر فرہنگ شامل کیا ہی، [۱] یہ بیان ذرا مشکوک ہی، چنانچہ مشہور بات ہی کہ سانپ کے کان بہت تیز ہوتے ہین، اسی طرح چوہے مین بھی سماعت کا نہ ہونا بہت مشکوک ہے،

اور زندگی مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، حالانکہ یہی کمال حیوان ہے، حاسۂ شامہ کا فائدہ یہ ہے، کہ بے سخن حیوان اسی کے ذریعے مفید و مضر غذا مین تمیز کرتا ہے، چنانچہ جو سبزہ کہ ان کے لئے زہر ہے، اور جو پانی کہ ان کے لئے شوردار ہے، اس سے وہ اسی قوت کی مدد سے پرہیز کرتے ہین، ان حیوانات مین یہ حاسہ اکثر دیگر حواس پر فضیلت رکھتا ہے، چنانچہ شکاری کتا جھاڑیون اور کھیتون مین اسی کی مدد سے زندہ پرندہ کا پتہ لگاتا ہے، اور چیونٹی بو ہی سے دانے کے مقام کو معلوم کرکے اوس کو اپنے سوراخ مین لے آتی ہو، حاسۂ باصرہ حیوانات کے لئے بہت زیادہ سودمند اور نفع بخش ہے، یہ اسی کی مدد سے اپنے دشمن اور دوست مین مدد کرتے ہین، اس کے علاوہ اسی سے وہ مرغوب غذا کو طلب کرتے، اور مضر رسان اور مہلک مقامات سے دور بھاگتے ہین،

لیکن نفس ناطقہ کے لئے حاسۂ سامعہ باقی تمام حواس پر افضل ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ کو دیگر نفوس پر جو فضیلت حاصل ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ یہ علم پذیر ہے جس نفس کو حاسہ سامعہ نہین ہوتا، اس کو نہ تو بولنا آتا ہے، نہ وہ علوم ریاضی یا دیگر علوم حاصل کرسکتا ہے، یہان تک کہا جاسکتا ہے، کہ جو شخص گنگ ہو، وہ درجہ مردمی سے ساقط ہے نفس ناطقہ کے لئے حاسۂ شامہ سب حواس سے کمتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص مین یہ حاسہ نہین، اس کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچتا ہے، کہ وہ خوشبوؤن کو حاصل نہین کرسکتا، لیکن اس کی تلافی اس طرح ہو جاتی ہے، کہ وہ بدبوؤن سے بھی محفوظ رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفس ناطقہ کے لئے جو حاسہ شریف ترین ہے، یعنی حاسہ سامعہ وہ بے سخن حیوانات مین خسیس ترین ہے، اور جو اس کیلئے خسیس ترین ہے، یعنی حاسۂ شامہ، وہ حیوانات کیلئے شریف ترین ہو انسان مین قوت ذائقہ بہت لطیف اور قوی ہوتی ہے، اسی سے وہ چیزون کی طرف رغبت کرتا ہے، اور بھوک کی لذت، یا تکلیف، کے علاوہ وہ دو لذتین حاصل کرتا ہے، کہ بے سخن حیوانات کو میسر نہین آتین، حواس لامسہ اور باصرہ کے اعتبار سے انسان اور حیوانات مین کوئی فرق نہین، دونون ان حواس کی وجہ سے اپنے آپ کو گرمی اور سردی کی تکلیف سے محفوظ رکھتے ہین، جنسی کھانے کی لذت حاصل کرتے ہین، تاکہ ان کی نوع تلف نہ ہوجائے، اپنے دشمن سے دور بھاگتے ہین، اور مہلک مقامات سے کنارہ کرتے ہین، بایں ہمہ جو مخصوص منافع کہ نفس ناطقہ کو حواس سے حاصل ہین، اور جن تک حیوانات کی رسائی نہین اُن مین سے ایک علم ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ حیوانات پر فضیلت رکھتا ہو،

بے علم انسان تو گائے بیل کی مانند ہوتا ہے، اور باعلم فرشتوں کا ہم مرتبہ ہوتا ہے، بے علم انسان کے نفس تک یہ علم دو راستوں سے پہنچتا ہے، ایک قول اور دوسرا کتابت[1] قول سے استفادہ ممکن ہوتا ہے سامعہ کی وجہ سے، اور کتابت سے باصرہ کی مدد سے، یعنی اگر سماعت نہ ہو، تو قول کو سُن نہیں سکتے، اور اگر بصارت نہ ہو تو تحریر کو پڑھنا ناممکن ہو، ان دو حواس کے ذریعے علم حاصل کرنے کے بعد انسان گائے بیل کے درجے سے ترقی کرنے کے بعد فرشتہ بن جا سکتا ہے، اسی واسطے کہا جا سکتا ہے، کہ انسان کے لئے یہ دونوں حواس باقی ماندہ حواس کی بہ نسبت افضل ہیں، پھر ان دونوں میں سے سامعہ باصرہ کے مقابلے میں بھی شریف تر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مادرزاد اندھا ہو، لیکن اس کی قوت سماعت درست ہو تو وہ سن کر ہی بہت علم حاصل کر سکتا ہے، اگرچہ وہ شکلوں اور رنگوں کا تصور نہیں کر سکتا، اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص مادرزاد بہرا ہے، تو اوس کو بولنا ہی نہیں آتا، نہ وہ کوئی علم حاصل کر سکتا ہے، حالانکہ اس کی قوت بصارت میں کوئی فتور نہیں، اس کو ایسا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے، جس میں وہ اشاروں سے کام چلا سکے، مختصر یہ کہ جس طرح نفس نامیہ (نباتی) کا کمال یہ ہے کہ وہ نمو پذیر ہو، اسی طرح نفس ناطقہ کا کمال یہ ہے کہ وہ علم پذیر ہو، اور نفس ناطقہ کا یہ کمال بغیر ان دو حواس کے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر ان دونوں حواس کو دیگر حواس کے مقابلے میں شریف تر مانا گیا ہے، جو فائدے کہ انسان کو ان دو حواس سے حاصل ہوتے ہیں، ان سے بے سخن حیوان محروم رہتا ہے، یہ نفس ناطقہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں، پھر یہ شخص درجہ علوم پر پہنچتا ہے، تو ان فوائد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس ناطقہ کے یہ دونوں حواس زیادہ دقت پذیر ہوتے ہیں،[2]

(۸)

جن حواس ظاہری کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان سے انسان صرف محسوسات کا علم حاصل کر سکتا ہے، معقولات کو حاصل کرنے کیلئے اس کو حواس باطنی کی ضرورت ہوتی ہے، کسی قول کی محض آواز یا کسی تحریر کی شکل و صورت تو محسوسات میں سے ہے، اور اس آواز اور اس تحریر کے معنی معقولات میں سے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے،

---

[1] زاد المسافرین ص۱۹، [2] ایضاً ص۱۶-۲۲

کہ جو کچھ بھی حواس باطنی سے حاصل ہوتا ہے، وہ بالضرورت حواس ظاہری کے راستے سے گذر چکا ہوتا ہے، چنانچہ مادرزاد اندھا شخص رنگون اور شکلون، اورمادرزاد بہرا شخص آوازون اور لحنون کا تخیل کرسکتا ہی نہ ان پر فکر کرسکتا ہی، حواس ظاہری کی طرح حواس باطنی بھی پانچ ہین، تخیل، وہم، حفظ، فکر اور ذکر، یعنی یاد کرنا، سطور آیندہ مین انہی پر بحث ہوگی،

حواس باطنی مین سے وہم گویا حرکت فکر ہے، یا عقل کی سب پہلی حرکت ہے، اس کے پس پشت حس ہوتی ہے یعنی جس چیز مین حس نہین ہوتی، اس مین وہم بھی نہین ہوتا، لیکن حس کے مقابلے مین وہم زیادہ خطا پذیر ہوتا ہے، چنانچہ انسان اکثر زیانکار چیزون کو سودمند سمجھتا ہے، اور بالعکس سودمند چیزون کو زیانکار، وہم اور حس مین فرق یہ ہے، کہ حس کی فعلیت بیداری مین ہوتی ہے، اور وہم کی بیداری اور خواب دونون مین، اس کے علاوہ حس سے حاضر اشیار کا علم ہوسکتا ہے، لیکن وہم سے حاضر اور غائب دونون اشیا معلوم کی جاسکتی ہین، حیوان مین وہم کا وہی درجہ ہوتا ہے، جو انسان مین عقل کا ہوا کرتا ہے، لیکن وہم کا اثر عقل کے اثر کی نسبت کمزور ہوا کرتا ہے، انسان کی قصدی حرکات فکر کا نتیجہ ہوتی ہین اور وہم نفس بہیمی کی حرکت ہے[1]، اس کی تعریف یہ ہے کہ یہ قوت ہی جس سے ہوا کی وساطت سے اشیار دریافت کی جاتی ہین، یا یہ کہ یہ وہ قوت ہی، جو محسوسات کے اثر کو قبول کرتی ہے؛ اس کے مقابلے مین قوت تخیلہ، یا تخیل وہ قوت ہے، جو محسوسات کی صورت کو اُن کے ہیولیٰ سے مجرد کرکے ان کی نگہداشت

---

[1] کتاب زاد المسافرین کا جو قلمی نسخہ کیمبرج مین ہے، اس پر حاشیہ اور شرح بھی ہے، اس موقع پر حاشیہ نویس اور شارح کا یہ فقرہ بہت بصیرت افروز ہے، "...... تخیل در چیزے تواند کرد کہ اول از حواس ظاہر یافتہ باشد، وہمچنین تفکر و توہم والا در چیزے کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، از راہ حواس باطن نمی تواند دانست، واگر کسی گوید کہ چیزے را تخیل و توہم کند، کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، مثل آدم دو سرو دریائے زیبق را مثال این گوئیم کہ چون آدم، و سررا، ہر دو را دیدہ و ہمچنین دریا و زیبق را بتفصیل و ترکیب کند کار متفرقہ است، و این کارہا کند" (ص ۴۸ و ۴۹) زمانہ حال کے ماہرین نفسیات بھی اپنی اپنی کتابون مین تخیل کی بحث مین گویا اسی فارسی عبارت کا ترجمہ کردیتے ہین، چنانچہ دیکھو نفسیات مصنفہ پروفیسر اینجل ص ۲۰۳، ۵۲ لیکن چند سطرین قبل ہی کہا گیا ہے، کہ "وہم نخستین حرکت عقل است" (ص ۴۳) اور عقل نفس ناطقہ کے لئے مخصوص ہی، لیکن اب یہان وہم کو نفس بہیمی کی حرکت کہا جارہا ہی، جو عقل سے مبرا ہوتا ہے، اس تضاد کا کیا حل ہی؟

کرتی ہے، یہ قوت دماغ کے سامنے کے حصہ میں ہوتی ہے،[1] قوتِ متخیلہ ان صورتوں کو مجرد کرکے ان کو قوتِ[2] حافظہ کے سپرد کرتی ہے، یہ بھی ایک حسِ باطنی ہے، اور یہ موخر دماغ میں ہوتی ہے، ایک اور حسِ باطنی ذاکرہ ہے، جو ان محفوظ صورتوں کو حفظ میں سے واپس نکالتی ہے، قوتِ حافظہ اور قوتِ ذاکرہ میں سے مقدم قوتِ حافظہ ہوتی ہے، کیونکہ جب تک کہ کوئی چیز حفظ نہ کی جائے، اس وقت تک اس کا احیاء، یا تذکرہ ممکن نہیں ہو سکتا، جب قوتِ متخیلہ "صورتہائے شخصی، یا صورتہائے قولی، یا صورتہائے کتابتی" میں سے ایک صورت کو اس کے ہیولی سے مجرد کرتی ہے، اور قوتِ حافظہ کے سپرد کرتی ہے، تو قوتِ حافظہ اس صورت کی نگہداشت کرتی ہے، پھر جو صورت کہ قوتِ متخیلہ اس کے بعد اسکے سپرد کرتی ہے، قوتِ حافظہ اس کا مقابلہ پہلے کی صورت کے ساتھ کرتی ہے، جب یہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مشابہ پاتی ہے، تو اوس کو وہی صورت سمجھتی ہے اور جب یہ صورتیں ایک دوسری سے نہیں ملتیں، تو جان لیتی ہو کہ یہ وہ نہیں،

ان تمام حواسِ باطنی کے وظائف کو حکیم ناصر خسرو نے ایک لطیف تشبیہ کی صورت میں بیان کیا ہے، کہتے ہیں کہ قوتِ متخیلہ، جو صورتوں کو اُن کے ہیولی سے مجرد کرتی ہے، گویا ایک لکھنے والا شخص ہے، جو "صورتِ قول" کو اس کے ہیولی یعنی ہوا اور آواز، اور "صورتِ نوشتہ" کو اس کے ہیولی یعنی سیاہی و کاغذ و حروف وغیرہ سے مجرد کرکے اس صورت بے ہیولی کو قوتِ حافظہ کے اندر لکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں جو کچھ انسان کے حافظے میں ہوتا ہے، وہ نفسانی کتابت ہے، جس کو نفس قوتِ متخیلہ کے قلم سے حافظے کے کاغذ پر لکھتا ہے، چنانچہ ہم جانتے ہیں، جب ہم کسی تحریر، یا قول کو حفظ کرتے ہیں، تو حروف و الفاظ

---

[1] شارح کا خیال ہے کہ :- "مراد از قوتِ متخیلہ حس مشترک است کہ مرجع محسوسات را کہ ہمہ حواس ظاہر دریابند دریابد و آن صورتہا را بخزانہ خیال سپارد، نہ قوت متخیلہ کہ جمہور آن را غیر حس مشترک دانند و کار او ترکیب و تحلیل صور است و مکان آن را کہ در مقدم دماغ گفتہ نیز موید ہمین است" (ص۴۹) [2] شارح کے نزدیک :- "مراد از قوتِ حافظہ درین جا قوتِ خیال است کہ حافظ و نگاہدارندۂ صورت است، نہ قوتِ حافظہ کہ مصطلح قوم است کہ آن حافظ و نگاہدارندۂ معانی جزئی است، کہ واہمہ ادراک نمودہ پس قوتِ حافظہ بمعنی لغوی است نہ اصطلاحی، اما تعیین مکان این قوت کہ حافظہ صورت است موخر دماغ کردن درست است، اگر گوییم کہ موخر بطنِ اول دماغ باشد" (ص۴۹)

تو غائب ہوجاتے ہیں، اور وہ صورت مجرد باقی رہ جاتی ہے، جس کو قوتِ متخیلہ نے منتزع کرکے قوتِ حافظہ کے سپرد کیا ہے،

قوتِ ذاکرہ گویا ایک شخص ہے، جو اس کتابتِ نفسانی کو پڑھتا ہے، چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قوتِ ذاکرہ جب چاہتی ہے اُن نوشتوں

کو پڑھ لیتی ہے، جو حفظ ہیں، اور خود وہ نوشتے اپنے اپنے حال پر باقی رہتے ہیں، اس کتابت کا حال عام جسمانی کتابت کا سا ہے

کہ ان کو خواہ کتنا ہی پڑھا یا سنا جائے، ان کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے، کہ نفس قوتِ ذاکرہ

کی مدد سے اُس نوشتۂ نفسانی کو پڑھ سکتا ہے جس کو قوتِ متخیلہ نے حافظہ کے کاغذ پر لکھا ہے، اور اس پڑھنے میں آواز اور حروف

شنودنی کو ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ اگر ہم کوئی شعر حفظ کرلیں، تو پھر بعد میں باآواز بلند پڑھے بغیر اس کا

اعادہ کرسکتے ہیں،

مندرجۂ بالا تشبیہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ جس طرح نفس کی ظاہری کتابت و کتابہ ہوتی ہے، اسی طرح باطنی کتابت

و کتابہ بھی ہوتی ہے، اور جس طرح اس کی ظاہری گفتاری، و گفتہ ہوتا ہے، اسی طرح باطنی گفتاری و گفتہ ہوتا ہے،

فرق یہ ہے کہ ظاہری جو کچھ ہے، وہ ہیولیہائے مصور ہے، اور باطنی جو کچھ ہے، وہ صورتِ بے ہیولیٰ لہذا ضروری ہے

کہ ان مجرد صورتوں کو حاصل کرنے والی قوتیں لطیف ہوں، یہ قوتیں حواس باطن ہیں، باوجود اس کے کہ محسوسات و مدرکات

بکثرت ہیں، لیکن پھر بھی یہ حواس باطن ان سب کیلئے تنگ نہیں، ان تمام صورتہائے ہیولانی کا نمایندہ مشاعر جسم میں ہے، یہ حواس

ظاہری ہیں، ان حواس کی خصوصیت یہ ہے، کہ یہ دو چیزوں کو بیک وقت اور بیک جا حاصل نہیں کرسکتے، بلکہ ایک ایک کرکے

پاتے ہیں، محسوسات ان کے اندر پہنچ کر ایک دوسرے کی مزاحمت کرتے ہیں، اور ان کے لئے ان حواس کے اندر جگہ تنگ

ہوجاتی ہے، چنانچہ ایک ہی مقام پر دو حرف نہیں لکھے جاسکتے، اس کے مقابلے میں کتابتِ نفسانی میں بہت سے مختلف علوم جگہ

پاتے ہیں، اور ان کے آپس میں نہ مزاحمت ہوتی ہے، نہ اُن کے لئے جگہ کی تنگی ہوتی ہے[1]

---

[1] زاد المسافرین ص۲۱۲-۲۱۴ حکیم ناصر خسرو نے اپنی مثنوی روشنائی نامہ (مطبوعہ کاویانی ص۱۰) میں حواس ظاہری و باطنی اور ان کے وظائف کو بہت خوبی اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، کہتے ہیں:-

ترا زین خان شش سورہ گزر شد، درین خان خانہ تو پنج در شد،

مختصر یہ کہ قدرت نے اشیائے عالم کو دریافت کرنے کیلئے دو آلات بنائے ہیں، ان میں سے ایک تو حواس ظاہری ہیں، جن سے محسوسات و مشاہدات دریافت کئے جاتے ہیں، اور دوسرے حواس باطنی ہیں جن سے نامحدود و نامتناہی چیزیں دریافت کی جاتی ہیں، اب چونکہ انسان اپنے حواس ظاہری سے تمام متناہیات و جسمانیات کو دریافت اور ان کے تمام منافع و فوائد کو حاصل کر لیتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ وہ حواس باطنی سے نامتناہیات کو دریافت اور قبول، اور اون کے تمام فوائد کلی کو حاصل کرے کہ اسی کا نام عقل ہے، ہمارے اس دعویٰ کی، کہ انسان نے اپنے حواس ظاہر سے تمام اون فوائد و لذات و منافع کو حاصل کر لیا ہے، جو اس دنیا میں موجود ہیں، اور اب کوئی چیز ایسی نہیں رہی جس کو اوس نے چھوڑ دیا ہو، یا جو اس سے پوشیدہ رہی ہو، دلیل یہ ہے کہ زمانہ دراز گذر گیا، اور اب تک کوئی نئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ انسان پہلے ہی سے اوس سے واقف نہ ہو[۱]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۳) کشادہ ہر درے در بوستانے ، زہر در اندر آید کاروانے ،

اگرچہ اندرین خانہ غریبی ، ازین بر پنج دریا بانصیبی ،

یکے چشمت کو بیند عجائب ، شود زین دید فی رائے تو صائب ،

دگر گوشت کہ شہر او کلامست ، ولت را زان معانی بس تمامست ،

دگر بینی کہ بوئے گل پذیرد ، دماغ و دل ز بویش ذوق گیرد

ز ذوق و لمس نعمت ہست بہرہ ، چو نرمی یا درشتی دست بہرہ

حواس ظاہر اند این پنج باطن ، بود پنج دگر اے یار محسن ،

خیال و وہم و فہم و حفظ دیگر ، کہ حس مشترک خوانیش بر سر ،

خطا بینند باز این پنج گانہ ، توانی راست بین شان کرد یانہ

ریاضت کش مراد و راست بین کن ، پس آنگاہے گمانت را یقین کن ،

چو اینہا راست بین گشتند از آن پس ترا سرمایہ این اندر جہان بس ،

کشادہ گردد آنگہ چشم بینش ، ببینی آن ورائے آفرینش

[۱] یہ دلیل بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ اس کو تسلیم کر لینے سے کیا انسان (نعوذ باللہ) عالم الغیب والشہادہ نہیں بن جاتا؟

اب رہا یہ دعویٰ کہ انسان حواس باطنی سے نامتناہیات پر اطلاع پاتا ہے، سو اس کی دلیل یہ ہے، کہ حواسِ باطنی کی قوت بھی نامتناہی ہے، چونکہ متناہی قوت والے حواس یعنی حواس ظاہری سے موجوداتِ متناہی سے واقفیت ہوتی ہے، لہذا ظاہر ہے کہ نامتناہی قوت والے حواس یعنی حواس باطنی، موجودات نامتناہی کا علم مہیا کریں گے خصوصاً اس لئے بھی کہ نامتناہیات کی اصل یعنی عقل بھی انسان کو عنایت ہوئی ہے۔ اس پر معترض کہہ سکتا ہے، کہ جب انسان نامتناہی پر مطلع ہوجاتا ہو، تو یہ نامتناہی اس کے لئے متناہی بن جاتا ہے، چنانچہ اگر یہ صحیح ہے کہ آسمان اپنی اس وسعت کے باوجود آنکھ کے تل میں سماسکتا ہے، اور اس قدر مختلف و متلون صورتیں قوتِ متخیلہ میں جو کاسۂ سر کے اندر ہے، جگہ پاسکتی ہیں، تو یہ بھی صحیح ہے کہ نامتناہیات اپنی بے نہایتی کے باوصف نامتناہی قوتوں کو متناہی کر دیں، لیکن ہمارے اس قول کی تائید کہ انسان اپنے حواس باطنی سے روحانیات کے کلیاتِ نامتناہی سے مطلع ہوجاتا ہے، حواس ظاہری کے ضائع نہ ہونے سے ہوتی ہے، اس کے علاوہ جب انسان حواس ظاہری سے تمام فوائد جسمانیات کو حاصل کرلیتا ہے، تو ضروری ہے کہ وہ حواس باطنی سے "تمام فوائد عقلانی" کو حاصل کرے، اور پھر بھی یہ نامتناہی قوتیں ضائع نہ ہوں، بعینہٖ اس طرح جیسے کہ متناہی قوتیں ضائع نہیں ہوتیں[۱] (باقی)

سیر الصحابہ حصہ ششم

جسمیں بہ ترتیب چار اہم ہستیوں حضرت امام حسن، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسین اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے حالات و سوانح اخلاق و فضائل، اور ان کے مذہبی، علمی، اخلاقی، اور سیاسی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، ضخامت ۳۰۷ صفحے، قیمت ے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۴) لیکن شارح کا خیال ہے کہ "اگر کسے گوید کہ بسیار چیزہا درین زمانہا نزدیک ظاہر شدہ است کہ پیش ازین ظاہر نہ بودست، این حکم چگونہ راست باشد؟ گوئیم کہ بعض چیزہا کہ بر بعض مردم بعض اقالیم ظاہر شدہ آن نیست کہ بعض مردم اقالیم دیگر ندانستہ اند، بلکہ بر آنہا ظاہر .... (یہاں ایک لفظ کرم خوردہ ہے، مصحح کو معلوم نہ ہوسکا کہ کیا ہے) نہایتش بر مردم اقالیم دیگر بعد از مدتے رسیدہ، پس چیزے نبودہ کہ بر مردم ظاہر نشدہ است" (صفحہ، صفحہ) زاد المسافرین ص ۲۶۹ - ۲۷۰،

فردوسی کا بزمیہ کلام

از

جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی

عجم کا نامور شاعر فردوسی اپنی غیر فانی رزمیہ نظم شاہنامہ کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کر چکا ہے، اس لئے اس شاہکار کے بعد کسی دوسرے کلام کو اس سے منسوب کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی، لیکن مؤرخین اور تذکرہ نویسوں نے شاہنامہ اور مثنوی یوسف و زلیخا کے علاوہ بھی فردوسی کے بزمیہ کلام از قسم قصائد و غزلیات، قطعات، رباعیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے متفرق اشعار بھی نقل کئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران کا یہ مایۂ ناز رزمیہ نویس بزمیہ شاعری پر بھی قدرت رکھتا تھا، اگرچہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فردوسی نے کوئی دیوان مرتب کیا ہو، دولت شاہ کے اس بیان سے کہ

"شاعری پیشہ ساختہ، قطعہ و قصائد می گفت از خاص و عام وجہ معاش بدو می رسید[1]"

معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ لکھنے سے پیشتر فردوسی بھی اور پیشہ ور شاعروں کی طرح قصائد و غزلیات لکھکر معاش حاصل کرتا ہوگا، لیکن نظامی عروضی کا بیان ہے، کہ فردوسی کا پیشہ زمینداری تھا جس کی آمدنی سے وہ کسب معاش کرتا تھا[2] اسلئے ظاہر ہے، کہ معیشت کے لئے وہ کسی کا محتاج نہ تھا اسی طرح جو اشعار قصائد وغیرہ کے ملتے ہیں، اُن سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ اوس نے مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہو، بہرحال اس سے اتنا پتہ چلتا ہے، کہ فردوسی نے قصائد و غزلیات وغیرہ لکھے تھے، جن کا بہت سا حصہ برباد ہوگیا، اور بالفعل نایاب ہے،

---

[1] تذکرہ دولت شاہ ص۱ طبع بمبئی، [2] چہار مقالہ ص۴۷ طبع ایران شہر برلن،

خود فردوسی اپنی مثنوی یوسف و زلیخا مین[1] جو اس کی آخر عمر کی تصنیف ہی، اپنے عاشقانہ اشعار و غزلیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے،:-

بسے نامۂ دوستان گفتہ ام، الخ

ہمیدون بسی راندہ ام گفتگوے زخوبان شکرّلب ماہروی،

لیکن صاحب مرأۃ الخیال کے نزدیک شاہنامہ کے سوا فردوسی کا اور کلام نہین ہی[2] اس پر تنقید کرتے ہوئے مولٰنا آزاد فرماتے ہین،:-

"تذکرۂ مرأۃ الخیال مین جو لکھا ہے کہ سوائے شاہنامہ کے کوئی اور نظم اوس کی نہین یہ غلط ہی کیونکہ قصہ حضرت یوسف راقم نے بچشم خود دیکھا ہی ××× دو قطعہ جو تاریخ ہفت اقلیم مین دیکھے گئے اہل اخلاق کیلئے تحفۂ دلکش ہین[3]"

اس کے بعد آزاد نے ہفت اقلیم کے حوالہ سے تین قطعے اور ایک رباعی نقل کئے ہین،

حمد اللہ مستوفی نے لکھا ہے، کہ شاہنامہ کے علاوہ فردوسی کے عمدہ اشعار ہین، اور ایک غزل کے چار شعر نقل کئے ہین[4]

لطف علی آذر نے بھی فردوسی کے اشعار نقل کئے ہین، اور لکھا ہی کہ

"چندبیتے از قصائد و قطعات و رباعیات کہ در بعضے کتب متفرقہ بنظر رسیدہ منتخب و نوشتہ شد[5]"

رضا قلی ہدایت نے بھی لکھا ہی کہ مثنویات کے علاوہ فردوسی کے قصائد اور غزلیات بھی تھین، جو باقی نہین رہین[6] اور متفرق اشعار نقل کئے ہین،

فردوسی کے بزمیہ کلام (قصائد و غزلیات وغیرہ) پر یورپین مستشرقین ڈاکٹر ایتھے (ETHE) نے ایک

---

[1] چند سال ہوئے پروفیسر شیرانی نے رسالہ اُردو مین ایک مضمون لکھا تھا جس مین مثنوی یوسف زلیخا کو فردوسی سے منسوب کرنے کی وجوہ پر مفصل بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ یہ مثنوی فردوسی کی تصنیف سے نہین ہی، [2] مرأۃ الخیال ص۴۲ بمبئی [3] نگارستان فارس ص۱۳۰،۱۳۱ [4] تاریخ گزیدہ ص۸۱۴، طبع عکسی لندن، [5] آتش کدہ [6] مجمع الفصحا جلد اول ص۳۸۳،۳۸۴۔

مضمون بعنوان FIRDUSI ALS LYRIKER لکھا تھا، جو میونخ (جرمنی) کے رسالہ SITZUNGSBERICHTE - (جلد ۲ ۱۸۷۲ء ص ۲۷۵-۳۱۰ اور جلد ۳ ۱۸۷۳ء ص ۶۲۳-۶۵۳) مین شائع ہوا تھا، پروفیسر براؤن نے اس مضمون کا حوالہ اپنی کتاب مین دیا ہی[۵] اصل مضمون جرمن زبان مین اور بالفعل نایاب ہے صرف اس قدر معلوم ہو سکا، کہ ایتھے نے اپنے مضمون مین جن کتابون کا حوالہ دیا ہی وہ حسب ذیل ہین:-

۱- مجموعۂ اشعار شعراے متقدمین یعنی ایک سو ستر شعرائے اشعار جو زیادہ تر فردوسی کے پیش رو اور اس کے معاصر شعرار کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہی، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ مین موجود ہی،

۲- مخزن الغرائب، تذکرۂ شعرار فارسی قلمی،

۳- مخزن الغرائب، اسی نام کا ایک اور رسالہ،

۴- لباب الالباب عوفی،

۵- آتشکدۂ آذر،

۶- ہفت اقلیم امین رازی،

۷- ریاض الشعرار والۂ داغستانی،

۸- لب لباب،

۹- خلاصۃ الافکار،

۱۰- بتخانہ،

۱۱- منتخب التواریخ بدایونی،

مندرجۂ بالا کتابون مین فردوسی کے جو اشعار منقول ہین، ان کو ایتھے نے یکجا جمع کر دیا ہی، جن مین ایک قصیدہ ۷۵ شعر کا، تین غزلین، چھ رُباعیان تین قطعے اور دو قصیدے اور ہین، لیکن ایتھے کے منقولہ بعض قطعے اصلی نہین ہین،

---

[۵] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۲ ص ۱۳۱ کا نوٹ. نمبر ا،

جیسا کہ اون کی سست بندش اور بے ربطی سے پایا جاتا ہی اسی بنا پر ایک ایرانی محقق نے یہ اعتراض کیا ہی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح مین جو اشعار ہین، وہ تمامتر متوسطین اور متاخرین کی تصنیف سے ہین۔[۱]

ایسے کی کتب مرجوعہ مین اکثر قلمی کتابین ہین، جو عسیر الحصول ہین، اس لئے اس کی بیان کردہ تین مطبوعہ کتابون لباب الالباب، آتشکدہ، اور منتخب التواریخ کے علاوہ بعض دیگر کتب تذکرہ کی مدد سے ہم ذیل مین فردوسی کے اشعار نقل کرتے ہین،

۱- لباب الالباب عوفی، (جلد دوم ص۳۳ طبع لندن)

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم	زگفتار تازی واز پہلوانی،
بچندین ہنر شصت ودو سال بودم	کہ گوشہ برم زآشکار و نہانی۔
بجز حسرت و جز وبال گناہان،	ندارم کنون از جوانی نشانی،
بیاد جوانی کنون مویہ آرم،	بدین بیت بو طاہر خسروانی،
جوانی من از کودکے یاد دارم،	دریغا جوانی دریغا جوانی،

۲- تاریخ گزیدہ (ص۸۲۴) طبع عکسی لندن)

شبے دربرت گر برآسودمی،	سرِ فخر بر آسمان سودمی،
قلم در کفِ تیر بشکستمی،	کلاہ از سر مہر بر بودمی،
بقدر از نہم چرخ بگذشتمی،	بہ پی فرق کیوان بفرسودمی،
بہ بیچارگان رحمت آوردمی،	بدرماندگان بر بخشودمی۔

۳- ہفت اقلیم (نگارستان فارس ص۱۵۶، ص۱۵۷)

فلک گر بزیر نقاب اندراست	وگر زیر پرّ عقاب اندراست

---

[۱] مجلہ کاوہ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ ص۳ طبع برلین،

مپندار کو از پئے کار تو، — بہ بند خطا و ثواب اندر است

اگر بد کنی کیفر خود بری، — نہ چشم زمانہ بخواب اندر است

برایوانہا نام بیژن ہنوز، — بزندان افراسیاب اندر است

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم الخ (مطابق تاریخ گزیدہ)

بیا گوے کہ پرویز از زمانہ چہ برد — برو بپرس کہ کسری ز روزگار چہ خورد،

گر او گرفت ممالک بدیگران بگذاشت — ور این ہنا د خزائن بدیگران بسپرد،

تا چند نہی بر دل خود غصہ و درد — تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد

زان پیش کہ گرد و نفس گرم تو سرد — با دوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد

۴ - منتخب التواریخ (جلد اول ص۱۰ طبع کلکتہ)

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست — چگونہ دریا کا نرا کنارہ پیدا نیست

شدم بدریا غوطہ زدم ندیدم دُر — گناہ بخت من است این گناہ دریا نیست

۵ - آتشکدہ (ص۹۲، ص۹۷ طبع بمبئی)

مستست ہمی چشم تو و تیر بدست، — بس کس کہ ز تیر چشم تو نجست،

گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست — کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

بیا گوی کہ پرویز از زمانہ چہ خورد، الخ (مطابق ہفت اقلیم)

بسی رنج دیدم الخ (مطابق مذکورۂ بالا) صرف ۲ شعر،

تا چند نہی بر دل خود غصہ و درد، الخ (مطابق ہفت اقلیم)

دوش از سر لطف بندہ پروردن خویش — بنمودی طریق مردمی گردن خویش

جرمم ہمہ عفو کرد و دستم بگرفت — خندان خندان فگند در گردن خویش

۶ - مجمع الفصحاء (جلد اول ص۳۵۳، ص۳۵۴ طبع ایران)

شہی کہ چون بدو انگشت در زخیبر کند برآمد از پے اسلام صد ہزار انگشت

علیِّ عالیِ اعلیٰ کہ دستِ قدرتِ او ہزار رہ زدہ در چشم روزگار انگشت

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست بہیچ وجہ مراد را زمانہ جویا نیست

برو مجاور دریا نشین مگر روزی بدستت افتد دری کش ہمتا نیست

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست الخ، (مطابق منتخب التواریخ)

بیا بگوی کہ پرویز از زمانہ چہ خورد الخ، (مطابق مذکورۂ بالا)

دو چیز بر تو بے خطر ببینم، کانرا خطر است نزد ہر حستر

دینار چو برنہی بسر بر تاج، در معرکہ جان چو برنہی مغفر

اگر بدانش اندر زمانہ لقمان وار سرای پردۂ عصمت برآسمان زدۂ

وگر زکتبِ فلاطون وارسطاطالیس ہرآنچہ ہست پسندیدہ پاک بستدۂ

اگر سپہبد سیصد ہزار شہر شوی وگر برہمن ششصد ہزار بتکدۂ

بہ پیش ضربت مرگ این ہمہ ندارد سود ہمی بباید رفتن چنانکہ آمدۂ

"در اظہار تاسف از جوانی و تضمین بیت ابو طاہر المتخلص بخسروانی"[۵] (مطابق عوفی وغیرہ)

"از غزلیات اوست"

شبی در برت (مطابق گزیدہ وغیرہ)

اسمین ایک شعر زائد ہے، اور "درماندگان" کی بجائے "دلدادگان" ہے،

جمال تو گرزان کہ من داری ہ بجائے تو گرزان کہ من بودمی،

"در حضور سلطان محمود بر حسب امر بجہت دمیدن خط ایاز او یاق گفتہ"

---

[۵] ابو طاہر الطیب بن محمد الخسروانی طبیب، شعرائے آل سامان مین سے تھا، (لباب الالباب ج ۲ ص ۳)

مستست ہمی چشم تو و تیر بدست ــــ بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست

گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست ــــ کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

غم در دل من درآمد و شاد برفت ــــ با زآمد و رخت خویش بنہاد برفت

گفتم بہ تکلف کہ زمانی بنشین، ــــ بنشست و کنون رفتنش از یاد برفت

تا چند ہمی بر دل خود غصہ و درد، الخ (مطابق ہفت اقلیم وغیرہ)

دوش از سر لطف بندہ پروردن خویش، الخ (مطابق آتشکدہ)

(۷) دیباچہ شاہنامہ (طبع بمبئی ص ۸ و ص ۱۰)

فردوسی کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ ایک مجلس میں جب کہ تمام درباری شعراء حاضر تھے، سلطان محمود نے ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں رباعی کہنے کی فرمایش کی، شعرائنے فردوسی کی طرف اشارہ کیا، اوس نے فی البدیہہ کہا:۔

مست است بتا چشم تو و تیر بدست، الخ (مطابق مجمع الفصحاء)

سلطان کو یہ رباعی بہت پسند آئی اور اوس نے فردوسی کی بہت تعریف کی،

سلطان محمود کے وزیر احمد بن حسن میمندی، اور فردوسی میں مخالفت تھی، اس وجہ سے فردوسی کے احباب اسکو اس بات کی ترغیب دیا کرتے تھے، کہ وہ اس کی مخالفت ترک کرکے اس کے ساتھ موافقت پیدا کرلے، مگر فردوسی اسکی کچھ پروا نہین کرتا تھا، اور کہتا تھا:

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام ــــ مائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز

سوی در وزیر چرا ملتفت شوم، ــــ چون فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا، تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا:۔

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست الخ

ان کتابون کے علاوہ بعض لغت کی کتابون میں بھی فردوسی کے اشعار ملتے ہین، جو سند مین لائے گئے ہین،

مثلاً :-

۱- فرہنگ شوری :-

لغت "ترک" کی سند مین :-

بدو چگونہ دھسم کسوئی کہ از شرفش | کلاہ گوشہ عرش است ترک شب پوشم

لغت "ذوش" کی سند مین :-

بانگ کرد ست اے بتِ سیمین | ذوش خواندم ترا کہ ہستی ذوشش

لغت "گوش" کی سند مین :-

پاس می داشتم برائے و بہوش | وز خطاب کسم نیامد گوش

۲- مجمع الفرس،

لغت "ذرغ" کی سند مین :-

دل برد مرا و نزد مردم نشمردم (کذا) | گفتا کہ چہ سود است کہ درغ آب برد

لغت "فلاوش" کی سند مین :-

بر گرد گل سرخ تو خطی بکشیدی، | تا خلق جہانرا بجلاوش فگندی

مگر اسدی طوسی نے اس شعر کو رودکی سے منسوب[۱] کیا ہے، اور اس کو اس طرح لکھا ہے :-

گرد گل سرخ اندر خطی بکشیدی | تا خلق جہانرا بفگندی بجلاوش

۳- فرہنگ جہانگیری،

لغت "سکنک" کی سند مین :-

اسپے چنانکہ دانی زیر از میان زیر | در کاہی کہ داشت نہ سکنک نہ راہوار

۱؎ لغت فرس ۲۵ طبع جرمنی،

ان مآخذ کے علاوہ بھی اگر تحقیق کی جائے تو ممکن ہے کہ لغت کی کتابون اور اشعار کی بیاضون مین فردوسی کا اور کلام بھی حاصل ہوسکے ،

یہ تمام اشعار جو اوپر نقل کئے گئے ہین، بہت ممکن ہو کہ ان مین بعض اشعار فردوسی کے نہ ہون، لیکن اس مین شک نہین ہو کہ اکثر حصہ اسی کی تصنیف سے ہے، اور اسی کے نام سے تذکرون مین منقول چلا آتا ہے، اب رہا یہ سوال کہ یہ اشعار فردوسی کے شایان شان ہین یا نہین ؟ تو اس زمانہ کے طرز سخن کو دیکھتے ہوئے ہم فردوسی کے اس کلام کو معیار سخن سے گرا ہوا نہین پاتے، اگرچہ بعض سخن فہمون کے نزدیک وہ اس قدر قیمت کا مستحق نہین ہے، جیسا کہ فردوسی کے کلام کو ہونا چاہئے، چنانچہ پروفیسر براؤن بھی اس کے متعلق یہی رائے رکھتے تھے، لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن شعرا نے کسی خاص صنف نظم مین کمال پیدا کیا ہے، ان کا دوسرا کلام وہ وقعت اور رتبہ حاصل نہین کرسکا ہے، یہی وجہ ہے کہ نظامی گنجوی جو مثنویات کے امام مانے گئے ہین، ان کی غزلیات و قصائد مین وہ رنگ پیدا نہ ہوسکا، جو مثنویات مین ان کا امتیازی وصف ہے، بہر حال ہمارے پاس اس وقت فارسی کے ایک قدیم اور نامور شاعر کے کلام کا کچھ حصہ جو اس نے شاہنامہ کے علاوہ لکھا تھا، موجود ہے، اور اصناف قصیدہ و غزل وغیرہ مین فردوسی کے طرز سخن اور انداز کلام کو ظاہر کررہا ہے ،

مقبرۂ شاہ بیگم

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مولف "حیاتِ جلیل" الٰہ آباد

خلوص و وفا کی پیکر، بے قرار اور دردمند دل والی بیگم آج اپنے شوہر جہانگیر کے قربِ ظاہری سے محروم اور اس کی آخری آرام گاہ سے منزلوں دور ہے، وہ الٰہ آباد میں دفن ہے اور جہانگیر لاہور میں، مگر اس کی بے چین روح کو تسکین وتسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اس کی ابدی خواب وراحت کے لیے اس کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی اسی کے نازبردار ہاتھوں سے سپردِ خاک ہوئی، وہ جیسی نفیس مزاج، جمیل وخوبصورت تھی نصیبوں سے ویسی ہی حسین ودلکش قبر بھی پائی، یہ مقبرہ نہایت خوش قطع غیر معمولی طرز کا ہے، ہندؤوں اور اندلسی مسلمانوں کے ملے جلے طریق تعمیر کا بہتر نمونہ، بیگم نے ایک ہندو راجہ کے گھر جنم لیا تھا، ایک مسلمان بادشاہ کے یہاں دم توڑا، اس لئے اسکا مدفن دونوں کی مخلوط ومتحد یادگاروں کی نظیر ہے، اکبر کے عہد کا عروج تھا، اور جہانگیر کی ذاتی نگرانی اور توجہ، ایسی چیز تیار ہوگئی جس کی مثال دوسری جگہ کم ملے گی تفصیل آگے آتی ہے۔

سلاطینِ اسلام کے مختلف خاندانوں اور مختلف دوروں کے مختلف طرزِ تعمیر سے صاحبانِ فن واہلِ نظر کو اطلاع وآگاہی ہے، اس لیے صراحت وتشریح کی ضرورت نہیں، اسقدر یاد دلادینا کافی ہے[1] کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں عربی تعمیرات کا اثر ختم ہوکر ہندؤوں اور ایرانیوں کا اثر قائم ہوگیا تھا، یا یوں کہیے کہ عربی طرزِ تعمیر کے بجاے ہندی طرزِ تعمیر غالب ہوکر جدید مغلیہ طرزِ تعمیر کی بنیاد پڑی تھی، جہانگیری طرزِ تعمیر میں جو مغلیہ طرزِ تعمیر کا وسطی یا دوسرا دور ہے، عربی اور ایرانی طرز کے ساتھ ہندؤوں اور بودھوں کا طرزِ تعمیر بھی نظر آتا ہے،

[1] مرقع اکبرآباد، از مولوی سید احمد مارہروی، صفحہ ۶،

یہ مقبرہ اس اتحاد کی زندہ یادگار اور جہانگیری عمارات میں نقشِ اولین ہے،

یہ سنگین و خوشنما نازک عمارت باغ کے پچھم جانب خسرو باغ کا تیسرا[1] مقبرہ ہے مسٹر بیل[2] کے حساب سے دوسرا اور زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے پہلا،

باغ کے صدر جنوبی دروازہ سے دو ڈھائی سو قدم کے فاصلہ پر بالکل سامنے یہ سہ منزلہ عمارت واقع ہے، اتفاق سے آجکل اس کے قریب ہی املی کے ایک پرانے درخت کی شاخیں راستہ پر بڑھ آئی اور پھیل گئی ہیں جس سے نگاہ کو دفعۃً رک جانا پڑتا ہے لیکن اسکا سایہ سایۂ رحمت اور باعثِ راحت و فرحت ثابت ہوتا ہے، اور دوسرا ہی قدم یا دوسری ہی نظر ڈالنے پر مقبرہ کا سنگین چبوترہ، بلند کرسی، سطحِ زمین سے ملا ہوا دروازہ بلکہ عمارت کی ہر چیز گنبد مع کلس سامنے آجاتا ہے، پھاٹک سے یہان تک پہنچنے کے لئے فراخ و کشادہ سڑک موجود ہے جو تقریباً آدھے راستہ تک خوب پختہ، سواری لے جانے کے قابل بنی ہے، اس کے دونون جانب دلآویز روش نشین سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں، خوشنما جھاڑیاں اور جابجا بڑے بڑے گھنے درخت بھی ہیں، بقیہ نصف راہ صرف پیادہ طے کرنا ہوتی ہے، کیونکہ گھومنے والوں کے لئے پختہ سڑک یہان سے بائیں کو گھوم جاتی ہے اور چند پتھر یہان سدِّ راہ کھڑے کر دیئے گئے ہیں، مرنے والون کی عظمت، منزلت اور قبرون کی حرمت، ادب و احتیاط کا اقتضا یہی تھا، یہ تجویز پرانی ہو یا حال کی اصلاح، ضرور قابلِ تحسین و اعتراف ہے،

اس مقبرہ اور اس کے حوالی کا ایک مکمل نقشہ صاف اور اچھا خفیف رنگین، امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ میں موجود ہے، جس کے نیچے ذیل کی عبارت لکھی ہے،

Mausoleum of the Ranee wife of the Emperor Jah-
-angir near Allahabad Drawn and engraved by Thos
Daniell

[1] آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا جلد دوم یعنی، دی مانومینٹل انٹی کوئیٹیز اینڈ انسکرپشنس، مولفہ ڈاکٹر اے فوہرر پی ایچ ڈی مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۳۰، اور پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس صفحہ ۵۳۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد جلد ہشتم مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۴۰ و جدید ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۳، و تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد، صفحہ ۱۴۲، [2] مفتاح التواریخ صفحہ ۳۲۵،

یہ نقشہ نامور چابکدست نقاش و مصور طامس وانیال کی صناعی و ہنرمندی کا شاہکار ہے اور ڈیڑھ صدی پہلے کی نقشہ کشی و طباعت کا کارنامہ، پیمانہ بڑا ہے، قرینہ ہے کہ نظری ہوگا، لیکن اصل سے بالکل ملتا جلتا ہے اور اصول پیمائش کے مطابق مانا جاتا ہے، مقبرہ کے پچھم پرانی دیوار اور کنواں مع تماشائیوں اور تفریح کرنے والوں کے انبوہ کے اپنی پوری شان و سامان کے ساتھ نظر آتا ہے، شہر و حوالی شہر کی مخلوق کا ایک جم غفیر پانی لینے کے لئے ہر قسم کے برتن، پکھالین، اور جانور ہمراہ لے کر امنڈا آتا ہے،

موجودہ حالت مین بھی مقبرہ کا منظر اور اس کا گرد و پیش نہایت دل پسند و دلکش ہے، پچھم جانب وسیع میدان ہے، لان (LAWN) ہین، پورب کو دو عمارتین ہین، پہلی اسکی بڑی بیٹی سلطان النسا شاہ بیگم کا خوبصورت گنبد، دوسری اس کے تحت جگر سلطان خسرو کا مرقد، شمال مین روشین اور کیاریان ہین، اور خیابان ہین، کچھ زیر زراعت زمین بھی ہے سر سبز و لہلہاتے ہوئے قطعات ہین، دیوار بھی قائم ہے، کنوان بھی مگر ایک بڑی حد تک بے مصرف، حوض بھی ہین، مگر خشک، سرو کے پودے حال مین لگائے گئے ہین، تاڑ کے دو پرانے درخت بھی باقی ہیں، معلوم نہیں، کس کی رعایت ذوق ملحوظ رکھی گئی ہے، کچھ اور سدا بہار درخت بھی ہیں ترتیب و نگہداشت کے لحاظ سے بلکہ ہر حیثیت سے کوئی چیز کسی طرح انگشت نمائی کے قابل نہین، اور یون تو ع

کیسی ہی ٹھیک بات ہو حسن کو اختلاف ہے

یہ تعمیر چار فٹ کی بلند کرسی پر کی گئی ہے، عمارت کے سب سے نیچے درجہ کا ہر پہلو اکتالیس گز ہے، اوپر چڑھنے کے لیے ایک ایک فٹ اونچی تین تین سیڑھیان ہین، یعنی آسایش و فراغت کے ساتھ پہنچ جانے کے لئے صدر دروازہ کے دونون جانب ایک ایک چھوٹا سا زینہ موجود ہے، نیچے اوپر مقبرہ کی تینون منزلین جدا جدا نظر آتی ہین، مگر یہ ایک ہی بنیاد یا دیوار پر قائم نہین ہین، بلکہ تینون طبقے یا مرتبے یکے بعد دیگرے بنے ہوئے ہین، مرتبہ اس عہد کی دفتری و کتابی اصطلاح مین منزل کے معنی مین مستعمل ہوتا تھا[۵۲]، یہ مرتبے مختلف انداز اور جدا جدا عرض و طول

[۵۱] الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ باڈرن ریویو آفس مین بھی اس کا ذکر ہے، ص ۵۲، [۵۲] جہانگیر نامہ معتمد خان

کے ہین، پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا چھوٹا، لمبائی چوڑائی اور بلندی مین کم ہوتا چلا گیا ہے، یہانتک کہ تیسری منزل کی وسعت بقدر مقدور اختصار کے ساتھ، نیز اسکی انتہائی بلندی، گنبد اور گنبد کے کلس پر پہنچکر ختم ہوجاتی ہے، فن ڈرائنگ کے ایک ماہر کا ارشاد ہے کہ مقبرہ کا فوٹو ایک مثلث نما چوکھٹے مین بڑی آسانی وخوبی سے آسکتا ہے؛

باہر سے دیوارین تمام وکمال سرخی مائل سنگ سفید کی ہین، کہین کہین زرد کھنٹو پتھر بھی استعمال ہوا ہے نیچے والے طبقہ (منزل) مین دیوارون کے باہر اٹھارہ فٹ چار انچ چوڑا چبوترہ ہے، اس چبوترہ مین تین سمت تو پانچ پانچ سنگین جالیان چار فٹ نو انچ لمبی ایک فٹ چوڑی لگی ہین، چوتھی طرف یعنی دکن کو سامنے کے رخ صرف دو جالیان ہین اور ان کے بیچ مین (صدر کا ایک) دروازہ، سب ملا کر سترہ جالیان ہوئین، یہ جالیان اصول فن پیمایش وتعمیر کے مطابق بنائی گئی ہین، اور روشنی کا اچھا کام دیتی ہین، یہ (داخلہ کا) دروازہ چبوترہ سے گذر کر یعنی چبوترہ کو کاٹتا ہوا بارہ فٹ نو انچ کے فاصلہ پر ملتا ہے عمارت کے علو ورفعت اور اپنے اطراف وجوانب کی بلندی وشان کے لحاظ سے آجکل تنگ اور نیچا سمجھا جاتا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ تین چار سو برس پیشتر یہی صورت پسند ورائج تھی، ہندوانہ تعمیرات مین یہ بات عام پائی جاتی ہے، موجودہ چوکھٹ اور کواڑون کی حالت اُن کی دیرینہ سالی وکہنگی کم از کم کثرتِ استعمال پر دلالت کرتی ہے، تختے کمزور، نسبۃً پتلے، قدرے ناہموار اور ناپیوست سے ہو رہے ہین، بالائے دروازہ محراب کی بلندی اس کی چوڑائی کی مناسبت سے نہین، بلکہ کچھ زیادہ پائی جاتی ہے، اس محراب کے دونون طرف یعنی آمنے سامنے دوسری منزل کو جانے کے لیے غیر مسقف (کھلے ہوے) زینون کی دہری قطارین ہین،

دیوارین پورا بوجھ اٹھانے کے قابل خوب مضبوط، موٹی موٹی، اینٹ اور چونے کی بنائی گئی ہین، تعمیر مین یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ منزل زیرین کے پہلے حصہ کی کھلی چھت دوسری منزل کے لیے چبوترہ کا کام دیتی ہے، اور دوسری منزل کی چھت تیسری یعنی سب سے اوپر والی منزل کے ساتھ کار آمد ہے، اندر کی تیسری دیوار پر دو منزلون کا بار تھا اس لیے وہ زیادہ مستحکم اور عریض ہے، پہلی دیوار صرف تین فٹ سات انچ ہے، دوسری چار فٹ ساڑھے چار انچ، اور تیسری پانچ فٹ نو انچ، دیوارون کا موٹاپا بقدر ضرورت بتدریج بڑھتا گیا ہے، اسی لیے بمقابلہ پہلے

حصے کی دیوار کے دوسرے اور تیسرے حصے کی دیوارین زیادہ چوڑی رکھی گئی ہین، چھت یہان دس فٹ سات انچ بلند رہ جاتی ہے، اس (دوسری) منزل کی دیوارون مین ہر چہار طرف، ہر ضلع کے وسط مین ایک ایک کھلا ہوا دروازہ ہے، ان دروازون مین چوکھٹ بازو نہین ہے، اکی بغلی دیوارون مین نیچے اوپر دو دو آنکڑے لوہے کے لگے ہیں، جنکی شکل یہ ہے، [ ] قیاس ہوتا ہے، کہ ان قلابون پر کبھی کواڑ رہے ہون گے، یا ان پائیزون پر کواڑ لگانے کا ارادہ رہا ہوگا، مگر تکمیل کی نوبت نہین پہنچی، ہر دروازے کے دونون طرف محرابون کے دو دو نشان بھی ہین، یعنی ہر دیوار مین چار چار، دروازون کی بلندی طے کرنے کے بعد دیوارون پر، ہر آٹھ محرابون کے اوپر آرائش و زیبایش کے لیے پتھر مین کھدے ہوئے معمولی نقش و نگار ہین، ایسے ہر پھول کے گرد، ہر نقش کے ساتھ محرابون سے اوپر خوشنما سنگی حاشیہ نظر افروز ہے، نقشی کارنس کے نیچے پتھر مین جال بنے ہین، یہ کل جگہ خالی اور غیر مکمل سی نظر آتی ہے، حتی کہ دروازون کے خشتی پہلو چونے کے پلاسٹر سے بھی محروم ہین، اور پلاسٹر پر قلعی تو کسی جگہ نہین پائی جاتی، صورتِ حال شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس طرف توجہ نہین ہوئی، یا یہ کہ اس منزل کے نیچے شاہزادی دفن تھی اور اس کے اوپر نقلی تربت ہے، اس لیے اس درمیانی طبقہ کو سادہ چھوڑ دیا اور ان بالا و پست درجون کا احترام مدنظر رکھا گیا، حتی الوسع ہر نوع کی آرایش و تکلفات تعمیر سے درگذر کیا گیا ہی، معمولی محرابین اور جدولین کافی سمجھی گئی ہین، دروازے بھی مستقل دروازون کی حیثیت کے نہین، بلکہ دیوارون مین مستطیل شگاف نکاس کے لیے ہین، یہ منزل منزل اسفل (نیچے والی) کی چھت یا اندرونی گنبد کے گرد کے اکہرے حصے پر اٹھائی گئی ہے،

تیسری منزل یا "مرتبۂ سوم" نے پوری عمارت اور اس کے حسن کو انتہا پر پہنچا دیا ہے، یہ بارہ دری آج بھی مجلۂ عروسی یا نیرنگ کمال وجمال ہے، یہ جگہ مربع ہے، ہر طرف تین تین در ہین، بیچ کا در زیادہ فراخ اور کشادہ ہے، باقی دونون دائین بائین کے اس سے کم چوڑے ہین، اوپر ایک خوشنما سبک قبہ ہے، بیگم کی نقلی یا مصنوعی قبر اسی مرمرین مجمر (کٹہرہ) کے اندر بنی ہے، اس سے ایک گز نیچے سنگ سرخ کی غلام گردش ہے،

اور اس پر ہموار سطح چھت، غلام گردش کے اوپر پتھر کے صاف ستھرے تختے باہر نکال کر دھوپ اور بوچھار سے بچانے کے لیے چھجا بنا دیا ہے، مقبرہ کا یہ حصہ حسین سے حسین ہے، انگریز ہندسوں[1] (انجینیرون) نے قنوج کے مخدوم جہانیاں کی مسجد کو (جو عہد سلاطین شرقیہ کی یادگار ہے) پتھر پر نقاشی و دستکاری کے لحاظ سے نہایت خوب اور قابل تحسین بتایا اور لاجواب لکھا ہے، لیکن مین عرض کرونگا کہ مقبرۂ شاہ بیگم کے اس حصہ مین جیسا خوب اور باریک و نازک کام نقاشی اور بیل بوٹے کا کیا گیا ہے، مسجد کا کام اس کے مقابلہ مین کچھ زیادہ وقعت نہین رکھتا، شاید اسکی یہ وجہ معقول ہو کہ مسجد کی تعمیر اس مقبرہ سے دو ڈیڑھ سو برس پیشتر ہوئی تھی، اتنے زمانہ مین زمانہ بہت ترقی کر گیا تھا، اور مغلون کی سرپرستی اور دستگیری نے سنگ تراشی و نقاشی کے ہنر کو منتہاے کمال پر پہنچا دیا تھا، اس ایوان مین پہنچکر نظر واپس آنا نہین چاہتی، ع

کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

قبر کا تابوت، لوح سرہانے، سنگ پائین، ہر چیز مرمر کی اپنی اپنی جگہ بے مثل ہے، تعویذ کے دونون پہلوؤن پر یہ رباعی جلی حروف مین پاکیزہ نستعلیق مین کندہ ہے، (بائین جانب، تابوت کے دلے مین)

بیگم کہ زعصمت رخِ رحمت آراست — اقلیم عدم ز نورِ عزت آراست

(داہنی طرف کے دلے مین)

سبحان اللہ زہے کمال عفت — کز حسن عمل چہرۂ جنت آراست

تعویذ پر حسب معمول قلمدان بنا ہے،

لوح مزار شاہزادی کے شایانِ شان، خوب بلند ہے، اس پر یہ کتبہ ہے،

اللہ اکبر

چون چرخ فلک ز گردشِ خود آشفت — در زیر زمین آئینۂ مہ بنهفت

[1] گزیٹر جدید ضلع فرخ آباد،

تاریخ وفات شاہ بیگم جستم از غیب ملک بخلد شد بیگم گفت (۱۰۱۳ھ)

لکاتبہ عبداللہ مشکین قلم، جہانگیر شاہی،

مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ مین "آئینۂ مہ" کی جگہ "آئینۂ خود" اور مسٹر بیوریج نے اپنے مقالہ مین[3] "آئینۂ مہر" لکھا ہے، مسٹر ڈیوہرسٹ نے اپنی تحریر مین[4] تصحیح فرمادی ہے، بیل صاحب نے پہلی رباعی مین "عزت" کی جگہ "غیرت" لکھا تھا، شاید چھاپے کی غلطی ہو،

بازآمد، ان پتھرون پر نہایت خوبصورت نستعلیق حروف کندہ ہین، ہر مصرع کے گرد نفیس بیلین اور گلکاریان ہین، یہ حروف اس قدر باقاعدہ، سڈول، دبیز اور باہر کو ابھرے ہوئے ہین، کہ آجکل کے موٹے موٹے انگریزی حروف جو تیل وغیرہ کی چادرون پر ڈھالے جاتے ہین، ان کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہین، مرمرین ظرف اور نستعلیق حرف، ع

عروس جمیل و لباس حریر،

پتھر کے پھولون پر کوئی روغن سرخی مائل پھرا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ ماند ہوتا جاتا ہے، سنگ بالین ایک بلند بالا تختہ مرمر کا، لمبا چوڑا اور خوب موٹا ہے، خوبصورت دلفریب تراشا گیا ہے، اس پر نہایت عمدہ کام ہے، پائین قبر

[1] میر عبداللہ مشکین قلم دولت جہانگیری کے نامور کاتب و خوشنویس تھے، قلعۂ الہ آباد مین اشوک کے مشہور سنگین ستون پر ہندی عبارت کے نیچے ۱۰۱۴ھ مین جہانگیر نے اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام فارسی مین کندہ کرایا ہے، وہ انھیں کے ہاتھ کا کمال ہے، (مفتاح التواریخ صفحہ ۱۹۷) تبریز کے رہنے والے، شاہ نعمت اللہ مشہور ولی کی اولاد سے تھے، دینی و دنیوی صوری و معنوی، علوم مین پایہ بلند رکھتے تھے، مشکین قلم دربار جہانگیری سے خطاب ملا تھا، مختلف مقامات پر اکثر بادشاہی کتبے آپکے ہنر و جادو نگاری کی یادگار ہین، ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) مین رحلت فرمائی، فرزند صالح نے عالیشان مقبرہ آگرہ مین بنوایا تھا، ان کے خاندان مین خوشنویسی پشتہا پشت تک قائم رہی (حیات جلیل حصہ دوم صفحات ۲۰۲ و ۲۰۳ - نوٹ) [2] صفحہ ۳۲۳ [3] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۶۰۳ [4] جرنل مذکور بابتہ جولائی ۱۹۰۸ء، صفحہ ۷۴۷،

کا تختہ بھی ایک ڈال سنگ مرمر کا، سرھانے والے پتھر کے بالکل مشابہ اور ہمشکل ہے، اس پر بھی ویسی ہی نفیس بیلین اور باریک کام ہے، البتہ کچھ لکھا نہین ہے، یہ سنگ بالین کا ہر لحاظ سے پورا جواب ہے، اور خود لاجواب، یہان مرمرین ولمون اور تختون پر مختلف اقسام خصوصاً کنار کی بیلین، خوبصورت دوہری تہری ابھری ہوئی نگاہ افروز ہین کہین کہین کچھ پتھر یا اس کا کوئی ریزہ اکھڑ بھی گیا ہے، مگر ان کے نشانات و داغ زیادہ نمایان نہین، کم ہین اور خفیف، قبہ، گنبد مختصر و ہندوانہ ہے، جینی وضع سے بہت ملتا جلتا ہوا، جہان ایوان کی دیوارون کی بلندی ختم ہو جاتی ہے یعنی عمارت کے چوکور حصہ سے پتھر کے تختے بڑھتے گھٹتے ہوئے لگا کر، بتدریج اٹھا اٹھا کر، چارون پہلوؤن کو اوپر لیجا کر ملا دیا ہے، حقیقۃً یہ کوئی برج نما (مدور) یا گنبد نہین ہے بلکہ ایک خاص وضع کی چیز ہے، اس پر کلس بھی اسی شان کا زرنگار و زراندود مناسب حال چڑھایا گیا تھا، اب بے رونق ہو گیا ہے، اس طبقہ کا قبہ اس کا فرش، اس کے مرمرین تختے اور چٹانین، اس کے حسین ستون، ان سب پر نازک نقاشیان، غرضکہ اس کا ہر جزو و کل قابل ناز اور سلاطین تیمور کی عظمت ماضیہ اور صنعت کاملہ کا آئینہ دار ہے،

حکومتون کے انقلاب اور یار و اغیار کی دست درازی و دست برد نے اس کے ساتھ جو کچھ ظلم کیا ہوگا کس کی زبان بتا سکتی ہے، لیکن امن و امان اور تہذیب و روشنی کے زمانہ مین یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد عوام نے جو قدردانی کی اور سیاحون اور زائرین نے جس قدر ضرر پہنچایا، وہ بھی ناقابل تلافی ہے، فرش کے چمکتے ہوے پتھرون پر بہت سے حضرات نے انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی مین اپنے نام نامی اور دستخط گرامی نقش فرما دیئے ہین، کسی مسٹر جیمس نے اپنے نام کے ساتھ ۱۸۶۱ء بھی چاقو سے کھود دیا ہے، شاید یہی سب سے پہلا ظلم اور فتنہ برپا ہوا تھا، جس کی اور لوگون نے تقلید کی ہے،

اوپر کی دونون منزلون کی آپ سیر کر چکے اور اس سیر سے تمام باغ بلکہ حد نظر تک کا لطف اٹھا لیا، آیئے اب باقی ماندہ، پست ترین طبقہ کو بھی اندر سے دیکھ لیجئے، دراصل یہی منزل، منزل اول ہے، از زمین پر واقع ہے، مگر مہیب وسیع، فراخ اور کافی روشن ہے، اس کے داخلہ کا دروازہ وہی ایک ہے، جس کا ذکر ابتدا

مین آچکا ہے، دروازہ مین قدم رکھتے ہی یہ تہ زمین یا بالائے زمین حصہ عمارت کا شروع ہو جاتا ہے، ایک لمبا چوڑا، چوکور کمرہ شاہ بیگم کا مدفن ہے، جس پر کسی قدر اٹھی ہوئی محدب چھت ہے، اس کمرہ کے اردگرد دوہری دوہری غلام گردشین، طواف کرنے کے لئے خوب لمبی چوڑی بنی ہین یعنی صدر دروازہ سے اندر آکر پوری وسعت وطوالت کا ایک لمبا سا کمرہ ملتا ہے، اس کے بعد دوسرا دروازہ ہے، اس دروازے کے بعد پھر ویسا ہی چوڑا چکلا گرد گھا (مطاف) ہے، مگر یہ پہلے سے طول مین کم ہے، ان دونون دروازون سے گذر کر حجرۂ قبر مین پہنچتے ہین، باقی تین طرف کوئی دروازہ نہین لیکن روشنی کی شعاعین سنگ سرخ کی سادہ مگر قابل غور جالیون اور خانون سے ہو کر اندر آتی ہین، یون سمجھ لیجئے کہ پہلی دیوار سے جو تین فٹ سات انچ عریض ہے اور اس کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد اس کنارہ سے اُس کنارہ تک آپ کو پانچ حصے یا کمرے ملین گے، پہلا دروازہ سے لیکر دوسری دیوار و دروازہ تک، یہ بارہ فٹ چوڑا ہے، اس کے بعد دوسری دیوار چار فٹ ساڑھے چار انچ موٹی ہے، پر دوسرا کمرہ سات فٹ ساڑھے چار انچ چوڑا، بعدازان تیسری دیوار پونے چھ فٹ موٹی، بعدازان حجرۂ قبر ہے، انیس فٹ مربع، گویا وسطی یا مرکزی کمرہ کے گرد ہر چار سمت دوہرے درجے ہین، دو داہنے دو بائین، دو سرھانے اور دو پائین، مرکزی حجرہ پر دوسری اور تیسری منزلین واقع ہین،

قبرون کا تہ خانہ مین بنانا تو ایک مدت دراز سے چلا آتا تھا، لیکن سلطنت مغلیہ کے عروج، یعنی اکبر اور جہانگیر کے عہد مین اسکو اور بھی ترقی ہو گئی تھی، بالخصوص بیگمات کی تدفین مین، پھر کچھ زمانہ بعد تو دولتمند اور صاحب مقدرت طبقون مین اسکا رواج عام اور دستور سا ہو گیا، چنانچہ شاہ بیگم کی ساس (اکبر کی پہلی ہندو بی بی، جہانگیر کی مان) ملکہ مریم زمانی[1] آگرہ کے ایک ایسے ہی مقبرہ مین سو رہی ہے، اس سے بھی روشن اور شہرت یافتہ مثال ممتاز محل (روضہ تاج) کی ہے، نیز شاہجہان کی ملکہ قندھاری بیگم کے مدفن کی اس کی گنبدی

---

[1] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد مارہروی، صفحہ ۱۶۴ [2] ؎ ؎ ایضاً، صفحات ۵۰ - ۱۲۳،

کا تختہ بھی ایک ڈال سنگ مرمر کا، سرھانے والے پتھر کے بالکل مشابہ اور ہمشکل ہے، اس پر بھی ویسی ہی نفیس بیلین اور باریک کام ہے، البتہ کچھ لکھا نہین ہے، یہ سنگ بالین کا ہر لحاظ سے پورا جواب ہے، اور خود لاجواب، یہان مرمرین ولھون اور تختون پر مختلف اقسام خصوصاً کنار کی بیلین، خوبصورت دوہری تہری ابھری ہوئی نگہ افروز ہین، کہین کہین کچھ پتھر یا اس کا کوئی ریزہ اکھڑ بھی گیا ہے، مگر ان کے نشانات و داغ زیادہ نمایان نہین، کم ہین اور خفیف، قبہ، گنبد، مختصر و ہندوانہ ہے، چینی وضع سے بہت ملتا جلتا ہوا، جہان ایوان کی دیوارون کی بلندی ختم ہو جاتی ہے یعنی عمارت کے چوکور حصہ سے پتھر کے تختے بڑھتے گھٹتے ہوئے لگا کر، بتدریج اٹھا اٹھا کر، چارون پہلوون کو اوپر لیجا کر ملا دیا ہے، حقیقۃً یہ کوئی برج نما (مدور) یا گنبد نہین ہے بلکہ ایک خاص وضع کی چیز ہے، اس پر کلس بھی اسی شان کا زرنگار و زر اندود مناسب حال چڑھایا گیا تھا، اب بے رونق ہو گیا ہے، اس طبقہ کا قبہ، اس کا فرش، اس کے مرمرین تختے اور چٹانین، اس کے حسین ستون، ان سب پر نازک نقاشیان، غرضکہ اس کا ہر جزو و کل قابل ناز اور سلاطین تیمور کی عظمتِ ماضیہ اور صنعتِ کاملہ کا آئینہ دار ہے،

حکومتون کے انقلاب اور یار و اغیار کی دست درازی و دست بردنے اس کے ساتھ جو کچھ ظلم کیا ہوگا کس کی زبان بتا سکتی ہے، لیکن امن و امان اور تہذیب و روشنی کے زمانہ مین یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد عوام نے جو قدر دانی کی اور سیاحون اور زائرین نے جس قدر ضرر پہنچایا، وہ بھی ناقابلِ تلافی ہے، فرش کے چمکتے ہوے پتھرون پر بہت سے حضرات نے انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی مین اپنے نام نامی اور دستخط گرامی نقش فرما دیئے ہین، کسی مسٹر جیمس نے اپنے نام کے ساتھ ۱۸۶۶ء بھی چاقو سے کھود دیا ہے، شاید یہی سب سے پہلا ظلم اور فتنہ برپا ہوا تھا، جس کی اور لوگون نے تقلید کی ہے،

اوپر کی دونون منزلون کی آپ سیر کر چکے اور اس سیر سے تمام باغ بلکہ حد نظر تک کا لطف اٹھا لیا، آئیے اب باقی ماندہ، پست ترین طبقہ کو بھی اندر سے دیکھ لیجئے، در اصل یہی منزل، منزل اول ہے، از زمین پر واقع ہے، مگر بہت وسیع، فراخ اور کافی روشن ہے، اس کے داخلہ کا دروازہ وہی ایک ہے جس کا ذکر ابتدا

مین آچکا ہے، دروازہ مین قدم رکھتے ہی یہ تہ زمین یا بالائے زمین حصہ عمارت کا شروع ہوجاتا ہے، ایک لمبا چوڑا، چوکور کمرہ شاہ بیگم کا مدفن ہے، جس پر کسی قدر اٹھی ہوئی محدب چھت ہے، اس کمرہ کے ارد گرد دوہری دوہری غلام گردشین، طواف کرنے کے لئے خوب لمبی چوڑی بنی ہین یعنی صدر دروازہ سے اندر آکر پوری وسعت وطوالت کا ایک لمبا سا کمرہ ملتا ہے، اس کے بعد دوسرا دروازہ ہے، اس دروازے کے بعد پھر ویسا ہی چوڑا چکلا گردگھا (مطاف) ہے، مگر یہ پہلے سے طول مین کم ہے، ان دونون دروازون سے گذر کر حجرۂ قبر مین پہنچتے ہین باقی تین طرف کوئی دروازہ نہین لیکن روشنی کی شعاعین سنگ سرخ کی سادہ مگر قابل غور جالیون اور خانون سے ہوکر اندر آتی ہین، یون سمجھ لیجئے کہ پہلی دیوار سے جو تین فٹ سات انچ عریض ہے اور اس کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد اس کنارہ سے اُس کنارہ تک آپ کو پانچ حصے یا کمرے ملین گے، پہلا دروازہ سے لیکر دوسری دیوار و دروازہ تک، یہ بارہ فٹ چوڑا ہے، اس کے بعد دوسری دیوار چار فٹ ساڑھے چار انچ موٹی ہے، پر دوسرا کمرہ سات فٹ ساڑھے چار انچ چوڑا، بعدازان تیسری دیوار پونے چھ فٹ موٹی، بعدازان حجرۂ قبر ہے، انیس فٹ مربع، گویا وسطی یا مرکزی کمرہ کے گرد ہر چار سمت دوہرے درجے ہین، دو داہنے دو بائین، دو سرھانے اور دو پائین، مرکزی حجرہ پر دوسری اور تیسری منزلین واقع ہین،

قبرون کا تہ خانہ مین بنانا تو ایک مدت درازسے چلا آتا تھا، لیکن سلطنت مغلیہ کے عروج یعنی اکبر اور جہانگیر کے عہد مین اسکو اور بھی ترقی ہوگئی تھی، بالخصوص بیگمات کی تدفین مین، پھر کچھ زمانہ بعد تو دولتمند اور صاحب مقدرت طبقون مین اسکا رواج عام اور دستور سا ہوگیا، چنانچہ شاہ بیگم کی ساس (اکبر کی پہلی ہندو بی بی، جہانگیر کی مان) ملکہ مریم زمانی[1] آگرہ کے ایک ایسے ہی مقبرہ مین سو رہی ہے، اس سے بھی روشن اور شہرت یافتہ مثال ممتاز محل (روضۂ تاج) کی ہے، نیز شاہجہان کی ملکہ قندھاری بیگم کے مدفن کی اس گئی گذری

[1] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد مارہروی، صفحہ ۱۶۴ [2] ،، ایضاً، صفحات ۵۰-۱۴۳،

حالت میں بھی دہلی و آگرہ میں ایسی زیر زمین قبرین بہ تعداد کثیر موجود ہین،[1]

شاہ بیگم کا جسد خاکی کسی سفید و تابندہ مہر کے تابوت کے اندر دفن نہیں ہے بلکہ اسکی قبر اینٹ چونے کی سادہ و بے تکلف تعمیر ہے، قبر کے چبوترے کا طول دس فٹ عرض سات فٹ دو انچ ہے، قبر کا تابوت یعنی اونچا حصہ پانچ فٹ پانچ انچ لمبا، دو فٹ پانچ انچ چوڑا ہے، قبر کے چبوترہ کی بلندی ایک فٹ ایک انچ ہے، اور تعویذ کی ایک فٹ چار انچ، دونوں کی ملاکر دو فٹ پانچ انچ ہوئی، اسکی چھت کسی قدر پست گر محدب ہے، چارون دیوارون کے پہلوؤن کو کچھ کچھ اٹھاکر اوپر ملاکر پاٹ دیا، اگر آپ چاہیں تو اس کو نیم گنبد کہہ سکتے ہیں، شاید ایک تہ خانہ یعنی زمین دوز حصہ عمارت کے لیے یہی مناسب و کافی تھا، اس پورے طبقۂ زیرین میں معمولی پتھر کے چوکون کا ہموار صاف ستھرا فرش ہے، کثرت استعمال و پامالی سے چکنا بھی ہوگیا ہے، ایک وسیع مسقف رقبہ میں ایسا فرش نہایت اچھا پیرون کے لیے آرام دہ اور آنکھوں کیلئے راحت بخش ثابت ہوتا ہے، شاید یہ درجہ کبھی چارون طرف سے بند رہا ہوگا، جیسا کہ مسٹر بیل نے لکھا ہے، اور منافذ اور جھنجریون سے روشنی کا بقدر قلیل انتظام ہوگا، مفتاح التواریخ کے الفاظ یہ ہیں:- "اصل تربت او اندرون روضہ ہست و آن مسدود است از ہر چہار طرف" بظاہر اسکی تعبیر دشوار ہے، اور اگر آمد و رفت کے اعتبار سے بند ہونا مراد ہو تو چارون طرف سے مسدود ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ایک دکن رخ تو دروازہ ضرور کھلا ہوا موجود ہے، بہر کیف اب کوئی بگڑی ہوئی کیفیت باقی نہیں، غالباً اصلی حالت میں تبدیل کردیگئی ہے، ممکن ہے کہ یہان کبھی نقش و نگار یا رنگینیان رہی ہون، مگر اس وقت سفیدی اور چونے کی تہون کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، چھت کی استرکاری میں البتہ کچھ جدولین، اور دائرہ بناتے ہوئے جال در جال پیدا کردیئے گئے ہیں، اور وہ خوشنما ہیں،

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پری رہی، اسی طرح آج بھی ہے، اُسکی آغوش یا دامانِ عاطفت میں کئی بچے کھیل رہے اور قبر کے پہلوؤن اور بغلی حصون کو آباد کئے ہوئے ہیں، اس کی قبر کے پاس داہنے کو

---

[1] تاریخ آگرہ صفحات ۵۵، ۹۰، ۹۲، ۹۴، ۹۶، ۱۰۷، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۷۳، [2] ص ۳۳۵

دو چھوٹی چھوٹی قبرین ہین، جس کے بعد اینٹ کی جالی سے ادھر کا دروازہ بند کردیا ہے، بائین طرف بھی دو ہین، دوسرے درجے مین، اسی طرح پر بائین طرف دو قبرین چھوٹی چھوٹی برابر کو ہین، اور تین قبرین کسی قدر ہٹ کر، تیسرے درجہ مین ایک معمولی چبوترہ اینٹون کا نظر آتا ہے، جو تقریباً ایک گز مربع اور ایک بالشت اونچا ہوگا،

"بجلدت شد بیگم" سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہین جو سنگ بالین پر مرقوم ہے، مسٹر بیل اپنی اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری مین ۱۰۱۲ = ۱۶۰۳ء لکھتے ہین، تزک مین سال وفات ۱۰۱۳ھ چھپا ہے، ممکن ہے کہ ٹائپ کی غلطی ہو، مسٹر بیوریج کی رائے ہے، کہ تزک کی مندرجہ تاریخ یعنی ۲۶ رماہ گذشتہ ۱۰۱۳ھ ۶ رمئی ۱۶۰۵ء کے مطابق ہوتی ہے، غالباً خود جہانگیر یا اس کے نقل کنندہ کاتب سے ایک سال بڑھ گیا ہے، صحیح تاریخ ۲۶ ر ذیحجہ ۱۰۱۲ھ یا ۶ ارمئی ۱۶۰۳ء ہے، اکبر نامہ سے بھی یہی سال پایا جاتا ہے،

ڈاکٹر فوہرر شاہ بیگم کا سال وفات ۱۰۱۳ھ لکھتے ہین، وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سب سے بڑے افسر تھے، انکی کتاب یادگار ہائے قدیم پر سرکاری استناد، سرکاری حکم اور سرکاری خرچ سے سرکاری مطبع مین چھپی، یہ مقبرہ اور اس کا کتبہ ان کی نگرانی اور سایۂ عاطفت مین تھا، ان سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا تعجب سے خالی نہین،

کرنیل نیول ڈسٹرکٹ گزیٹر جدید مین ارقام فرماتے ہین، کہ "کتبہ سے سال وفات ۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے" گزیٹرون کے فاضل مولف بھی انسان ہین، باوجود وسعت نظر و تحقیق اور قابل معاونین کی ایک جماعت کے ان کا قلم بھی کبھی کبھی فاش غلط نگاریان کرجاتا ہے، ان کا یہ لکھنا کہ خسرو کی مان کا سال وفات ۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے، ایک فاحش غلطی ہے، "معلوم ہوتا ہے" کے معمولی فلسفیانہ وادیبانہ عذر کے لکھ دینے سے ان کی ذمہ داری وجوابدہی ان کو سبکدوش نہین کرتی، اس شاہزادی نے ۲۶ ر ذیحجہ ۱۰۱۲ھ کو وفات

[1] صفحہ ۱۵۲، [2] صفحہ ۲۶، [3] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۳-۶،

[4] آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا سلسلۂ جدیدہ، جلد دوم، صنادید قدیمہ الہ کبتے، صفحہ ۱۳۰،

[5] صفحہ ۱۶۹، گزیٹر سابق، صفحہ ۲۰۲،

بائی تھی جو تمام تقاویم موجودہ ورائجہ کے حساب سے ۶ رمئی ۱۶۰۴ء کے مطابق ہے، قطعۂ تاریخ اور اسکی نقل آپکے سامنے موجود تھی، ۱۰۱۲ھ یکم جون ۱۶۰۳ء سے شروع ہوکر ۱۹ رمئی ۱۶۰۴ء کو ختم ہوا، ۱۶۲۱ء کا پہلا دن ۱۵ رصفر ۱۰۳۰ھ کے مطابق تھا، پندرہ برس کا تفاوت! قیاس چاہتا ہے کہ غلطی سے ماں کے سالِ وفات کے بجائے بیٹے کا لکھ گیا ہو، اس لئے کہ سلطان خسرو آخر جنوری یا شروع فروری ۱۶۲۲ء میں فوت ہوا تھا، اور ۱۰۳۱ھ کا آغاز ۲ر نومبر ۱۶۲۱ء کو اور اختتام ۲۵ راکتوبر ۱۶۲۲ء کو ہوتا ہے، بعض اوقات ایک تقویم سے دوسری میں تحویل کرتے وقت مہینوں یا دنوں کا فرق ناگزیر یا ناقابل لحاظ سمجھا جاتا تھا،

صفحات تاریخ بتاتے ہیں کہ مغلوں کے محلات میں آنے والی ہندوستانی شاہزادیوں میں مان بائی شاہ بیگم سب سے پہلی رانی تھی جس نے حرم سرائے سلطانی میں جان دی اور اپنے شوہر پر نثار و تصدق ہوگئی، تیمور کے پوتے نے بھی نیازمندی و وفا کا حق ادا کیا اور اس کے جسد خاکی کی ابدی آسایش کے لئے دامنِ فردوس میں ایک قابلِ رشک نشیمن مہیا کر دیا، اسکا مقبرہ جس اہتمام و لطافت اور تعمیری و نسوانی رعایتوں کے ساتھ اس سرسبز و سدا بہار چمن کی آغوش میں تیار کرایا گیا، اس کے شایان شان تھا، مغلوں کے بہت سے شاندار مقبرے اور مدفن میں نے آگرہ اور دہلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر دیکھے ہیں، لیکن شاہ بیگم کے مقبرے کو بے تکلف و تامل اور بلا خوف تردید ان کے سلیقۂ تعمیر کا حسین ترین نمونہ اور خوشنمائی و نزاکت کا مجسمہ کہہ سکتا ہوں، اس کی سادگی و نظر فریبی مسلّم ہے، ساتھ ہی جدت وضع، انداز تعمیر اور مجموعی اختصار نے جو خوبی و رعنائی پیدا کر دی ہے، اسکی داد تحسین مجھ ناشناس کی آنکھیں کیا دے سکتی ہیں، میں نے ایک بالغ نظر کو اس وجہ خاص سے اسکو تاج پر بھی فوقیت و ترجیح دیتے دیکھا ہے،

ایک عورت کے روضہ کی تعمیر میں خصوصیت یا صفت اسکی نسوانیت کو ہونا چاہئے، اگر اکبری دور کے تعمیرات کا سا مردانہ پن، استواری و استحکام کی نمائش اور اہتمام اس میں بھی کیا جاتا تو لطافت و نزاکت، دلکشی و دلربائی خواہ مخواہ مفقود یا نظر انداز ہو جاتی، یہ نسوانیت یہاں ارادۃً پیدا کی گئی ہے اور بدرجہ اتم زیب دے رہی

یوں کہئے کہ روضہ کی عمارت محض روضہ نہیں بلکہ شاہ بیگم اپنی بہار حسن وجمال کے ساتھ اس رشک فردوس مقام پر جلوہ افروز ہے، پھر یہ اسکی انتہائی خوبی ہے کہ صبح درخشاں ہو یا نیمروز تاباں، شام کا دھندلکا ہو یا رات کی گھنگھور سیاہی، یہاں رانی اپنی اترتی یا ڈھلتی ہوئی جوانی میں نہیں، بلکہ چڑھتے ہوئے شباب میں رونق بخش نظر آتی ہے،

میں نے جب اپنی جوانی اور نئی عمر میں اس کو پہلے پہل دیکھا تھا تو اپنے نزدیک فیصلہ کر لیا تھا کہ جہانگیر نے یہ خوبصورت اور نازک یادگار بنا کر بیگم کی مہرووفا کا صلہ یا حقیقۃً اپنا خراج عشق ادا کیا ہے اولوالعزم شاہجہان نے بلند حوصلگی کے ساتھ ممتاز محل کا روضہ بنوانے میں محض باپ کی تقلید یا پیروی کی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے،

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے مرقد پر بارہا گیا، اور زبان حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے،

بر مزار ما غریباں، نے چراغے، نے گلے
نے پر پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

گجراتی زبان اور اوسکی تاریخ

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی)

(۳)

گجراتی لٹریچر دو خاص عہدون مین تقسیم ہی، (۱) عہدِ قدیم، (۲) عہدِ جدید، عہدِ قدیم کا زمانہ پندرہوین صدی سے انیسوین صدی تک ہی، اور عہدِ جدید کی ابتدا، انیسوین صدی سے ہوتی ہے، عہدِ جدید کی خصوصیت یہ ہی کہ جو شاعر اس زمانہ مین گذرا، وہ ایک خاص مذہبی خیال کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا، جو طالب علم ان کی تصانیف کا مطالعہ کرے، اوس کو چاہئے کہ سب سے پہلے وہ مختلف جماعتون کا مطالعہ کرے، اور اون کے مختلف عقائد کو سمجھے، ان شاعرون کا پوری طور سے مطالعہ اسوقت ممکن ہوسکتا ہی، جب ہم اون مختلف جماعتون سے پوری طور پر واقف ہوجائین، جن سے وہ متعلق تھے، اگر ہمارے پاس اس کے متعلق کامل معلومات نہ ہون تو ہم ان شاعرون مین سے کسی شاعر کے ساتھ انصاف نہین کرسکتے ہین، ہم اپنے قدیم شاعرون کا مناسب طریقہ سے مطالعہ اُسی وقت کرسکتے ہین، جب کہ ہم شاعر کو سمجھین، اور اوس کی جماعت کے عقائد پر احتراماً غور کرین، اگر ہم کسی تعصب کے ماتحت ایسا کام کرین، تو ہم ضرور اون کے ساتھ بے انصافی کرین گے، "نرسنہ" کو سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہے، کہ وشنو جماعت کے متعلق واقفیت حاصل کرین، اور میرآن کی پیروی کرنے کے لئے ہمین میران جیسا بننا چاہئے،

عہدِ قدیم کا سب سے آخر شاعر اور گجرات کا ایک بہترین شاعر ہمارا رنگیلا دیارام شاعر تھا، دیارام کی زندگی کے متعلق مختلف روایات ہین، بعض کہتے ہین، کہ وہ اخلاقاً کمزور تھا، اور اس کی شہادت اوس کی تصانیف سے ملتی ہے جنمین وہ عشق کے جذبات کو علانیہ بغیر اخلاق کے معمولی قواعد کی پابندی کے بیان کرتا ہے، اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جوانی مین وہ بہت شریر تھا، وہ چاندود کا رہنے والا تھا، چاندود سنیڈ مونکی جاترا کی جگہ ہی، اور "نرمادا" (؟) کے کنارے واقع ہے، دیارام کو اس سے خاص مسرت ہوتی تھی،

کہ وہ ان عورتوں پر جو نمادا کے کنارے پانی لینے آتی تھیں، پتھر پھینکے اور شرارت کرے، ایک روز اوس نے ایک سنار کی عورت کو چھیڑا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اوسے تیرکر پاس کے گاؤں "کرنالی" میں بھاگ جانا پڑا، وہاں ایک سادھو کسوانند سے ملاقات ہوئی اور وہ ایسے شریر اور بدمعاش کو اپنا چیلا نہیں بنانا چاہتا تھا، مگر آخر کار کسوانند نے اُسے اپنا چیلا بنالیا، دیارام اس سے بہت خوش ہوا، اور اوس نے، یہ "پاڈا" گایا، گرو بڑا ہے، گرو بڑا ہے"، دیارام فطری شاعر تھا، وہ بچپن ہی سے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ لیا کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اوس نے اپنی جوانی کے زمانہ میں چند "پاڈے" نظم کئے تھے، جو اخلاق سے گرے ہوئے تھے، اوس نے کبھی شادی نہ کی، اور بوڑھا ہو کر مجرد ہی حالت میں مرگیا، ہندوستان کے مقدس مقامات کی پیدل جاکر زیارت کی جس سے اوسے مختلف تجربات حاصل ہوئے، بنارس میں اوس نے کاشی وشو یشور کی تعریف میں ایک کتاب لکھی، وہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی زبانوں سے واقف تھا، وہ بہت حسین اور دلفریب تھا، اوس کی آواز میں شیرینی تھی، وہ وشنو جماعت سے تعلق رکھتا تھا، اُس کے "گربے" بہترین اور مقبول "گربے" کا مضمون نسوانی جذبات کے ذریعہ شری کرشن کی پرارتھنا ہے، دیارام کے گربے میں عشق کے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ گربے کا مضمون عبادت ہے، اس لئے اسے لڑکی اپنی ماں کے سامنے بغیر روک ٹوک کے گا سکتی ہے، دیارام کے گربے مشہور و معروف ہیں، یہ دیکھنا مناسب نہیں ہے کہ اس کا چال چلن بے داغ تھا، یا نہیں، لیکن خدا کے ساتھ اس کا عقیدہ بہت زیادہ تھا، اس کا گرو اچھا کا رام بھٹ اُسی زمانہ کا دوسرا اوتار کہتا تھا، اس کی تصانیف کئی ہیں، اوس کی زبان شیریں اور دلفریب ہے، اس کا طرز تحریر بہت صاف ہے، وہ خودمختار اور صداقت شعار تھا، اس کی فطرت کی جھلک اس کی نظموں میں پائی جاتی ہے، وہ گجرات کا بائرن کہلاتا تھا اور عہد قدیم کا بہترین شاعر تھا،

عہد جدید کا آغاز دیارام کے بعد سے ہوتا ہے، اس عہد کے بعد برطانوی حکومت مضبوطی کے ساتھ قائم ہو چکی تھی، شورید ہ سر مرہٹے گجرات سے چلے گئے تھے، مغربی تعلیم کی ابتدا ہو رہی تھی بمبئی یونیورسٹی قائم کی گئی تھی، گجرات کے پایۂ تخت احمد آباد میں بھی تعلیم پھیل چلی تھی، بعض لٹریری ریسرچ (تحقیقات) بھی کی گئی تھی، انگریز مشنریوں کی مدد سے گجراتی زبان کے قواعد لکھے گئے تھے، احمد آباد میں گجرات ورنیکلر سوسائٹی قائم ہو گئی تھی، شاعر دلپت رام ڈایا بھائی اس سوسائٹی کا خاص تنظیم کرنے والا تھا، وہ

عہدِ جدید کا پہلا اور خاص شاعر ہے، مذہب جو شاعری کا مرکز تھا، بدل دیا گیا تھا، اب شاعری کے مضمون مین انسانی زندگی کے تمام مختلف پہلو دکھائے جاتے تھے، نرمداشنکر جو دلپت رام کا معصر تھا سورت شہر مین ۱۸۳۳ء سے ۱۸۸۶ء مین گذرا تھا، یہ دونون شاعر لٹریچر کے میدان مین ایک دوسرے کے حریف تھے، اس کا لازمی نتیجہ ادبی مباحثے تھے، جو سامل اور رولیہ جیسے تو نہ تھے، لیکن کچھ کچھ ویسے ہی تھے، ان بحث و مباحث سے سوسائٹی کو بہت فائدہ ہوا، دلپت رام پرانے سخت مذہبی نظام سے تعلق رکھتا تھا، اور نرمداشنکر ایک نوجوان بت شکن اور سوسائٹی کی اصلاح کرنے والا تھا، اوس نے کچھ انگریزی تعلیم حاصل کرلی تھی، نرمداشنکر کو ہر ایک پُرانی چیز سے نفرت تھی، یہ دو برابر کے لیکن ایک دوسرے کی رقیب قوتین ایک دوسرے سے جنگ کرتی تھین، ان شاعرون کے مزاج اور فطرت کا عکس ان کی تصانیف مین نمایان ہے، دلپت رام ارتقا پر عقیدہ رکھتا تھا، اور نرمداشنکر سوسائٹی کی اصلاح و بہبودی کے کام مین انقلابی خیال رکھتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ذات پات کے نظام کا ایک ہی وار مین کام تمام کردے، دلپت رام اس بات کا سبق دیتا تھا، کہ سوسائٹی کی ترقی کے کام کو آہستہ آہستہ اور بتدریج کرنا چاہئے، اس دیرپا جنگ سے لٹریچر پر بہت فائدہ مند اثر ہوا،

نرمداشنکر اور دلپت رام گجراتی لٹریچر کے قابلِ احترام شاعر کہلائے جانے لگے، دلپت رام نے ہمارے لٹریچر مین بہت کچھ اضافہ کیا ہے، اوس کی زبان سنجیدہ، متین، معمولی، ظریف، اور پُرمعنی ہے، اس کے "دُہرے" اور "چاندے" اس بات کے ثبوت ہین، اوس نے ہمین "چند گربے" بھی دئے ہین، اوس پر خدا کی طرف سے ایک عجیب بخشش تھی، کہ وہ "پادون" کو فی البدیہہ کہہ لیا کرتا تھا، بہ حیثیت ایک آدمی کے وہ سادہ مزاج اور وفادار تھا، اور حکومت اور عوام دونون اوس سے محبت کرتے تھے، نرمداشنکر خودسر، مضطرب اور تخیل رکھنے والا اور مصلح تھا، اور بحیثیت ایک شاعر کے نوجوان طبقہ اوسے بہت پسند کرتا تھا، اوس کی شاعری مین زور ہے، اور اوس کے "ویر راس" مین شجاعت کے جذبات ہمین بہادر بناتے ہین، اُس کا خیال تھا، کہ کام کو شروع کرنے کے بعد بہرحال اُسے ختم کرنا چاہئے، نرمداشنکر ہی پہلا شخص ہے جس نے گجراتی لٹریچر مین نثر کی ابتدا کی، مادرِ وطن سے اوسے بہت تھی، اوس کی نظم بعنوان "اے باوقار گجرات تیری فتح، ہو" بطور ایک قومی ترانہ کے پیش کیجا سکتی ہے، نرمداشنکر پہلا شخص تھا، جس نے گجراتی ڈکشنری، (لغت) لکھی تھی، بھولا ناتھ سارابائی

نے گجراتی لٹریچر مین ایشور بھگتی (خدا کی عبادت) کی نظمین لکھنے کی پہلے پہل بنا ڈالی تھی،

کیا کوئی ایسا گجراتی ہے جس نے "لاٹھی" واقع (کاٹھیاواڑ) کے ٹھاکر صاحب شری سورسنگھ گوہی کا نام نہین سنا صرف وہی ایک ایسی مثال ہے، جو بادشاہ بھی تھا اور شاعر بھی، اس کا تخلص "کلاپی" تھا، اس کی موسیقی کی آواز ایسی ہی شیرین تھی جیسے برسات کے موسم مین کسی مست اور بے رفیق طاؤس کی، اس کے زمانہ مین بہت سے نئے اور مختلف عناصر گجراتی لٹریچر مین داخل کئے جارہے تھے، گجرات مین انگریزی تعلیم کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ انگریزی زبان کی خصوصیات بھی ہمارے لٹریچر مین داخل ہوتے جاتے تھے، اب تک شاعری کا نفس مضمون عشقِ الٰہی تھا، "کلاپی" نے اپنی نظمون مین دنیاوی عشق داخل کر دیا، کلاپی نوجوانون اور طالب علمون کا مقبول شاعر ہے، اس کی نظمین عشقیہ جذبات (پریم رس) سے پُر ہوتی ہین، ان خطوط مین جو اوس نے اپنے دوستون کو لکھے ہین، ادبی چاشنی ہے، اور وہ بہت اچھے ہین، وہ شاعر کے بہ نسبت عاشق مزاج زیادہ ہے، اوس کی نظمین ذاتی تجربہ کے حسن سے رنگی ہوئی ہین، اس کی خوش قسمتی تھی، کہ اس کے حلقۂ احباب مین بہترین لٹریری اشخاص تھے، منی لال ناتھو بھائی، درویدی ساملداس کالج بھاونگر مین سنسکرت کا پروفیسر تھا، اوس نے بہت سے مضامین لکھے ہین، اور اُن مین سے ایک مضمون جو اوس نے کیرکٹر پر لکھا ہے، قابلِ توجہ ہے، پریمانند کے تماشون کو چھوڑ کر ہم یہ کہہ سکتے ہین، کہ اب تک گجراتی مین ڈرامون کا لٹریچر نہ تھا، اس کا ڈرامہ "کانتا" گجراتی ڈرامون مین سے ہے، اوس نے بہت سے سنسکرت ڈرامون مثلاً "اُتر رام چرتر"، "شکونتلا" وغیرہ کا ترجمہ کیا ہے، اوس نے بہت سے فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہین، وہ گو سنسکرت کا پروفیسر تھا، لیکن اوس نے غزل لکھنے کا تتبع، فارسی الفاظ کو گجراتی الفاظ مین استعمال کرکے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے: مثلاً "اُمید لاکھون ناکامیون کے اندر پوشیدہ ہے، زخم معشوق کے خنجر کے اندر چھپا ہوا ہے، مین نے جدائی کے ایام آہ وزاری اور اشک بہا بہا کر گذار دئے ہین، اگر میرے حلق پر خنجر بھی چل جائے، پھر بھی وصال کی تمنا مجھ سے جدا نہ ہوگی"،

گووردھن مادھو رام ترپیدی گجراتی لٹریری کانفرنس کا پہلا پریسیڈنٹ گجراتی مصنفون مین نہایت ممتاز جگہ رکھتا ہے، وہ ایل، ایل بی، اور نادیاد (نڑیاد) کا ناگر برہمن تھا، وہ گجراتی، سنسکرت اور انگریزی کا بہت ہی پر شوق

طالب علم تھا، اس وقت گجراتی زبان عجیب حالت مین سے گذر رہی تھی، تین اور عالم اشخاص کی تو یہ کوشش تھی، کہ گجراتی کو سنسکرت کے ساتھ ملا دیا جائے، اور نئے تعلیم یافتہ نوجوان اس بات کیلئے انتہائی کوشان تھے، کہ گجراتی کو انگریزی کے زیر اثر لے آئین، گوردھن نے اس رسہ کشی کو بہت کامیابی کے ساتھ طے کر دیا، اس نے خوبصورتی کے ساتھ تینون زبانون سنسکرت، انگلش، اور انگریزی کی خصوصیات کو اختیار کرکے اُن کو باہم ملا دیا، اُس کا آخری ناول "سرسوتی چندر" گجراتی لٹریچر مین بہترین تصنیف ہی، وہ چار حصّون مین شائع کی گئی ہی، گوردھن نے اپنے علم کے خزانہ کو اُسی تصنیف مین ختم کر دیا ہے، اس کے کیرکٹر نہایت اعلیٰ ہین، وہ ایک بڑے متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ خاندان کا معاشرتی ناول ہے، ہم اس کے کمود، اور (ہیروین) "کسم" (اسکی بہن) اس کے سرسوتی چندر (ہیرو) وشنو داد، بدھی دان وغیرہ، کو اپنی باطنی نظر کے سامنے دیکھتے ہین، اس ناول کا گجراتی سوسائٹی پر بہت ہی اچھا اثر ہوا ہے، المختصر گجراتی سوسائٹی مثل سرسوتی چندر بن گئی ہی، اس نے گجراتی کے بڑے بڑے شاعرون کی زندگی پر انگریزی مین بعض مضامین لکھے ہین، علاوہ ازین اوس نے اپنی نظمون کا مجموعہ شائع کیا ہے جس کا نام محبت کی انگشتری (سنھ مدرا) رکھا ہے، اس کے نثر کا تتبع بہت کیا جاتا ہی، ۱۹۰۸ء مین وہ مرگیا،

اب ہم اپنے زمانہ مین پہنچ گئے ہین، اس زمانہ کے موجودہ گجراتی شاعرون اور مصنفون کی نسبت اگر کچھ لکھا جائے تو شاید ہمارا مضمون قابلِ اعتراض بن جائے، اس لئے ہم ان کو آیندہ مؤرخ کے حوالہ کرتے ہین، تاہم ختم کرنے سے پہلے گجراتی لٹریچر کی موجودہ حالت کے متعلق مختصر طور پر ضرور کچھ کہین گے، گجراتی زبان نے بہت ترقی کر لی ہی، کئی ماہواری رسالے شائع ہوتے ہین، کالجون مین بھی گجراتی پڑھائی جاتی ہے، گجراتی لٹریچر کے تمام شعبون پر کئی عالم لکھنے والے ہین ناول بھی لکھے جاتے ہین، کنھیا لال منشی اور نرائن ٹھاکر مہذب ناول لکھتے ہین، نثر کا لٹریچر بھی بہت صاف، سادہ اور شایستہ ہے، آج زبان کی سادگی نے لٹریچر مین مستقل جگہ حاصل کر لی ہے، تصنع کے بجائے سادگی ہے، عدم تعاون کی تحریک نے بہت قابل لکھنے والے پیدا کر دیے ہین، یا دوسرے الفاظ مین یہ کہ اس تحریک نے ہمارے لٹریچر پر نئی روشنی ڈالی ہی، اس نئی طرز کے خاص لکھنے والے تحریک کے روح رواں، ہمارے بزرگ اور محترم مہاتما گاندھی جی ہین آجکل

کے نثر لکھنے والون مین یہ سب سے اوّل ہین، جس طرح اون کی زندگی پاک، سادہ اور عبادت گذار ہے، اسی طرح ان کی زبان بھی پاک، صاف سادہ اور شگفتہ ہے، اونھون نے گجراتی نثر مین ایک نئی شاخ لگائی ہے،

شاعری بھی اعلیٰ بلندی پر پہنچ گئی ہے، دلپت رام شاعر کا قابل فرزند نھا لال آج کل لٹریری آسمان کا چاند ہے جس سے بہت سے مُبتدی مُستفید ہوتے ہین، وہ بہترین شاعرون مین سے ہے، اس کی نظمین چاندنی رات کے مانند حسین اور دلفریب ہین، اوس نے بھی شاعری مین نئی شاخ لگائی ہے، اسکی نظمون کی خصوصیات "بلینک ورس" ہے اسکے ڈرامے بھی اوسی طرز مین لکھے جاتے ہین، اس کے گربے" گجرات مین بہت مشہور ہین،

اردشیر فرامجی خبردار[1] ایک اور شاعر ہے، جو گو پارسی ہے، مگر اس کی نظمین پاکیزہ اور ادبی ہوتی ہین، حب وطن پر اُس کی نظمون نے گجراتیون کے قلوب مین جگہ کرلی ہے، پروفیسر بلونت رائے کلیان رائے، ٹھاکور کی عالمانہ اور فلسفیانہ نظمین اعلیٰ سوسائٹی مین پڑھی جاتی ہین، نرنھراؤ، بھولا بھائی، ڈی وے، ٹیاگو، جدید انگریزی کو گجراتی شاعری کے ساتھ مدغم کرنے مین کامیابی ہوئی ہے، اسکی وہ نظمین جو فطرت کی تعریف مین لکھی گئی ہین، بہت خوشی کے ساتھ پڑھی جاتی ہین،

ان نامون کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شاعرون کی ایک کثیر تعداد گجرات کے گلستان مین چہل قدمی کر رہی ہے، تراجم سے بھی گجرات کے لٹریچر مین دوسری زبانون کی خصوصیات کا اضافہ ہو رہا ہے، دیوان بہادر کیشولال، ہرشدلال دھروکے، "امرو ونشک" "شکونتل" وغیرہ سنسکرت کے بعض عالمانہ تراجم ہین، پروفیسر دھرو ایک بہت بڑا نقاد اور فائیلولاجسٹ ہے، (بنارس ہندو یونیورسٹی کے) پروفیسر انند شنکر دھرو بھی سنسکرت کے ایک بڑے عالم ہین، وہ ادبی رسالہ "وسنت" کے مدیر اور مشہور نقاد ہین،

مختلف صوبون کی زبانون مثل بنگالی، مرہٹی وغیرہ کے مطالعہ کا رواج گجرات مین ہو چلا ہے ان زبانون کی خصوصیات بھی گجراتی مین داخل کیجا رہی ہین، علاوہ سائنس اور تاریخ کے علوم مین بھی کافی تحقیقات اور جدوجہد کی گئی ہے، ابھی حال مین ایک انسائیکلوپیڈیا بھی لکھی جارہی ہے، جس سے زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچے گا،

[1] عرف عام مین اس کا نام اردیشر اور تخلص کبردار کہلاتا ہے،

مندرجہ ذیل شعرا گجراتی زبان کے پیدا ہوے، جنکو گجرات مین کافی مقبولیت ہوئی،

(۱) نرسینھ مہتا، جونا گڈھی، متولد ۱۴۱۴ء،

(۲) میران بائی، (میواڑ) ۱۴۰۳ء ۱۴۷۰ء،

(۳) بھالنڑ ۱۴۳۹ء ۱۵۲۹ء،

(۴) اکھا ۱۶۱۵ء ۱۶۷۵ء،

(۵) پریمانند، بڑودھ کا باشندہ تھا، ۱۶۳۶ء مین پیدا ہوا، اور ۱۷۳۴ء مین فوت ہوا،

(۶) سامل احمد آباد کا رہنیوالا تھا، ۱۶۷۵ء مین پیدا ہوا اور ۱۷۳۰ء مین انتقال کرگیا،

(۷) دیارام. ڈبھوئی مین قیام رکھتا تھا، ۱۷۶۷ء مین پیدا ہوا، بڑا فاضل تھا، چودہ زبان کا عالم تھا، ۱۸۵۲ء مین فوت ہوا،

(۸) دلپت رام اصل وطن آبا و اجداد کا بھلیان تھا، پھر کاٹھیاواڑ مین آکر بسے اس کے بعد احمد آباد چلے آئے، ۱۸۲۰ء مین پیدا ہوئے، اور ۱۸۹۸ء مین اس فانی دنیا کو خیر باد کہا، ان کا لڑکا بھی گجرات کا اسوقت بہترین شاعر ہے،

(۹) نرمدا شنکر ۱۸۳۳ء مین پیدا ہوا، سورت ان کا مسکن تھا، ۱۸۸۶ء مین چل بسے،

(۱۰) نند شنکر ۱۸۳۵ء مین اس جہان مین آئے اور ۱۹۰۵ء مین یہان سے کوچ کر گئے، یہ سورت کے باشندے تھے،

(۱۱) نول رام، اسکی ولادت سورت مین ہوئی ۱۸۳۶ء،

(۱۲) رنچھوڑ بھائی ۱۸۳۷ء مین تولد ہوا اور ۱۹۲۳ء مین انتقال کیا،

(۱۳) بھگوان لال اندرجی ڈاکٹر ۱۸۳۳ء مین اسکی ولادت ہوئی، ۱۸۸۸ء مین وفات پائی،

(۱۴) من سکھ رام، ۱۸۴۴ء مین اس باکمال نے دنیا مین قدم رکھا، یہ گجرات کا فردوسی ہے، اپنے اشعار مین غیر ملکی زبان سے بے حد احتراز کرتا ہے، اور خالص گجرات کی زبان استعمال کرتا ہے، فارسی، عربی وغیرہ کے الفاظ مشکل سے اُس کے اشعار مین ملین گے، ۱۹۰۷ء مین اوس نے دنیا کو وداع کیا،

(۱۵) کے خسرو کابراجی، ۱۸۴۲ء مین پیدایش ہے، اور ۱۹۰۴ء کو راہی ملک عدم ہوئے،

(۱۶) واگ جی، ۱۸۵۰ء مین پیدا ہوئے، اور ۱۸۹۰ء مین وفات پائی،

(۱۷) ناراین ہیم چندر، ۱۸۵۵ء،

(۱۸) گوردھن رام، ۱۸۵۵ء مین پیدایش ہوئی، اپنے وقت کے اہلِ کمال مین ان کا شمار ہے ۱۹۰۷ء مین اس جہان سے رخصت ہوئے،

(۱۹) ہری لال، متولد ۱۸۵۶ء، متوفی ۱۸۹۶ء،

(۲۰) منی لال، نبھو بھائی ۱۸۵۸ء متوفی ۱۸۹۸ء،

(۲۱) بالاشنکر، ۱۸۵۹ء، ۱۸۹۸ء،

(۲۲) انبالال شاکرلال، ۱۸۴۸ء،

(۲۳) نتھورام، ۱۸۶۲ء، ۱۹۲۲ء،

(۲۴) تری بھون داس، ۱۸۶۳ء،

(۲۵) امرت لال، پڈھی یار، ۱۸۷۰ء،

(۲۶) بھوگندر راؤ، ۱۸۶۵ء، ۱۹۱۵ء،

(۲۷) رنجیت راؤ، سنہ،

(۲۸) ڈایا بھائی، ناٹک لکھنے مین وقت صرف کیا، ۱۹۰۲ء،

(۲۹) نہالال کوی ابن دلپت رام کوی، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۵۵ سال کی ہوگی، "گربا" لکھنے مین آپ کو کمال ہے، یہ ایم اے ہین، اور فارسی سے بھی آشنا ہین، انکے علاوہ اس عہد مین نرسی راؤ، بلونت راؤ، کلاپی، منی شنکر، متوفی ۱۹۲۴ء اور بوٹا ڈکر وغیرہ قابلِ ذکر ہین،

سب سے آخر مین مجھے افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مسلمان گجراتی شعراء کے نام اور حالات دستیاب نہین ہوئے، حالانکہ اکثر احباب سے مین نے طلب کئے، مگر نہ مل سکے، اگر کوئی صاحب اطلاع دین گے، تو بے حد شکر گذار ہون گا،

پدماوت کا مُصنّف کون تھا؟

از

مولانا سعید انصاری صاحب رفیق دار المصنفین

منشی برج بھوکن لال صاحب محب نے دریاباد (ضلع بارہ بنکی) کی ایک تاریخ لکھی ہی، جو ۱۹۲۵ء مین لکھنؤ کے نامی پریس سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، اسمین قاسم شاہ صاحب کی ایک منظوم بھاشا تصنیف "ہنس جواہر" کا تذکرہ کرتے ہوے پدماوت سے اوس کا مقابلہ کر کے ترجیحی پہلو پیدا کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین پدماوت کی نسبت "خلاصۃ تواریخ" کی حسبِ ذیل عبارت نقل کی گئی ہے،:-

"نسخہ پدماوت مشتمل بر حقیقت رائے رتن سین مرزبان چیتور کہ بنا بر پدماوت زوجۂ خود با سلطان علاء الدین والی دہلی محاربہ نمودہ بود کہ مصر پدپادھر اسامی را بھاکھا ہندی نوشتہ آن را باہورام خلاصۂ مریدان گوشائین ولی رام بعبارتِ مرغوبہ بفارسی درآوردہ"

(تاریخ دریاباد ص ۱۰۹)

اور اس سے حسب ذیل تاریخی نتائج نکالے گئے ہین،:-

(۱) پدماوت کو اول مشر پدپادھر نے جو راے رتن سین کے درباری رکن تھے، بزمانہ علاء الدین (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) والیِ دہلی بھاشا زبان مین تصنیف کیا،

۲- بعد اوس کے باہورام مرید گوشائین ولی رام کے ذریعہ اسے فارسی جامہ نصیب ہوا،

۳- اور ہندی تصنیف کی مدد سے ایک مدت کے بعد شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) کے عہد مین ملک محمد جائسی

کی کتاب پدماوت تالیف ہوئی،

۴ - اورنگ زیب (۱۰۶۸ھ ۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء) کے زمانہ تک نقاشِ اول کی دھوم رہی (یعنی بدمادھر پدماوت کے مصنف کی حیثیت سے مشہور رہا، کیونکہ خلاصۃ التواریخ اورنگ زیب کی عہد کی تصنیف ہے،) پھر نقشِ ثانی کا رواج ہوا، (یعنی ملک محمد جائسی کی پدماوت کا شہرہ ہوا، اور پدمادھر کی شہرت فنا ہوگئی،) جو اس وقت تک شہرت کے ساتھ قائم ہے،

۵ - اس واقعہ سے ہنس جواہر (مصنفہ قاسم شاہ صاحب) کا درجہ ملک محمد جائسی کی کتاب پدماوت کے مقابلہ مین ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ یہ پدماوت مشر پدمادھر اور باہورام کی کتابون کا ترجمہ ہے، اور ہنس جواہر قاسم شاہ کی طبع زاد تصنیف ہے،

لیکن ان نتائج مین متعدد غلط فہمیان ہین،

۱ - مصر پدمادھر (صحیح بدمادھر) مصنف پدماوت کو راے رتن سین والیِ چتور کا درباری فرض کیا گیا ہے، جس کے لئے تاریخی سند کی ضرورت ہے، اور مصنف نے "خلاصۃ التواریخ" کی مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ (جو قابلِ بحث ہے) کوئی سند مہیا کرنے کی زحمت گوارا نہین فرمائی ہے،

۲ - چونکہ بدمادھر کا زمانہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہین ہے، اسلئے پدماوت کا زمانہ تصنیف سلطان علاء الدین والیِ دہلی کا عہدِ سلطنت (۶۹۵ھ ۱۲۹۶ء تا ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء) بہ مشکل فرض کیا جا سکتا ہے،

۳ - بدمادھر کی پدماوت کے کسی نسخہ کا کسی کتب خانہ مین مصنف نے وجود نہین ثابت کیا ہے، اسلئے اوس کے فارسی ترجمہ (مصنفہ باہورام) کے وجود کا یقین بھی آسانی کے ساتھ نہین آسکتا

۴ - بدمادھر کی پدماوت اور اس کا فارسی ترجمہ چونکہ "مشکوک الوجود" اور "مفقود الخبر" ہین، اسلئے ایسی کتابونکو قطعیت کے ساتھ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا ماخذ قرار نہین دیا جا سکتا،

۵ - یہ بھی تسلیم کرنا مشکل ہے، کہ خلاصۃ التواریخ کے زمانۂ تصنیف تک جو اورنگ زیب کے عہد مین لکھی گئی، پدماوت کا مصنف بدمادھر ہی تسلیم کیا جاتا تھا، اور ملک محمد جائسی کی پدماوت گوشۂ گمنامی مین پڑی ہوئی تھی،

۷- پد ما دھر اور بنا ہو رام کی کتابون کا وجود ثابت ہونے سے پہلے یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے، کہ ملک محمد جائسی کی پدماوت اون کا ترجمہ تھی، اور اس لئے ہنس جواہر (مصنفہ قاسم شاہ) اوس پر ترجیح رکھتی ہی،

حقیقت یہ ہی کہ مصنف کے پیش نظر خلاصۃ التواریخ کا جو مطبوعہ نسخہ تھا، اس مین عبارت غلط چھپی ہی، دار المصنفین مین اوس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اس کتاب کا مصنف سجان سنگھ دہیر ساکن قصبہ بٹیالہ اپنی ماخذون کو گناتے ہوے پدماوت کے متعلق لکھتا ہی، :-

"و نسخہ پدماوت مشتمل بر حقیقت راے رتن سین، مرزبان چتور، کہ بنا بر پدماوت زوجہ خود با سلطان علاء الدین والی دہلی محاربہ نمودہ"

یہ عبارت یہین پر ختم ہو گئی ہے، اور اس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہین، :-

۱- پدماوت مین راے رتن سین والی چتور کا قصہ لکھا ہے، جو اپنی بیوی پدماوت کی وجہ سے سلطان علاء الدین والی دہلی سے لڑا تھا،

۲- اسمین یہ تصریح نہین ہی، کہ پدماوت علاء الدین کے زمانہ مین تصنیف ہوئی تھی،

۳- نہ اس کا ذکر ہے کہ پدماوت کا مصنف کون تھا؟ اور کس زمانہ مین گذرا تھا؟

۴- نہ اس کا پتہ ہے، کہ پدماوت کا بھاشا سے فارسی مین ترجمہ ہوا تھا،

ل۵ کتبخانہ برٹش میوزیم اور بانکی پور کی فہرستون مین اس نام کے مختلف تلفظ لکھے ہین، مارلے، اور اسپرنگر نے (س ن ح ان) ، ہیں اور الیٹ نے (س ب ح ان) گارسن دی ٹاسی نے (س ح ان) پڑھا ہے، بوڈلین لائبریری کی فہرست مین ایتھے نے (س ح ان راے) لکھا ہے، جو ٹاسی کے مطابق ہے، چونکہ آخری تلفظ مین "ہند وپن" ہے اس لئے وہی صحیح ہے، بانکی پور کی فہرست مین مصنف کو کہتری لکھا گیا ہے، اور اس کی تائید دار المصنفین کے قلمی نسخہ سے ہوتی ہے، کہ اس مین نام کا جزء سنگھ کا لفظ بھی ہے، جو پنجاب کے اون کھتریون کے نام کے ساتھ شامل ہوتا ہے، جو سکھ مذہب کے پیرو رہتے ہین،

اب آگے چلیے، پدماوت کے ذکر کے بعد سجان سنگھ نے اپنی کتاب "خلاصۃ التواریخ" کے دوسرے ماخذ کا تذکرہ کیا ہے اور وہ یہ ہے:-

"و نسخہ راجاولی کہ مصر بدہا[1] دھر اسامی راجہا بخط ہندی نوشتہ، و آنرا نباہورام[2] خلاصہ مریدان گسائین ولی بعبارات مرغوبہ بفارسی در آوردہ"

اس ثابت ہوتا ہے، کہ:-

۱- راجاولی ہندی زبان میں ایک کتاب مصر بدہا دھر نے تصنیف کی تھی،

۲- نباہورام نے اسی راجہ ولی کو فارسی زبان میں لکھا تھا،

۳- راجاولی میں راجاؤں کے نام لکھے گئے تھے،

۴- بدہا دھر اور نباہورام کب اور کس زمانہ میں گذرے ہیں؟ اس کا کچھ ذکر نہیں ہے،

دار المصنفین کے قلمی نسخہ سے ہم نے جو عبارتیں نقل کی ہیں، برٹش میوزیم اور بانکی پور کے نسخوں میں بھی اُسی کے مطابق ہیں،

اب حسب ذیل مسائل پر غور کرو،

۱- پدماوت اور راجاولی دو کتابیں ہیں،

۲- پدماوت میں رائے رتن سین کی رانی پدماوت کا قصہ ہے، اور راجاولی میں راجاؤں کے نام ہیں، اسلئے دونوں کے موضوع میں بڑا فرق ہے، جو دونوں کے ناموں سے ظاہر ہے،

۳- پدماوت کے مصنف کا نام نہیں لکھا ہے، اور راجاولی کے مصنف کا نام بدہا دھر اور فارسی مترجم کا نام نباہورام بتایا گیا ہے، پھر بدہا دھر، پدماوت کا مصنف کیسے ہو سکتا ہے، اور نباہورام کے پدماوت کے فارسی

---

[1] و [2] قلمی نسخہ میں یہ نام صاف نہیں پڑھے گئے، کتبخانہ برٹش میوزیم اور بانکی پور کی فہرستوں میں پہلا نام (ب د ہ ا د ہ ر) (Bidhadhar) اور دوسرا (ن ب اہ و رام) (Nibahuram) لکھا ہے اس لئے مصنف نے تاریخ دریاباد میں بدماہا دھر اور باہورام جو نام لکھے ہیں، غلط ہیں،

ترجمہ کو کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے؟

۴۔ پدماوت، ملک محمد جائسی کی تصنیف ہے، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہو، جس کا انکار اب تک کسی نے نہین کیا ہے، خلاصہ تواریخ مین جو پدماوت کے مصنف کا نام نہین لیا گیا ہے، اوس کا سبب یہ نہ تھا، کہ پداوت کسی اور شخص نے بھی لکھی تھی، بلکہ یہ سبب تھا، کہ پدماوت کا ملک محمد جائسی کی تصنیف ہونا ایک مشہور بات تھی،

۵۔ خلاصۂ تواریخ کے ماخذون کی فہرست مین متعدد نام ایسے بھی ملتے ہین، جن کے مصنفین کا ذکر نہین کیا گیا ہے، مثلاً گل افشان جو سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ تھا، اور جس مین بکرماجیت کے حالات تھے، تاریخ شہاب الدین غوری، تاریخ سلطان علاء الدین خلجی، تاریخ بہادر شاہی جس مین گجرات (احمد آباد) کے بادشاہون کے حالات تھے، تاریخ سلاطین جس مین ملتان، مالوہ، دولت آباد (دکن) جونپور، بنگالہ، اوڑیسہ کے سلاطین کا تذکرہ تھا، توکیا ان سب کتابون کو بھی فرضی مصنفین کی طرف منسوب کر دیا جائے گا؟

لہ فہرست کتبخانہ برٹش میوزیم بانکی پور،

تلخیص و تبصرہ

طریق معاش کا انتخاب

طریق معاش کا انتخاب اپنی اہمیت کے لحاظ سے جسقدر غور و تامل کا مستحق ہی اسی قدر اُس مین غفلت و بے پروائی برتی جاتی ہے، ہر پیشہ کے لئے اختیار کرنے والے کی صلاحیت اور استعداد کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اور اسی اعتبار سے اوسکی تعلیم و تربیت ہونی چاہئے، لیکن عام طور پر طلبہ کی صلاحیت و استعداد پر کوئی توجہ نہین کی جاتی اور بغیر اس خیال کے کہ جس پیشہ کیلئے اونھین تیار کیا جا رہا ہے، اُس مین وہ کہان تک کامیاب ہو سکتے ہین، والدین اُنھین اپنی پسند یا مصلحت کے لحاظ سے تعلیم دیتے رہتے ہین، بہت کم والدین کا انتخاب طلبہ کی استعداد کے موافق ہوتا ہی، عموماً اون کے اندازہ اور قیاس مین غلطی ہو جاتی ہی جس کی پاداش طلبہ کو تمام عمر اپنی ناکام زندگی مین برداشت کرنی پڑتی ہے، اس غلطی سے بچنے کی غرض سے چند سالون سے یورپ کے بعض ملکون مین ایسے ادارے قائم کئے گئے ہین جنمین ابتدا ہی سے طلبہ کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ ہوتی رہتی ہے، اور زمانہ تعلیم ہی مین اون کو بتا دیا جاتا ہی کہ وہ کن پیشون کیلئے زیادہ موزون ہین تاکہ اوسی لحاظ سے وہ اپنے آیندہ طریق معاش کا انتخاب کرکے اس کے لئے تیاری کرین اور زندگی مین کامیاب ہو سکین، انگلستان مین بھی اس قسم کا ایک ادارہ (Institute of Industrial Psychology) دس سال سے کام کر رہا ہی، اس کے صدر ڈاکٹر مایرس (Dr. C. S. Myers) نے اس موضوع پر حال مین ایک مقالہ مانچسٹر گارجین مین تحریر کیا تھا جسے اسٹیٹسمین نے نقل کیا ہی، اس کی تلخیص ہم سطور ذیل مین پیش کرتے ہین :-

اگر کسی شخص نے کوئی ایسا پیشہ اختیار کر لیا ہے، جس کے لئے وہ موزون نہین ہی، تو انفرادی حیثیت سے اس کی زندگی

ناکام اور دردناک ہے، اور اجتماعی حیثیت سے وہ ایک ایسے مسئلہ کو پیش کر رہا ہے، جو موجودہ زمانہ کے اہم مسائل مین ہے؛
غلط پیشہ اختیار کرنے کا نتیجہ غیر آسودگی، بے اطمینانی، ناشادگی، و ناکامی، خود اعتمادی کا نقصان، اور انسانی قوتون
کا حیرت انگیز اختلاف ہے، لیکن دانشمندی کے ساتھ صحیح پیشہ کا انتخاب کرنا بھی آسان نہین ہے، اُس کے لئے لڑکے
یا لڑکی کی دماغی، جسمانی اور مزاجی قابلیت اور استعداد کا ٹھیک اندازہ لگانا ضروری ہے اس کیلئے یہ معلوم کرنا بھی
ضروری ہے، کہ مختلف پیشون کے لئے کس کس قسم کی اہلیت اور قابلیت درکار ہے، پیشون کے انتخاب مین اکثر و بیشتر اتفاق
ہی کو دخل ہوتا ہے، محض اس لئے کہ بچون اور اُن کے والدین و اساتذہ کو وہ معلومات حاصل نہین ہوتے جو ایک صحیح تر انتخاب
کیلئے ضروری ہین، فلسفہ، نفسیات مین جو ترقی حال میں رونما ہوئی ہے، اوس نے خوش قسمتی سے اس مسئلہ کا حل بھی پیدا
کر دیا ہے، ماہرین نفسیات سوالون سے ایسے طریقے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہین، جن سے طلبہ کی ذہنی اہلیت اور
مزاجی اور کرداری کیفیت کا صحیح اندازہ ہو سکے، اور وہ ایک بڑی حد تک اس کوشش مین کامیاب ہوگئے ہین، وہ اپنے
طریقہ پر زید کی جانچ کرکے صرف یہی نہین بتا دیتے کہ وہ ایک ذہین لڑکا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہین، کہ یونیورسٹی کے جن
طلبہ نے نمایان کامیابی کے ساتھ اعلیٰ ڈگریان حاصل کی ہین، زید اپنی ذہنی استعداد کے لحاظ سے ان سے کسی قدر بڑھا ہوا
ہے، نیز اونھین یہ بھی معلوم ہوجاتا ہو کہ اوس مین صنعت و حرفت کے پیشون مین کامیاب ہونیکی صلاحیت بہت کم ہے، اور
انجنیری تعمیرات، دندان سازی، اور اسی قسم کے دوسرے پیشے اوس کے لئے موزون نہین ہین، نفسیاتی جانچ کے ذریعہ
سے وہ معلوم کرلیتے ہین کہ زید مین خود اعتمادی، حاضر جوابی، احتیاط اور منطقی استدلال کی صفتین موجود ہین، اور اس
سے زبانی گفتگو کرکے وہ اس خیال کی تصدیق کرلیتے ہین، کہ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوسکتا ہو، دریافت کرنے پر زید کبھی
اس پیشہ کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہو، پھر اس کے اساتذہ بیان کرتے ہین کہ لاطینی اور انگریزی زبانون مین اسکی
استعداد بہت اچھی ہے، ... انجمن مباحثہ کا وہ ایک سرگرم رکن ہو، آخر مین اوس کے باپ سے گفتگو کرکے یہ معلوم کرلیا جاتا ہو،
کہ وہ زید کو بیرسٹری کی تعلیم دلانے کی استطاعت رکھتا ہے، اور تعلیم سے فراغت کے بعد ہی جب تک زید کی آمدنی
قابل اطمینان نہ ہوجائے، اوس کی مالی امداد کرنے کیلئے آمادہ ہو، ان معلومات کے بعد زید کے لئے یہ پیشہ منتخب کیا جاتا ہو،

انگلستان میں اس قسم کی جانچ او مشورہ کا کام ایک خاص ادارۂ نفسیات (National Institute of Industrial Psychology) کے ہاتھ میں ہے، دس سال سے زائد سے اس ادارہ کے ارکان مختلف پیشون کے لئے طلبہ کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ کے طریقے وضع کر رہے ہین، اور اونھون نے تفصیل کے ساتھ اُن ضروریات کا مطالعہ کیا ہے، جس کا لحاظ ہر پیشہ کے انتخاب کیلئے لازمی ہے، اونھون نے تین عنوانون کے ماتحت تمام پیشون کی تقسیم کی ہے (۱) وہ پیشے جن کا تعلق خاص طور پر اشخاص سے ہے، مثلاً درس وتدریس، عملہ کی نگرانی وغیرہ، (۲) وہ پیشے جو خاص کر اشیا سے متعلق ہین، مثلاً فن تعمیر، چمن بندی وغیرہ (۳) وہ پیشے جو خصوصیت کے ساتھ مجرد خیالات اور علامات سے تعلق رکھتے ہین مثلاً روپیہ وغیرہ کا حساب کتاب، یہ تقسیم اگرچہ ناقص ہے تاہم کارآمد ہے،

یہ ادارہ جن طلبہ کو کسی پیشہ کے انتخاب کی بابت مشورے دیتا ہے، اُن سے دریافت بھی کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے انتخاب مین کہان تک کامیاب ہوئے، اس دریافت کے جو جوابات موصول ہوئے ہین، وہ بہت امید افزا ہین، اور اون سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو مشورے ادارہ نے دیے تھے، وہ عمومیت کے ساتھ صحیح اور کامیاب ثابت ہوے چنانچہ جن لوگون نے ادارہ کے مشورون پر عمل نہین کیا، ان مین کامیابی اور ناکامی کا تناسب تقریباً برابر ہی رہا، لیکن جن لوگون نے اس کے مشورون پر عمل کیا، ان کی کامیابی ناکامی سے نوگنا زیادہ تھی،

یہ ادارہ جس کی شاخین انگلستان کے متعدد مدارس مین قائم ہوگئی ہین، اونچے درجون کے طلبہ مین سے ہر سال تقریباً آٹھ سو طلبہ کو اُن کے آیندہ طریق معاش کے انتخاب کے متعلق مفید اور مناسب مشورے دیتا رہتا ہے، لیکن یہ قلیل تعداد اوس کثیر تعداد کے مقابلہ مین کچھ بھی نہین ہے، جو اس قسم کے مشورون سے محروم رہنے کے باعث زندگی مین عموماً ناکام رہتی ہے، لہذا خیال یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام مدارس مین ایسے اساتذہ مقرر کر دیے جائین جن کا کام خاص طور پر وقتاً فوقتاً طلبہ اور طالبات کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ کرنا، اور اونھین مفید مشورے دینا ہوگا، یہ اساتذہ ادارۂ نفسیات کے تعلیم یافتہ ہون گے، اور اوسی ادارہ کے طریقون پر عمل کرین گے، "ع ز"

یورپ میں اوسط پیدائش کے انحطاط کا اقتصادی اثر

پروفیسر ہرش (Hersch) جنیوا یونیورسٹی نے ان اثرات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو یورپ مین اوسط پیدائش کے انحطاط سے اقتصادی حالات پر پڑرہے ہین، جیساکہ اسٹیٹسمین راوی ہے، یہ نتیجہ نکالا ہو کہ یہ انحطاط مستقل کسادبازاری کے پیدا کرنے کا ایک قوی باعث ہوگا، اور اس سے بے روزگاری کا مسئلہ حل نہ ہوسکے گا، پروفیسر موصوف بتاتے ہین کہ سیکڑون برس تک یورپ کے ملکون کا سالانہ اوسط پیدائش تقریبًا (۴۰) فی ہزار تھا، انحطاط فرانس مین شروع ہوا، اور گذشتہ صدی کے دوران مین اس کی رفتار برابر جاری رہی، اس صدی کے آخری رُبع مین یہ انحطاط ان ملکون مین بھی شروع ہوگیا، جہان جرمن نسل کے لوگ آباد ہین، اور وہان موجودہ صدی کی ابتدا مین اس انحطاط مین تیزی کے ساتھ ترقی ہوتی گئی، جنگ عظیم کے قریب اٹلی اور مغربی سلافی قومون (Western Slavs) مین کچھ انحطاط رونما ہونے لگا، فرانس مین اگرچہ اوسط پیدائش برابر گرتا جارہا تھا، تاہم ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس سال دوسرے ممالک کا اوسط فرانس سے بھی کم تھا، فرانس کا اوسط پیدائش فی ہزار (۱۷/۴) تھا، جرمنی کا (۱۶) سوئزرلینڈ اور ناروے کا، (۱۶/۷) انگلستان کا (۱۵/۸) اور سوئیڈن کا (۱۴/۸) جنگ کے بعد ہی اسپین، پرتگال، پولینڈ، سوویٹ روس، اور ریاستہائے بلقان مین بھی اوسط پیدائش گرنے لگا، اونچے طبقون کی بہ نسبت صنعت و حرفت کے طبقون مین اوسط پیدائش زیادہ ہے، لیکن شہرون مین اس کا انحطاط دولتمندون سے زیادہ غربا مین نمایان ہو،

اوسط پیدائش کے انحطاط کا اثر ملک کی آبادی پر یہ پڑا کہ تمام یورپ اور خصوصًا اس کے شمالی اور مغربی ممالک مین بچون کی تعداد کا تناسب بہت گھٹ گیا، اور بڑون کا تناسب اس وقت بڑھا ہوا ہو، جسکی ایک وجہ یہ ہو کہ اوسط اموات مین کمی ہوگئی ہو، لیکن نوجوانون کی تعداد کے تناسب مین کمی شروع ہوگئی ہے، اور بوڑھون کا تناسب زیادہ ہوگیا ہو، یعنی جیساکہ پروفیسر موصوف لکھتے ہین، اگر اس وقت بچون کی تعداد کم ہے، اور بڑون اور بوڑھون کی زیادہ تو تھوڑے ہی دنون مین بچون اور کام کرنے کے قابل اشخاص کی تعداد اور بھی کم ہوجائے گی اور

بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، شمالی اور وسط مغربی یورپ میں اوسط پیدائش اوسط اموات کے تقریباً برابر ہی ہے، اور ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں یہ اوسط اموات سے نیچے گر جائے، یعنی مغربی یورپ کی آبادیوں میں جمود کے آثار پائے جاتے ہیں،

اس صورت حال کے اقتصادی اثرات کیا ہوں گے؟ پروفیسر ہرش اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ پیدا کرنے والوں کی بہ نسبت صرف کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی، کیونکہ معاشی نقطۂ نظر سے پیدا کرنے والوں کی تعداد تقریباً تمام تر جوانوں اور پختہ عمر والوں پر مشتمل ہے، بچوں کا کام پیدا کرنا نہیں، بلکہ صرف کرنا ہے، اور ان کی تعداد کا انحطاط بوڑھوں کی تعداد کی افزایش سے زیادہ ہے، "پیدا کرنے والوں کی تعداد کی مناسبت سے صرف کرنے والوں کی تعداد کا یہ مستقل انحطاط لازمی طور پر بے روزگاری کو ترقی دیتا رہے گا، اور یہ بے روزگاری کوئی وقتی اور موسمی بے روزگاری نہ ہوگی، بلکہ ایسی بے روزگاری ہوگی، جسے بجا طور پر ترکیبی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ نتیجہ ہوگی آبادی کی ترکیب عمری کا"

اس بے روزگاری کو دور کرنے کیلئے پروفیسر موصوف یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کام کے گھنٹوں میں تدریج تخفیف کر دی جائے، جن کاموں کیلئے اجرت مقرر ہے، ان کے لئے عمر تدریج محدود کر دی جائے، طبقۂ عوام کی قوت خریداری میں اضافہ ہو جائے، اور تنخواہوں میں تخفیف کر کے ملازمتوں کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن اوسط پیدائش کے گر جانے سے جو ترقی پذیر کساد باری وجود میں آگئی ہے، اوس کو رفع کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشی زندگی کے مختلف شعبوں میں آبادی اور سرمایہ کی تقسیم میں ایک تبدیلی پیدا کر دی جائے، تمام ضرورتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتیں، ایک شخص کو اپنی بھوک اور پیاس بجھانے کیلئے غذا اور پانی کی ایک متعین مقدار چاہئے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی صاحب علم کی تشفی کیلئے کتنی کتابوں کی ضرورت ہوگی، یا تصویروں کی کونسی تعداد اس شخص کے ذوق کو پورا کر دے گی، جو اونھیں جمع کرنے کا شائق ہے، غرض جو ضروریات خالص مادی اور زندگی کیلئے لازمی ہیں، وہ سامان کی ایک محدود مقدار سے پوری ہو سکتی ہیں، لیکن جو ضروریات اجتماعی، دماغی، فنی، اخلاقی، یا اسی قسم کی ہیں وہ حقیقتہً غیر محدود ہیں، اور اون کو پورا کرنے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک مزید ضرورت پیدا ہو جاتی ہے، پہلی قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کوئی آبادی سامان کی جو مقدار استعمال کر سکتی ہے، اس کی تعیین خاص طور پر اس آبادی کی

مجموعی تعداد سے کی جاتی ہے، اور دوسری قسم کی ضروریات کیلئے سامان کی جو مقدار درکار ہوتی ہے، اس کا انحصار خصوصیت کے ساتھ اوس آبادی کے معیار حیات و تمدن اور اوس کی قوت خریداری پر ہوتا ہے"، پروفیسر سرشن کا خیال ہے کہ پہلی قسم کے سامانوں کا اوسط پیداوار کم کر دینا چاہئے، دوسری قسم کے سامانوں کی طلب تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ بڑھتی ہی جائے گی، خواہ آبادی اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے، "ع ز"

سرطان کے علاج میں ترقی

تین ہزار برس سے زیادہ ہوئے، جب کہ مصر کے قدیم پوجاریوں نے سرطان کے بعض مریضوں کو دیکھ کر اس مرض کے متعلق کچھ لکھا تھا اور اس کے علاج کے لئے ایک مرہم تجویز کیا تھا، جو دراصل بہت کم مفید ثابت ہوا، پھر اس کے بعد اب سے تقریباً ایک سو برس پہلے تک اس مرض کی نسبت بہت کم معلوم ہو سکا، ایک سو سال ہوئے، ماہرین حیوانات و نباتات اور اطبا، نے خوردبین کے ذریعہ سے اس کا معائنہ شروع کیا اور بیس سال کے عرصہ میں یہ معلوم کر لیا کہ سرطان کی متعدد قسمیں ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں، جو سرطان جلد سے پیدا ہوتے ہیں، وہ جلد کے چھوٹے چھوٹے خانوں سے بنتے ہیں، اور جو اندرونی اعضا سے نکلتے ہیں، وہ اُن خانوں سے بنتے ہیں جن سے ان اعضا، کی تعمیر ہوتی ہے؛ ہڈی کا سرطان جسم کے کسی اور حصہ کے سرطان سے مختلف ہوتا ہے، بتدریج ان سرطانوں کی علحدہ علحدہ تقسیم قائم کی گئی، ان کے جدا گانہ نام رکھے گئے اور یہ قلم بند کر لیا گیا کہ بعض سرطان دوسروں دوسروں کی بہ نسبت بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، تقریباً اسی زمانہ میں فن جراحی میں بھی ترقی رونما ہونے لگی اور بعض سرطانوں پر عمل جراحی کیا بھی گیا، لیکن انیسویں صدی کے وسط تک جبتک کہ بے حس کرنے والی دواؤں کا استعمال عام نہیں ہو گیا، سرطان کے بڑے آپریشن نہیں کئے گئے، اور چونکہ تمام زخم پک جاتے تھے، اس لئے بہت کم غدود کاٹ کر نکالے جاتے تھے، پھر لسٹر (Lister) کی عظیم الشان تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صفائی اور دافع تعدیہ اشیاء کے استعمال سے زخم کو پکنے اور خراب ہونے سے روکا جا سکتا ہے، اور اس اکتشاف کے بعد سرطان کے نازک آپریشن بھی کئے جانے لگے، لیکن تندرست ہو جانے والے اشخاص کی تعداد پھر بھی کم ہی رہی،

۱۸۹۶ء مین رونٹجن (Roentgen) نے عکس ریز (اکس ریز) کو دریافت کیا اور ۱۸۹۸ء مین میڈم کیوری (Madam Curie) نے ریڈیم کو معلوم کیا ان دریافتون کے بعد سے سرطان کے علاج کا جدید طریقہ شروع ہوا، یعنی آپریشن کے ذریعہ سے نکال دینا یا ریڈیم کے ذریعہ سے فنا کر دینا، لیکن بہت سے سرطان ایسے ہین، جو آپریشن یا ریڈیم کسی طریقے سے اچھے نہین ہو سکتے،

۱۹۰۰ء کے قریب یہ معلوم کیا گیا، کہ سفید چوہون کو بھی انسان ہی جیسا سرطان ہوتا ہے، اور یہ ایک جانور کے جسم سے نکال کر دوسرے جانور کے جسم مین منتقل کیا جا سکتا ہی،

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سرطان کسی جرثومہ (germ) کے سبب سے نہین ہوتا، لہذا یہ قدیم خیال بالکل غلط تھا، کہ سرطان کے مریض کا تعدیہ اس کے تیمارداروں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہی، اسی طرح جانورون پر تجربہ کرکے یہ بھی دکھایا جا چکا ہی، کہ یہ مرض موروثی نہین ہوتا،

جانورون مین سرطان بعض معمولی کیمیاوی مواد (Chemicals) سے پیدا کیا جا سکتا ہی، بعض کیڑے بھی سرطان پیدا کرنے کا سبب ہو سکتے ہین، مصر مین ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہی، جس کے کاٹنے سے سوزش پیدا ہوتی ہے اور اُسی قسم کا سرطان پیدا ہو جاتا ہی جیسا فراعنہ مصر کے زمانہ مین وہان کے باشندون مین پایا جاتا تھا کیڑون کے کاٹنے سے جو سرطان پیدا ہوتا ہی، وہ بہ نسبت سرد ملکون کے مشرق بعید مین بہت زیادہ پایا جاتا ہی،

اس مین شبہہ نہین کہ لوگ اگر حفظانِ صحت کے معمولی اصولوں پر عمل کرنے لگین، تو بہت سے سرطانون سے پناہ مل سکتی ہی، مثلاً منہ کے سرطان اکثر ایسے مصنوعی دانتون کے استعمال سے جو ٹھیک لگتے نہین یا تیز دانتون کے زبان پر رگڑنے سے یا اسی قسم کے دوسرے اسباب سے جنھین دفع کیا جا سکتا ہے، پیدا ہو جاتے ہین، اسی طرح جو سرطان تار کول یا ایسے روغنون سے پیدا ہوتے ہین، جو مشینون مین استعمال کئے جاتے ہین اُن سے بچنے کا بہت آسان طریقہ یہ ہی کہ کثرت سے غسل کیا جائے تاکہ اس قسم کے روغن جسم سے صاف ہوتے رہین،

"ع ز"

یونان کے بعض آثار قدیمہ

گذشتہ موسم گرما میں یونان کے دارالسلطنت ایتھنز میں ماہرین آثار قدیمہ نے بہت سی نادر چیزیں کھود کر نکالی ہیں، ایتھنز کے قدیم بازار (The agora) میں بے شمار کنوے تھے، ان میں سے صرف ایک کنوے سے (۲۱۷) چیزیں برآمد کی گئی ہیں، یہ چیزیں چھٹی صدی قبل مسیح سے لیکر ۸۶ء قبل مسیح تک کی ہیں ان میں سب سے زیادہ قدیم چیز ایک خوبصورت برتن ہے جسمیں دو دستے لگے ہوئے ہیں، یہ ساتوین صدی قبل مسیح کے آخری دور کا ہے، اس کے علاوہ ایک اور نہایت قدیم گلدان ہے جس کی شکل ایک جھکے ہوئے لڑکے کے مانند ہے، جس مقام پر یہ قدیم بازار واقع تھا، وہان اب جدید عمارتین بن گئی ہین، اوران آثار قدیمہ کے نکالنے کیلئے بہت سے جدید مکانات کو گرا دینا پڑا ہے، گذشتہ موسم گرما کی کھدوائی مین کنوون کے علاوہ بالکل غیر متوقع طور پر ایک مقبرہ بھی برآمد ہوا ہے، اس مین تین انسانی ڈھانچے، ایک نیلے شیشے کا ہار اور چند ٹوٹے ہوئے گلدان ملے ہین، اسی کے قریب فتح کے پردار دیوتا کے دو مجسمے بھی برآمد ہوئے ہین، جو پانچوین صدی قبل مسیح کے بنے ہوئے ہین، ایک سنگ مرمر کا مجسمہ شہنشاہ ہیڈرین (دوسری صدی عیسوی) کا بھی نکلا ہے، اس کا سر اب تک نہین ملسکا ہے، لیکن اور علامات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ یہ مجسمہ اسی شہنشاہ کا ہے، ایک اور سنگ مرمر کا مجسمہ چوتھی صدی قبل مسیح کا شاہکار ہے، یہ ایک نوجوان حسینہ کا مجسمہ ہے، جس کا لباس اس قدر باریک دکھایا گیا ہے کہ جسم کی خوبصورتی لباس کے اوپر سے بھی نمایان ہے، قریب تین سو قندیلین (لیمپ) برآمد ہوئی ہین، جو مختلف قسمون اور ساتوین صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی عیسوی تک کے مختلف زمانون کی بنی ہوئی ہین، تین سال کی کھدوائی مین ایک ہزار سے زیادہ کتبے اور چوبیس ہزار سے زیادہ قدیم سکے ملے ہین، اس سلسلہ مین ایک دلچسپ چیز یہ ہاتھ آئی ہے، کہ یونان کے قدیم معمار پختہ عمارتون مین جو مسالہ دیتے تھے، اس کا نسخہ مل گیا، ڈاکٹر لیسلی شیر (Dr. Leslie Shear) جنکی سرکردگی مین امریکہ کے ماہرین آثار قدیمہ نے ان مین سے

اکثر چیزیں برآمد کی ہیں، اپنے ساتھ پرانی گچ کے کچھ ٹکڑے امریکہ لیتے آئے تھے، جن کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن میں (۲) فی صدی بالو اور (۳۶) فی صدی چونا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ تناسب اوس نسخہ سے مختلف ہے جو شہنشاہ اغسطس (پہلی صدی قبل مسیح) کے زمانہ کا معمار وٹرووس (Vitruvius) چھوڑ گیا ہے،

قدیم اہلِ ایتھنز کی مذہبی زندگی سے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہوئے ہیں، یونان میں فرقہ ادریہ (Gnostics) دوسری صدی عیسوی کا ایک طاقتور فرقہ تھا، جس کے مذہب میں سحرکاری کے علاوہ یونانی، مصری، اور سامی مذاہب کے اجزا بھی شامل تھے، ان لوگوں کے پاس بعض ایسے جواہرات ہوتے تھے جن پر عجیب و غریب قسم کی تصویریں بنی ہوتی تھیں اور عجیب و غریب دیوتاؤں کے نام اور طلسمی عبارتیں کندہ ہوتی تھیں، چنانچہ جو پتھر برآمد ہوا ہے، وہ اس قسم کا ہے، جسے "ابراساکس" (Abraxas) کہتے ہیں، اس نام کے اعداد (۳۶۵) ہیں جو سال کے دنوں کی تعداد ہے، اس پتھر پر ابراساکس نامی ایک عجیب جانور کی تصویر بنی ہوئی ہے جس کا سر مرغ کا ہے، اور جس کی ٹانگوں کے بجائے دو سانپ ہیں،

ایتھنز کی قدیم عدالتی کارروائی سے متعلق بھی ایک دلچسپ چیز برآمد ہوئی ہے، جو شہری جیوری کے فرائض کے لائق سمجھے جاتے تھے، اونھیں ایک کانسے کا ٹکٹ دیا جاتا تھا، جس پر اون کا نام، اُس شعبہ کا نام جس سے وہ متعلق ہوتے تھے، اور شہر کی مہر کندہ ہوتی تھی، مقدمہ کی سماعت کے وقت جیوری کے ہر رکن کو کانسے کے دو قرص دئے جاتے تھے، ایک کا مرکزی حصہ کھوکھلا اور دوسرے کا ٹھوس ہوتا تھا، جس قرص کا مرکزی حصہ کھوکھلا ہوتا تھا، اوسے ملزم کی بریت کے لئے ووٹ دینے میں استعمال کرتے تھے اور جس کا ٹھوس ہوتا تھا، اسے سزا کیلئے ووٹ دینے میں جیوری کا ہر رکن ووٹ دیتے وقت پوشیدہ طور پر ایک قرص کانسے کے ایک برتن میں ڈال دیتا، اور پھر ان سب قرصوں کو جمع کر کے جیوری کی رائے معلوم کر لی جاتی، اور اسی کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا، جو قرص برآمد ہوئے ہیں، وہ چوتھی صدی قبل مسیح کے ہیں، اور یہ اُسی زمانہ کے ہیں جس زمانہ کی عدالتی کارروائی کا بیان ارسطو نے اپنے "دستورِ ایتھنز" میں کیا ہے،

قدیم ایتھنز کے سیاسی قانون کے متعلق بھی ایک اہم چیز کا انکشاف ہوا ہے، پانچوین صدی قبل مسیح مین ایتھنز کے قانون مین جلا وطنی (Ostracism) کا رواج جگہ پا چکا تھا، اس قانون کے مطابق وہان کے شہری کسی قائد کو جو حد سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کرلے، دس سال کیلئے جلا وطن کر سکتے تھے، اس کا طریقہ یہ تھا، کہ اوس قائد کا نام مٹی کے ایک ٹکڑے پر جسے اوسٹراکون (Ostrakon) کہتے تھے کندہ کر دیا جاتا تھا، اور وہی اس کے خلاف ووٹ کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، پہلا مدبر جس کے خلاف یہ قانون جاری کیا گیا، ہپارکوس (Hipparchos) تھا، جو جنوری ۴۸۷ء قبل مسیح مین جلا وطن کیا گیا چنانچہ ایک اوسٹراکون جسپر اوس کے خلاف ووٹ دیا گیا تھا، گیارہ دوسرے اوسٹراکونون کے ساتھ برآمد ہوا ہے،

"ع ز"

خلفائے راشدین

سیر المہاجرین کا حصہ اول، یہ چارون خلفا کے ذاتی حالات فضائل اور مذہبی و سیاسی کارنامون اور فتوحات کا آئینہ ہے، حجم ۲۸۰ صفحے قیمت :- ۱۲؎

مہاجرین

حصہ اول

اس کتاب مین خلفائے راشدین کے علاوہ بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ اکابر بنی ہاشم و قریش اور ان اصحاب کے حالات سوانح، اخلاق و فضائل کی تفصیل کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، شروع مین ایک مفصل مقدمہ مین قریش کی تاریخ اور قبائل مہاجرین کی تفصیل کی گئی ہے، اور مہاجرین کے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہین، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، قیمت للعہ، حجم ۴۲۹ صفحے،

منیجر دار المصنفین

ادبیات

خونِ جگر

از حضرت جگر مرادآبادی،

سنتا ہون کہ ہر حال مین وہ دل کے قرین ہے   جس حال مین ہون اب مجھے افسوس نہین ہے

عالم ہے کچھ ایسا کہ زمان ہے نہ زمین ہے،   مین ہون، نہ درِ ناز نہ سجدہ، نہ جبین ہے

جس دل مین تری یاد ہے تو صدر نشین ہے،   وہ دل بھی حسین اوس کی محبت بھی حسین ہے

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہین ہے،   سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جو ننگِ جبین ہے

جس رنگ مین دیکھو اوسے وہ پردہ نشین ہے   اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہین ہے

ہر ایک مکان مین کوئی اس طرح مکین ہے،   پوچھو تو کہین بھی نہین، دیکھو تو یہین ہے،

نزدیک ہو یا دور، جہان تم ہو وہین ہے،   عاشق وہی عاشق ہے جو مجبور نہین ہے،

وہ آئے ہین اے دل ترے کہنے کا یقین ہے،   لیکن مین کرون کیا مجھے فرصت ہی نہین ہے،

قطعاتِ امجد

از حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی،

آیا ہے، زمانۂ ترقی،   گندہ، بندہ، خدا ہوا ہے،

ایمان سے دل کو صاف کرکے   امجد، صوفی بنا ہوا ہے،

جہان کو ناز ہے ہستی پر اپنی، مین اپنی نیستی پر مر رہا ہون،

ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری، تنزّل مین ترقی کر رہا ہون،

—:—

ہے اور یقینی ہے، یہی سب کی صدا ہے، لیکن، نہین معلوم کہ وہ کون ہے کیا ہے؟

کیا کوئی کہے اوس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے؟ ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے،

—:—

ہر گھڑی عمر کی کیا جلد گذر جاتی ہے، جس طرح کوئی اُڑا جاتا ہو طیارے مین

جان اور جسم کی آغوش مین کیا حیرت ہے زندگی جھولتی ہے موت کے گہوارے مین

رنگِ حسرت،

ازجناب جلیل قدوائی ایم اے علی گڈھ،

میرے نالون پہ اوس نے آہ نہ کی، آہ کیا مجھ پہ اک نگاہ نہ کی؟

مین نے کس شوق سے اوسے دیکھا اوس نے میری طرف نگاہ نہ کی،

غلط انداز بھی نگہ مجھ پر، تونے اے شوخ کم نگاہ نہ کی،

میری آہون نے مجھ کو خاک کیا، اوس ستم گر کے دل مین راہ نہ کی،

ہم نے ہنس ہنس کے عشق مین کاٹی جان پہ بھی بنی تو آہ نہ کی،

سچ ہے یہ آپ نے مجھے چاہا؟ مین نے ہی آپ سے نباہ نہ کی،

تجھ کو دل دے کے وہ سبق سیکھا، بھول کر پھر کسی سے چاہ نہ کی،

ہم اسیرون نے جب قفس چھوڑا، مڑ کے پھر اس طرف نگاہ نہ کی،

زندگی بھر ہم اس روش سے چلے کہ تمیزِ گدا و شاہ نہ کی،

دولتِ عشق پا کے مین نے جلیلؔ

ہوسِ مال و حُبِ جاہ نہ کی،

مطبوعاتِ جدیدہ

جدید اردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن حجم ۳۴۷ صفحے مجلد تقطیع چھوٹی، قیمت سے رنا شر انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن،

ادھر چند سال مین اردو ادب اور شعر و شاعری کی تاریخ و تبصرہ پر بعض اچھی اچھی کتابین نکلی ہین، اون مین ایک اور اضافہ اس زیر تبصرہ کتاب "جدید اردو شاعری" سے ہوا ہے، جو غور و فکر اور اصابتِ رائے کے ساتھ لکھی گئی ہو، کتاب کا مبحث اس کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اس مین دورِ جدید کی شاعری پر بامعان نظر بحث کی ہے، کتاب چند حصون اور ہر حصہ چند بابون مین تقسیم ہو، پہلے حصہ مین شعر کی ماہیت، تعریف، شاعری کی قسمین، اور پھر اردو شاعری کی صنفین بیان کی گئی ہین، دوسرا حصہ گویا اصل موضوع پر مقدمۂ کتاب کی حیثیت رکھتا ہو، جس مین مصنف نے جدید اردو شاعری کا آغاز انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد سے دکھایا ہو، اور اوسے "دورِ انقلاب" سے تعبیر کرکے بتایا ہو کہ اس سے پہلے اردو شاعری دورِ انحطاط مین تھی، پھر اس کے تنزل کے اسباب بتائے ہین، اسکے بعد انقلاب کے اثرات دکھا کر آزاد اور حالی کو جدید اردو شاعری کا معمار بتایا ہے، اور جدید اردو شاعری کی پیدایش کا زمانہ ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۴ء تک مین متعین کیا ہو، اس کے بعد کتاب کا تیسرا حصہ آتا ہے، اور یہین سے اصل موضوع بحث چھڑتا ہے، مصنف نے اس کو "عصرِ اصلاح" سے تعبیر کیا ہے، اس مین آزاد، حالی، نذیر احمد، شرر، شبلی، اور کیفی حیدرآبادی کو جگہ دی ہے، ان مین سے ہر ایک کے حالاتِ زندگی اس اسلوب مین لکھے ہین، جس سے ان کی شاعری کی تدریجی ترقی نمایان ہو، اور پھر ہر ایک کی شاعری کے کمالات و خدمات پر محققانہ تبصرہ کرکے باہم ایک دوسرے مین موازنہ کیا ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ ان معاصرین پر یکجا قلم اوٹھانے کے باوجود ذاتی رجحانات و عصبیت سے دامن بچا کر جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کی کوشش رکھنا مصنف کا لائقِ ستایش کارنامہ ہے، اس کے بعد درمیانی زمانہ

جسمین اسماعیل، اکبر، شوق قدوائی، اور نظم طباطبائی وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، پھر عصر حاضر آتا ہے، جسمین اس عہد کے ممتاز شعراء اقبال، سیلم، سرور جہان آبادی، حسرت، فانی، چکبست، عظمت، جوش، اصغر، امجد، جگر، ریاض، صفی، جلیل، عزیز، اور رسوا وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، اور اوسی اسلوب و انداز مین ان کی شاعری پر ناقدانہ تبصرہ ہے، آخری باب "شعرائے مستقبل" کے عنوان سے ہے، جسمین ہمارے نوجوان شعراے اردو کو روشناس کیا گیا ہی،

مصنف کی رایون اور تنقیدون سے یون تمام و کمال اتفاق کرنا تو ممکن نہین، لیکن کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہو کہ یہ رائین کامل غور و فکر اور کلام کے صحیح مطالعہ کے بعد قائم کی گئی ہین، البتہ حیدرآباد کے شعراے اردو کے متعلق مصنف کی رائین شاید اصول جرح و تعدیل کی حیثیت سے بھی مستند نہ سمجھی جائین، تاہم ان کے تذکرون مین بھی ایک حد تک اظہار حق کی کوشش کی گئی ہے، لیکن معلوم نہین مصنف نے ہمارے شہر کے زندہ شاعر اقبال سہیل کو "سہیل مرحوم" کے لقب سے کیون یاد کیا ہی، شاید یہ "تابش سہیل" کی آیندہ درخشانی کا تغافل آمیز خیمہ ہو، جو کچھ دنون مین پریس سے نکلنے والی ہے، اور اس کی مستحق تھی کہ اس کتاب کے باب عصر حاضر مین پہلے سے موجود ہوتی،

انقلاب دہلی

مرتبہ جناب نظامی بدایونی، نظامی پریس بدایون، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے، سرورق خوشنما، قیمت ۸؍،

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد ہندوستان کو جن سیاسی حالات سے دوچار ہونا پڑا، اونھین دیکھتے ہوئے اس عہد کے اردو شعرائے کلام مین دلی اور اسلامی ہند کی بربادی پر جو کچھ بھی مل جاتا ہی، وہ بساغنیمت ہی، کیونکہ مختلف سیاسی ماحول کی بنا پر اوس عہد کے شعرائے اردو نے اگر اپنے مجروح جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے کی جراءت بھی کی تو اوسی گل و بلبل اور روداد چمن کی داستان کا پردہ قائم رکھ کر، تاہم یہ بھی صحیح نہین کہ اردو شاعری دلی اور اسلامی ہند کی بربادی کے مرثیون سے کلیتہً خالی ہی، ہمین جناب نظامی بدایونی کا جنھون نے دلی کی بربادی کے ستائے ہوؤن کی پُرنم آنکھین بھی دیکھی ہون گی، شکر گذار ہونا چاہئے کہ اونھون نے اس جانب توجہ کی، اور دلی کی بربادی کے اردو مرثیے ایک رسالہ کی شکل مین جمع کر دئے، جو "فریاد دہلی معروف بہ انقلاب دہلی" کے نام سے موسوم ہے، اس مین تقریباً ۶۰، ۶۵ اردو شعراء کے مرثیے ہین، رسالہ کی ترتیب شعراء کے نامون کے حروف تہجی پر ہے، ایک ایک دو دو سطرون مین شاعرون کا مختصر تعارف بھی درج ہی، ابتدا مین

خواجہ حسن نظامی صاحب "مولف غدر دہلی کے افسانے" نے ایک دیباچہ لکھا ہے،

تہذیب عمل، از جناب ملک محمد باقر نسیم رضوانی متعلم، ایم اے ناشر مہتمم دفتر تذکرہ گجرات، پرنٹنگ پریس گجرات پنجاب، حجم ۹۰ صفحے، قیمت ۶ر

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی پنجاب کے ایک لائق اور ہونہار نوجوان ہین اور دور طالب علمی سے مسائل دنیا پر غور و فکر کی نظر رکھنے کی عادت ڈالی ہے زیر تبصرہ رسالہ تہذیب عمل ان کی تعلیمی و علمی زندگی کا پہلا ثمرہ ہے، اسمین اونھون نے اپنے ہمعمر نوجوانون کو اپنی عملی زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح اصول زندگی اور اچھے عادات اختیار کرنے کیلئے راہ ہدایت دکھائی ہے، رسالہ مین کوشش کی گئی ہے کہ ایک ایک مسئلہ یا اصول زندگی کو ایک ایک صفحہ مین پیش کیا جائے، اور جہان ضرورت ہوئی ہے، اوسی سابق موضوع کو نئے صفحہ پر نئے عنوان سے جگہ دی گئی ہے تقریباً ۶۰، عنوانات ہین، رسالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے دلچسپ اور ہمارے نوجوان طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے،

فرانسیسی افسانے، از جناب عزیز احمد صاحب کلبہ جامعہ عثمانیہ ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۰۴ صفحے قیمت ۱۲ر

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد کی جانب سے جناب عبد القادر صاحب سروری کی ادارت مین "دنیا کے شاہکار افسانے" کی اشاعت کا جو سلسلہ جاری ہے، اوس کا چوتھا حصہ فرانسیسی افسانے کے نام سے شائع ہوا ہے، اس مین ۹، ۱۰ مختصر فرانسیسی افسانون کا ترجمہ ہے، دیباچہ مین فرانسیسی ادب پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور ہر افسانے کے ساتھ اوس کے فرانسیسی فسانہ نگار کی تصویر اور اوس کا مختصر تعارف درج ہے،

تاج آفرینش، از جناب عبد الحمید صاحب نعمانی حجم ۱۰۴ صفحے قیمت ۸ر پتہ اجمل بکڈپو پریس بلڈنگ بمبئی نمبر ۹،

"تاج آفرینش" مصر کی ایک مصلح خاتون ملک خانم عرف باحثۃ البادیہ کے چند مضامین کا اردو ترجمہ ہے، مضامین مین پردہ، تعدد ازدواج، معاشرت زن و شو، اور عورتون کی سسرال کی زندگی وغیرہ کے مباحث ہین، مضامین خصوصاً عورتون کے پڑھنے کے لائق ہین، ترجمہ صاف، سلیس اور روان ہے،

پردہ اسلامی نقطہ نگاہ سے، از مولوی سید محمد ادریس صاحب بھسپدا (منیجر تاج گنج آگرہ، قیمت ۱ر

اس رسالہ میں مکالمہ کے طور پر اسلامی پردہ، اور عورتوں کی اسلامی معاشرت کو بیان کیا گیا ہے،

گلدستہ صد احادیث نبوی، مرتبہ مولانا احمد علی انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور خوبصورت مجلد چھوٹی تقطیع کے ۷۸ صفحے،

لاہور کی انجمن خدام الدین مفید دینی خدمت انجام دے رہی ہے، اس کی جانب سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام اور اصلاحِ مسلمین کیلئے رسالے شائع ہوتے رہتے ہیں، جو مفت یا برائے نام قیمت پر ملتے ہیں، زیر نظر رسالہ گلدستہ صد احادیث نبوی میں صحاح سے سو مفید حدیثیں معہ ترجمہ کے ایک خوبصورت رسالہ کی شکل میں چھاپی گئی ہیں یہ رسالہ بلا جلد کے مفت اور مجلد ۲ کے ٹکٹ بھیجکر انجمن سے مل سکتا ہے،

مشکوٰۃ الصلوٰت، مؤلفہ مولوی محمد الیاس صاحب برنی، استاذ معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

حجم ۱۴۲ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ۸ مؤلف سے بیت السلام حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے،

"مشکوٰۃ الصلوٰۃ" کا تذکرہ چند سال پہلے ان صفحات میں آچکا ہے، اس میں درود وسلام کی ۷ حزبیں ورد و وظیفہ کیلئے مرتب کیگئی ہیں، رسالہ مقبول ہوا اب اسی کا طبع ثانی دوبارہ شائع ہوا ہے،

اسلامی عقائد، از مولانا اسلم جیراجپوری شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی قیمت ۱/

بچوں کیلئے دینیات کی تیسری کتاب کے عنوان سے یہ رسالہ لکھا گیا ہے، رسالہ کا نام تو عقائد اسلامی ہے لیکن مباحث میں انبیائے کرام کے تاریخی حالات کا حصہ زیادہ ہے،

کتبخانہ بانکی پور کی نئی فہرستیں، مشرقی کتبخانہ بانکی پور کی ترتیب فہرست کا جو کام کئی سال سے جاری تھا افسوس ہے کہ وہ حکومت بہار کی مالی دشواریوں کے سبب سے بند ہو گیا تھا، تاہم فہرست مذکور کی جو جلدیں مطبع میں زیر طبع تھیں، ان کی چھپائی جاری ہے، چنانچہ اوس کی حسب ذیل جلدیں نئی چھپ کر شائع ہوئی ہیں،

۱۔ جلد انیس ۱۹ حصہ اول عربی مخطوطات متعلقہ اصول فقہ و فقہ، مرتبہ مولوی عبدالحمید صاحب مطبوعہ بہار گورنمنٹ پریس پٹنہ ۱۹۳۱ء

۲۔ جلد اٹھارہ حصہ دوم عربی مخطوطات متعلقہ علوم القرآن، مرتبہ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۲ء

۳۔ ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسی جلد اول مرتبہ خان بہادر مولوی عبدالمقتدر صاحب مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۲ء

۴۔ ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسی، جلد دوم، مرتبہ خان بہادر موصوف مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۳ء

جلد ۳۲ | ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء | عدد ۶

مضامین

شذرات

اس ماہ کے سلسلۂ مقالات میں سفرِ افغانستان کے عنوان سے پہلا مقالہ درج ہے، جس میں اس سفر کے سرسری اور جزئی حالات کا بیان ہے، کہیں کہیں غیر اہم باتیں بھی آگئی ہیں، جسکا سبب یہ ہے کہ غیر ملک کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی، سیاح کو نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں، سفر کے سرسری واقعات کے ختم ہونے کے بعد اس ملک کے حالات پر ایک مفصل تبصرہ بھی حوالۂ قلم ہوگا، اسوقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس ملک کی اصلی خدمت یہ ہے کہ اسکو اُس امن وامان اور سکون کے حصول کا موقع دیا جائے جو اسکو میسر نہیں آتا، پھر اُسکو اسکی قبائلی زندگی سے نکال کر وسیع قومی و وطنی دائرہ میں آنے کی تلقین کیجائے، اور ملک میں صحیح تعلیم کی اشاعت عام کیجائے، اور وہاں کی مذہبی تعلیم میں نصاب وطریقۂ درس کی وہ اصلاح کیجائے، جس کی ضرورت آج تمام علمائے اسلام نے بالاتفاق تسلیم کرلی ہے،

افغانستان کے علمی و ادبی حلقہ میں روز افزوں ترقی کے آثار نمایاں ہیں، اس سلسلہ میں تاریخِ اسلام کی ضروری کتابوں کے ترجمے بھی ہورہے ہیں، اس سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کی الفاروق کا فارسی ترجمہ وہاں شائع ہوچکا ہے، اور اب خاکسار کی سیرت عائشہؓ کا ترجمہ کیا گیا ہے، ترجمہ مکمل ہوچکا ہے، اور اسوقت سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ کے مطالعہ میں ہے، موصوف صاحب سیف وقلم ہیں، میری نئی تصنیف خیام جو اس سفر میں میرے ساتھ تھی، جس ذوق وشوق سے انھوں نے لی، اس سے اُن کے ادبی وعلمی شغف کا پتہ چلتا تھا، امید ہے کہ یہ ترجمہ چند ماہ کے بعد وہاں کے حالات کے سکون کے بعد شاہ ظاہر خاں کے عہد میں طبع ہوکر شائع ہو، عجب نہیں کہ وہ افغان خواتین کی نئی راہِ زندگی میں نمونہ اور اسوہ کا کام دے،

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی مسرت افزا ہوگی کہ مکہ معظمہ کے چند ادبا نے ملکر یہ تہیہ کیا ہے کہ دارالمصنفین کی سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ عربی زبان میں کریں، شیخ رشدی الصالح ملحس اڈیٹر ام القریٰ اس تجویز کے محرک ہیں، اگر یہ ترجمے واقعًا

چھپکر شائع ہوگئے تو امید ہے کہ دنیائے اسلام کے مرد و زن کے سامنے اسلام کے دونوں صنفوں کے بہترین نمونے آجائینگے،

صوبہ کے بعض نوجوانوں نے صوبہ کے علمی و روحانی مرکز پھلواری میں جو اب سلسلۂ آبادی میں صوبہ کے دار الحکومت پٹنہ سے ملحق ہورہا ہے ایک مسلم اکاڈمی کا خواب دیکھا ہے، یہ مجلس گو شروع تو نجی کی ایک شخصی کوشش سے ہوئی، مگر اب چند سال سے یہ ایک جماعتی مجلس کے قالب میں ڈھل رہی ہے، مجلس کے مقاصد حسب ذیل ہیں، زبان اردو کی توسیع و ترویج، ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو حقیقی اسلامی روایات اور سچے کارناموں سے روشناس کرنا اسلام اور شاہان اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہوں، ان کو دور کرنا انگسٹ بک کمیٹی اور بورڈ آف اسٹڈیز کی منظور کردہ کتابوں کو مذہبی، تاریخی اور ادبی نقطہائے نظر سے جانچنا، اردو اور انگریزی زبان کی تصانیف کا ایک کتبخانہ قائم کرنا، خوشی کی بات ہے کہ سابق وزیر تعلیمات مرحوم سر فخر الدین کی طرح حال وزیر تعلیم مولوی سید محمد حسین صاحب بھی اس مجلس کی سرپرستی فرما رہے ہیں،

لاہور کے صیغۂ مشرقیات کے اساتذہ تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ وہ ہمارے علمی و ادبی ذخیرہ میں ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے حکیم میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرۂ شعرائے اردو (مجموعۂ نغز) بڑی محنت سے شائع کیا ہے، پروفیسر محمد اقبال نے اخبار الدولۃ السلجوقیۃ نام بنی سلجوق کی ایک عربی تاریخ تصحیح کرکے شائع کی ہے، اور عنقریب تاریخ الحکماء بیہقی (تتمۂ صوان الحکمۃ) پروفیسر محمد شفیع صاحب کی محنت و کوشش سے شائع ہونے والی ہے،

ابتک مسلمانان چین کے حالات میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت اسلام کے حصۂ چین کے سوا ہماری زبان میں کوئی کتاب موجود نہ تھی حالانکہ چین کی اسلامی برادری کا علم ایک مدت سے ہم کو ہے، اب مسرت کی جگہ ہے کہ خود ایک چینی نوجوان اہل قلم نے جنکا اسلامی نام بدر الدین ہے، اور جو چھ سات سال سے ہندوستان میں تحصیل علم میں معروف ہیں، اس کمی کو پورا کیا ہے، اور مسلمانان چین کے گذشتہ اور موجودہ حالات پر دو ڈھائی سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ کر ہمکو اشاعت کی غرض سے دی ہے، نوجوان موصوف کلکتہ سے پہلے دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں آئے، پھر انگریزی تعلیم کی غرض سے جامعہ ملیہ دہلی گئے، اور وہاں سے فراغت کرکے عربی ادب میں تکمیل و ترقی کی غرض سے پھر دار العلوم ندوہ میں مقیم ہیں، انھوں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ عربی میں مضمون لکھ لیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس کتاب کا عربی میں بھی خود ہی ترجمہ کریں،

لکھنؤ سے جو ماہوار اصلاحی واخلاقی ومذہبی رسالہ اصلاح نام نکالا گیا تھا، بحمد اللہ کہ وہ چھ مہینوں سے اب تک نکل رہا ہی، اور اپنی بعض خصوصیات کے لیے پسند کیا جا رہا ہے، ضرورت اسکی ہو کہ مسلمان اسکی طرف توجہ کریں، اور اپنی خریداری اور امداد سے اسکے نوجوان اڈیٹر کی حوصلہ افزائی فرمائیں، رسالہ کی قیمت صرف تین روپیے سالانہ ہے، اور پتہ، رسالہ اصلاح، بادشاہ باغ لکھنؤ ہے،

یورپ میں لندن اور لائیڈن سے انگریزی، فرنچ اور جرمن میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے جو مسلسل اجزا ۱۹۱۳ء سے شائع ہو رہے ہیں، اور جو اب واؤ تک پہنچ چکے ہیں، اور جنمیں اسلام، اسلام کے عقائد، عبادات، فقہ، تاریخ اور مسلمان ملوک وسلاطین وحکما ومصنفین، غرض اسلامی علوم وفنون وتاریخ کے جملہ مباحث ہوتے ہیں مصر کے چند ارباب علم کی کوشش سے اکتوبر ۱۹۳۳ء سے انکا عربی ترجمہ شروع ہوا ہے، محمد ثابت الفندی سند یافتہ فلسفہ، واحمد الشنتناوی سند یافتہ فلسفہ وتاریخ ابراہیم زکی خورشید سند یافتہ تاریخ اور عبد الحمید یونس کے نام ترجمہ کی لوح اول پر ثبت ہیں، ابھی صرف اسکا پہلا جزء شائع ہوا ہے، اور ہندوستان میں ابناء شرف الدین تاجرین کتب بھنڈی بازار بمبئی اسکے ایجنٹ ہیں، ہر دو ماہ میں اس کے چار چار جزء (۴۸ صفحے) شائع ہوا کریں گے، اور ہر اشاعت دو ماہہ کی قیمت عہ ہوگی، شائقین علم اس کے لئے ابناء شرف الدین کے پتہ سے درخواستیں بھیجکر اسکے خریدار بن سکتے ہیں، مصر میں اسکے دفتر کا پتہ شارع قصر النیل نمبر ۲۳ ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اکثر اجزاء نظر سے گذرے ہیں، اور دار المصنفین انکا مسلسل خریدار ہی، یہ بات بے محابا کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے علوم وفنون وتاریخ پر یورپ کی تحقیقات جہانتک پہنچی ہو ان مباحث کا نچوڑ اور عطر ان اجزاء میں کھینچکر رکھدیا گیا ہی لیکن جہانتک مذہبی علوم ومباحث کا تعلق ہو افسوس ہو کہ ان میں بیحد غلطیاں ہیں، خصوصاً اے، جی ونسنک صاحب کی تحقیقات میں عصبیت اور دانستہ شرارتوں کا اظہار ہی اور وہ اس انسائیکلوپیڈیا کے مؤلفین میں سے ایک ہیں، لیکن خوشی کی بات ہو کہ مصر کے اہل علم بھی انکی اس حیثیت سے اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ مصر کی شاہی لغوی مجلس میں انکے شریک کیے جانے پر اختلافات برپا ہیں، انسائیکلوپیڈیا کے عربی مترجمین بھی اس کتاب کی اس کمزوری سے آگاہ ہیں، اور اسی بنا پر وہ علماء ازہر اور دیگر مسلمان اہل علم سے قابلِ اعتراض مواقع پر حواشی لکھوا کر کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔

مقالات

سفرِ افغانستان

ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مدت سے آرزو تھی کہ کم از کم قریب ترین ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان ہی کو دیکھ لوں، ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ العلما، پشاور کی شرکت کے زمانہ میں دو دفعہ درۂ خیبر کی سیاحت کی ایکدفعہ اس مختصر سفر کے رفیق مولوی ظفر علیخاں صاحب اور مولنا سید حسین احمد صاحب تھے، اور دوسری دفعہ مولنا محمد علی اور جناب شعیب صاحب قریشی، دونوں دفعہ لنڈی کوتل کے قلعہ سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا، پہلی دفعہ واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ شہر پشاور کا پھاٹک بند ہوگیا، اور رات جمرود کی سرائے میں قرونِ وسطیٰ کے مسافروں کیطرح بسر ہوئی، اور دوسری دفعہ لنڈی کوتل کے مشہور شنواری رئیس کے یہاں دن بھر قیام رہا،

اس اچلتے ہوئے جلوۂ دیدار نے آتشِ شوق کو تیز تر کر دیا تھا، پچھلے ہی موسم گرما میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے "قابلِ شکست عہد" ہوا تھا کہ آیندہ سال افغانستان کی سیر کیجائے، ابھی اس گرمی پر پوری سردی آنے بھی نہ پائی تھی کہ خود "کوہ طور" سے طلبِ دیدار کی صدا بلند ہوئی،

ڈاکٹر سر اقبال کا نوازش نامہ آیا کہ حکومتِ افغانستان نے مجھے، اور سر راس مسعود، اور آپ کو اپنے ہاں کے بعض علمی و تعلیمی مسائل میں مشورہ کی غرض سے بلانا چاہا ہے، کیا آپ چلنے کو تیار ہیں، میں نے جواب دیا کہ اس ملک کی جو خدمت مجھ سے بن آئے، میں اس کے لیے تیار ہوں، اس کے بعد، ر اکتوبر کو ہز اکسلنسی صلاح الدین سلجوقی جنرل قونسل افغانستان کا خط آیا، جسمیں اسی مطلب کا اظہار تھا، میں نے ان کو بھی اپنی آمادگی کی اطلاع دی، جنرل قونسل صاحب کی اصل تحریک تو یہ تھی کہ ہم لوگ ۱۴ر اکتوبر کے جشنِ استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر

جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا، اس لیے تاریخ کی تعیین کا مسئلہ پاسپورٹ کے ملنے کے بعد رفقاء کے مشورہ پر موقوف رہا، توقع تھی کہ ۱۹-اکتوبر کو پاسپورٹ مجھے مل جائیگا، ادھر راس مسعود صاحب کو یونیورسٹی کی مشغولیتوں کے سبب سے جلد واپسی کی عجلت تھی، ۱۷ تک ان صاحبوں کو پاسپورٹ مل گئے، اور ۲۰ کو لاہور سے اور ۲۱ کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بنگیا، اور وہ اسی کے مطابق روانہ ہو گئے، میری نسبت دفتری تحقیقات کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور بالآخرہ ۱۶ کو نینی تال میں اس پر دستخط ہوئے، اور ۲۱ کو وہ اعظم گڑھ پہنچا، میں لکھنؤ چلا آیا تھا، دوسرے دن ایک آدمی کی معرفت پاسپورٹ لکھنؤ بھیجا گیا، جہاں وہ ۲۳ کی صبح کو پہنچا، اور میں اسی روز کے میل سے ۲ بجے پشاور روانہ ہو گیا، پشاور میں برادران عزیز حکیم عبدالعزیز ندوی، اور حکیم عبدالجلیل ندوی، اور افغان مامور دیزہ (افغان پاسپورٹ آفیسر) عبدالغفور خانصاحب کو تار پہلے ہی دیدیا تھا، ۲۴ کی رات کو ۸ بجے کے قریب گاڑی پشاور سے ایک اسٹیشن پہلے نوشہرہ پہنچی، یہاں غیر متوقع طور پر حکیم عبدالعزیز صاحب ندوی، حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی، عبدالرحمان ندوی تاجر پشاور، پہلے سے آکر موجود تھے، ان کی ملاقات سے بیحد خوشی ہوئی، ایک گھنٹہ کے بعد گاڑی پشاور پہنچی، گو کہ میری آمد کی اطلاع عام طور سے شائع نہیں ہوئی تھی، تاہم اسٹیشن پر نمایندگان حکومتِ افغان، متعدد احباب، جمیعۃ العلماء سرحد، اور بھارت سبھا کے چند ارکان موجود تھے،

شب بھر حکیم عبدالعزیز صاحب کے نو تعمیر کاشانہ "امان منزل" میں بسر کی، صبح کو شہر کے بعض علماء، اور بعض قومی کارکنوں نے ملاقات کی عزت بخشی، پنجاب کی طرح صوبہ سرحد میں بھی، شریعت کے مقابلہ میں رسم و رواج کو قانون کی حیثیت حاصل ہے، جب سے صوبہ سرحد میں کونسل کا قیام ہوا ہے، بعض پرجوش مسلمان کارکن اس کے لیے کوشاں ہیں، کہ رسم و رواج کو توڑ کر شرعی احکام کی پابندی کا قانون منظور کیا جائے، ان صاحبوں نے مجھ سے خواہش کی کہ افغانستان سے پشاور کو جب واپسی ہو تو اس اثنا میں یہاں مجلسِ شریعت کا اجلاس ہو اور میں اسمیں شرکت کروں، چونکہ یہ خیال نہ تھا کہ واپسی کا راستہ بدلیگا، اس لئے میں نے قبول کر لیا،

یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ پاسپورٹ ملنے کے بعد بھی، ابھی سفر کی سرکاری دقتیں ختم نہیں ہوئی ہیں، ابھی افغان

گورنمنٹ کے پاسپورٹ افسر کا ویزہ، اور صوبۂ سرحد کے چیف سکریٹری کے دستخط باقی ہیں، جن سے سرحد کے عبور کرنے کی اجازت حاصل ہوگی، یہ کام بھی ختم ہوا، ۲۵ کی دوپہر کو برادرم حکیم عبد الجلیل صاحب ندوی کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، جس میں شہر کے بعض علما، اور معززین شریک تھے، کھانے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی، یہیں افغانستان لے جانے والا موٹر آگیا، یہاں سے حکیم عبد العزیز صاحب کے افغانی دواخانہ گیا، اور وہاں سے دوستوں سے رخصت ہو کر پشاور سے نکلا، غالباً ۳ بجے سہ پہر کا وقت تھا جب موٹر پشاور کے حدود سے باہر روانہ ہوا، میں نے سمجھا کہ اب عوائق سفر کا خاتمہ ہوا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد درۂ خیبر کے دہانہ پر جمرود کی منزل آگئی، موٹر ایک دفتر کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا، یہاں برطانی محکمۂ آمد و رفت نے ہر شخص سے ایک ایک روپیہ اور موٹر سے چار روپے وصول کئے، اور رسید دیدی کی، موٹر میں میں تنہا تھا، ساتھ ایک میرا ملازم اور دوسرا شوفر تھا،

اب ہم درۂ خیبر کے اندر داخل ہوگئے، دونوں طرف پہاڑیوں کا طویل سلسلہ اور بیچ میں درہ کا پُرپیچ راستہ تھا، حکومت انگریزی نے اپنے حدود تک سڑک نہایت عمدہ بنوائی ہے، درہ کا سب سے تنگ مقام مجھے وہ نظر آیا جہاں علی مسجد نام چھوٹی سی لیکن نہایت تاریخی مسجد بنی ہے، مسجد کے پاس چاے اور سبزی اور پھلوں کی چند دکانیں ہیں، اس مسجد تک ۱۹۲۱ء میں دو دفعہ پہلے بھی آچکا تھا، اور یہاں ایک نماز ادا کرنے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا، اس وقت پھر اس مسجد پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی، پہلے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان یہی مسجد حد فاصل تھی، لیکن اب انگریزوں نے اس سے بھی آگے بڑھکر اپنی سرحد قائم کی ہے،

اس درہ کے اوپر اسی کے ساتھ ساتھ خیبر ریلوے کی لائن بچھی ہے جس کی تعمیر انگریزی انجنیرنگ کی حیرت انگیز کرامت ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر انگریزی سیاست کی سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ ریلوے تقریباً ۱۵ میل تک اس طرح پھیلی ہے کہ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر، اور کبھی وادی کے دامن میں، اور کبھی کسی پہاڑی کے سینہ کو بیچ سے چیرتی ہوئی نظر آتی ہے،

بہرحال ان ہیبتناک مناظر سے گذرتے ہوئے ۴ بجے کے قریب لنڈی کوتل کی وسیع وادی میں قلعہ کے سامنے جا کر موٹر پھر رکا، میدان میں سپاہی ورزشی کھیلوں میں مصروف تھے، یہاں شوفر اور میرا ملازم قلعہ کے اندر گئے

اور جمرود کی رسید اور پاسپورٹ جاکر دکھائے، جس کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت ملی، اور موٹر نے پھر آگے کا رخ کیا کچھ دیر کے بعد انگریزی سڑک کی صنعتکاری ختم ہوئی، اور درہ کا فطری راستہ نمودار ہوا، اور یہیں انگریزی سرحد کا آخری دفتر قائم تھا، ایک پہاڑی کے اوپر بنگلہ میں درۂ خیبر ایجنسی کا دفتر تھا، شوفر اور ملازم نے جاکر یہاں پھر پاسپورٹ دکھائے اور برطانی پاسپورٹ افیسر نے EXAMINED کی مہر ثبت کی،

یہاں سے نکل کر چند قدم آگے بڑھے تھے کہ افغانستان و ہندوستان کی موجودہ سرحد کا بورڈ نظر آیا جس پر انگریزی میں یہ لکھا تھا، کہ "یہاں سے ہندوستان کی سرحد ہے، اور کسی کو بغیر صحیح پاسپورٹ کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں" یہاں ریلوے لائنوں کے بیچ سے جانے والے راستہ پر جس طرح ریل آتے وقت پھاٹک یا کسی اور چیز سے راستہ بند کردیا جاتا ہے، اسی طرح ایک لمبے ستون کو آڑا کرکے راستہ روک دیا گیا تھا، یہاں دونوں طرف کے سنتری کھڑے رہتے ہیں اور ادھر کے جانے والے، ادھر کے اور ادھر سے آنیوالے ادھر کے سرحددار کے سپاہیوں کی اجازت سے اس روک کو اٹھا دیتے ہیں، اور مسافر پار ہو جاتے ہیں، چنانچہ حسب دستور سنتری نے برطانی سرحدداری کے سپاہی سے جو پچھلے بنگلہ کے پاس کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارہ سے دریافت کرکے روک کو دور کیا اور موٹر دفعۃً غلام ملک سے نکل کر آزاد ملک میں داخل ہو گیا،

یہی مقام تورخم کہلاتا ہے، اور جواب افغانی و ہندی سرحد ہے، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ درہ کا جتنا حصہ زیادہ پر پیچ اور مشکل ہے جنگی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر برطانی حکومت نے اپنے قبضہ کو وہاں تک بڑھا دیا ہے، اب اسکے بعد درہ نسبۃً پھیلنا شروع ہوتا ہے، راستہ بالکل فطری حالت میں ہے، البتہ کہیں کہیں پتھروں کو بیچ سے ہٹا دیا گیا ہے، اور نشیب و فراز کو برابر کردیا گیا ہے، اس سرحد سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کے اوپر افغان حکومت کی پہلی چوکی تورخم نامی واقع ہے، اس کے نیچے پانی کا چشمہ سا بہتا ہے، اور ایک مختصر سے باغ یا چند درختوں کے جھنڈ کے سایہ میں خالی زمین مسجد کا کام دیتی ہے، یہاں وضو کرکے عصر کی نماز ادا کی، اور افغان افسر نے پاسپورٹ دیکھکر راہداری کا محصول چار روپیہ وصول کیا،

اب ہم افغان علاقہ میں چل رہے تھے، درہ کا راستہ کشادہ ہوتا جارہا تھا، پاس کی پہاڑیاں دور ہٹتی جارہی تھیں، ۵ بجے کے قریب افغانی مشرقی سرحدداری کے پاس پہنچ گئے، جسکا نام ڈکہ ہے، یہاں وادی وسیع ہے، اور سامنے دریائے کابل کی نہایت کم چوڑی آب رواں کی چادر پھیلی ہوئی نظر آئی، ایک طرف افغانی سرحددار کا مغربی طرز کا بنگلہ تھا، دوسری طرف کچی دیواروں کی عمارت کا ایک پھاٹک تھا جو افغانی سرحدداری کا دفتر تھا، یہاں شوفر اور ملازم نے لیجاکر پاسپورٹ دکھائے، اور وہاں اس پر "بسرحدداری درہ مشرقی ملاحظہ شد برائے رفتن کابل کی اجازتی مہر لگائی گئی، اور خبر دی گئی کہ یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے افغانی سرحددار صاحب سے میری معرفی کرائی جائے گی، مگر وہ بیمار تھے، اندر سے باہر آنے کے انتظار میں تاخیر کا اندیشہ تھا، اس لئے معافی مانگ کر آگے بڑھنے کی اجازت چاہی، افغان سپاہی نے روک کی زنجیر ہٹائی اور موٹر آگے روانہ ہوا،

اب قریب شام کا وقت آگیا تھا، پٹھان مسافر مرد و عورت، بچے اور بوڑھے آجارہے تھے، اونٹ گدھے، گائے، بیل، بھیڑیں، چراگاہوں سے واپس آرہی تھیں، درۂ خیبر کے شروع سے لیکر یہاں تک دیہاتی پٹھان خواتین سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں مستور کھلے منھ بڑی آزادی سے آجارہی تھیں، بدن پر گھٹنوں تک سیاہ کرتے، پاؤں میں بڑے گھیر کی عموماً سیاہ شلواریں، سر سے پاؤں تک سیاہ چادریں، ہر قسم کے زیور اور ظاہری آرائش سے تماستر پاک، ان کو دیکھکر خیال ہوتا تھا کہ شاید اصل سادہ اسلامی پردہ یہی ہوگا،

ڈکہ سے آگے نکلے تو پہلی افغانی چھاؤنی نظر آئی، خیمے کھڑے تھے، سپاہی اپنی خاکی وردیوں میں چل پھر رہے تھے، ان خیموں سے ذرا ہٹکر ان کے باورچی خانہ کا خیمہ نظر آیا، ان سپاہیوں کی وردی یہ تھی، خاکی پتلون خاکی کوٹ، سر پر خاکی ٹوپی، جس کے آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوا، مصری سپاہیوں کی بھی اسی قسم کی وردی ہے، مگر اُن کے سر پر ترکی ٹوپی رہتی ہے، جس کے اوپر ایک خاکی غلاف چڑھا ہوتا ہے، اور اسی کپڑے کا آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوتا ہے، جس سے مقصد آنکھوں کے سامنے دھوپ کی تمازت کو روکنا ہوتا ہے،

اب شام ہو چکی تھی، اور موٹر سناٹے کے عالم میں پوری تیزی سے دوڑ رہا تھا، کبھی کبھی پٹھان کاشتکار دل

کاغول یا خانہ بدوش مسافرون کا کوئی مختصر قافلہ مل جاتا تھا، جس کے ساتھ مویشیوں کا گلہ، باربرداری کے جانور یہاں تک کہ کسی بیل یا گدھے کی پیٹھ پر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں، وادیوں میں کہیں کہیں کھیت بھی تھے، یکے بعد دیگرے افغانی چوکیاں بھی گذریں، جنکے مکانات خام دیواروں کے تھے،

درۂ خیبر سے لیکر ادھر خام مکانات کا رواج عام طور سے ہے، اور غالبًا اس سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہے کہ اس قسم کے مکانات بارش میں محفوظ رہتے ہیں، ادھر بارش تو کم ہوتی ہے، یہاں کی سیرابی اور سرسبزی زیادہ تر برف کے پگھلنے سے جو چشمے جاری ہوتے ہیں، انہی سے ہے، واپسی میں ملتان میں بھی اسی قسم کے مکانات دیکھے، کابل و غزنین وغیرہ مین بھی ایسے مکانات نظر آئے، بلکہ تعجب ہوتا تھا کہ قلعے اور دھس اور شاہی عمارتین بھی اسی خام مٹی کی ہوتی ہیں، یہ مٹی نہایت چکنی اور لسدار ہے، کھگل کے بعد یہ دیواریں بڑی مستحکم ہو جاتی ہیں، قلعوں میں کئی کئی گز کی چوڑی دیواریں ہوتی ہیں، اور ان میں ہر کونے پر مٹی ہی کی برجیاں بنی ہوتی ہیں، دیواروں میں بندوقوں کے لئے بیشمار سوراخ ہوتے ہیں،

درہ خیبر میں اور دوسرے آزاد سرحد میں ہر خاندان یا قبیلہ کا اسی قسم کا الگ الگ قلعہ ہوتا ہے، جو ہر ایک کو دوسرے کے حملوں سے بچاتا ہے، اس چھوٹے سے قلعہ کا سردار **ملک** کہلاتا ہے، جمرود سے لیکر لنڈی کوتل تک اور اس کے بعد بھی ہر قسم کے ملکوں کے قلعے بعض مسمار بعض کھڑے، بکثرت نظر آتے ہیں، اسی قسم کی افغانی چوکیاں راستوں میں ملیں، جنمیں سے بعض اچھی خاصی بلند تھیں، اور سپاہی سیڑھیوں سے چڑھ اور اُتر رہے تھے، چونکہ رات ہوگئی تھی، اس لیے خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کسی چوکی پر ہم کو روکدیا جائے، مگر ڈکہ کے سرحددار سے کہکر ٹیلیفون سے نہ روکنے کی ہدایت کرادیگئی تھی،

اب رات کے ۸ بج چکے تھے، چاندنی چھٹکی تھی، ہر طرف پہاڑوں کی دیوارین نظر آتی تھین کہیں کہیں پتھروں سے چشمے بہ رہے تھے، انسانون اور انسانی آبادیون کا نشان میلوں تک نظر نہیں آتا تھا، گرم رفتار موٹر کی آواز کے سوا ہر طرف سناٹا تھا، اسی اثنا مین ایک پل آیا، جو گو نیا بنا تھا، مگر ابھی استعمال میں نہیں آیا تھا، نیچے چشمہ بہہ رہا تھا، ٹوٹا ہوا

نے موٹر کو نیچے اتار کر چشمہ کے اندر سے گذر کر اوپر چڑھنا چاہا، انجن چشمہ کے سرد پانی سے بجھکر خاموش ہوگیا، اب بار بار انجن کو ہینڈل کرکے متحرک کرنے میں کچھ دیر لگی، باوجود اس خاموشی تنہائی اور لق و دق میدان کے فضا میں امن و امان کا اطمینان چھایا تھا، اور جس سے یہ نتیجہ نکالا کہ بحمداللہ ملک میں مسافروں کو ہر گونہ امن و امان اور اطمینان حاصل ہے، اور یہ ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے،

چند جھٹکوں کے بعد انجن گرم ہوکر پھر متحرک ہوا، اور اوپر چڑھکر اس منزل کو طے کیا، اب جلال آباد قریب تھا، سڑک سیدھی اور صاف تھی، دورویہ درختوں کی صفیں تھیں جنکو ختم کرنے کے بعد ہم کو جلال آباد کے چراغ نظر آنے لگے، اور بالآخر آبادی آئی، اور ہم باغ شہید نام سرکاری مہمانخانہ میں جاکر اترے، سیڑھی پر مامور صاحب استقبال کے لئے کھڑے تھے، باغ کے اندر یہ ایک بڑی عمارت تھی جسمیں متعدد کمرے آراستہ اور مہمانوں کے لئے تیار تھے، انھیں میں سے ایک کمرہ میں اتارا گیا، مسہری اور اس پر صاف بستر اور کمل قرینہ سے لگے تھے، کمرہ میں میز کرسی، آرام کرسی ہر چیز تھی،

اس اکتوبر میں جلال آباد کا موسم پشاور کے برابر سرد تھا،

یہاں پہنچکر پہلے ہاتھ منھ دھوکر وضو کرکے مغرب اور عشا کی یکجا مسافرانہ نمازیں ادا کیں، تھوڑی دیر میں کھانا آیا، کھانے کے بعد کابل کا مشہور سردہ اور انگور آئے سردہ اتنا میٹھا اور ساتھ ہی اتنا سرد تھا کہ وہ اس ٹھنڈک میں کھایا نہ گیا، رات بھر آرام کیا، صبح اٹھکر نماز کے بعد باغ کی سیر کی، کس قدر پر لطف سماں تھا، باغ کی پشت پر پہاڑیاں تھیں، پہاڑیوں کے دامن میں دریاے کابل یا کوئی اور چشمہ آہستگی سے بہ رہا تھا، ایک چشمہ کسی طرف سے آکر باغ کی روش کے کنارے کنارے رواں تھا، روشوں پر ہر دو طرف چنار کے لمبے لمبے درخت کھڑے تھے، یہ مہینے افغانستان میں موسم خزاں کے ہوتے ہیں، وہاں خزاں میں پتے خشک ہونے کے بجاے زرد ہوجاتے ہیں، ہر طرف زرد زرد پتوں کی ایک دوسری بہار نمودار تھی،

جلال آباد کے اس باغ کا نام میں نے باغِ شہید سنا، شاید اس لیے کہ امیر حبیب اللہ خاں شہید نے

اس کو بنوایا ہے، باغ کی عمارت کا طرز ہندوستان سے جدا تھا، بلند کرسی تھی جس کے بعد برآمدہ، برآمدہ کے بیچ کے راستہ سے ایک بڑے وسیع ہال میں داخل ہو جاتے تھے، اس پورے ہال کے اوپر چھت کے بجائے گنبد، دونوں طرف کمرے، اس ہال کے پیچھے بلند سائبان جس کے نیچے ایک مختصر وادی جس میں پانی کی روانی اور سامنے مذکورہ بالا پہاڑیاں، اس باغ کی تعمیر کی نسبت گو امیر حبیب اللہ خان کی طرف سنی، مگر بڑے ہال کے بلند دروازہ کے اوپر ایک پتھر نصب تھا جس پر کتبہ لگا تھا میں نے اس کتبہ کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر افضل خاں کے نام کے سوا کچھ اور پڑھا نہ گیا، میں نے سنا تھا کہ بچہ سقہ کے ہنگامہ میں جلال آباد اور اس کی سرکاری عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا تھا اس کی ایک شہادت میں نے یہ پائی کہ باغ مذکور کے برآمدہ میں جو دروازے اور کھڑکیاں لگی تھیں، ان کے شیشے نہ صرف ٹوٹے تھے، بلکہ اُن کی لکڑیوں کو آگ سے جلائے جانے کی کوشش کی علامتیں موجود تھیں،

افغانستان کی آبادیوں کے مکانات کی چھتیں خام اور منڈیر کے بغیر، اور سپیدی یا گچ کے بجائے مٹی سے باہر سے لیے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی عمارتوں کے دیکھنے کی عادی نگاہوں کو وہ پر رونق نہیں معلوم ہوتی ہیں مسجدیں بھی عموماً خام دیواروں کی اور گنبد و منار سے خالی ہوتی ہیں، اس لیے وہ دور سے ممتاز نظر نہیں آتیں اور اسی لئے باہر کے سیاحوں کو یہ آبادیاں آباد اور دلکش نہیں معلوم ہوتیں، حالانکہ وہ مکانات اندر سے بہت عمدہ، آراستہ اور خوبصورت ہوتے ہیں، موجودہ شہر جلال آباد کی بھی یہی کیفیت تھی، مسافروں کے لیے ہوٹل یا کھانے کی دکانیں ہیں، چائے کے روسی سماور ہر جگہ گرم نظر آتے ہیں، یہیں سے چند میل کے فاصلہ پر ہڈا ایک گاؤں ہے جہاں کے مشہور مجاہد عالم ملا ہڈا کے نام سے ہندوستان کے انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں آج سے بیس برس پہلے بہت نامور تھے، اور جو انگریزی فوجوں سے بارہا نبرد آزما ہو چکے تھے، ان کا سرکاری خطاب نجم المشائخ تھا جس کی نسبت سے اُن کے مدرسہ کا نام جو اسی ہڈا میں واقع ہے، نجم المدارس ہے، اور میں نے کابل کے ایک صاحب علم سے سنا کہ وہاں ملا صاحب کا متروکہ بہت اچھا خاصہ کتبخانہ ہے، یہ مدرسہ پرانے طرز کا عربی مدرسہ ہے، مامور صاحب جلال آباد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جلال آباد کے آس پاس بودھ لوگوں کی بکثرت سنگی یادگاریں ہیں

جلال آباد پشاور سے اسی میل ہے، اور کابل پشاور سے دو سو میل پر واقع ہے، آج ایک سو بیس میل طے کرنے تھے، صبح کو آٹھ بجے جلال آباد سے آگے بڑھے، سڑک اچھی، اور کچھ دور تک نئی بنی تھی، پل بھی مرمت ہو رہا تھا، کہیں کہیں سڑکوں کی درستی بھی ہو رہی تھی، پٹھان مزدور کام پر لگے ہوئے تھے، اونٹوں اور گدھوں پر لدے ہوئے خانہ بدوش قبیلے، اور کہیں کہیں ہل چلانے والے کاشتکار اپنے بیلوں کے ساتھ نظر آتے تھے، جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ زیادہ سنگلاخ ہوتا جا رہا تھا،

جلال آباد سے تھوڑی دور چل کر سب سے پہلی بڑی آبادی نملا نامی آئی، یہاں ایک وسیع شاہی باغ ہے جسمیں سرکاری مہمانخانہ بھی ہے، باغ میں ہر طرف درختوں کی رونق تھی، روشوں پر چنار اور آملہ کے درخت لگے تھے، گو راستہ دوسری طرف سے تھا، لیکن ہم نے باغ کے دیکھنے کی خاطر باغ کے اندر سے ہو کر راستہ اختیار کیا، اسکو ایک نظر دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے، قصبہ میں کاشتکاروں کی آبادیاں تھیں، اور دوسرے باغ ادھر ادھر لگے تھے،

افغانستان میں پہلے جب موٹروں اور لاریوں کی سواریاں رائج نہ تھیں، اور عموماً لوگ گھوڑوں یا اونٹوں پر سفر کرتے تھے، تو عموماً ہر بارہ تیرہ میل پر پڑاؤ ہوتا تھا، اور ہر پڑاؤ پر سرکاری عہدہ داروں اور مہمانوں کے قیام کیلئے مکانات بنے تھے، جنمیں تمام سروسامان مہیا رہتے تھے، اب موٹروں کی گرم رفتاری نے منزلوں کو دور تر کر دیا ہے، اب اسی میل، سو میل، سوا سو میل پر یہ مکانات بالکل جدید فرنیچر اور ساز و سامان کے ساتھ موجود ہیں، تاہم مسافر ابھی تک انھیں پرانی منزلوں کا حساب لگاتے ہیں، اور ان کی فارسی میں ہمارا ہندوستانی لفظ "پڑاؤ" پوری آزادی سے مستعمل ہے، اور فاصلہ بتاتے وقت مسافت کی تعیین "یک پڑاؤ" "دو پڑاؤ" سے کیجاتی ہے، میل کے بجائے ان کے ہاں "کروہ" کا پرانا ہندوستانی فارسی لفظ جاری ہے جس کو ہم ہندی "کوس" کا مرادف کہہ سکتے ہیں اور جو تقریباً پونے تین انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے، اب جدید سڑکوں کی تعمیر میں فرنچ اصطلاحات میٹر، سینٹی میٹر اور کیلو میٹر کا رواج ہو رہا ہے،

یہاں سڑکوں پر میلوں کے نشانات نہیں لگے ہوئے ہیں، اس سے مسافروں کو مسافتوں کے جاننے میں

دقتیں پیش آتی ہیں، اگر ملک کی وزارتِ امور نافعہ اس کی طرف توجہ کرے، تو یہ ذرا سی اصلاح مسافروں کی بڑی الجھن کو دور کر دے،

نملا سے آگے بڑھکر شاید ایک آدھ گھنٹہ میں، ہم فتح آباد پہنچ گئے، یہ جلال آباد سے اٹھارہ میل پر ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ پشاور اور کابل کے ٹھیک بیچ میں واقع ہے، یہ بھی ایک قصبہ سا ہے، مختصر سا بازار ہے، جس میں مسافروں کے کھانے پینے کی چیزیں اور سبزیاں ملتی ہیں، چائے خانے مع گرم سماوروں کے کئی موجود ہیں

اب جبکہ کابل اور پشاور کے درمیان مسافروں کی اور اسباب کی لاریاں اور ٹیکسی گاڑیاں بکثرت آتی جاتی ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر ان کے لئے تیل اور ان کی درستی کے مختصر سامان موجود رہیں، چنانچہ صوبہ سرحد کے ایک مسلمان تاجر نے افغانی سرکار سے اس کا ٹھیکہ لیا ہے، ان کی پہلی دکان تو ڈکہ میں ملی تھی، جہاں پانی پت کے ایک مسلمان نوجوان نوکر تھے، دوسری دکان فتح آباد میں ملی، دکان کی عمارت نئی بنی تھی، عمارت کے نیچے زمین دوز کمرہ تیلوں کا گودام تھا،

نملا کے آس پاس کھیت ہیں، جنہیں افغانی کاشتکار اس وقت ہل چلا رہے تھے، یہ ہل ہندوستانی ہلوں کے مشابہ تھے، اس ملک میں کھیتوں کی سیرابی چشموں اور نہروں کے پانی سے ہوتی ہے، یہ چشمے اور نہریں فطرۃً نشیب میں، جدھر جدھر گھومتی ہیں زمین کو شاداب اور سرسبز بناتی جاتی ہیں، اور وہاں آبادیاں قائم ہو جاتی ہیں، کچھ دنوں کے بعد جب ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا ہے تو یہ آبادیاں بھی ادھر منتقل ہو جاتی ہیں، اس انتقال مکانی کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں جا بجا ملتی جاتی ہیں،

سیرابی کا طریقہ یہ دیکھا کہ کاشتکار کفگیر کی طرح کی لکڑی کا کوئی آلہ (ڈوا) ہاتھ میں لیکر نہروں سے پانی اُلیچ اُلیچ کر کھیتوں میں چھترا کر پھینکتے ہیں، افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا طریقہ بھی یہی دیکھا، سڑکوں کے دونوں طرف چشمے بہ رہے ہیں، میونسپلٹی کے ملازم جو سڑکوں کی صفائی کے لئے مامور ہیں، وہ اسی طرح سے چشموں سے پانی اُلیچ اُلیچ کر سڑکوں کو تر کرتے ہیں، تاکہ گرد و غبار بیٹھ جائے،

جلال آباد سے فتح آباد تک سڑک کی سنگلاخی ایسی ہے کہ موٹروں کو سخت سے سخت ہچکولے پڑتے ہیں، ہمارا موٹر گو زیادہ مستعمل نہ تھا، مگر اس کے ایک پہیے کے نیچے کی ایک کمانی ٹوٹ گئی، فتح آباد کی تیل والی دکان میں پہنچکر موٹر میں جب تیل ڈالا جانے لگا تو اس ٹوٹی کمانی پر نظر پڑی، بڑی مشکلوں سے وہاں لوہے کی ایک لمبی سلاخ کا ٹکڑا ملا، جس کو ٹیڑھا کرکے، لوہے کے تار سے باندھکر اس کمانی کی مرمت کیگئی، جسمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، اس دکان کے ملازم بھی ہندوستانی تھے، انھوں نے چائے سے تواضع فرمائی، انھیں نے مجھے بتایا کہ یہاں سے چھ میل پر ایک مزار ہے، جسکی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت لوطؑ کی قبر ہے، اور لوگ اسکی زیارت کو جاتے ہیں،

یہاں کچھ بچے قرآن پاک اور پرانی گلستان و بوستان اور کسی فارسی نظم کے سبق پڑھتے نظر آئے، انکے گا گا کر پڑھنے کی خاص لَے تھی، جو مجھے تو بہت خوش آیند معلوم ہوئی،

۱۱ بجے کے قریب موٹر کی مرمت ختم ہوئی، اور ہم آگے بڑھے، راستہ اوسی طرح دشوار گذار، سنگلاخ، اور پُر پیچ تھا، ہم کو کابل پہنچکر وزرائے حکومت سے معلوم ہوا کہ موجودہ حکومت نے کابل اور پشاور کے درمیان ایک اور سڑک کا کام شروع کیا ہے، جو نسبتہً اس سے کم دشوار گذار ہے اور ساتھ ہی اس راستہ سے کابل اور پشاور کے درمیان پچاس میل کی مسافت کم ہو جائیگی، اور امید ہے کہ اس سڑک کی تیاری کے بعد ہندوستان و افغانستان کی آمد و رفت، اور تجارتی کاروبار میں بہت بڑی ترقی ہو جائے گی، میرے خیال مین پشاور سے جلال آباد کو وہی نسبت ہے جو چمن اور کوئٹہ سے قندھار کو ہے، مگر قندھار کے بازاروں میں جو رونق اور آبادی اور دکانوں کی کثرت نظر آتی ہے، وہ جلال آباد کو نصیب نہیں، حالانکہ جلال آباد پشاور سے صرف اسی میل ہے، اور اسی بنا پر جلال آباد مین تجارتی ترقی کی بہت بڑی صلاحیت موجود ہے، کہ افغانستان و یاغستان اور دیگر مشرقی کوہستانوں کے درمیان یہی ایک شہر تجارت کا مرکز بن سکتا ہے،

فتح آباد سے چل کر ڈیڑھ بجے دن کو ہم گُولاں نامی قصبہ مین پہنچے، آبادی گو مختصر مگر مشغول معلوم ہوئی چھوٹا سا بازار بھی ہے، جسمین دن رات کی ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں، کھانے کی کئی دو کانیں تھیں، یہاں سے کابل تک

پھر کوئی ایسا مقام نہ تھا، اس لیے یہاں کھانے کا انتظام کیا گیا، اس دوکان کو ہوٹل تو نہیں کہہ سکتے، گو یہاں اس کا یہی نام ہے، ہاں باورچی کی ایک ستھری دوکان کہہ سکتے ہیں، ایک طرف میرے لیے اس نے میز اور کرسی لگادی، اور اوپر کھانا رکھدیا، پشاور سے جو افغانی روٹی شروع ہوتی ہے، وہی پورے افغانستان میں ملتی ہے، چپاتیوں کا رواج نہیں، دنیا کے اکثر ملکون کی طرح یہاں بھی گھروں میں روٹیاں بازاروں سے پک کر آتی ہیں، یہ بڑی قسم کی تنوری روٹی ہوتی ہے، روٹی، مرغ، انڈے اور فیرنی کے تین کھانے، اور کافی کی تین پیالیاں میرے اور شوفر اور ملازم کے لیے تھیں، مگر اس ارزانی کو سنکر آپ حیرت زدہ ہونگے، کہ ان کی مجموعی قیمت انگریزی سکہ کے حساب سے صرف ایک روپیہ ایک آنہ تھی،

ملک افغانستان کے اندر اب تک شاید سوا سو میل کے قریب ہم طے کر چکے تھے، مگر اب تک کسی مسجد کے منارے نگاہیں نہیں ٹکرائی تھیں، یہاں آکر یک بیک خیال ہوا کہ کیا یہ پورا اسلامی ملک مسجدوں سے خالی ہے؟ میں نے دکاندار سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے، اس نے سامنے کے بلند چبوترہ کی طرف اشارہ کیا، ظہر کا وقت تھا وہاں گیا تو دیکھا کہ قصبہ کی سب سے اونچی جگہ پر مٹی کا ایک چبوترہ ہے، اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا دالان ہے، دالان میں صرف ایک دروازہ تھا، اس کو کھولکر دیکھا تو دیوار میں امام کی جگہ کے لیے محراب بنائی گئی تھی اور خطیب کے لئے بغل میں ایک دو زینہ کا چبوترہ تھا، اب سمجھ میں آیا کہ چونکہ یہاں کی ان مسجدوں میں گنبد اور منارے نہیں ہوتے، اسی لیے وہ اجنبیوں کو مسجدیں نہیں معلوم ہوتیں،

بہرحال مسجد میں ظہر اور عصر کی یکجا نماز ادا کرکے ۳ بجے کے قریب آگے چلے، اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے، راستہ کا پیچ وخم اور نشیب و فراز بڑھتا جاتا تھا، راستہ کیا، پہاڑوں کے بیچ سے اور کبھی ان کے ادھر سے اور کبھی ادھر سے، پہاڑوں کو بچا بچا کر وہ نکالا گیا ہے اور جو اس قدر کم چوڑا ہے کہ دو موٹریں بمشکل چل سکیں، ان کے نیچے ہر قدم پر عمیق غار، کھڈ، یا چشمہ، اگر ڈرائیور ایک سکنڈ کے لیے بھی غفلت کرے تو موٹر اور سواریوں کی ہڈیوں تک کا بھی کہیں پتہ نہ چلے، پہاڑی راستوں کا پیچ وخم اس قدر ہے کہ ہر موڑ پر یہ ڈر لگتا تھا کہ کوئی لاری یا

موٹر ادھر سے آئے، تو ٹکرا نہ جائے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر واقف کار اور مشاق ڈرائیور نہ ہوں تو بسلامت پہنچنا مشکل ہے، اس پست و بلند اور ناہموار راستہ کو دیکھکر سعدی کی درویشانہ کیفیت کا شعر یاد آتا تھا،

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم،

گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم،

الغرض ان خطرناک نشیب و فراز اور زیر و بالا، اور چڑھاؤ اُتار راستوں کو طے کرکے مغرب کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں دریائے کابل میں بند باندھا گیا ہے اور پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے، اس کے پاس ہی قرینہ کی ایک آبادی آئی، جسکا نام شاید خاک جبار ہے، اور اس کے بعد دور تک راستہ اس طرح ہے کہ اوپر پہاڑی دیوار، نیچے سڑک اور اس کے نیچے پتھروں سے الجھتا اور نشیب و فراز سے ہاتھا پائی کرتا ہوا چشمہ نما دریا کا پانی بہ رہا ہے، اس وقت بھی کابل سے سرِ شام چلنے والی لاریاں سامان و اسباب اور مسافروں سے بھری ہوئی، راستہ میں ملتی جاتی تھیں، اخیر مغرب کو شاید کابل سے ۱۵ میل پہلے، بتِ خاک پہنچے، یہ گویا کابل کا پھاٹک ہے، پرانی وضع کا اچھا خاصہ بازار ہے، آمد و رفت کی کثرت بھی تھی، یہاں سرِ راہ ایک مکان کے سامنے موٹر رکا، معلوم ہوا کہ یہاں کابل جانے کا محصول چنگی وصول ہوتا ہے، یہاں سے کابل کا سیدھا راستہ ہے، سڑک چوڑی، ہموار اور صاف، سڑک کے دونوں طرف چشمے بہ رہے تھے، اور ان کے نیچے غالباً چنار کے درخت دورویہ لگے تھے، جیسے جیسے شہر قریب آتا جاتا تھا روشنی کی رونق بڑھتی جاتی تھی، اب شہر کابل کا چنگی خانہ آیا، یہاں موٹر کا نمبر، ڈرائیور کا نام، مسافر کا نام وغیرہ درج کیا گیا، یہیں ٹیلیفون آیا کہ حکومت کی طرف سے چند نمایندے استقبال کے لئے آرہے ہیں، چند منٹ انتظار کیا جائے، انتظار کو کچھ ہی منٹ گذرے تھے کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار شاہی موٹر آکر رُکا، اور اس سے چند اصحاب اترے، جنمیں سے ایک وزارت خارجیہ کے اور دوسرے صاحب وزارت تعلیم کے نمایندے اور ایک دو اور بزرگوار تھے، انھوں نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی وزارتوں کی طرف سے خوش آمدید اور مہمان نوازی کے الفاظ ادا فرمائے، اور مجھے اپنی کار میں لے کر شہر میں داخل ہوئے،

رات کا وقت تھا، شہر کے اکثر حصے بجلی کی روشنی سے منور تھے، بعض حصوں کی عمارتیں اچھی خاصی بلند اور شاندار، اور سڑک صاف و ہموار تھی، پولیس کے سپاہی اچھی خوشنما وردیوں میں آمد و رفت کے نظم و نسق کیلئے کھڑے تھے، پرانے کابل سے گذر کر ہم کابل کے نئے شہر میں پہنچے، اور دارالامان میں لائے گئے، جس کو امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں جدید طریق پر آباد کرنا چاہا تھا، یہاں یورپین انجنیروں کی نگرانی میں جدید طرز و انداز کی پانچ چھ سرکاری عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور ہر عمارت کئی کئی منزل کی ہے، انھیں عمارتوں سے ایک شاندار عمارت شاہی مہمانخانہ ہے، اسی مہمانخانہ کے سامنے آکر موٹر رکا، اور ہم سب اتر کر باغ کے اندر داخل ہوئے، اس باغ کے پھاٹک پر وہ صاحب ملے جو ہم نووارد مہمانوں کی خاطر مدارات اور دیکھ بھال کے لیے مقرر تھے، ان کا نام سرور خاں اور گویا تخلص ہے، یہ امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کے زمانہ کے مشہور سردار عبدالقدوس خاں کے پوتے ہیں، پچیس تیس کے درمیان عمر ہوگی، یہ فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، شعر و شاعری کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں، فارسی میں کم کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، شعر العجم اور میرزا مظہر کے خریطۂ جواہر کے تمام منتخب اشعار ان کی نوک زبان ہیں، اندازہ ہے کہ پچیس تیس ہزار شعر ان کو یاد ہونگے، اخلاق پسندیدہ، اطوار شایستہ، ذہن رسا، مذاق عالی، تذکروں کے حافظ، اور قلمی کتابوں کے جویا، فارسی تحریر کا سلیقہ بہت خاصہ رکھتے ہیں، کابل کی شاہی انجمن ادبی (جسکو "رائل اکاڈمی" کہنا چاہئے، اور جسکو موجودہ حکومت نے قائم کیا ہے) کے رکن رکین ہیں، رسالہ کابل[1] میں ان کے مضامین چھپا کرتے ہیں،

سرور خاں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا، میں نے عرض کی "در کابل دیدہ بودم و اکنوں در کابل می بینم" انھوں نے اس فقرہ سے مزا لیا، اور مجھے ساتھ لیکر مہمان خانہ کی دوسری منزل پر لے گئے، جہاں ہمارے پیشرو رفیقوں کا قیام تھا، اور اس کا ایک کمرہ میرے لیے مخصوص تھا، یہاں سب سے پہلے مدیر صاحب مہمانخانہ سے تعارف کرایا، پھر ڈاکٹر اقبال اور نواب سر راس مسعود سے جا کر ملا، سر راس مسعود کیساتھ پروفیسر ہادی اور ڈاکٹر سر اقبال کیساتھ غلام رسول خاں بیرسٹر لاہور سکرٹری ہو کر آئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، پروفیسر ہادی میرے پرانے دوست ہیں، ان سے بارہ برس کی ملاقات ہے، نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے ہیں، پہلے سائنس کے لیے انگلستان گئے تھے، پھر واپس آکر جامعہ ملیہ

[1] پہلے کابل سے رسالہ کابل اور دوسرے سے شہر کابل مراد ہے،

میں رہے، وہاں سائنس کلاس کو ترقی دی، پھر مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے، فارسی ایک حیثیت سے ان کی مادری زبان ہے، اور ایرانی فارسی ایرانی لب و لہجہ میں اچھی بولتے ہیں، اور ماشاء اللہ مردانہ حسنِ صورت اور اعتدالِ قامت سے بھی سرفراز ہیں، فارسی میں اب جاکر پی، ایچ ڈی کی ڈگری لندن سے حاصل کی ہے، اور ایرانی جاز رانی پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے، غلام رسول خاں آج سے چوبیس برس پہلے امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں کابل میں بصیغۂ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے، اس لئے ان کی رفاقت سے سب کو بہت آرام پہنچا،

بہرحال اسوقت جب ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کی کہ مجھے چھوڑ کر آپ سب کے اس بعجلت سفر پر مجھے اردو کا ایک پرانا شعر راستہ بھر یاد آیا کیا،

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

سب نے کہا یہ شعر گویا آج ہی کے لیے کہا گیا تھا،

اس وقت نو بجے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے ہاں مہمانوں کی دعوت تھی، اُن کا ٹیلیفون آیا کہ "نو وارد مہمان" بھی شریکِ دعوت ہوں، اور لوگ تیار ہو چکے تھے، اس لئے تاخیر کے خیال سے میں بھی اسی حالت میں بلا تبدیل لباس، ساتھ ہو گیا، ہم لوگ دو موٹروں میں روانہ ہوئے، ایک میں ڈاکٹر اقبال، میں اور سرور خاں گویا اور دوسرے میں سر راس مسعود، پروفیسر ہادی اور غلام رسول خاں، تھوڑی دیر میں صدر اعظم صاحب کے محل تک پہنچے محل میں ہر جگہ بجلی کی روشنی تھی، جگہ جگہ فوجی سپاہیوں کے پہرے تھے، ایک دروازہ پر پہنچکر اترے، دوسرے مہمان سب پہنچ چکے تھے، سب سے آخر میں ہم لوگ پہنچے تھے، محل میں ہر چیز یورپین طریق و قاعدے سے تھی، ایک گیلری سے ہو کر اندر وسیع دالان میں پہنچے، سب سے تعارف اور ملاقات ہوئی، مہمانوں میں جن صاحبوں کے نام اسوقت یاد آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ، شہزادہ اسد اللہ خاں کمانڈر افواج شاہی، سردار فیض محمد خاں وزیر خارجیہ، سردار احمد خاں وزیر دربار، اللہ نواز خان وزیر فوائد عامہ، میر عطا محمد خاں صدر مجلس

اعیان (پارلیمنٹ) وغیرہ،

چند منٹ کے توقف کے بعد سردار ہاشم خاں صدر اعظم تشریف لائے، بالا قد، وجیہ چہرہ، گورا رنگ، متوسط بدن، فرنچ کٹ داڑھی، سر پر افغانی ٹوپی، جسم پر کوٹ اور پتلون، افغانستانِ جدید میں امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ سے سر کے علاوہ باقی جسم میں یورپین لباس رواج پذیر ہے، یہاں کے تعلیم یافتہ اصحاب، اربابِ مناصب، عہدہ دار، فوج، پولیس، سپاہی، حتیٰ کہ خدام اور سرکاری شوفر تک یہی لباس پہنتے ہیں،

ہاشم خاں نے آکر مہمانوں سے مصافحہ کیا، سردار فیض محمد خاں نے ہندوستانی مہمانوں کا ایک ایک کرکے تعارف کرایا، اس کے بعد سردار ہاشم خاں سب کو لیکر کھانے کے کمرہ میں گئے، کھانا میز و کرسی پر تھا، ہر چیز یورپین طریق پر آراستہ تھی، کھانا کھلانے والے ملازمین بدستور سیاہ کپڑوں میں تھے، ہاتھوں میں سپید دستانے اور سر پر افغانی ٹوپیاں، کھانے کی گول میز مختلف قسم کے انگوروں اور پھلوں اور گلدانوں سے آراستہ تھی، کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب و سلیقہ ہر چیز آجکل کی متمدن دنیا کی سطح کے برابر تھی، اور بقول ڈاکٹر اقبال، ہم کو تعجب ہو رہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں، یا تمدن جدید کی نئی دنیا میں،

میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں، سرور خاں گویا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ رسالہ کابل میں افغانستان کے اکثر علما و فضلا و شعرا، اور اربابِ کمال کے حالات چھپتے ہیں، مگر اس کا ذکر اب تک نہیں آیا، جس نے کابل میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی، سب نے پوچھا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خراسان کے عالم مقاتل بن حیان، جو ابو مسلم خراسانی سے بھاگ کر ادھر چلے آئے تھے، اس سلسلہ سخن سے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع ہوگئی، اور اس موضوع پر سردار فیض محمد خاں نے جو عہد امانی میں وزیر تعلیم، اور اب وزیر خارجہ ہیں، اس قدر پر معلومات گفتگو فرمائی، اور ہندوستان کے مورِ یا خاندان (دہلی پتر) اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر اس خوبی سے کیا کہ میں ان کا بیحد معترف ہوگیا، سر راس مسعود نے اپنے جاپانی سفروں کے حالات سے اس علمی دسترخوان میں نئی لذت پیدا کی، ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ و سیاست کے نکات بیان فرمائے،

اسی میز پر رئیس اعیان میر عطا محمد خاں کے متعلق معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء والی مکہ کی مشہور موتمر اسلامی میں وہ بھی سفیر افغانستان کے ساتھ شریک تھے، اور وہ کہتے تھے کہ میں نے تمھیں وہاں دیکھا تھا، مگر مجھے ملنا یاد نہیں آیا، یہ نہایت متین وسنجیدہ اور خاموش بزرگ ہیں، چہرہ پر خوبصورت داڑھی ہے، سن پچپن اور ساٹھ کے قریب ہوگا، عربی ممالک کی سیاحت کی ہے، اور عربی زبان خوبی اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں،

وزیر حربیہ شاہ محمود خاں، نادر خاں شہید مرحوم کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں، ابھی گو جوان ہیں، مگر ماشاء اللہ جوان صالح ہیں، ان میں ہر دلعزیزی اور محبوبیت کی شان معلوم ہوتی ہے، وہ اپنی فوجی وردی میں تھے، اور شہزادہ اسد اللہ خاں بھی فوجی وردی میں تھے، یہ شاہی فوجی دستہ کے کمانڈر ہیں، امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے خلف الرشید امیر امان اللہ خاں کے سوتیلے بھائی اور نادر خاں اور ہاشم خاں وغیرہ کے بھانجے ہیں، ابھی گو سن کم ہے، مگر سعادت کا نور پیشانی پر نمایاں ہے، غالباً پچیس برس کے قریب عمر ہوگی،

ہمارے رفقائے طعام میں اللہ نواز خاں بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، شاید لوگوں کو یاد ہو کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے، ان میں سے ایک یہ تھے، گو یہ اصلاً افغان ہیں، مگر مدت سے ان کا خاندان ملتان میں آباد ہے، اور وہ اس طرح ہندوستانی اور افغانی دونوں ہیں، بچہ سقا کے ہنگامہ کے وقت جنرل نادر خاں کو جس نے سب سے پہلی مدد دی وہ یہی تھے، اون کا مجاہد کی حیثیت سے سرحد کے بعض قبائل پر اثر تھا، وہ انھیں میں سے تین سو آدمی لیکر نادر خاں کے پاس آئے اور انھیں کا سب سے پہلا دستہ تھا جو شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل پہنچا تھا، موجودہ حکومت اون کے خدمات کی پوری قدر کرتی ہے، اور اس نے ذمہ داری کے مختلف عہدوں پر ان کو سرفراز کیا، اور اب وہ آجکل وزیر فوائد عامہ (پبلک ورکس) ہیں، دوہرا بدن، چوڑا چہرہ، گندم گون رنگ، چہرہ سے استقلال اور عزم برستا ہے،

کھانے سے فارغ ہو کر ملاقات کے پہلے کمرے میں آکر بیٹھے، چائے کافی، سگریٹ وغیرہ سے تواضع ہوتی رہی، سردار ہاشم خاں نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ہے، میں نے کہا بلا ساز کے کوئی مضائقہ نہیں، وہ

وہ شاید ساز کا لفظ نہ سمجھے، فرمایا، "ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی، مرد گاتے ہیں"، ڈاکٹر اقبال نے تائید کی، گویوں یا قوالوں یا فوجی نغمہ نوازوں کا ایک دستہ آیا، نشستیں کرسیوں پر تھیں، وہ ادب سے آداب بجالاکر نیچے قالین پر بیٹھ گیا، اور نغمہ طرازی شروع کی، ہندوستان میں تو بیدل عظیم آبادی کی بہت کم پرستش ہے، مگر افغانستان اور سنا ہے ایشیائے وسطی کے دوسرے فارسی داں ملکوں میں بیدل کی بہت قدر ہے، قوالوں نے بھی بیدل کی غزل شروع کی، پھر حافظ کی ایک دو غزلیں پڑھیں پھر بیدل کو شروع کیا، تھوڑی دیر تک یہ مجلس سماع گرم رہی، اور بعد ازیں میزبان کا شکریہ ادا کرکے سب مہمان ۱۱ بجے رات کے قریب رخصت ہوئے،

دوسرے دن جمعہ کا روز تھا، خیال تھا کہ آزاد اسلامی ملک کا بھی جمعہ دیکھیں، صبح کو مختلف اصحاب ملنے کو آئے جنمیں ہندوستانی بھی تھے اور تعلیم یافتہ افغان، اور اہل منصب بھی، ہندوستان اور افغانستان کے وقت میں قریب قریب ایک گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے، وہاں کی گھڑی ہمارے ہاں سے ایک گھنٹہ پیچھے رہتی ہے، میں نے ابھی گھڑی نہیں بدلی تھی، اور صاحبوں نے پیچھے کرلی تھی، نماز کا وقت بارہ بجے کے بعد آگیا، شاہ نادر خاں مرحوم مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے، مگر اس دن شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں جسکا نام "جامع مسجد پل خشتی" ہے، [illegible] والے تھے، ہم لوگ بھی وہیں پہنچے، امیر معاویہ پر جب سے دمشق کی مسجد میں ایک خارجی نے حملہ کیا تھا، اس وقت [illegible] اسلام میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ مسجد کی عمارت میں ایک گھرا ہوا کمرہ بادشاہ کے لیے ہوتا ہے، امیر معاویہ نے [illegible] جاری کی تھی تو اس کا نام "مقصورہ" تھا، معلوم نہیں افغانستان میں اس کو کیا کہتے ہیں، بہر حال اس جامع مسجد میں بھی یہ مقصورہ بنا ہوا ہے، اور افغانستان کے بادشاہ اسی میں نماز پڑھتے رہے ہیں،

"پل خشتی" ایک پل کا نام ہے، جو لکڑی کے بجائے اینٹوں سے بنا ہے، اسلئے پل خشتی کہلاتا ہے، اور اسی نسبت سے مسجد کو جامع مسجد پل خشتی کہتے ہیں، یہ مسجد پرانے شہر میں ایک تنگ بازار کے اندر واقع ہے، مسجد گو وسیع تھی مگر ہندوستان کی جامع مسجدوں کی طرح شاندار نہیں، نمازی دروازے سے لیکر محراب تک بھرے تھے، غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی، ظاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کی عام مالی حالت بلند نہیں، یہ سب پرانے افغانی

لباسوں میں تھے، سامنے منبر پر کوئی افغانی مولوی صاحب فارسی میں وعظ فرمارہے تھے،

ہم لوگوں کو شاہی مقصورہ میں لے جایا گیا، وہاں دوسرے مخصوص اصحاب بھی پہلے سے موجود تھے، تھوڑی دیر کے بعد اعلیحضرت شاہ نادر خاں مرحوم تشریف لائے، چھریرا بدن، بالا قامت جسم پر سیاہی مائل مخطط سوٹ، پاؤں میں بوٹ، سر پر کلاہ اور دستار، ہاتھوں میں سپید دستانے، مسجد میں وہ نہایت سادگی کے ساتھ داخل ہوئے اہل مسجد سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، یعنی جن صفوں سے وہ گذرے، وہاں لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوئے اور نہ واعظ صاحب نے اپنا وعظ بند کیا، موحد مسلمانوں کی یہ ادا کس قدر مؤثر ہے کہ خانۂ خدا میں غیر خدا کی تعظیم نہیں، جب وہ مقصورہ کے دروازہ کے پاس آئے، تو انکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا، جو اسلام کی مساوات کی عملی مثال کے طور پر دل میں محفوظ رہے گا،

وہ مقصورہ کے دروازہ کے سامنے پہنچے تو ایک بلند بالا غریب پیر کہن سال اپنی جگہ سے اٹھکر ان تک پہنچا، سر پر عربی مندیل بندھی تھی، پاس پہنچکر اس نے شاہ مرحوم کے رخسار کو بوسہ دیا، (افغانستان میں محبت کے اظہار کے طور پر ایک دوسرے کے رخسار کو بوسہ دیتے ہیں) شاہ مرحوم نے بھی اسی محبت سے اوسکے رخسار کو بوسہ دیا، اور اوسکو اپنے ساتھ مقصورہ میں لے آئے، اور باڈی گارڈ کے آدمیوں سے فرمایا کہ انکو بھی یہیں اگلی صف میں جگہ دو، اندر آکر سب سے ملے، مجھ سے چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی، اسلئے سردار فیض محمد خاں نے مجھے ملایا، مصافحہ کیا، اور تواضع اور خاکساری کے انداز میں خیریت دریافت فرمائی، اور اپنے پہلو میں جگہ دی، تھوڑی دیر کے بعد وعظ ختم ہوا، موذن نے اذان دی، اذان کے بعد سب سنتیں پڑھنے کو کھڑے ہوگئے، پھر دوسری اذان ہوئی اور خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا، دوسرے خطبہ کے آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خاں کا نام لیا، تو میں نے دیکھا کہ مرحوم نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر تواضعاً اپنے سر کو جھکا دیا، ان کی یہ ادا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی،

خطبہ کے بعد دوگانۂ جمعہ، اور اس کے بعد حسب معمول سنتیں ادا ہوئیں، لوگ اپنی جگہ جگہ پر بیٹھے رہے

اس کے بعد امام نے دعا مانگی، اور سب مصلیوں نے بھی آمین کے لئے ہاتھ اٹھائے، نماز سے فارغ ہوکر، شاہ مرحوم نے ایک اور مؤثر نظارہ پیش کیا، ان مرد ضعیف کو اپنے پاس بلاکر ہم لوگوں سے فرمایا کہ یہ سید ہیں، اور نیک ہیں اور میرے پرانے ملنے والے ہیں، پھر ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے کہ "اسلام کا بھلا ہو، اور مسلمانوں کی خدمت جس سے بن آئے، اسکو نیک توفیق عطا ہو۔ پہلے تو وہ سمجھے نہیں کہ شاہ مرحوم نے کیا فرمایا، شاہ نے دوبارہ وہی الفاظ فرمائے تو انھوں نے دعا، کے لیے ہاتھ اٹھائے، شاہ مرحوم نے اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھاکر آمین کہی،

اس کے بعد سب اٹھے، شاہ مرحوم نے ہم مہمانوں سے فرمایا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے، اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو ساتھ ہی کھانا تناول کریں، مگر دوسرے ضروری کاموں کے سبب سے ہم سب نے اس وقت معذرت چاہی، اس کے بعد سب مل کر وہ اپنے موٹر پر واپس گئے، ان کے پیچھے اُن کے باڈی گارڈ کی کار روانہ ہوئی،

ہم غلام ملک کے رہنے والوں کے لیے شاہ و گدا کی یکساں نماز کا نظارہ نہایت مؤثر تھا، ڈاکٹر اقبال فرمانے لگے کہ آج میں سمجھا کہ دار الحرب میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں ؟ میں نے عرض کی، ڈاکٹر صاحب آپ نے اسلام کے نظریہ کے طور پر جو فرمایا تھا،

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

آج آپ نے عملاً اسکی تصویر دیکھی، اگر غزنین کا بڑا مرقع نہیں دیکھا تو کابل کا چھوٹا مرقع تو دیکھ لیا، فرمایا، ہاں دیکھ لیا۔
(باقی)

رہبانیت اور اسلام

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ

از

مولانا عبد السلام ندوی،

اسلام سے پہلے دو متضاد نظامِ اخلاق دنیا مین قائم تھے، اور ان دونون کو اون لوگون نے قائم کیا تھا، جو اپنے دینی اور دنیوی اقتدار سے دنیا کو ان کا پابند بنا سکتے تھے، ایک نظامِ اخلاق تو روم اور ایران کے شہنشاہون رئیسون، امیرون اور دولت مندون کا تھا، جو ہر قسم کی دنیوی شان وشوکت، دنیوی جاہ وجلال، اور دنیوی آرائش ونمایش کے اظہار کا ذریعہ تھا، اور آج یہی نظامِ اخلاق یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ طبقہ مین پہنچکر اور بھی زیادہ شاندار لطیف اور رنگین ہو گیا ہے، اور تمام دنیا اوسکی پابند ہو رہی ہے،

دوسرا نظامِ اخلاق یہودیون، عیسائیون اور ہندوؤن کے مذہبی پیشواؤن کا تھا، جسمین انتہا درجہ کی بوسیدگی، انتہا درجہ کی شکستگی، انتہا درجہ کی خشکی، اور انتہا درجہ کی ترشروئی پائی جاتی تھی، اور اس مین تکلف کے بجائے سراسر تکلیف ہی تکلیف تھی، لیکن اس تکلیف کے باوجود ان لوگون کا دینی اقتدار اس کو دنیا مین اس قدر مقبول بنا رہا تھا، کہ جو لوگ اپنے مزاج وطبیعت کے لحاظ سے اس طریقِ زندگی کے مخالف تھے، وہ بھی ان لوگون کا احترام کرتے تھے، اور آج بھی پوپون، سنیاسیون اور درویشون کے سامنے بڑے سے بڑے گردن فراز لوگون کے سر نیاز جھک جاتے ہین،

اسلام آیا تو یہ دونون نظامِ اخلاق انتہائی عروج کی حالت مین قائم تھے، اور اون مین ہر قسم کی

دینی اور دنیوی کشش پائی جاتی تھی لیکن اسلام نے شدت کے ساتھ ان دونوں کی مخالفت کی اور اس کے مقابل میں ایک نہایت معتدل نظامِ اخلاق قائم کیا جس مین فطری میلان کے سوا کسی قسم کی رنگینی، بوقلمونی اور تراش و خراش نہ تھی، باپ ماں کے فرمانبردار رہو، بچّون سے محبت رکھو، عورتون کے ساتھ عمدہ سلوک کرو، زمین پر اکڑ کر مت چلو، نرم لہجے مین بولو، اگر کوئی سلام کہے، تو اس کے سلام کا جواب اوس سے بہتر طریقہ پر دو، یہ اور اسی قسم کی سیکڑون اخلاقی باتین اسلامی نظامِ اخلاق کا جزو ہین، اور یہ ایسی باتین ہین جو بچّون کو ریڈرون مین پڑھائی جاتی ہین، اس لئے اس قسم کی سادہ اخلاقی باتون کو سنکر بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے آخری پیغمبر کا یہ کونسا عظیم الشان اخلاقی کارنامہ ہے، اور اس مین کونسی جدّت اور ندرت پائی جاتی ہے؟

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی حقیقی چیزین جن سے دنیا اور اہلِ دنیا کا وجود قائم ہے وہی ہین جو سادہ اور معتدل اور فطری ہین، لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غیر فطری چیزون کی مصنوعی لیکن ضرر رسان لذتین، دنیا کو ان فطری چیزون سے غافل کر دیتی ہین، اور ایسی حالت مین ایک پیغمبر کا اصلی کارنامہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے چہرے سے ان غیر فطری اور مصنوعی چیزون کا نقاب اوتار کر پھینک دے، تاکہ فطرت کا اصلی چہرہ روشن ہوجائے، دودھ اور پانی نہایت سادہ فطری چیزین ہین، مگر انھی دونون سے انسانی زندگی کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے، لیکن ایک شرابی، شراب کو ان دونون پر ترجیح دیتا ہے، اور شراب کی مصنوعی لطافتون کے سامنے ان دونون قدرتی چیزون کی کوئی قدر و قیمت نہین ٹھہراتا، ایسی حالت مین اگر کوئی شخص اوس کو دودھ اور پانی کے فوائد اور شراب کے نقصانات سمجھاتا ہے، تو اس کے یہ معنی نہین ہین کہ وہ سائنس کے کسی جدید اور دقیق مسئلہ کی ایجاد کرتا ہے، بلکہ اوس کا اصلی کارنامہ صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ اس شخص کی آنکھون کے سامنے سے نشہ کا مصنوعی پردہ ہٹا دینا چاہتا ہے، رسول اللہ صلعم کے زمانے مین اخلاقی حیثیت سے دنیا کی حالت بھی شرابیون کی سی ہو رہی تھی، ایک طرف تو فرمانروایانِ روم و ایران اپنے شاہانہ ساز و سامان کے نشے مین چور اور دوسری طرف یہودیون عیسائیون اور ہندؤون کے مذہبی پیشوا اپنی اپنی گدڑی مین مگن تھے،

کہ اسی حالت مین رسول اللہ صلعم نے اپنی سادہ اور معتدل اخلاقی تعلیم سے ان دونون فریق کی آنکھون کے سامنے سے غفلت کے یہ پردے دور کر دئے اور فطرت کا جو خوبصورت چہرہ حریر کی چمکدار قباؤن اور کمل کی گدڑیون کے اندر چھپ گیا تھا، اوس کو اپنے اصلی حسن و جمال مین دنیا کے سامنے پیش کر دیا،

۲- دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو معتدل فطری نظام اخلاق قائم کیا وہ اگرچہ بظاہر نہایت بے رنگ اور سادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس زمانے کی حالت کو پیش نظر رکھا جائے جس مین رسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے تھے، تو صاف معلوم ہوگا کہ آپ کی اخلاقی تعلیمات اوس زمانے کے حالات کے بالکل مخالف تھین، اور مخالف حالات پر قابو پانا اور زمانے کی روش کے مخالف چلنا بڑے بڑے اولوالعزم ہی لوگون کا کام ہو سکتا ہے، اوس زمانے مین اہل عرب بالخصوص صحابۂ کرام نہایت غربت و افلاس کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، ایک صحابی کا بیان ہے کہ مین ساتوان مسلمان ہون، اوس وقت یہ حالت تھی کہ ہم لوگ درخت کے پتے کھا کھا کر گذرا وقات کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے جبڑے پھٹ پھٹ گئے تھے،

تمام اہل مدینہ کی عام غذا کھجور اور جو تھی، جو کا آٹا بھی چھنا ہوا نہین ہوتا تھا، کیونکہ صحابہ کے گھرون مین چھلنی نہین ہوتی تھی، آٹا پیس کر مونہ سے پھونک دیتے تھے، بھوسی اُڑ جاتی تھی، اور جو کچھ بچ جاتا تھا اس کو کھا لیتے تھے،

کپڑے کی یہ حالت تھی کہ بہت سے صحابہ کے پاس صرف ایک چادر ہوتی تھی، جس کو گلے مین باندھکر ٹخنون تک لٹکا لیتے تھے، کہ تہبند اور کرتہ دونون کا کام دے، ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا کہ ایک کپڑے مین نماز جائز ہے یا نہین؟ تو ارشاد ہوا،

اولکلکم ثوبان. کیا تم مین ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہین،

شادی بیاہ مین دولھنون کو معمولی جوڑا بھی میسر نہین ہوتا تھا، حضرت عائشہ رض کا بیان ہے کہ میرے پاس گاڑھے کی ایک کرتی تھی، شادی بیاہ مین جب کوئی دولھن سنواری جاتی تھی تو وہ مجھ

سے اوس کو مستعار منگوا لیتی تھی، رومال نہایت معمولی درجہ کی چیز ہے، لیکن صحابۂ کرام کو وہ بھی میسر نہ تھا، کھانا کھاتے تھے، تو پانؤن کے تلوون مین ہاتھ پونچھ لیتے تھے،

صحابۂ کرام کے گھر نہایت مختصر، پست اور کم حیثیت ہوتے تھے، اون مین پاخانے تک نہین ہوتے تھے، اور راتون کو گھرون مین چراغ تک نہین جلائے جاتے تھے، یہ حالت بالکل راہبانہ اور جوگیانہ زندگی کے مطابق تھی، اور ایسی حالت مین اگر آپ راہبانہ اور جوگیانہ زندگی کی تعلیم دیتے تو اس ماحول کے بالکل مطابق ہوتی اور صحابۂ کرام نہایت آسانی کے ساتھ اوس کو قبول کر لیتے،

زمانۂ جاہلیت مین بھی مذہبی حیثیت سے اہل عرب کا میلان رہبانیت ہی کی طرف تھا، مثلاً مذہبی اعمال مین اہل عرب کا سب سے محبوب ترین عمل حج تھا، اور اوس کو وہ طرح طرح کی ریاضتون کے ساتھ ادا کرتے تھے، مثلاً اہل یمن جب سفر حج کیلئے روانہ ہوتے تھے تو کسی قسم کا زاد راہ ساتھ نہین لیتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم لوگ متوکل باللہ ہین، خدا کے گھر کا حج کرتے ہین تو کیا وہ ہم کو کھانا نہ کھلائے گا؟ لیکن مدینہ تک پہنچکر بھیک مانگنے لگتے تھے، ایک رسم یہ تھی کہ جب یہ حج کرتے تھے تو گھرون کے اندر دروازے کے راستے سے نہین داخل ہوتے تھے، بلکہ گھر کی پشت سے پھاند کر آتے تھے، کیونکہ وہ چاہتے تھے، کہ زمانۂ حج مین اون کے اور آسمان کے درمیان کوئی درمیانی چیز حائل نہ ہونے پائے، اس لئے اگر وہ دروازون سے گھر مین آتے تو اون کے اور آسمان کے درمیان چھت حائل ہو جاتی، ایک طریقہ یہ تھا کہ ایام حج مین قریش کے سوا عرب کے اور تمام مرد اور عورت ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ قریش کے لوگ چونکہ خانہ کعبہ کے مجاور تھے، اس لئے اونھون نے تمام اہل عرب پر اپنا تفوق قائم کرنے کیلئے یہ طریقہ ایجاد کر لیا تھا، دوسری بات یہ تھی کہ اہل عرب کپڑے پہن کر مذہبی مراسم کا ادا کرنا مذہبی زہد و تقشف کے مخالف سمجھتے تھے، زمانۂ جاہلیت کے کی ان سختیون کا اثر عہد اسلام مین بھی قائم رہا، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا

کہ اپنے دونوں بیٹوں کا سہارا دیکر چل رہا ہے، وجہ دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ اوس نے خانۂ کعبہ تک پاپیادہ چلنے کی منت مانی ہے، ایک صحابیہ نے بھی اسی قسم کا ارادہ کیا اور رسول اللہ ؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا پیدل بھی چلو اور سوار بھی ہو لیا کرو، ایک طریقہ یہ تھا کہ اونٹوں کی طرح ناک مین نکیل ڈال لیتے تھے، دوسرا شخص اسکو پکڑ کر کھینچتا تھا، خود رسول اللہ صلعم نے اسی طرح ایک شخص کو طواف کرتے دیکھا،

حج کا زمانہ عرب مین خصوصیت کے ساتھ تجارتی گرم بازاری کا زمانہ ہوتا ہے لیکن اسلام لانے کے بعد صحابۂ کرام رضؓ حج مین تجارت کو ایک گناہ کا کام سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ تو صرف ذکر و عبادت کا زمانہ ہے، ان کے علاوہ اس زمانہ مین اور کسی دنیوی کام مین مشغول نہین ہونا چاہئے،

بعض لوگ روزے کے متعلق بھی طرح طرح کی سختیون کا التزام کرتے تھے، مثلاً روزہ رکھتے تھے تو دھوپ مین کھڑے رہتے تھے، اور کسی سے بات چیت نہین کرتے تھے، اور ان تمام حالات نے رہبانیت کی تعلیم کیلئے فضا کو بالکل صاف کر دیا تھا، اسلام آیا تو اوس نے صحابۂ کرام مین اور بھی شدت کے ساتھ ذوق عمل پیدا کیا، اور اس حالت مین قدرتی طور پر بہت سے صحابہ رہبانیت کی طرف مائل ہوئے، چنانچہ چند صحابہ نے رسول اللہ صلعم کی بیبیون کی خدمت مین آکر آپ کی عبادت کا حال دریافت کیا، لیکن جب آپ کی معتدل عبادت گذاری کا حال معلوم ہوا، تو اونھون نے اپنے معیار کے مطابق اوس کو کم سمجھا، اور اوس کی یہ تاویل کی کہ ہم مین اور رسول اللہ صلعم مین بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ آپکے اگلے پچھلے گناہ سب معاف ہو چکے ہین، اسلئے آپ کو بہت زیادہ عبادت کی ضرورت نہین، اسلئے ان مین ایک صاحب نے کہا کہ مین رات بھر نماز پڑھتا رہون گا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ مین ہمیشہ روزہ رکھون گا، ایک صحابی بولے کہ مین کبھی نکاح ہی نہ کرونگا، حضرت عثمان بن مظعون رضؓ ایک رہبانیت پسند صحابی تھے، اونھون نے اپنے اوپر عورت، خوشبو، اور ہر لذیذ چیز کو حرام کرنا چاہا، یہانتک کہ رسول اللہ صلعم سے بدھی ہونے کی اجازت حاصل کرنی چاہی، اور صحابہ کہتے ہین، کہ اگر آپ اون کی یہ درخواست منظور فرما لیتے تو ہم سب کے سب بدھی ہو جاتے،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ تھے، جو سخت سے سخت ریاضت اور سخت سے سخت عبادت میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے دیکھا کہ مسجد کے دونوں ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے، دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ ایک صحابیہ نے جن کا نام زینب ہے یہ رسی باندھ رکھی ہے، جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو اوس سے لٹک جاتی ہیں، تاکہ نیند نہ آنے پائے ایک صحابی تھے جو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے تھے، اور رات کو نماز پڑھتے تھے،

اسلام میں جہاد بھی ایک عبادت ہے، اس لئے اس کا شوق بھی صحابہ کے دلوں میں رہبانیت کا میلان پیدا کرتا تھا، چنانچہ حضرت سعد بن ہشامؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بی بی کو طلاق دیدی، اور مدینہ آیا کہ وہاں کی جائداد کو بیچ کر ہتھیار خریدوں اور جہاد کروں، اون کو چند صحابہ اور ملے، جنھوں نے کہا کہ ہم میں سے اور چھ شخصوں نے بھی یہی ارادہ کیا تھا،

ان سب سے بڑھکر یہ کہ خود صحابہ میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ ایسا موجود تھا، جو بالکل راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو بالکل خدمت اسلام کیلئے وقف کر دیا تھا، اور ہر قسم کے دنیوی کاروبار، یعنی زراعت، تجارت اور ملازمت وغیرہ کو چھوڑ کر اپنی زندگی صرف عبادت گذاری کیلئے نذر کر دی تھی، یہ لوگ راتوں کو عموماً عبادت کرتے تھے، اور قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی تھی، اور اس کو بیچ کر اپنے بھائیوں کیلئے کھانا مہیا کرتی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے، اور جب شادی کر لیتے تھے، تو اوس حلقہ سے نکل جاتے تھے، ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے، کہ رانوں تک لٹک آتی تھی، اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے، اور مسجد کی چھت میں لگا دیتے تھے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتی تھیں، یہ لوگ اون کو اوٹھا کر کھا لیتے تھے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، رسول اللہ صلعم کے پاس جب کہیں سے کوئی صدقہ کا کھانا آتا تھا، تو مسلم اون کے پاس بھیج دیتے تھے

اور جب دعوت کا کھانا آتا تھا، تو اون کو بلا لیتے تھے، اور ان کے ساتھ بیٹھکر کھاتے تھے، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ راتون کو رسول اللہ صلعم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے تھے، یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو آدمی کو اپنے ساتھ لیجاتا تھا، اور ان کو کھانا کھلاتا تھا، چنانچہ بعض فیاض اور دولت مند صحابہ کبھی کبھی اسّی اسّی آدمیون کو ساتھ لیجا کر کھانا کھلاتے تھے، ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی،

ان تمام واقعات کے پیش نظر رکھنے کے بعد علانیہ ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ بالکل رہبانی تعلیم کی دعوت دے رہی تھی، لیکن بایں ہمہ رسول اللہ صلعم نے رہبانیت کی مخالفت کی، اور عام اعلان فرمایا،

انّ اللہ ابدلنا بالرّھبانیۃ الحنفیّۃ	خدا نے رہبانیت کے بدلے ہم کو آسان اور سیدھا مذہب عطا فرمایا،

اور جو لوگ نکاح کو مذہبی زہد و تقشّف کے خلاف سمجھتے تھے، اون کو ہدایت فرمائی،

تزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ولا تکونوا کرھبانیۃ النصاری،	یعنی نکاح کرو کیونکہ مین اور امتون کے مقابل مین تمھاری بڑھی ہوئی نسلی تعداد پر فخر کرونگا، اور عیسائیون کی طرح جوگی بنانہ اختیار کرو،

صرف اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ رہبانیت کے خلاف متعدد دلائل قائم کئے:۔

۱۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رض کے متعلق جو عورت، خوشبو، اور تمام لذیذ چیزون کو اپنے اوپر حرام کرلینا چاہتے تھے، یہ آیت نازل ہوئی:۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تحرموا طیبٰت ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا انّ اللہ لا یحب المعتدین۔	مسلمانو! خدا نے جو پاکیزہ چیزین تمھارے لئے حلال کردی ہین، اون کو (اپنے اوپر) حرام نہ کرو، اور حد سے نہ بڑھو، کیونکہ خدا حد سے بڑھنے والون

(سنن نسائی)

اس آیت سے بہ تصریح ثابت ہوا کہ اسلام نے رہبانیت کی مخالفت اس بنا پر کی کہ وہ توسط اور اعتدال کے مخالف تھی، کیونکہ انسانی زندگی کا مقصد صرف عیش و عشرت نہیں ہے، لیکن اس معاملہ مین اس قدر حد سے بھی نہ بڑھ جانا چاہئے، کہ ہر خوشگوار اور لذیذ چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے، یہان تک کہ شراب کی طرح برف کا شربت بھی ناجائز ہو، اور اجنبی عورتون کی طرح اپنی عورت بھی اپنے اوپر حرام کر لیجائے،

۲- دوسری بات یہ ہے کہ رہبانیت کی بنیاد درحقیقت نفس کشی پر قائم تھی، یعنی بہت سے لوگون کا خیال تھا کہ انسان خدا کیلئے جسقدر دکھ اٹھاتا ہو، اوسی قدر خدا اوس سے خوش ہوتا ہے، لیکن رسول اللہ صلعم نے اس خیال کو غلط قرار دیا، چنانچہ ایک صحابی ایک سال آپ کی خدمت مین حاضر ہو کر واپس چلے گئے، دوسرے سال پھر حاضر خدمت ہوئے، تو صورت اس قدر بدل گئی تھی، کہ آپ نے اُن کو نہین پہچانا، اور اونھون نے خود اپنا تعارف کرایا، تو آپ نے فرمایا تمھارا رنگ روپ کیون بدل گیا، تمھاری صورت تو اچھی خاصی تھی، بولے جب سے آپ سے جدا ہوا رات کے سوا دن کو کبھی نہین کھایا، یعنی برابر روزے رکھے، فرمایا تم نے اپنی جان کو کیون دکھ دیا، ؟ پورے رمضان کا روزہ رکھو، اور ہر مہینے مین صرف ایک دن کا۔

۳- رہبانیت کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے، کہ انسان عبادت کی معمولی مقدار پر قناعت نہین کرتا، بلکہ اس قدر عبادت کرتا ہے، جو انسانی طاقت سے باہر ہوتی ہے، چنانچہ جن صحابیہ نے مسجد کے دونون ستونون کے درمیان ایک رسی باندھ رکھی تھی، جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تھین تو اس سے لٹک جاتی تھین، تاکہ نیند نہ آنے پائے لیکن رسول اللہ صلعم نے اس رسی کو کھلوا دیا، اور فرمایا کہ

لیصل احدکم نشاطہ فاذا فتر فلیقعد۔ یعنی جب تک آدمی چست و چالاک رہے اوس وقت تک نماز پڑھے اور جب تھک جائے تو بیٹھ جائے،

اس غیر معمولی عبادت کے بے نتیجہ ہونیکی ایک وجہ اور بتائی،

علیکم ما تطیقون من الاعمال یعنی تم لوگ صرف اوتنی ہی عبادت کرو جتنی کہ تمکو

فانّ اللہ لا یمل حتّی تملوا.	طاقت ہے، کیونکہ خدا ثواب دینے سے اوس وقت تک نہین تھکتا جب تک تم لوگ خود

ایک حدیث مین ہے، کہ جب کسی کو نماز پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے، تو اوس کو سو رہنا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے کہ استغفار کی حالت مین توبہ و استغفار کے بجائے وہ اپنے آپ کو گالیان دینے لگے،

اصل یہ ہے کہ دل پر اثر کسی کام کی کثرت کا نہین ہوتا، بلکہ مداومت کا ہوتا ہے یعنی جو کام ہمیشہ کیا جاتا ہے گو اوسکی مقدار کم ہو، وہی نتیجہ خیز ہوتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے، کہ

اِنّ اَحَبّ الاعمال ادومھا الی اللہ وان قل.	یعنی خدا کو وہی عبادت سب سے زیادہ پسند ہے، جو ہمیشہ کی جائے، گو وہ کم ہو،

رسول اللہ صلعم سے زیادہ عبادت گذار کون ہوگا؟ لیکن جب حضرت عائشہ رضؓ سے سوال کیا گیا، کہ رسول اللہ صلعم کو کون سی عبادت سب سے زیادہ پسند تھی، تو بولین کہ وہ جو ہمیشہ کیجائے؛ اسی اصول کی بنا پر اسلام نے کثرتِ عبادت اور کثرتِ ریاضت کو ناجائز قرار دیا، اور اسی چیز پر رہبانیت کی بنیاد قائم تھی

۴ - رہبانیت کی بنیاد ایک اور چیز پر بھی قائم ہے یعنی گوشہ نشینی اور مخلوق الٰہی سے علٰحدگی پر، اس لئے اصلی سوال یہ ہے کہ سوسائٹی سے الگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بہتر ہے، یا سوسائٹی مین شامل ہو کر رہنا افضل ہے،؟ اسلام نے دوسری صورت کو ترجیح دیا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے:-

انّ المسلم اذا کان یخالط النّاس و یصبر علی اذاھم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس و لا یصبر علی اذاھم.	جو مسلمان لوگون مین مل جل کر رہتا ہے، اور اون کی دی ہوئی تکلیفون پر صبر کرتا ہے؛ اوس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگون مین نہ تو مل جل کر رہتا ہے نہ اُن کی دی ہوئی تکلیفون پر صبر کرتا،

حکمائے اسلام نے فلسفۂ اخلاق پر جو کتابین لکھی ہین، اون مین بھی یہی ثابت کیا ہے کہ انسان

کے فضائل اخلاق کا ظہور صرف سوسائٹی میں رہنے سے ہوتا ہے، سوسائٹی سے الگ رہکر کوئی شخص محاسن اخلاق کا اظہار نہیں کرسکتا، چنانچہ ابن مسکویہ کتاب الطہارۃ میں لکھتا ہی کہ

"حکما کا قول ہے کہ انسان مدنی الطبع ہی یعنی وہ ایک ایسے شہر کا محتاج ہے، جسمیں بہت سے لوگ رہتے ہوں، تاکہ اوسکی انسانی سعادت مکمل ہوجائے، یہی وجہ ہی کہ انسان لوگوں کی دوستی، معاشرت اور اون کی سچی محبت کرنے پر مجبور ہے، کیونکہ یہ لوگ اوسکی ذات اور اس کی انسانیت کو مکمل کرتے ہین، اور وہ بھی اون کے لئے ایسا ہی کرتا ہے، پس جب یہ فطری ضرورت ٹھہری تو ایک عقلمند آدمی کیونکر تنہائی اور گوشہ نشینی کو اختیار کرسکتا ہے، اور ایسی حالت مین جو لوگ سوسائٹی سے الگ ہوکر پہاڑون کے غارون مین رہتے ہین، یا میدانون مین عبادت خانے بنا لیتے ہین، یا شہرون مین پھرا کرتے ہین، اون کو کوئی اخلاقی فضیلت بلکہ سرے سے انسانیت ہی نہین حاصل ہوتی، کیونکہ جو شخص سوسائٹی سے الگ رہتا ہے، اوس سے بہادری، سخاوت اور عدالت کوئی چیز ظاہر نہین ہوسکتی بلکہ اوس کے فطری قوا اور ملکات بالکل بیکار ہوجاتے ہین، اور اون کا رُخ خیر و شر کسی کی طرف نہین ہوتا، ایسی حالت مین یہ لوگ بمنزلہ جمادات اور مردون کے ہین، کہ وہ لوگ اپنی نسبت خود خیال کرتے ہین اور دوسرے لوگون کا بھی اُن کی نسبت یہی خیال ہوتا کہ وہ پاکباز اور عادل ہوتے ہین لیکن درحقیقت وہ پاکباز اور عادل نہین ہوتے یہی حال تمام اخلاقی فضائل کا ہے یعنی جب اس قسم کے لوگون سے برائیان نہین سرزد ہوتین، تو لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ یہ لوگ صاحب اخلاق ہین، حالانکہ اخلاقی فضائل ہیلی چیز نہین، بلکہ وہ افعال و اعمال ہین، جن کا ظہور تمام معاملات اور تمام اجتماعی کامون مین مشہور آدمیون کے سامنے اون کے گھرون مین ہوتا ہی"

اسی فلسفیانہ اصول کی بنا پر اسلام نے اجتماعی زندگی کو فضائل اخلاق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا اور راہبانہ زندگی کی تمام خصوصیات کے مخالف اخلاقی تعلیم دی، مثلاً راہبانہ زندگی کا نتیجہ یہ تھا کہ اعزہ و اقارب بلکہ ماں

باپ تک کی محبت دلون سے جاتی رہتی تھی، زندہ دلی اور خوش طبعی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا، لیکن اس کے مخالف اسلام نے اعزہ واقارب بالخصوص ماں باپ کے تعلقات کو نہایت اہم اور ضروری قرار دیا، چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا، کہ میری بہترین خدمت کا مستحق سب سے زیادہ کون ہے؟ فرمایا "تمھاری ماں" اوس نے کہا کہ پھر کون، فرمایا "تمھارا باپ"، عیسائی راہب عورتون سے سخت نفرت رکھتے تھے، لیکن اسلام نے عورتون کو زندگی کا نہایت ضروری جزو ٹھہرایا، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا:-

الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المرأة الصالحة۔ یعنی دنیا ایک پونجی ہے اور دنیا کی سب سے بہتر پونجی نیک عورت ہے۔

اور خانگی ضروریات اور معاشرتی تعلقات کے علاوہ، عورت کو شگفتگی خاطر، اور خوش طبعی کا ایک ذریعہ قرار دیا، چنانچہ ایک صحابی نے ایک شادی شدہ عورت سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ

فهلا تزوجت بکرا تضاحلك وتضاحکها وتلاعبك وتلاعبها۔ (بخاری) یعنی تم نے کنواری عورت سے شادی کیون نہین کی جو تم سے ہنسی مذاق کرتی اور تم اوس سے ہنسی مذاق کرتے، وہ تمھارے ساتھ کھیلتی، اور تم اوس

اولاد کی پرورش اور محبت کو بہت بڑی اخلاقی فضیلت قرار دیا، اور جو عورتین اولاد سے زیادہ محبت رکھتی تھین، خاص طور پر اون کی تحسین وستایش کی، چنانچہ فرمایا:-

خیر نساء رکبن الابل نساء قریش احناهن علی ولد فی صغره۔ عرب کی عورتون مین سب سے بہتر قریش کی عورتین ہین جو بچپن مین بچون سے بہت زیادہ محبت رکھتی ہین

ایک صحابی آپ کی خدمت مین اپنے بچے کو لیکر حاضر ہوئے، اور اوس کو چمٹانے لگے، آپ نے فرمایا، "تم کو اوس سے محبت ہے؟" بولے "ہان" فرمایا اس سے زیادہ تم سے ارحم الراحمین کو محبت ہے، بعض صحابہ ایسے تھے، جو اپنے تمام مال و دولت کو خدا کی راہ مین دے دینا چاہتے تھے، لیکن چونکہ اس سے اولاد کے حق

کو صدمہ پہنچتا تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے اون کو اس نیت سے باز رکھا، چنانچہ ایک صحابی نے اپنے مرض الموت مین آپ سے درخواست کی، کہ مین صاحب مال ہون اور میری وارث صرف ایک لڑکی ہے، کیا مین اپنے مال کا دو ثلث خیرات کر سکتا ہون؟ فرمایا نہین، اونھون نے کہا "تو آدھا"، فرمایا نہین صرف ایک تہائی" اور یہ بھی بہت ہے، اگر تم اپنے ورثہ کو دولتمند چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج اور بھیک منگا بنا کر چھوڑ جاؤ، تم خالصۃً لوجہ اللہ جو کچھ بھی صرف کروگے یہان تک کہ اپنی بی بی کے منہ مین اگر لقمہ بھی ڈالوگے تو تم کو اس کا ثواب ملے گا،

زندہ دلی اور خوش طبعی کی یہ کیفیت تھی کہ خود رسول اللہ صلعم کا معمول تھا، کہ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک مصلے پر بیٹھے رہتے تھے، اور اس حالت مین صحابۂ کرام زمانۂ جاہلیت کے واقعات بیان کرتے تھے، اشعار پڑھتے تھے، اور ہنستے تھے، اور آپ ان تذکرون کو سنکر مسکراتے تھے،

عید کے دن چھوٹے چھوٹے لڑکے اور چھوٹی چھوٹی لڑکیان آپ کے پاس جمع ہوکر باجے بجاتی تھین اور مسرت کے ترانے گاتی تھین، حدیث کی کتابون مین ہے کہ صحابۂ کرام مردہ دل اور خشک مزاج نہ تھے، بلکہ اپنی صحبتون مین اشعار پڑھتے تھے، اور جاہلیت کے واقعات کا تذکرہ کرتے تھے،

۲- راہبانہ زندگی کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انسان کھانے پہننے اور رہنے سہنے کے تمام پر لطف اور راحت رسان طریقون کو چھوڑ کر نہایت ادنی درجہ کی وحشیانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے، چنانچہ ایک راہب نے پورے ۴۰ سال جو کی روٹی اور گدلے پانی پر بسر کئے، ایک اور راہب سال بھر مین صرف ایک بار ایسٹر کے دن حجامت بنواتا تھا، نہ کبھی کپڑا بدلتا تھا، نہ اوس کو دھوتا تھا، یہانتک کہ وہ خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر جسم سے اوتر جاتا تھا، ایک اور راہب عمر بھر ایک تنگ و تار غار مین رہا، ایک اور بزرگ جنگل کی خاردار جھاڑیون مین رہتے تھے، اور سونے کیلئے کبھی نہین لیٹتے تھے، ایک راہب نے پچاس سال تک اپنے چہرہ یا پاؤن پر پانی کی چھینٹ تک پڑنے نہین دی، لیکن اسلام چونکہ اصولاً اس زندگی کا

مخالف تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے ہر موقع پر اس کی مخالفت کی، چنانچہ ایک بار بعض صحابہ نے اسی قسم کی راہبانہ زندگی بسر کرنے کا تہیہ کیا، اور ان میں ایک صاحب نے کہا کہ "مین بچھونے پر نہ سوؤنگا" رسول اللہ صلعم کو خبر ہوئی تو ایک عام تقریر کی جسمین فرمایا کہ لوگ ایسا کیون کہتے ہین، ؟ مین تو نماز بھی پڑھتا ہون اور سوتا بھی ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون، اور نکاح بھی کرتا ہون، تو جو شخص میرے طریقہ سے انحراف کرے گا، وہ مجھ سے الگ ہے، ایک صحابی کہتے ہین، کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہتے تھے، اور پانی برستا تھا، تو ہمارے جسم سے بھیڑ اور بکری کی بو آتی تھی، یعنی چونکہ صحابہ غربت و افلاس کی وجہ سے بھیڑ بکری کے اون کا کپڑا پہنتے تھے، اس لئے جب اون پر بارش کے چھینٹے پڑتے تھے، تو اُن سے بھیڑ بکری کی بو آتی تھی، یہ ایک قدرتی رہبانیت تھی، جس کو آسانی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا تھا لیکن اسلام چونکہ اصولاً راہبانہ زندگی کا مخالف تھا، اس لئے اوس نے اس ناگوار حالت مین تغیر پیدا کیا، اور رسول اللہ صلعم نے ہر جمعہ کو غسل کرنا، اور خوشبو لگانا واجب یا کم از کم سنت قرار دیا، لیکن یہ غسل کیون ضروری قرار دیا گیا، اس کی وجہ خود صحابہ کی زبان سے سننا چاہیے،

حضرت عبد اللہ بن عباس رض بیان فرماتے ہین، کہ صحابۂ کرام سخت تنگدست تھے، کمل کے کپڑے پہنتے تھے، اپنی پیٹھ پر بوجھ لادتے تھے، اور اون کی مسجد نہایت تنگ اور اوس کی چھت نہایت پست تھی یعنی اوپر چھت کی جگہ صرف ایک چھپر تھا، ایک روز رسول اللہ صلعم نماز جمعہ کیلئے مسجد مین آئے، دن نہایت گرم تھا، لوگون کو کمل کے کپڑے مین پسینہ آیا تو اُن کے بدن سے اس قدر بو پھیلی کہ سب کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلعم کو بو کا احساس ہوا تو فرمایا کہ لوگو جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور جہان تک ممکن ہو، عمدہ تیل اور عمدہ خوشبو لگاؤ، صرف جمعہ ہی کی تخصیص نہین بلکہ آپ صفائی اور ستھرائی کو عموماً بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور لوگون کو مہذب صورت مین رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اوس کے بال بکھرے ہوے ہین، نہ تو اوس نے تیل لگایا ہے، نہ کنگھی کی ہے، فرمایا کیا اس کو بالون کے

سلجھانے اور ہموار کرنے کا سامان میسر نہین، ایک اور شخص کو دیکھا کہ نہایت گندہ اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہو، فرمایا کیا اوس کو پانی نہین ملتا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھوئے، ایک اور صحابی کہتے ہین، کہ مین رسول اللہ صلعم کی خدمت مین نہایت معمولی درجہ کے کپڑے پہنکر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کیا تمھارے پاس مال ہے؟ اونھون نے کہا ہان، فرمایا کس قسم کا مال ہے، بولے خدا نے مجھکو اونٹ، بکریان، گھوڑے، غلام سب کچھ دیا ہے، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے احسان کے نشانات تمھارے جسم سے ظاہر ہونے چاہئین، یعنی تم کو اپنی حیثیت کے موافق کپڑے پہننے چاہئین،

جسمانی طہارت و پاکیزگی، بلکہ جسمانی زیب و زینت کی چند معمولی چیزین ایسی ہین، جو متمدن اور وحشیانہ زندگی کے درمیان حد فاصل ہو سکتی ہین، اور اون کی پابندی مین بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ بھی صرف نہین ہوتا، لیکن راہب اور سنیاسی لوگ چونکہ ہر ممکن طریقہ سے زیب و زینت کی چیزون سے احتراز کرتے ہین، اس لئے ان کی پابندی کو مذہبی زہد و تقشف کے خلاف سمجھتے ہین، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی شکل و صورت نہایت وحشیانہ ہو جاتی ہے، اور صفائی و پاکیزگی ان کو چھو بھی نہین جاتی لیکن اسلام چونکہ دنیا کو وحشیانہ حالت سے نکالنے اور تہذیب و شایستگی کے پھیلانے کیلئے آیا تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے ان چیزون کو خصال الفطرۃ کا لقب دیا اور فرمایا، کہ "دس باتین فطرت مین محسوب ہین" یعنی مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک مین پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیون کی بیچ کی جگہ کو دھونا، بغل اور زیر ناف کے بال منڈوانا، منہ مین پانی ڈال کر کلی کرنا، اور استنجا کرنا، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ دین فطرت کے بانی اول یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ان باتون پر عمل کر کے خدا سے دریافت کیا، کہ یہ کیا ہے،؟ جواب ملا کہ "وقار" فرمایا تو خداوندا میرے وقار کو اور بڑھا، ان تعلیمات کو پیش نظر رکھکر اگر وحشیون، سنیاسیون، سادھوؤن اور راہبون کی جسمانی حالت پر نظر ڈالی جائے، تو صاف معلوم ہوگا کہ ان لوگون نے دنیا مین رہبانیت اور سنیاس کے نام سے کسقدر

غلاظت نجاست، گندگی، بلکہ وحشت پھیلا رکھی تھی، لیکن اسلام نے رہبانیت کا خاتمہ کرکے انسانیت کے چہرے کو کس قدر نازک لطیف اور روشن کردیا، لیکن ان تعلیمات کے ساتھ اسلام نے انتہا درجہ کی نمایش اور آرایش کی بھی ممانعت کی ہے، چنانچہ حضرت فضالہ بن عبیدؓ مصر کے گورنر تھے، لیکن ان کی یہ حالت تھی، کہ ایک دوسرے صحابی اون سے ملنے کیلئے گئے، تو دیکھا کہ اون کے بال بکھرے ہوے ہین، وجہ پوچھی تو بولے کہ رسول اللہ صلعم ہم لوگون کو بہت زیادہ عیش پرستی سے منع فرماتے تھے، سر سے اوتر کر پاؤن پر نظر پڑی تو دیکھا کہ پاؤن مین جوتا نہین ہے، بولے آخر ایسا کیون ہے،؟ فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤن رہا کرین، اس لئے رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیمات کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے، جو راہبانہ اور جوگیانہ زندگی سے ملتا جلتا ہے،

چنانچہ ایک بار آپ کے سامنے صحابۂ کرام نے دنیوی عیش و عشرت کا ذکر کیا تو فرمایا کہ کیا تم لوگ نہین سنتے ؟ کیا تم لوگ نہین سنتے،؟ پھٹے حال مین رہنا ایمان کا ایک جزو ہے، ایمان کا ایک جزو ہے، ایک حدیث مین ہے کہ خدا نے تم کو جو کچھ دیا ہے، اوس پر خوش رہو، تو سب سے زیادہ دولتمند سمجھے جاؤگے اور بہت زیادہ نہ ہنسو، کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے، ایک صحابی سے آپ نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت مین سے صرف ایک خادم اور ایک سواری جس پر سوار ہو کر تم جہاد کرسکو، کافی ہے، ایک حدیث مین ہے کہ کھیتی باڑی نہ کرو، اس سے تمھارے دلون مین دنیا داری کا میلان پیدا ہوگا،

ایک حدیث مین ہے کہ اگر تم لوگ خدا پر اچھی طرح توکّل کرو تو تم کو روزی اوسی طرح ملے گی، جس طرح چڑیون کو ملتی ہے، کہ صبح کو خالی پیٹ جاتی ہین اور شام کو پیٹ بھر کے آتی ہین،

ایک حدیث مین ہے، کہ مجھکو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے، جو گمنام ہو، اور تھوڑی سی روزی رکھتا ہو اور اسی پر قناعت کرے، ایک صحابی نے آپ سے کہا کہ مین آپ کو محبوب رکھتا ہون، فرمایا ذرا سوچ سمجھ کے کہو، اونھون نے کہا، خدا کی قسم مین آپ کو محبوب رکھتا ہون، فرمایا اگر تم مجھے محبوب رکھتے ہو، تو فقر و فاقے

کیلئے تیار ہوجاؤ، کیونکہ جوشخص مجھکو محبوب رکھتا ہے، اسکی طرف احتیاج سیلاب کی طرح بڑھتی ہے،
ایک حدیث مین ہے کہ جنت مین میرے حوض پر پہلے فقرائے مہاجرین اترین گے، جن کے سرون کے بال پریشان اور کپڑے میلے ہین، جو نازپرورده عورتون سے نکاح کرنے کی صلاحیت نہین رکھتے، اور جب کسی کے دروازے پر جاتے ہین، تو اون کو اندر آنے کی اجازت نہین ملتی" ایک حدیث مین ہے کہ جو شخص باوجود استطاعت کے محض خاکساری سے عمده لباس کا پہننا ترک کردے گا، خدا اوس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اوس کو اختیار دے گا، کہ اہل ایمان کے حلون مین سے جو حلہ چاہے پہن لے،، اسی قسم کی اور بھی بہت سی حدیثین ہین، اور ان حدیثون سے پہلے زیب و زینت اور صفائی و پاکیزگی کے متعلق جو حدیثین نقل کیگئی ہین، بظاہر اون کے مخالف ہین، لیکن درحقیقت ان حدیثون مین کسی قسم کا اختلاف و تناقض نہین ہے، چنانچہ شاه ولی اللہ صاحب ان دونون قسم کی حدیثون کو نقل کر کے لکھتے ہین، کہ

"ان دونون قسم کی حدیثون مین کوئی اختلاف نہین ہے، کیونکہ اس جگہ درحقیقت دو مختلف چیزین ہین، جو بظاہر مشتبہ معلوم ہوتی ہین، لیکن ان مین ایک چیز تو مقصود ہے اور دوسری مذموم، جو چیز مقصود ہے وہ بخل کا چھوڑنا ہے، لیکن انسانی مدارج کے اختلاف سے بخل مین بھی اختلاف ہوجاتا ہے، مثلاً بادشاہون کیلئے جو چیز بخل مین داخل ہے، وہ ایک فقیر کے حق مین بعض اوقات فضول خرچی مین داخل ہوجاتی ہے، دوسری جو چیز مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ بدوؤن اور وحشیون کی عادتین نہ اختیار کیجائین، بلکہ صفائی، پاکیزگی اور عمده عادتون کی خو ڈالی جائے، لیکن جو چیز مذموم اور بری ہے وہ یہ ہو کہ تکلف، نمایش، اور کپڑون پر فخر کرنے مین بہت زیاده مبالغہ نہ کیاجائے، اور محتاجون کی دلشکنی نہ ہونے پائے، اس قسم کی اور بھی بہت سی باتین ہین، اور حدیث کے الفاظ مین ان باتون کی طرف اشارات پائے جاتے ہین،

(باقی)

اغلبیون کا عدالتی نظام

از

سید ریاست علی ندوی،

اغلبیون کی حکومت، افریقیہ مین ۱۸۴ھ ۸۰۰ء سے ۲۹۶ھ ۹۰۹ء تک رہی، اس حکومت کے قیام سے پیشتر افریقیہ، مرکزی حکومت بغداد کے ایک ماتحت صوبہ کی حیثیت سے تھا، جس پر مصر کی حفاظت کے خیال سے قبضہ رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا، اور اسی لئے خزانۂ مصر سے ایک لاکھ سالانہ کی رقم یہان فوجی نظم ونسق برقرار رکھنے کے لئے خرچ کی جاتی تھی،

جب ۱۸۴ھ مین ابراہیم بن اغلب اس صوبہ کا والی بنایا جانے لگا، تو اوس نے افریقیہ کو ایک آزاد صوبہ کی حیثیت مین لانے کیلئے اس رسم کو ترک کرنا چاہا، اور خلیفہ ہارون رشید سے استدعا، کی کہ مصر کے خزانے پر ولایت افریقیہ کا بار نہ ڈالا جائے، مزید بران خود حکومت افریقیہ سے سالانہ چالیس ہزار دینار قبول کئے جائین، ہارون رشید نے یہ تجویز خوشی سے منظور کر لی، اوس وقت سے افریقیہ مین گویا ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی، جس کا بانی یہی ابراہیم بن اغلب تھا، اوس کے بعد افریقیہ کی یہ حکومت اسی کے خاندان مین متوارث رہی، یہان تک کہ اسماعیلیون نے ۲۹۶ھ مین اس کا خاتمہ کیا،

دولت اغلبیہ کا نظام حکومت اون مختلف شعبون مین تقسیم تھا، جو اوس عہد مین متمدن حکومتون کیلئے ضروری سمجھے جاتے تھے، چنانچہ عدالت وقضا کا صیغہ بھی اون کے نظام حکومت مین جداگانہ قائم تھا، اگرچہ ہماری سنہ وار تاریخون مین اس کا کوئی مستقل تذکرہ نظر نہین آتا تاہم کچھ ان کتابون مین اور زیادہ تر افریقیہ کے علماء و ارباب فضل

کے سوانح حیات، وتراجم مین اس صیغہ کی تفصیلات کے نشانات ملتے ہین جن سے اس کے متعلق ایک سرسری اندازہ ہوجاتا ہی،

قضاۃ کا تقرر افریقیہ مین دولت اغلبیہ کے قیام سے پیشتر تک قضاۃ افریقیہ کا تقرر براہ راست خلفای عباسیہ کرتے تھے، چنانچہ جب پہلا اغلبی والی ابراہیم اپنے عہدہ پر آیا، تو اسوقت عہدۂ قضار پر عبداللہ بن غانم سرفراز تھے، اور انھین خود ہارون رشید نے اس عہدہ پر مامور کیا تھا، (معالم الایمان ج ۱ ص ۲۱)

پھر جب اغلبی حکومت قائم ہوئی، تو قضاۃ کے تقرر کا حق خلفائے عباسیہ سے منتقل ہوکر اغلبی فرمانروا کو حاصل ہوگیا، چنانچہ عبداللہ بن غانم کی وفات سے جب یہ جگہ خالی ہوئی، تو خود فرمانروائے افریقیہ ابراہیم بن اغلب نے اپنے اختیار سے قاضی ابو محرز کو یہ عہدہ سپرد کیا، (معالم ج ۲ ص ۱۹) اغلبی فرمانروا کا یہ نامزد قاضی ساری حکومت کیلئے قاضی القضاۃ ہوتا، جس کا لقب بالعموم "قاضی افریقیہ" ہوتا، اور کبھی "قاضی قیروان" (دارالسلطنت) بھی کہا جاتا، اور یہی "قاضی افریقیہ یا قاضی قیروان" اغلبی حکومت کے محکمۂ "دیوان القضاء" کا افسر اعلیٰ ہوتا،

دیوان القضار

دیوان القضار مین حسب ذیل تقسیم کا پتہ چلا ہے، دفتر دار القضا، مجلس قضا، قضاۃ صوبہ جات و ولایت، دیوان المظالم اور دار الافتار، دیوان القضار کی اصطلاح کا اطلاق ان سب کے مجموعہ پر ہوتا تھا،

دفتر دار القضار و مجلس قضار، دیوان القضا، کا صدر دفتر جامع قیروان مین تھا، اور یہین مجلس قضا، بھی ہوتی تھی،

عمال دفتر اپنے اپنے مشاغل کے لحاظ سے "کاتب" صاحب و ثائق" "حجاب" وغیرہ کہلاتے، موخر الذکر، موجودہ اصطلاحات کے روسے، گویا موجودہ کچہریون کے کلرک" منشی" "پیشکار" اور چپراسی ہین،

یہ "کاتب" اور "صاحب وثائق" اپنے زمانہ کے ممتاز اہل علم مین ہوتے تھے، علوم دینیہ، فقہ (قانون اسلامی) اور ادب پر انھین عبور حاصل ہوتا، مثلاً ابن عذاری حوادث ۲۹۵ھ مین لکھتا ہے،

اسی سال ابو عقال بن خیر فقیہ نے بھی انتقال کیا، وہ اہل عراق (احناف) کے مذہب کے پیرو تھے، اور ابن عبدون کے زمانہ مین اون کے کاتب، (کلرک) تھے، (ابن عذاری ترجمہ اردو ص ۲۰۰)

اسی طرح ایک "صاحب وثائق" کی وفات کے موقع پر لکھتا ہے،

اسی سال (۳۱۹ھ) احمد بن احمد بن زیاد الفارسی **صاحب وثائق** نے قیروان مین وفات پائی، یہ صاحب علم و فضل تھے، عیسیٰ بن مسکین (قاضی القضاۃ افریقیہ) کے زمانہ مین احکام و مراسلات کی کتابت ان کے ذمہ تھی، وثائق، شروط، اور مواقیت صلوٰۃ کے متعلق ان کی تصنیفات بھی ہین، (ر ص ۲۸۶)

مجلس قضا کا اجلاس ابتدائے عہد سے قاضی ابو محرز (۱۹۱ھ ۱۴۳ھ) کے ابتدائی زمانہ تک اسی جامع قیروان مین ہوتا رہا، کچھ دنون کے بعد وہ جامع مسجد کے بجائے اپنے گھر ہی پر مقدمات کی سماعت کرنے لگے، (معالم الایمان ج ۲ ص ۲۰، ۲۳) پھر انھی کے عہد مین اسی عہدہ پر مساوی اختیارات کے ساتھ قاضی اسد بن فرات بھی بعض وجوہ سے مامور کئے گئے، اونھون نے حسب سابق اپنے اجلاس کیلئے جامع قیروان ہی کو منتخب کیا (ر ص ۲) اور پھر جب امام سحنون کا زمانہ (۲۳۴ھ ۲۴۰ھ) آیا، تو اونھون نے بھی اسی قدیم مقام کو دار القضا قرار دیا، اور اس کے بعد یہی مقام عہد آخر تک دار القضا رہا،

امام سحنون نے اپنے عہد مین مسجد ہی کے احاطہ مین عدالت کیلئے ایک مستقل عمارت تعمیر کرائی اور اسی مین اجلاس کرنے لگے، عمارت کے صدر دروازہ پر دربان ہوتے، جو اشخاص متعلق مقدمہ کے بجز کسی کو اندر نہ جانے دیتے، عدالت کی یہ عمارت بعض تاریخی روایات کی بھی دلچسپ مثال بن گئی، چونکہ

اس کے تعمیر کرانے والے امام سحنون مالکی المذہب تھے، اور اونھون نے دمشق و بغداد کی روایات کے برخلاف اپنی ذاتی راے سے عدالت کیلئے ایک مستقل عمارت اگرچہ وہ صحن مسجد ہی مین کیون نہ ہو، بنوائی تھی، اس لئے یہ احناف اور مالکیہ کا ایک اختلافی مسئلہ بن گیا، احناف کے پیش نظر غالبًا قضاۃ بغداد کا طرز عمل تھا، وہان بھی قاضی القضاۃ ہمیشہ پایہ تخت کی مسجد جامع مین اجلاس کرتا رہا، اس لئے اون کے نقطۂ نظر سے اس جداگانہ عدالتگاہ کی ضرورت نہین تھی، چنانچہ افریقیہ کی اس عمارت کے ساتھ یہ پیش آیا کہ امام سحنون کے بعد جو قضاۃ افریقیہ مالکی المذہب مقرر ہوئے وہ اسی مین اپنا اجلاس کرتے رہے، لیکن جب کوئی حنفی المذہب قاضی مقرر ہوتا تو اس عمارت کو منہدم کرادیتا، اور پھر جب کوئی مالکی قاضی آجاتا تو اس کو از سر نو تعمیر کراتا، معالم مین ہے،

وكان يجلس في بيت في الجامع بناه لنفسه اذ رای كثرة الناس وكثرة كلامهم فكان لا يحضر عنده غير الخصمين ومن يشهد بينهما وكانت قضاة المالكية يحكمون فيها بعده واذا ولی عراقی هدمها واذا ولی مدنی بناها.

(۲ ص ۵۰)

اور وہ (امام سحنون) جامع مسجد کی ایک عمارت مین اپنا اجلاس کرتے تھے، جسکو خود اونھین نے تعمیر کرایا تھا، کیونکہ اونھین سماعت مقدمہ کے وقت لوگون کی کثرت اور ان کی زیادہ گفتگو سے تکلیف محسوس ہوئی، چنانچہ اس کے بعد اون کے سامنے مدعی مدعا علیہ اور اون کے گواہون کے سوا اور کوئی حاضر نہ ہوسکتا تھا، اور مالکی قضاۃ اون کے بعد اسی عمارت مین اجلاس کرتے رہے، اور جب کوئی حنفی قاضی آجاتا تو اس کو منہدم کرادیتا، پھر جب کوئی مدنی قاضی مقرر ہوتا،

عدالت مین قاضی القضاۃ کی معیت مین چار دیگر فقہا بھی سماعت مقدمہ کے وقت مشورہ کیلئے بیٹھا کرتے تھے، جسے دورِ حاضر کی اصطلاح مین ججون کی بنچ "یا "اسیسرون کی جماعت" کے الفاظ سے تعبیر کر سکتے ہین، اگرچہ ان فقہاء کی حیثیت کسی قدر ان سے مختلف تھی، ان فقہاء کو قضاۃ خود اپنے ساتھ بٹھاتے اور وہ مقدمہ کی مالہ وماعلیہ کی سماعت کرتے، مقدمہ کی سماعت کے بعد قاضی ان سے نقد و نظر کے ساتھ بحث و گفتگو کرتا، جب سب کی رائین اور دلیلین معلوم ہو جاتین، تو مقدمہ کا کوئی فیصلہ کیا جاتا، اس لئے فقہاء کی یہ جماعت نہ تو "ججون کی بنچ" سے کلیتہً مطابق ہے، کہ انھین حق قضاءت حاصل نہ تھا، اور نہ انھین اسیسرون کی جماعت کہا جا سکتا ہے، کہ دورِ حاضر مین کم از کم ہندوستان کی عدالتون مین اسیسرون کا انتخاب علم وفضل کے اعتبار کے بجائے مالیہ کی کثرتِ ادائی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف یہ چارون فقہاء اپنے علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز ہوتے تھے اور قاضی کے ساتھ کسی خاص قسم کے مقدمون مین شرکت کرنے کے بجائے جیسا کہ اسیسرون مین ہوتا ہے، اون تمام مقدمون مین شریک سماعت رہتے جو قاضی کی عدالت مین دائر ہوتے تھے، معالم مین قاضی حماس بن مروان کے متعلق ہے،

واجلس معہ من الفقہاء اربعۃ	اور اپنے ساتھ چار فقہاء موسیٰ ابن القطان، ابو
موسی ابن القطان وابا عبد اللہ	عبد اللہ الضراب اور عبد الرحمن الورقہ۔۔۔۔۔ کو
الضراب وعبد الرحمن الورقۃ ۔۔۔	بٹھایا، اور اون سے درخواست کی، کہ اون
و۔۔۔۔۔ وسالھم ان ینظروا مایرد	کے اجلاس مین جو مقدمات زیر سماعت ہون
فی مجلسہ ولا یحکم بین خصمین	حاضر رہ کر اون پر غور کرین، اور اون سے
حتی یناظرھم فی قضیتھما (۲ ص ۲۲۴)	جب تک فریقین کے قضیہ پر تبادلہ خیال نہ

(مرکز کے بغیر خود فیصلہ نہ کرے)

عورتون کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک خاص دن

بعض قضاۃ افریقیہ نے عورتون کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک خاص دن مقرر کر دیا تھا، جسمین صرف عورتون کے مقدمات سُنے جاتے تھے، اجلاس مین صرف قاضی

بیٹھتا، حاجب اور دربان اور پیشکار تک مجلس سے رخصت کر دیئے جاتے، قاضی ابو محرز کے سوانح حیات میں مذکور ہے،

وکان ابو محرز یجلس الخصوم فی دارہ ویجعل للنساء یوما عند باب دارہ،	ابو محرز مقدمات اپنے گھر پر کرتے تھے اور انھون نے عورتون (کے مقدمات) کیلئے ایک خاص دن مقرر کر دیا تھا، اوس دن وہ اپنے مکان کے دروازے کے پاس اجلاس کرتے تھے،
(معالم ج ۲ صـ۲۳)	

اسی طرح قاضی عبد اللہ بن غانم کے تذکرہ مین ہے،

کان یجلس للنساء یوما وتعلہ المالکی عن ابی محمد عبد اللہ بن ابی زید عن عبد اللہ بن سعید ابن الحداد عن ابیہ وزاد وکان یزیل الکتاب والحجاب من بین یدیہ فی ذالک الیوم الذی یحکم فیہ للنساء،	(عبد اللہ بن غانم) ایک خاص دن عورتون کے مقدمات سننے کیلئے بیٹھتے تھے، اس کا تذکرہ مالکی نے ابو محمد عبد اللہ بن ابی زید سے اور انھون نے سعید سے اور سعید نے اپنے باپ حداد سے نقل کیا ہے، اور یہ بھی اس پر مستزاد بتایا ہے، کہ جس دن عورتون کے مقدمے سننے بیٹھتے اوس دن اپنے پاس سے پیشکارون اور دربانون کو علٰحدہ کر دیتے تھے،
(ایضاً ج ا صـ۲۲)	

مہر عدالت عدالت کی مہر قاضی کی انگوٹھی مین ہوتی، عدالت کی تمام تصدیقون کا مدار اسی انگوٹھی پر ہوتا، اس لئے اس انگوٹھی کو قضاۃ کسی وقت جدا نہین کرتے تھے، اور اس کی حفاظت قاضی کے فرائض منصبی مین سمجھی جاتی تھی، فرمانروایانِ اغالبہ بھی اس کی نگرانی رکھتے تھے، کہ اس مہر کی پوری حفاظت ہوتی رہے، اس سلسلہ مین قاضی ابو محرز کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ معالم مین نقل ہے،

قاضی ابو محرز کی طبیعت کسی قدر شکی واقع ہوئی تھی، وہ جب تک وضو کرنے مین پانی خوب نہ بہالیتے اون کی تشفی نہ ہوتی، اس لئے وضو کرتے وقت انگوٹھی کو پہنے رہنا اون کیلئے دشوار تھا، وضو کے وقت اُن کی انگلی خالی دیکھکر لوگون کو دربردہ شکوک پیدا ہوے، اور کسی نے افواہًا فرمانروا ے افریقیہ ابراہیم بن اغلب تک یہ شکایت پہنچا دی کہ وہ وضو کے وقت انگوٹھی اوتار کر گھر مین رکھدیتے ہین، گھر کی عورتین موقع پاکر جس پر چاہتی ہین، مہر لگا لیتی ہین، ابراہیم کو یہ سنکر جستجو ہوئی، چنانچہ ایک دن قاضی ابو محرز وضو کرنے مین مصروف تھے، کہ ابراہیم کے دو خدام خاص اچانک آپہنچے، اور اون سے برجستہ سوال کیا، کہ "امیر دریافت فرماتے ہین کہ اس وقت آپ کی انگوٹھی کہان ہے"؟ قاضی ابو محرز اپنا وضو جاری رکھتے ہوے اپنا ایک ہاتھ گردن کے پاس لیگئے، اور سینے پر سے ایک ڈورا اوٹھا کر دکھائی اور کہا "یہ دیکھو ڈورے مین بندھی ہوئی میری گردن مین لٹکی ہے" (معالم ج ۲ ص ۲۴)

قضاۃ صوبہ جات و ولایت،	قاضی القضاۃ افریقیہ، افریقیہ کی دوسری ولایتون اور صوبون کیلئے قاضی مقرر کرتے تھے، چنانچہ افریقیہ کی مختلف ولایتون صقلیہ، طرابلس، اور زاب وغیرہ کے قضاۃ انھی کے مقرر کردہ ہوتے

ان قضاۃ کا کبھی کبھی تبادلہ بھی ہوتا، اور انھین معزول بھی کرنے کا اختیار تھا، ولایتون کی قضاۃ سے مراد ساری ولایت کی قضاۃ تھی، مثلاً ابو العباس اسحٰق بن ابراہیم ازدی کے سوانح مین ہے،

ولی قضاء الزاب لعیسی بن مسکین	عیسی بن مسکین (قاضی القضاۃ) کے عہد مین
ثم ولاہ حماس قضاء طرابلس	زاب کے قاضی مقرر ہوے، پھر انھین حماس نے
وکان عدلا فی احکامہ واراد	طرابلس کی قضاۃ پر مامور کیا، یہ اپنے فیصلون
بالزاب ای وسائر عمالۃ لقول	مین عدل وانصاف کرتے تھے، اور "زاب"
التیجی ولی قضاء الزاب وطبنۃ وباغایۃ	سے مراد اس کا پورا صوبہ ہے، کیونکہ تیجی کا بیان
لعیسی بن مسکین ایام ابراہیم بن احمد	تصریح سے ہے، کہ زاب، طبنہ اور باغایہ کی قضاۃ

وولاہ حماس القضاء ایام زیادۃ اللہ قضاء اطرابلس. (معالم ج ۲ ص ۲۷)	عیسیٰ بن مسکین کی طرف سے ابراہیم بن احمد کے عہد حکومت میں ملی، اور حماس نے ان کو زیادۃ اللہ کے زمانہ میں طرابلس کا قاضی مقرر کر دیا،

ولایت کے یہ قضاۃ اپنے صوبہ کے دیوان القضاء کے افسر اعلیٰ ہوتے، ان کے یہاں بھی عمال دفتر علیحدہ ہوتے، اور یہ خود اپنے صوبہ کے مختلف شہروں کیلئے قاضی مقرر کرتے، اور ان کے عزل و نصب کا اختیار انھی کو ہوتا،

ولایتوں کے قاضیوں کی اگر شکایتیں ہوتیں، تو وہ قاضی القضاۃ تک پہنچتیں جنکی یا تو وہ تحقیقات کرتے، یا اگر بے محل شکایتیں ہوتیں تو رد کر دیتے،

دیوان نظر المظالم نظر المظالم کا علیحدہ محکمہ اسی دیوان القضاء کے ماتحت قائم تھا، اس میں دو قسم کے مقدمات پیش ہوتے، ایک تو عمال و کارپردازان حکومت کی زیادتیوں کی وہ شکایتیں اس میں سنی جاتیں جو اون سے اپنے عہدہ کے فرائض کی انجام دہی میں سرزد ہوتیں، دوسرے بازار کے معاملات خرید و فروخت لین دین، ناپ تول، اور بیع و شرا میں جو زیادتیاں اور اختلافات ہوتے، اون کی داد رسی اور فیصلے کئے جاتے، اور شہر کی آبادی والے، اپنے کسی حق سے تجاوز کرتے تو اون کی گرفت ہوتی، یا کوئی ایسے فعل کا مرتکب ہوتا جو شہر کے باشندوں کی تکلیف کا باعث ہوتا تو بھی اوس کی گرفت ہوتی،

اس صیغہ کی پہلی قسم کے کاموں کے متعلق بالعموم مورخین اسلام نے تذکرہ کیا ہے، دوسری قسم کے کاموں کی تفصیل ذیل کے اقتباس سے ہو گی، معالم میں ابو القاسم محمد بن محمد بن خالد القیسی المعروف بہ طرزی کے سوانح حیات میں ہے،

وولاہ عیسیٰ بن مسکین علی مظالم القیروان وولاہ حماس بعدہ عشر	انھیں عیسیٰ بن مسکین نے مظالم قیروان پر مقرر کیا، پھر حماس نے انھیں قضارت سپرد کی،

سنین ... المراد بالمظالم احکام السوق (جلد ۳ ص ۸) سال تک اور مظالم سے مراد بازار کے احکام ہیں'

طرزی نے بازار میں بڑی خوبی سے نظم و ضبط قائم کیا، چنانچہ صاحب معالم کا بیان ہے،

لم یل اسواق القیروان قبلہ اضبط منہ۔ قیروان کے بازاروں میں اس سے پہلے کسی نے اسقدر ضبط و نظم قائم نہیں کیا،

چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ اپنے عہدے پر سرفراز تھے، قیروان کے بازار میں گذر رہے تھے ایک مقام پر جامع مسجد کے سامنے بڑی مقدار میں پانی بہتا نظر آیا جس سے راستہ کی آمد و رفت میں زحمت پیش آ رہی تھی، یہ فوراً وہیں رک گئے، تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ امام جامع مسجد کا یہ فعل ہے، اُن کے کوئیں میں چوہیا گر گئی ہے، بلا کر دریافت کیا، اور راستہ کی آمد و رفت روکنے کے جرم میں اس عظیم المرتبت شخصیت کو بھی قید خانہ بھیج دیا، جب ظہر کی نماز کا وقت آیا، لوگوں کو امام کی تلاش ہوئی، اور لوگ ان کے پاس سفارشی بن بن کر آنے لگے، کہ جرم سے چشم پوشی کیجائے، اور اون کو رہا کر دیا جائے، آخر انھیں قید خانہ سے نکالنے کا حکم دیا، جب سامنے آئے تو کہا "اگر تم امام نہ ہوتے، اور لوگ تم سے مستغنی ہوتے، تو میں تمھیں قید سے باہر نہ نکالتا،، (معالم ج ۳ ص ۸)

اسی لئے محکمۂ مظالم کا یہ عہدہ معزز عہدوں میں شمار ہوتا، اور ممتاز اہل علم اس پر سرفراز کئے جاتے تھے، چنانچہ قیروان کے محکمۂ مظالم پر حبیب بن نصر تمیمی (۲۲۷ھ) ابو العباس بن خداش تمیمی الفقیہ متوفی ۲۹۶ھ ابو العباس احمد بن ابراہیم بن احمد بن اغلب (۲۷۳ھ) وغیرہ جیسے ممتاز فقہاء کے نام ملتے ہیں، (ابن عذاری ترجمہ اردو ص ۱۴۹، ۱۶۶، ۲۰۰،)

محکمۂ مظالم میں جو فقہا، و قضاۃ عہدیدار تھے، اون کے مناصب مقرر تھے، اونکے محدود و متعین اختیارات کے لحاظ سے اوسی نوعیت کے مقدمات اون کی عدالت میں دائر ہوتے تھے، یعنی استغاثہ میں مالیت کی تعداد و مقدار کے لحاظ سے ان قضاۃ کو مقدمات کی سماعت کا حق حاصل تھا، قاضی ابو الربیع سلیمان

بن سالم کندی المعروف بابن کحالہ، عیسیٰ بن مسکین کے عہد میں قیروان کے محکمہ مظالم میں تھے۔ ان کے متعلق تصریح ہے:۔

ولاه ابن طالب قضاء باجه و اعمالها	ابن طالب نے انھیں باجہ اور اوس کے صوبہ
وولاه عیسی بن مسکین مظالم	کا قاضی مقرر کیا، اور پھر عیسیٰ بن مسکین نے
القیروان واذن له ان ینظر فی مائة	انھیں مظالم قیروان پر مامور کیا، اور
دینار (معالم ج ۲ ص ۱۳۱)	اجازت دی کہ سو دینار تک (کے مقدمات)

محکمہ افتاء صیغۂ افتاء بھی دیوان القضاء کے ماتحت تھا، مفتی شہر کا تقرر بھی قاضی القضاۃ کرتا جس کے فتاوے شرعی مسائل میں نافذ ہوتے، مفتی کا انتخاب قضاۃ چھان بین کے بعد کرتے، اور تقرر سے پہلے امتحان لے کر تشفی کر لیتے، مثلاً قاضی عبد اللہ بن طالب کے عہد میں محمد بن سحنون افتاء کی خدمت انجام دیتے تھے، اون کی وفات کے بعد فقیہ ابو العباس اس خدمت کو انجام دینے بیٹھے، مگر ابن طالب نے انھیں اس سے روک دیا، اور پہلے اون کی آزمایش کی، اسکے بعد اجازت عطا کی، معالم میں ہے:

ولما مات محمد بن سحنون جلس ابو	محمد بن سحنون کی وفات کے بعد ابو العباس افتاء
العباس للفتیا فانکر عبد اللہ بن	کی خدمت انجام دینے بیٹھے، مگر قاضی عبد اللہ
طالب القاضی ثم بعث الی ابی	بن طالب نے اونھیں اس خدمت سے روک دیا،
الفضل السوسی ان یختبره فالقی	اور ابو الفضل سوسی کو اونکے امتحان کیلئے روانہ
علیه کتاب القراض فاجاب عنه	کیا، چنانچہ وہ ابو العباس کے پاس آئے اور کتاب
کله فاباح له ابن طالب	القراض بطور امتحان اون کے سامنے پیش
الفتیاء	کی، سب کا اونھوں نے جواب دیا، اور ابن
(معالم ج ۲ ص ۲۲۵)	طالب نے اون کی خدمت افتاء کو منظور کیا،

قوانین حکومت | اسلامی قانون، قرآن مجید، احادیث، قاضی کی ذاتی رائے یعنی اجتہاد یا قیاس سے عبارت ہے، اور اسی کا مجموعہ فقہ کہلاتا ہے، اغالبہ کے عہد حکومت تک فقہ کے مذاہب اربعہ مین ایسی عصبیت پیدا نہین ہوئی تھی، کہان کا اجتماع ممکن نہ ہوتا، اس لئے سلطنت اغالبہ کا قانون فقہ حنفی یا فقہ مالکی کے بجائے محض فقہ اسلامی تھا، اسی لئے عہدۂ قضا پر کبھی مالکی المذہب مقرر ہوتے کبھی حنفی المذہب متعین کئے جاتے، علاوہ ازین یہ بھی کوئی ضرور نہ تھا کہ اگر قاضی القضاۃ مثلاً مالکی ہے، تو اپنے ماتحت صوبہ کے قضاۃ بھی مالکی المذہب ہی مقرر کرے، بلکہ یہ بھی ضرور نہ تھا، کہ قاضی مدعی و مدعا علیہ کے مسلک فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہوتا، بلکہ اوٹھین اختیار تھا، کہ وہ اپنے فہم و بصیرت کے لحاظ سے جو کچھ حق و دیانت سمجھین، اوسی کے مطابق فیصلے کرین، خواہ مدعی و متنغیث یا مدعا علیہ فقہ اسلامی کے مذاہب مین سے کوئی مذہب بھی رکھتا ہو،

چنانچہ امام سحنون نے اپنے عہدۂ قضاۃ مین قاضی سلیمان بن عمران کو جو بعد مین قاضی القضاۃ بھی بنے، ولایت بجایہ کا قاضی مقرر کیا، سلیمان مسلکاً حنفی تھے، اور اہل بجایہ مین ایک بڑی تعداد مالکی المذہب تھی، آخر باشندگان بجایہ کی ایک جماعت امام سحنون کے پاس شکایت لیکر آئی کہ سلیمان اپنے مذہب حنفی کے مطابق فیصلے کرتے ہین، امام سحنون نے اوس کے جواب مین کہا:-

ماقدمته علیکم الا وانا اعلم انه یحکم بمذهبه.	مین نے جب انھین تمھارے صوبہ مین بھیجا، تو یہ جان کر بھیجا کہ وہ اپنے ہی مذہب (حنفی) کے مطابق فیصلے کرین گے،
(ج ۲ ص ۹۹)	

شکایت لیکر آنے والا گروہ خاموشی سے واپس چلا گیا، (ج ۲ ص۹۹) یہی وجہ ہے کہ اغالبہ کے عہد مین افریقہ مین مذہب مالکی کی مقبولیت کے باوجود اکثر فقہا حنفی المذہب تھے، معالم مین ہی:-

ان اکثر الفقهاء اذ ذلک علی رای الکوفیین (ج ۲ ص۵۴)	کیونکہ اکثر فقہا، اوس زمانہ مین حنفی المذہب تھے،

لیکن اس کے باوجود حنفی و مالکی اختلافی مسائل کی بنا پر بہت کم اختلافات ملتے ہین، البتہ اختلاف اور عصبیت کی جھلک کلام و عقائد مین نظر آتی ہے، کیونکہ اغلبی عہد مین امرائے دولت مین سے غالب تعداد معتزلہ کی تھی، معالم مین ہے،

(ج ۲ ص)

اکثرھم (ای رجال ابن اغلب) کانوا معتزلۃ   اکثر رجال ابن اغلب معتزلی تھے،

یہ اختلافی عقائد ایسے تھے جن کی نوبت تکفیر تک پہنچی تھی اور ایک دوسرے کو صدق دل سے کافر سمجھتے تھے، اسلئے اکثر اس کے اثرات بھی ظاہر ہوجاتے تھے، اور وہ افریقیہ کے دیوان القضا مین بھی ظاہر ہوئے، لیکن ان کے تفصیلات کی چندان ضرورت نہین،

قاضی القضاۃ قاضی القضاۃ کو اگرچہ فرمانروایان اغالبہ نامزد کرتے تھے، مگر وہ تمام معاملات مین آزاد و خود مختار ہوتے، اونھین اس کا حق حاصل تھا، کہ جس وقت چاہتے، فرمانرواؤن کے پاس جاسکتے، خواہ حرم مین ہون یا دیوان عام مین، وہ ہر وقت امیر سے تخلیہ کر سکتے تھے، اور امیر وقت خواہ نیند مین ہو یا بیداری مین، یہ اطلاع کراکر فوراً باریاب ہوجاتے، کسی حاجب و دربان کو اس کی اجازت نہ تھی، کہ یہ جب محل شاہی تک پہنچین، تو امیر سے اون کی ملاقات کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کردے، وہ اکثر معاملات مین حکومت کے خلاف مقدمات سنتے، اور حکومت اور خود امیر کی ذاتی خواہش اور مرضی کے خلاف فیصلے کرتے، کبھی کبھی قاضی القضاۃ اور فرمانروائے افریقیہ مین سخت اختلافات پیش آجاتے، امیر افریقیہ کسی مقدمہ مین کوئی خاص فیصلہ کرنے یا مقدمہ اٹھا لینے کی خواہش کرتا، اور قاضی القضاۃ سختی سے تعمیل حکم سے انکار کر دیتا، اور نہ بصورت مجبوری اپنا استعفا پیش کر دیتا، جسے امیر واپس کرنے پر مجبور ہوتا، کہ اولاً اوس وقت اس عہدے کیلئے اوس سے بہتر شخص کوئی موجود نہ ہوتا، دوسرے استعفا منظور کرنے مین فرمانروا کے عدل و انصاف کی بدنامی ہوتی، اوس کی بکثرت مثالین افریقیہ کے قاضی القضاۃ کی سوانح عمریون مین ملتی ہین،

افریقیہ کے قضاۃ کی جو فہرست بہ ترتیب زمانہ مرتب ہوسکی، وہ حسب ذیل ہے:۔

شمار	نام قضاۃ	زمانۂ تقرر	زمانۂ علٰحدگی	کیفیت
۱	عبداللہ بن غانم،	سنہ ۲۷۱	سنہ ۱۹۰–۶	ابراہیم بن اغلب کے زمانۂ
۲	ابو محرز،	سنہ ۱۹۱	سنہ ۲۱۴	حکومت کے آغاز سے
۳	اسد بن فرات،	سنہ ۲۰۳	سنہ ۲۱۳	پیشتر روح بن حاتم کے
۴	احمد بن ابو محرز،	سنہ ۲۲۰	سنہ ۲۲۱	زمانہ مین تقرر ہوا تھا،
۵	عبداللہ بن ابی الجواد	سنہ ۲۲۱	سنہ ۲۳۲	
۶	امام سحنون،	سنہ ۲۳۴	سنہ ۲۴۰	ابن عذاری مین زمانۂ تقرر سنہ ۲۳۳ ہے
۷	سلیمان بن عمران،	سنہ ۲۴۰	سنہ ۲۵۷	" " سنہ ۲۴۲ ہے،
۸	ابن طالب،	سنہ ۲۵۷	سنہ ۲۵۹	
۹	سلیمان بن عمران،	سنہ ۲۵۹	سنہ ۲۶۹	" " سنہ ۲۶۷ ہے
۱۰	ابن طالب،	سنہ ۲۶۹	سنہ ۲۷۵	" " سنہ ۲۶۷ ہے،
۱۱	محمد بن عبدون بن ابی ثوب، المعروف بہ محمد بن عبداللہ الرعینی،	سنہ ۲۷۵ ۔	۔ ۔	
۱۲	صدینی،	۔	۔	
۱۳	عیسیٰ بن مسکین،	۔	۔	متوفی سنہ ۲۹۵ مدت ولایت قضاء ۵ سال ۱۱ مہینے
۱۴	حماس بن مروان،	۔	۔	
۱۵	محمد بن احمد بن جمال،	سنہ ۲۹۴	سنہ ۲۹۶	ابن عذاری مین ان کا نام محمد بن عبداللہ المعروف بہ ابن حیمان ہے (ص ۱۹۱) و محمد بن حیمان (ص ۱۹۶) و ابوالعباس بن حیمان (ص ۱۹۶) ہے

نفسیات حکیم ناصر خسرو

(۳)

از

پروفیسر مقتدر ولی الرحمٰن، ایم اے، استاذ نفسیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

(۹)

اثبات وانکار لذّت والم کو حکیم ناصر خسرو نے اپنے فلسفۂ مذہب میں بہت اہمیت دی ہے، اسی وجہ سے اس نے اس موضوع پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ "اندر شناخت لذّت مر نفس راپندار یست وقوتِ حق ودین وضعفِ شک وانجا واندر آنست"[1] اس کے علاوہ "اندر اثباتِ لذّت قوتِ دین وضعفِ الحاد است کہ بنیادِ دینِ حق برایجاب بہشت است مر مطیعان ونیکو کاران راکہ آن معدنِ غایت لذات است وآنجا رنج نیست البتہ......... ونیز برالزام دوزخ است مر عاصیان وبدکرداران راکہ آن مکانِ نہایت رنجہاست وآنجا ہیچ لذّت نیست البتہ"[2] آخری عبارت جو ہم نے نقل کی ہے، اس میں یہ خیال بہت اہم ہے، کہ بہشت[3] معدنِ لذت ہے کہ جسمین رنج نہین، اور دوزخ معدنِ رنج ہے کہ جسمین لذّت نہین، اسی خیال کو اوس نے لذّت والم کے اس

---

[1] زاد المسافرین صفحہ ۲۲۹، [2] زاد المسافرین صفحہ ۲۲۹ [3] بہشت و دوزخ کے وجود کو حکیم ناصر خسرو نے بڑے عجیب وغریب طریقے سے ثابت کیا ہے، کہتے ہین کہ اخلاق ستودہ یعنی عدل وانصاف، راست گوئی امانت مین خیانت نہ کرنا وغیرہ سب کے سب بہشت کے وعدے اور دوزخ کی وعید کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہین، یعنی یہ کہ یہ اخلاق معلولات ہین اور بہشت و دوزخ علل العقول شارح علل غائیہ ہین ان اخلاق کا وجود تو مسلّم ہے، بالفاظ دگر معلولات موجود ہین، اور معلول کا وجود علّت کے وجود کو مستلزم ہے، یہ محال ہے کہ معلول ہو اور علّت نہ ہو، لہذا علّت بھی موجود ہے یعنی بہشت و دوزخ موجود ہین (صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱) صفحہ ۵۰۵

نفسیاتی نظریے کی بنیاد قرار دیا ہے جس کا وہ قائل ہی یہاں بھی اوس نے سلبی طریقہ اختیار کیا ہے یعنی محمد زکریا رازی[۱] اور اس کے بیٹے نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہی اس کی تردید کی ہے لیکن خود اپنے آپ کوئی خاص تعمیری نظریہ قائم نہین کیا،

محمد زکریا رازی کا نظریہ لذت و الم مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہی :-

لذت دراصل رنج (یا الم) سے نجات پا جانے کی حالت کا دوسرا نام ہے یعنی یہ کہ لذت ہمیشہ رنج کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس کے علاوہ اگر لذت ایک خاص مدت تک باقی رہے تو یہ رنج بن جاتی ہی جس حال کو نہ لذت کہا جاسکتا ہے نہ رنج، وہ طبیعت ہی، اور اس کو حس سے معلوم نہین کیا جا سکتا، لذت حسی تو رہائی دلانے والی ہوتی ہے اور درد حسی رنج دلانے والا، لیکن لذت و الم پیدا کس طرح ہوتے ہین، ؟ اس کا جواب رازی نے لذت و الم اور حس کے تعلق کی توضیح سے دیا ہے، پہلے وہ سوال کرتا ہی کہ حس کسے کہتے ہین، ؟ حس ایک اثر ہے، جو محسوس کی وجہ سے صاحب حس مین پیدا ہوتا ہے[۲] یہ تاثیر ایک فعل ہے، جو اثر کنندہ اثر پذیر مین کرتا ہے، اثر پذیری اثر پذیر کے حال کے متغیر ہو جانے کا دوسرا نام ہے، اب یہ حال جو حالت اثر پذیری مین متغیر ہوتا ہی یا تو طبیعت

ف۱ ایران اور مسلمانون کا مشہور فلسفی ہے، حکیم ناصر خسرو ان سے بہت ناراض ہین، ان کے نزدیک الحاد، مخالفت رائے اور دنائت طبع ان کی خصوصیات امتیازی ہین، چنانچہ لکھتے ہین :- "محمد زکریا چندان سخن ملحدانہ گفتہ" (ص۱۱۲) "... باین نتیجہ تش در دو عزن و حرامزادہ آمد" (ص۹۵ اور ص۲۳۶) "... پس چنین سخن گفتن فلسفہ نباشد بلکہ عرضہ کردن جہل و سفاہت باشد" (ص۲۴۳) ڈاکٹر بہمن کا خیال ہو کہ اس تشدد اور ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ "اقوال محمد زکریا مطابق اقوال حرانیین است کہ قائل پنج قدیم ہستند باین معنی کہ ہیچ چیز دیگر را در قدم شریک باری میدانستند ... و معلوم است کہ این عقیدہ مخالف مذہب خدا پرستی حکیم ناصر خسرو است" (مقدمہ مصحح ص ۲)

ف۲ یہ تعریف گرانٹ ایلن کی تعریف کی یاد تازہ کرتی ہے۔ Organic substances acted upon by peculiar agencies in the inorganic world give rise to the phenomena of sensation دیکھو Colour-sense ص ۲۔

سے ہوتا ہے، یا طبیعت سے باہر، ان تمام مقدمات کے مسلم ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ جب اثر کنندہ اثر پذیر کو اس کے طبیعی حال سے باہر کر دیتا ہے، تو رنج (یا الم) پیدا ہوتا ہے، اور جب اثر پذیر اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرتا ہی تو لذت پیدا ہوتی ہے، اسی سے ثابت ہی کہ لذت ہمیشہ رنج کے بعد پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اپنی اصلی طبیعت کی طرف عود کرنا طبیعت سے باہر ہوئے بغیر محال ہے، طبیعی حال یعنی وہ حال جو نہ لذت ہے نہ رنج، اس لئے محسوس نہیں ہو سکتا، کہ محسوس ہونا تاثیر کا نتیجہ ہوتا ہے، اور تاثیر سے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، یا تو انسان طبیعی حال سے باہر ہو جاتا ہے، یا اس کی طرف عود کرتا ہے یعنی حال طبیعی سے مراد یہ ہے کہ انسان نہ تو طبیعت سے باہر ہے، نہ اوس کی طرف عود کرے، تاثیر میں یہ صورت محال ہے، اور بغیر تاثیر حس محال ہے، لہذا حال طبیعی میں حس محال ہے،

اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر ایک تاثیر کے بعد دوسری تاثیر ہو، اور یہ دونوں تاثیریں ایک دوسری کی ضد ہوں، تو اثر پذیر کو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلی تاثیر کی وجہ سے اثر پذیر اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، اور دوسری تاثیر جو پہلی تاثیر کی ضد ہے، لہذا اس سے پہلی تاثیر زائل ہو جاتی ہے، اور اس طرح اثر پذیر اپنی طبیعت کی طرف عود کرآتا ہے جس سے لذت حاصل ہوتی ہے لیکن چونکہ دوسری تاثیر پہلی کو زائل کرکے خود باقی رہتی ہے، لہذا اثر پذیر اس دوسری تاثیر کی وجہ سے پھر اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہی یعنی اثر پذیر میں حالت رنج پیدا ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر پذیر کا حال طبیعی طبیعت سے باہر ہونے اور طبیعت کی طرف عود کرنے کی درمیانی حالت ہی یعنی یہ وہ حالت ہی جو نہ لذت ہے نہ رنج[۵۱]،

محمد زکریا رازی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نظریے کی تشریح اس طرح کی ہے:۔

کہتا ہے، فرض کرو ایک شخص ایک ایسے کمرے میں ہے، کہ جس میں نہ اتنی سردی ہے کہ وہ کانپنے لگے اور نہ اتنی گرمی ہے کہ پسینہ پسینہ ہو جائے، اس شخص کو اس کمرے میں نہ گرمی لگتی ہے، نہ سردی یعنی یہ اس کا حال طبیعی ہے، فرض کرو کہ ہم اچانک اس کمرے کو اتنا گرم کردیں کہ اس کو تکلیف ہونے لگے، اور اس کے بعد اس میں آہستہ

---

[۵۱] زاد المسافرین ص۲۳۱۔ ص۲۳۳،

آہستہ ٹھنڈی ہوا داخل کریں، اس کو گرمی کی تکلیف کے بعد ٹھنڈک کی لذت محسوس ہوگی، کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ گرمی سے وہ اپنے حال طبیعی سے باہر ہوگیا تھا، اور ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اپنے حال طبیعی کی طرف عود کر آیا، اب فرض کرو کہ ہم یہ ٹھنڈی ہوا برابر پہنچاتے رہیں، تو کیا ہوگا؟ وہ شخص پھر اپنے حال طبیعی سے باہر ہو جائے گا، اور اسطرح اس کی تکلیف پھر شروع ہو جائیگی، اس کے بعد اگر ہم اس کمرے کو گرم کریں گے، تو اس کو لذت محسوس ہوگی، کیونکہ اس گرمی کی وجہ سے وہ پھر اپنے حال طبیعی کی طرف عود کریگا، وقس علیٰ ہذا،

اس مثال سے واضح ہوتا ہے، کہ لذت حسی حالت رنج سے خلاصی پا جانے کی وجہ سے راحت پیدا ہونے کی حالت ہے، پھر جب آدمی اپنی طبیعت سے باہر تو آہستہ آہستہ ہے، اور عود یکدم کرے تو لذت پیدا ہوتی ہے لیکن جب وہ یکدم طبیعت سے باہر اور عود آہستہ آہستہ کرے تو درد و رنج پیدا ہوتا ہے، مثال اس کی ایسی ہے، کہ ایک شخص بہت سخت بھوکا اور پیاسا ہے، اور یکبارگی کھانا کھالے اور پانی پی لے، تو اس کو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے وہ طبیعت سے باہر تو آہستہ آہستہ ہوا تھا لیکن کھا اور پی کر عود اس نے یکبارگی کیا، اسی طرح اگر کسی تندرست شخص کو چوٹ لگ جائے، تو وہ اپنے حال طبیعی سے گویا یکبارگی باہر ہو جاتا ہے اسی وجہ سے اس کو درد ہوتا ہے، اور چونکہ وہ اچھا آہستہ آہستہ ہوتا ہے یعنی اپنے حال طبیعی کی طرف عود آہستہ آہستہ کرتا ہے، لہٰذا اس کو لذت کوئی محسوس نہیں ہوتی، مختصر یہ کہ طبیعت کی طرف یکبارگی عود کر آنے کا نام لذت ہے اور طبیعت سے یکدم باہر ہو جانے کا نام رنج یا الم[1]

اس طرح محمد زکریا رازی کا نظریۂ لذت و الم مختصراً یہ ہے کہ لذت حسی رفع رنج کے سوا اور کچھ نہیں، اور رنج طبیعت سے باہر ہو جانیکے ہم معنی ہے، اور لذت طبیعت کی طرف عود کر آنے کے، لیکن طبیعت کی طرف عود کرنا طبیعت سے باہر ہو جانے سے قبل محال ہے، لہٰذا لذت لازماً رنج کے بعد ہوتی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ رازی نے اپنے مقالے کے آخر میں کہا ہے، کہ انسان کو روشنی کی طرف دیکھنے سے لذت حاصل ہوتی ہے لیکن اگر وہ روشنی کو بہت دیر تک

---

[1] زاد المسافرین ص۲۳۳-۲۳۴،

دیکھتا رہے، تو پھر اندھیرے کو دیکھنے سے بھی لذت یاب ہوتا ہے، رازی کا یہ قول خود اس کے اپنے نظریے کا نقیض ہو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس کے نزدیک لذت ہمیشہ رنج کے بعد ہوتی ہے، اور یہ طبیعت سے باہر ہو جانے کے بعد اس کی طرف عود کر آنے کا دوسرا نام ہے، اور طبیعت لذت و رنج کی درمیانی حالت ہے، جو محسوس نہیں ہوتی، اب سوال یہ ہے کہ روشنی اور اندھیرے کو دیکھنے کی دو حالتوں کے درمیان وہ کونسی حالت ہے، جسے رازی طبیعت کہے گا؟ جب انسان روشنی کے دیکھنے سے لذت یاب ہوتا ہے، تو وہ کونسی طبیعت ہے، جس کی طرف عود کرتا ہے؟ جواب صرف یہی ہو سکتا ہے، کہ چونکہ وہ روشنی کو دیکھنے سے لذت پاتا ہے، اور لذت میں اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے لہذا روشنی کو دیکھنا طبیعت ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پھر اندھیرے کو دیکھنے سے اسکی لذت نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اس میں وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، جو حالت رنج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس کا مقدمہ غلط ہے یا نتیجہ، اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے، کہ روشنی کو دیکھنے کے وقت انسان کی وہ حالت نہیں رہتی جو روشنی دیکھنے کے قبل اس کی ہوتی ہے، یعنی روشنی دیکھنے میں اس کی اصلی حالت بالفاظ دیگر طبیعت بدل جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو روشنی کو دیکھنے سے اس کو لذت کیوں ہوتی ہے، پھر رازی نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی، کہ دیکھنے اور نہ دیکھنے کے درمیان کوئی ایسی حالت نہیں، جو دیکھنے کی حالت بھی نہ ہو، اور نہ دیکھنے کی بھی نہ ہو، اور جس کو بقول اس کے طبیعت کہا جا سکے جس میں نہ رنج ہوتا ہے اور نہ لذت، ایک جگہ رازی نے لکھا ہے کہ خوبصورت عورت کو دیکھکر آدمی کو لذت اس لئے حاصل ہوتی ہے، کہ بدصورت عورت کو دیکھنے سے اس کو تکلیف ہو چکی ہوتی ہے، اس کا یہ قول بھی سخت رکیک اور بے معنی ہے، ہم کو خوبصورت عورت کو دیکھنے سے لذت اس وجہ سے حاصل نہیں ہوتی، کہ ہم بدصورت عورت کو دیکھتے دیکھتے عاجز آچکے ہوتے ہیں، یہ لذت تو انسان کے لئے فطری ہے، اس کے علاوہ یہ بھی اس کے نظریے کے خلاف ہے، اگر اس کا نظریہ صحیح ہے، تو ہونا یہ چاہئے تھا، کہ جو شخص نہ تو خوبصورت عورت کو دیکھتا نہ بدصورت عورت کو، وہ اپنی طبیعی حال پر ہوتا، اس لحاظ سے خوبصورت عورت کو دیکھنے سے اسے رنج ہونا چاہئے تھا، کیونکہ

اسمین وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو رہا ہے، اور بدصورت عورت کو دیکھنے سے اسکو لذت ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اسمین وہ اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے، لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے ان تمام شواہد سے ظاہر ہے کہ رازی کا یہ نظریہ صحیح نہین، کہ طبیعت کی طرف عود کرانے کا نام لذت ہے[۵۱]

ایک شخص کسی خوبصورت عورت کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے، اس کو دیکھنے سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ جیسا اودھر کہا جا چکا ہے، اس کو رنج ہونا چاہیئے تھا، اب فرض کرو کہ یہ عورت اس کی نگاہون کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے، اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے، حالانکہ چونکہ وہ اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرآیا ہے، لہذا اس کو لذت حاصل ہونی چاہیئے تھی، یعنی یہ حالت بھی رازی کے نظریے کے خلاف ہے[۵۲]، بہترین تردید اس نظریے کی اس طرح ہو سکتی ہے، کہ ایک تندرست اور سلیم الحواس شخص کو اس کے منہ مین شکر کا ڈلا دو، اس کے سامنے ایک گلدستہ اور مشک نافہ رکھو، اس کے قریب بہت عمدہ گانا گاؤ، نہایت خوبصورت دیبائے منقش کی چادر اس کی آنکھون کے روبرو پھیلاؤ، اور نہایت نرم باریک کپڑے کا لباس پہنا دو، اس طرح اُس کا تمام طبیعی حال متغیر ہو جائیگا، اب اس نظریے کے مطابق جب طبیعی حال اس طرح متغیر ہو جاتا ہے تو رنج پیدا ہوتا ہے، لہذا اوس شخص کو بھی سخت تکلیف ہونی چاہیئے تھی، لیکن عقلائے دہر جانتے ہین کہ اس سے اس کو تکلیف نہین، بلکہ لذت حاصل ہوتی ہے، اگر رازی کا نظریہ صحیح ہوتا، تو دنیا مین مکروہ اور تکلیف دہ چیز کا نام بھی باقی نہ رہتا[۵۳]

واقعہ یہ ہے کہ رازی نے لذت اور "راحت از رنج" مین خلط مبحث کیا ہے، یہ دونون ایک ہی چیزین نہین، بلکہ دو مختلف چیزین ہین، لذت تو وہ حالت ہے کہ جب انسان اپنے حالِ طبیعی سے اس حالت مین آتا ہے، تو شادمان اور خوش ہوتا ہے، اور جب اس حالت تک نہین پہنچ سکتا تو رنج اور تکلیف اوٹھاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی "شخص" درویشی و گرسنگی و تشنگی و تنہائی کی حالت کے بعد "تونگری، طعام و شراب و مونس" پالیتا ہے، تو شادمان اور خوش ہوتا ہے، اور جب وہ ان چیزون کو نہین پاسکتا، تو اپنی پچھلی حالت پر رہتا ہے، اور رنج اوٹھاتا ہے اوس کے مقابلے مین "راحت از رنج" وہ حالت ہے

[۵۱] زاد المسافرین ص ۲۲۵، [۵۲] ص ۲۲۳، [۵۳] " ص ۲۳۸، ۲۳۹، [۵۴] " ص ۲۴۱،

کہ جب انسان اس سے اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرتا ہے، تو اپنے اصلی حال پر آجاتا ہی، چنانچہ جب وہ تندرستی کے بعد بیمار ہوتا ہی، تو تکلیف اوٹھاتا ہی، اور جب پھر تندرست ہوجاتا ہے، تو اپنے پچھلے حال کی طرف عود کرتا ہی اور اس سے اوس کو نہ لذت حاصل ہوتی ہی، نہ رنج، رازی کی غلطی یہ ہے کہ اُس نے طبیعی حال کی طرف عود کرنے کو لذت کہا، دراصل یہ حالت نہ لذت کی ہوتی ہے، نہ رنج کی، دوسرے الفاظ مین لذت ایک ایجابی حالت ہی اور "راحت از رنج" سلبی، رازی اسی نکتہ تک نہ پہنچ سکا۔[۵۱]

اس کائنات مین طبائع کو "ہدایت الٰہی" حاصل ہے جس کی مدد سے وہ اپنے مصالح کی نگہداشت کرتے ہین اور جو بھی اپنے مصالح کی نگہداشت کرتا ہے، اس کو لذت حاصل ہوتی ہی، اسی ہدایت الٰہی کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو "فساد" اور رنج سے محفوظ رکھتے ہین، یہ طبائع کیلئے بمنزلہ روح کے ہے کہ ان مین قوت حس نہین ہوتی، اب تمام نفوس اپنے اپنے شرف کے مطابق اس ہدایت الٰہی سے متمتع ہوتے ہین، چنانچہ نفس ناطقہ بمقابلہ نفس حیوانی اور نفس حیوانی بمقابلہ نفس نباتی اس سے زیادہ مستفید ہوتا ہے، بہرحال موجودات مین سے کوئی بھی ایسا نہین، جو "ہدایت الٰہی" سے بہرہ ور نہ ہو، کیونکہ ان کے لئے بقا ہی، اور بقائے موجودات "ہدایت الٰہی" سے ہوتی ہے، اب لذت کی کیفیت اور کمیت اسی ہدایت الٰہی سے استفادہ پر موقوف ہوتی ہے، چنانچہ نباتات کیلئے غذا حاصل کرنے، اپنی طرح کے بچے پیدا کرنے اور نسل بڑھانے وغیرہ مین لذت ہی، لیکن حیوان مین چونکہ روح حسی ہوتی ہی، لہذا اوس کی لذت نباتات کی لذت سے بشیتر ہوتی ہے، اس مین نباتات کی لذات کے علاوہ حسّی لذتین بھی ہوتی ہین، اسی طرح نفس ناطقہ کی لذتین نفس حیوانی کی لذتون سے بھی زیادہ ہوتی ہین، چنانچہ اوس کی لذتین حسّی بھی ہوتی ہین، اور عقلی بھی، بلکہ یہان تک کہا جاسکتا ہے، کہ تمام حسّی لذتین صرف انسان ہی کو حاصل ہوتی ہین، صرف انہی لذتون پر غور کرو، جو ایک قوت ذائقہ ہی سے حاصل ہوتی ہین، اس قوت سے جو لذتین حیوانات کو حاصل ہوتی ہین، وہ ان کے پاسنگ بھی نہین ہوتین۔[۵۲]

---

[۵۱] زاد المسافرین ص ۲۴۴، [۵۲] ص ۲۴۵، ص ۲۴۸،

انسان کی لذتوں کا اندازہ اسی سے کرو کہ وہ اپنی ہر حس سے اس قدر لذتیں حاصل کرتا ہے کہ حیوانات بے سخن کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں، پھر قیمتی جواہر، املاک فاخرہ، ریاست فرمانروائی وغیرہ سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ ان حسی لذتوں کے علاوہ ہے، ان سب پر مستزاد علمی لذات ہیں، کہ جن کو وہ اپنے قوا میں سے شریف ترین قوت سے حاصل کرتا ہے، اور یہ لذات حسی لذات کے مقابلے میں شریف تر بیشتر، بلکہ بے نہایت ہوتی ہیں، وجہ اسکی یہ ہے کہ انسان کا نفس ان لذتوں کو اپنی ذاتی قوت سے حاصل کرتا ہے، اور اسمیں بھی شبہہ نہیں کہ نفس جو جوہر بسیط ہے، بے نہایت ہے، جب کوئی چیز بے نہایت ہوتی ہے، تو اس کی قوت ذاتی بھی بے نہایت ہوا کرتی ہے، پھر نفس انسانی کی علم پذیری ایک ذاتی صفت ہے، لہذا جو علم کہ وہ حاصل کرتا ہے، اس سے وہ لذت پاتا ہے، پھر اس علم کی بدولت وہ اور برتر علم تک پہنچتا ہے، لہذا اس کی لذت بھی بیشتر ہو جاتی ہے، وقس علی ہذا یہ بالکل ناممکن ہے، کہ نفس انسانی ایسا ہو جائے کہ علم کو قبول نہ کر سکے، اس تمام گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، کہ انسان کی لذات حسی بے شمار ہیں، اور یہ کہ یہ لذات اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں، کہ وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جانیکے بعد اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے اس کے علاوہ لذت علمی بھی اس کی بے نہایت ہوتی ہے، اور ہر علم میں نفس انسانی اپنے طبیعی حال سے باہر ہو جاتا ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، لہذا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کہ رازی کا نظریہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ طبائع بے حس کی لذت "ہدایت الٰہی" سے اون حرکات کے ذریعہ اپنی صورتوں کی نگہداشت کا نتیجہ ہوتی ہے، جو ان کے لئے بمنزلہ ارواح ہیں، مختصر یہ کہ حیوانات کی لذتیں نباتات کی لذتوں سے زیادہ ہیں، اور انسان کی حیوانات کی لذتوں سے زیادہ، یعنی نفوس کی لذتیں ان کے مراتب کے مطابق ہوتی ہیں[۱]، اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک نفس انسانی جسقدر زیادہ علم سیکھتا جاتا ہے، اسی قدر دور وہ ان لذات سے ہوتا جاتا ہے، جو اس میں اور بہائم میں مشترک ہیں[۲]،

---

[۱] زاد المسافرین ص ۲۴۹، ص ۲۵۰، [۲] ص ۵۲، ص ۳۹۶، ص ۳۹۸

تلخیص و تبصرہ

چینی اسلامی لٹریچر

مشہور اسلامی رسالہ مسلم ورلڈ (اکتوبر ۱۹۳۳ء) مین ایک مضمون عنوان بالا سے شائع ہوا ہے، جس مین مقالہ نگار نے چینی اسلامی لٹریچر کے تین دور پیش کئے ہین، اور آخر مین اس خیال کا اظہار کیا ہو کہ اگر چین کے مسلمانون کو ملکی ترقی کا ساتھ دینا، اور اُس سے فائدہ اوٹھانا ہو، تو اونھین اپنے قدیم نظام تعلیم اور اسلامی معتقدات کو بالای طاق رکھ دینا چاہئے، اور تعلیم جدید کی روشنی مین اپنے لئے ایک مفید راہ عمل اختیار کرنی چاہئے ہم اس مفید مشورہ کو شکریہ کے ساتھ نظرانداز کرکے نفس مضمون کا خلاصہ ذیل مین درج کرتے ہین:-

چین کا آخری عظیم الشان شاہی خاندان منچو خاندان تھا اور اس کا پہلا جلیل القدر شہنشاہ کانگ ہسی، (Kang Hsi) تھا، وہ ایک عالی دماغ مدبر ہونے کے علاوہ علم و فضل کا بھی بہت بڑا مربّی تھا، اوس نے چین کے تمام وسیع لٹریچر کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کرائی اور لٹریچر کی ہر صنف کے نمونے خواہ وہ کسی زبان کے ہون، شاہی کتبخانہ مین جمع کرائے لیکن اس ذخیرہ کے متعلق آج بہت کم معلومات حاصل ہین، بہر حال جہان تک چینی اسلامی لٹریچر کا تعلق ہو کانگ ہسی کا عہدِ حکومت اس لٹریچر کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جا سکتا ہے، اس دور کے مسلمان مصنفین مین سب سے ممتاز شخصیت لیوچیائے کی ہے،

۱- اسلامی نشاۃ ثانیہ اور لیوچیائے لیئن،

کانگ ہسی نے جو کتابین جمع کی تھین ان مین عربی اور فارسی کی بھی بعض تصنیفات تھین، اور اون مین سے

چند تصنیفات کا ترجمہ بھی اوس عہد میں چینی زبان میں ہوگیا تھا، حال کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہو کہ چینی اسلامی لٹریچر کی سب سے قدیم کتاب جس کی تاریخ تصنیف کی تعیین کی جا سکتی ہے، توضیح مذہب حق ہے، اوس کے مصنف کا نام وانگ تائے یو ہے، یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے، اور غالبًا عہد منچو سے قبل کی لکھی ہوئی ہے، کیونکہ موجودہ نسخہ سے معلوم ہوتا ہو کہ اس کا پہلا دیباچہ ۱۶۴۲ء میں لکھا گیا تھا یعنی کانگ ہسی کی تخت نشینی سے تقریبًا بیس سال قبل، اس کتاب میں بھی جیسا کہ چین کے قدیم اسلامی لٹریچر کی اکثر کتابوں میں پایا جاتا ہے مسلمانوں کے ساتھ مذہبی رواداری برتنے کا شاہی فرمان درج ہو، وانگ تائے یو کی تصنیف کی اشاعت کے تقریبًا ۲۵ سال بعد ایک قدیم تر کتاب کا ترجمہ شائع ہوا، جو ایران یا عرب کے خاندان یوان (YUAN) کے عہد میں لائی گئی تھی، اس کتاب کا نام حق کی طرف رجعت کرنے سے متعلق اہم باتیں ہے،

اسی طرح ایک مختصر کتاب "مسلمانوں کی پہلی آمد" کے نام سے ہے جسکی تاریخ تصنیف متعین نہیں لیکن اسکے ایک دیباچہ پر ۱۶۶۲ء درج ہے، جو کانگ ہسی کے عہد حکومت کا پہلا سال ہے، اس اہم کتاب میں چین میں مسلمانوں کی پہلی آمد کے بابت نظریہ رویا کی اشاعت کی گئی ہے، اور اس کے مطالعہ سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ چین میں اسلام کا داخلہ شہنشاہ تائے سنگ کی درخواست پر ہوا تھا لیکن اس کتاب میں تاریخ کے حساب غلط ہیں اور "روایات" متداولہ کے ثبوت کیلئے کافی نہیں، تاہم اوسکی قدامت میں کوئی شبہ نہیں ہے،

"مسلمانوں کی پہلی آمد" کے چند ہی سال بعد "قبلہ نمائے اسلام" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کا مصنف صوبہ یونن (Yunnan) کا ایک مسلمان ماون ینگ (Ma wenping) نامی تھا، اس کتاب کا چنگتو (Chengtu) اڈیشن ۱۸۸۵ء میں دس جلدوں میں شائع ہوا، جو (۵۰۰) صفحات سے زائد ضخامت کا تھا، اوس کے علاوہ چھوٹے اڈیشن بھی نکلے، جنمیں سے ایک خلاصہ قبلہ نما کے عنوان سے چار جلدوں میں شائع ہوا، اس کتاب سے ابتدائی منچو عہد کے مسلمانوں کے حالات پر روشنی پڑتی ہو، جو اپنی تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے جنوبی مغربی صوبہ میں نمایاں تھے، اس دور کا سب سے بڑا مصنف

لیو چیائے لیَین تھا،

لیو چیائے لیَین جس کو لیو چیہ ( ) بھی کہتے ہین خاندان منچو کے ابتدائی عہد مین شہر نانکنگ مین پیدا ہوا، اوس نے اپنی تمام عمر علم و فضل کی تحصیل مین صرف کردی، اوس نے ایک ایسا علمی معیار قائم کردیا، کہ اوس کے بعد تمام چینی اسلامی فضلا نے اوسی کا تتبع کیا اوس کی ابتدائی کتابون مین ایک بہت مشہور کتاب فلسفۂ اسلامی ہے، فلسفۂ اسلام پر یہ ایک ایسی مختصر مگر جامع تصنیف ہے، کہ بعد کے مصنفین مین سے اکثرون نے اوسی سے مواد حاصل کیا ہے، فلسفۂ اسلامی کے پہلے دیباچہ مین کانگ ہسی کے عہد حکومت کا تیرھوان سال ۱۶۷۴ء درج ہے، اس کتاب مین جغرافیہ اور اوس زمانہ کی تاریخ عالم سے متعلق نوین صدی عیسوی کی بہت سی شکلین اور نقشے بنے ہوئے ہین، اس کتاب کے بعد لیو چیائے لیَین نے اس کا ایک خلاصہ اسلامی قوانین و رسوم کے اہم منتخبات" کے عنوان سے شائع کیا، جس کا دیباچہ ۱۷۱۰ء کا لکھا ہوا ہے، اس مین اسلامی عقائد اور رسوم سے متعلق مختلف مابعد الطبیعیاتی اور علمی مباحث ہین، یون تو لیو چیائے لیَین نے بہت سی کتابین لکھین، لیکن اوس کی سب سے زیادہ عظیم الشان تصنیف سیرۃ النبی ہے، اس کتاب کی تاریخ تصنیف کے متعلق مختلف رائین قائم کیگئی ہین، لیکن عموماً اس کا سال تصنیف ۱۷۲۱ء اور ۱۷۲۴ء کے درمیان خیال کیا جاتا ہے اور کثرت رائے یہ ہے، کہ اس کا پہلا اڈیشن ۱۷۷۵ء مین شائع ہوا، لیو چیائے لیَین سے قبل چین مین جو اسلامی لٹریچر موجود تھا، اوسے خالص علمی نہین کہہ سکتے تھے، اور نہ وہ زیادہ ضخیم تھا، اوس کا بیشتر حصہ قدیم تصانیف کے ترجمہ اور موازنہ پر مشتمل تھا، اور اس مین قرآن پاک اور تفسیر پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا، لیو چیائے لیَین کے وقت تک چینی نژاد مسلمانون مین تبحر علمی مفقود تھا،

لیو چیائے لیَین کے بعد چین کے اسلامی کلچر کی دوسری تحریک شروع ہوئی، اور اس دوسرے دور کو دفاع اسلامی اور مافو چو کا دور کہتے ہین،

۲- دفاع اسلامی اور مافو چو کا دور،

۱۷۵۸ء کے قریب شہنشاہ چین لنگ (Chien Lung) نے ترکستان کو سلطنت چین میں شامل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا اور چین کے تمدن (کلچر) میں باہمی مبادلہ ہونے لگا، اور جس طرح نشأۃ ثانیہ کا دور کانگ ہسی کے عہد سے شروع ہوا تھا، اوسی طرح وفاع اسلامی کے دور کی ابتدا چین لنگ کی فتحِ ترکستان سے ہوئی، یہ دور مافوچو (Ma Fu chu) کے زمانہ میں اپنے شباب پر پہنچ گیا، مافوچو انیسوین صدی کے ابتدائی دور کا مشہور فاضل اور مدافع اسلام (APOLOGIST) تھا، اس وقت مغربی چین میں چینیوں اور عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر سخت حملے ہو رہے تھے، مافوچو اوس جماعت کا سردار تھا، جو ان حملوں کا جواب دے رہی تھی، مافوچو کو چینی اور عربی زبان کی قدیم تصانیف پر کامل عبور حاصل تھا، اوس نے پہلے اپنے بعض پیشروؤں کی کتابوں پر نظرِ ثانی شروع کی، اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے مافوچو کی تصنیف کو لیا، پھر "عربی بہار و خزان کی سرگذشت" پر نظرِ ثانی کی، حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کے اکثر چینی اسلامی مصنفین تمامتر مافوچو ہی پر اعتماد کرتے ہیں،

مافوچو نے اسلام کی مدافعت میں جو کچھ لکھا، اوس کی ابتدا، اون تخیلات پر نقد و تبصرہ سے کی جو اوس زمانہ میں ذات باری تعالیٰ کی نسبت قائم کئے جاتے تھے، اپنی کتاب "آسمان کی توصیف بلیغ" میں اوس نے اوس تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جو کنفیوسیس کے لفظ آسمان اور اسلامی لفظ اللہ کے درمیان ہے،

۱۸۴۲ء میں مافوچو نے اپنا روزنامچہ شائع کیا جو اوس نے ایک طویل سفرِ حج میں لکھا تھا، اس میں وہ روزانہ کے واقعات، منزلوں کے فاصلے اور اون اشخاص کے حالات بیان کرتا ہے، جو اُسے سفر میں ملے تھے، یہ روزنامچہ پہلے عربی میں لکھا گیا تھا، بعد میں مافوچو کے ایک شاگرد اور مداح مآن لی (MAAN LI) نے اوس کا ترجمہ چینی زبان میں کیا، مافوچو نے چین میں اسلام کی ترقی سے متعلق ایک فارسی کتاب کو دوبارہ اڈٹ کیا اور لوگوں کی اخلاقی اصلاح کیلئے ایک کتاب بیداریِ عالم لکھی، اُس کو شاعری سے بھی ذوق تھا، اور وہ کنفیوسیس کے دیوان کے مثل اپنی غزلوں کا بھی ایک مجموعہ مرتب کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس کام کو ختم نہ کر سکا

اور ۱۸۶۶ء میں صرف ایک دیباچہ لکھکر رہ گیا، بعد کو اوس کے شاگرد و اورادبی جانشین ماآن لی نے وہ مجموعہ تیار کیا، جو دیوان اسلامی کے نام سے مشہور ہے، ماآن لی نے ما فو چو کی دو اور کتابوں یحی نیکی، اور توضیح رسوم قواعد کا ترجمہ بھی کیا، اوس نے عربی فن شاعری پر خود بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام اسلوب شعر عرب ہے، ماآن لی کے بعد چینی اسلامی لٹریچر کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

۳- تحریک جدید اور پائیٹنگ اسکول،

انیسوین صدی کے نصف آخر مین چین کے مسلمان زیادہ تر اپنے حقوق ملی کے اصول کیلئے جدو جہد کرتے رہے، اور اس زمانہ مین بہت کم اعلیٰ لٹریچر پیدا کر سکے، قیام جمہوریہ کے ساتھ ہی مغربی خیالات کا ایک طوفان ملک مین داخل ہوگیا اور ان جدید خیالات مین آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے ساتھ حیات دنیوی اور مذہب کے متعلق بھی ایسے خیالات اور نظریات سامنے آئے جن سے ملک اوس وقت ناآشنا تھا، پائیٹنگ ( ) کے نوجوان مسلمانون کی ایک جماعت جس نے قیام جمہوریہ مین نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا تھا، اوس وسیع تحریک مین شریک ہوگئی، جس کا مقصد چین مین جدید تہذیب و تمدن کو رواج دینا تھا، اور اس مقصد کیلئے سب سے پہلے اونھون نے زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے جدید نظام تعلیم کو ذریعہ بنانا چاہا، چنانچہ اس جدید تر اختراع کا ایک بڑا حصہ نظام تعلیم کے سپرد کیا گیا، اور دوسرا بڑا حصہ پبلک پریس نے اپنے ہاتھون مین لیا، اور اخبارات و رسائل کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، پائیٹنگ کے جدید اسکول کا نصف سے زائد لٹریچر اون چھوٹی چھوٹی کتابون پر مشتمل تھا جو پروپگنڈا کیلئے لکھی جاتی تھین اور جنمین سے کوئی بھی بیس یا تیس صفحات سے زیادہ کی نہ تھی، پائیٹنگ کے مکتبۂ اسلامیہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے، اور ایک کثیر تعداد مین اسلام پر چھوٹی چھوٹی کتابین شائع کی ہین، ان مین سے اکثر قدیم تصانیف کا خلاصہ ہین، جو عام فہم زبان مین مختصر کر دی گئی ہین، چین کے مسلمانون نے متعدد ہفتہ وار اور ماہوار رسالے نکالے، لیکن ان مین سے کوئی استقلال اور کامیابی کے ساتھ جاری نہ رہ سکا جس کی ایک وجہ غالباً مالی دقت ہے،

جہاں ہے لرزہ براندام تیری عسکریت سے
ہژبرانِ دلاور کانپتے ہیں تیری ہیبت سے

مسلّم ہے زمانہ میں ترا آئینِ جانبازی
تجھے ہے جنگجو اقوام میں حاصل سرفرازی

مگر اے ملتِ خودکام! یہ کسکے مقابل میں
مگر اے عبرتِ اقوام! یہ کسکے مقابل میں

یہ صہبائے کہن سے آہ تیری سرخوشی کبتک؟
یہ فرطِ غیظ سے ظالم! تری محسن کشی کبتک؟

گرانی تھی جسے برقِ بلا اعدا کے خرمن پر
وہ تیغِ خون‌فشاں چلتی ہے اب خود اپنی گردن پر

مٹایا تو نے ظالم! آہ اس غازی کی ہستی کو
بلند اکر کیا جس نے لوائے حق پرستی کو

چھڑایا تجھکو اک پنجۂ سفاک سے جس نے
بچایا تجھکو اک طوفانِ خون و خاک سے جس نے

وہ غازی، ڈوبتی کشتی کی جسنے ناخدائی کی
صفِ باطل سے تنہا جسنے قوت آزمائی کی

بچالی دستِ غارتگر سے تیری آبرو جس نے
خزاں دیدہ چمن کو دی بہارِ رنگ و بو جس نے

نکالا جسنے تجھکو پستیِ قعرِ مذلت سے
نگاہیں آشنا کردیں فضائے اوج و رفعت سے

دبایا جس نے سیلابِ تفرنج کے تلاطم کو
دماغوں سے مٹایا غیر کے ذہنی تحکم کو

محاسن ہی فقط حاصل کئے درسِ تمدن کے
نہ الجھا خار سے دامن لٹ لوٹیں پھول چن چنکے

اچھالا نام ملک و قوم کا اقوامِ عالم میں
نئے سر سے کیا شانہ وطن کی زلفِ برہم میں

نشاطِ کامرانی ہر دلِ افسردہ کو بخشی
بہارِ رنگ و بو پھر گلشنِ پژمردہ کو بخشی

ضیا اندوز تھا ذروں سے تیرے مہرِ نورانی
درخشاں کس قدر تھا تیرا دورِ نشأۃِ ثانی

دوبارہ اسکے دم سے قالبِ مردہ میں جان آئی
زمانہ کو دکھایا اس نے اعجازِ مسیحائی

شریعت پر تھا مبنی اس کا آئینِ جہانبانی
دلِ بیدار تھا لذت شناسِ ذوقِ ایمانی

شعارِ دیں پہ قائم اسکی تدبیر و سیاست تھی
صدائے حق کے آگے سربسجدہ اسکی سطوت تھی

بظاہر گرچہ وہ اجلالِ شاہانہ کا حامل تھا
حقیقت میں مگر روشن نفس درویشِ کامل تھا

ز سر تا پا یقیں تھا، صاحبِ ایمانِ محکم تھا
یقیناً عالمِ اسلام کا صندیدِ اعظم تھا

مدبّر تھا، مفکّر تھا، بہادر تھا، مجاہد تھا
سرِ اورنگ قیصر تھا، سرِ سجادہ زاہد تھا

امیرِ کشورِ جاں تھا، جہانگیر و جہاں باں تھا
بہارِ باغِ ایماں تھا، چراغِ بزمِ عرفاں تھا

معارف کا مبلّغ، حکمت و دانش کا داعی تھا
وقارِ ملک و ملّت کے لیے گرمِ مساعی تھا

وطن کا مایۂ صد ناز فرزندِ گرامی تھا
وہ زورِ بازوئے اسلام تھا، ملت کا حامی تھا

بظاہر گو وہ کابل کے افق پر جلوہ آرا تھا
مگر کل مطلعِ اسلام کا روشن ستارا تھا

نہ اٹھا دورِ آخر میں کوئی عالی ہمم ایسا
ہوا اب تک نہ تجھ میں صاحبِ سیف و قلم ایسا

کیا حق مرتے دم تک حبِّ قومی کا ادا اُس نے
وطن کی راہ میں جانیں لڑا دیں بارہا اُس نے

ہزاروں ہیں مظاہر اسکی شانِ خسروانی کے
ہیں روشن کارنامے اسکی فتح و کامرانی کے

وطن کا گوشہ گوشہ شاہد اسکی ترکتازی کا
فسانہ ذرہ ذرہ کی زباں پر دلنوازی کا

نہ دی کچھ داد تو نے آہ اسکے سعیِ پیہم کی
نہ جانی قدر تو نے آہ اُس سالارِ اعظم کی

خود اپنے ہاتھ سے "وہ ہستیِ نادر" گنوائی ہے
نظیر اس کی نہ پائیگی نہ اب تک تو نے پائی ہے

یہ ممکن ہے بھلا دے تو ستمگر! اسکی خدمت کو
نہ روئے حشر تک اے قوم تو اُس جانِ ملت کو

مگر تڑپے گی صدیوں "موجِ کابل" اسکی فرقت میں
وطن کی خاک لیگی اُسکو آغوشِ محبت میں

عقیدت سے جگہ آنکھوں میں دیگی ایسے جنرل کو
بھلائیگی بھلا تاریخ کیونکر فاتحِ تھل کو

مطبوعاتِ جدیدہ

فلسفۂ نفس، مصنفہ جناب ضامن صاحب نقوی، ناشر ہندوستانی اکیڈمی یوپی، الہ آباد، حجم ۲۰۸ صفحے، لکھائی چھپائی ٹائپ میں، کاغذ دبیز، قیمت درج نہیں،

علم النفس، قدیم وجدید دونوں فلسفوں میں حکما و فلاسفہ کا مستقل موضوعِ بحث و نظر رہا ہے، اور ان کے مختلف دوروں میں اس پر مختلف نقطہائے نظر کے ساتھ غور و فکر ہوتا رہا، یہانتک کہ دورِ حاضر میں تو اس نے ایسی شکل اختیار کرلی کہ یہ علم شاخ درشاخ ہوکر مختلف مستقل علوم میں تقسیم ہوگیا، اور یہ فروع اپنی اصل سے ایسی جداگانہ حیثیت میں آگئے، کہ ان دونوں میں لاہوتی و ناسوتی، علوی و سفلی اور روحانی و مادی کی متباین نسبتیں قائم ہوگئیں، مصنف "فلسفۂ نفس" نے اس تصنیف میں انھی ٹوٹے ہوے رشتوں کو جوڑ کر اسی تباین و تناقض کو دور کرنا چاہا ہے، اور قارئین کے خیالات کی مادی سے روحانی، سفلی سے علوی اور ناسوتی سے لاہوتی جانب رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کتاب نہ علم النفس سے متعلق محض حکماے قدیم کے خیالات و افکار کی ترجمان ہے، اور نہ اس میں علم النفس کے متعلق فلاسفہ کے جدید خیالات و نظریات ہی تعیین کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، بلکہ مصنف کے ذہن میں علم کے قدیم وجدید دونوں قسم کے مباحث کے مطالعہ سے جو خیالات و نتائج مستحضر ہوے، انھی کو ایسے ربط و تسلسل کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ کتاب کے نتیجۂ بحث میں انسانیت کا شرف امتیاز محض حق و حقیقت کا ادراک قرار پاتا ہے اور پھر حیات و کائنات کا مقصود حید محض حق شناسی نکلتا ہے، اور یہ حق شناسی خود شناسی پر منتج ہوتی ہے، اور پھر یہی خود شناسی، خداشناسی کے رتبۂ بلند کو حاصل کرتی ہے،

کتاب، مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی، بی اے کے "تعارف" کے بعد ایک مقدمہ اور چار ابواب پر

مشتمل ہے، پہلے باب میں نفس اور اسکی ماہیت پر بحث ہے، دوسرا باب نفس کے افعال و قویٰ کے ذکر میں، تیسرے باب میں نفس کے متعلقات کا بیان آیا ہے، اور چوتھا باب "بعض معارف نفسیات" کے عنوان سے ہے، اور اسی میں تمام مباحث کا خلاصہ سمٹ کر آگیا ہے، کتاب کے مسائل قدیم بھی ہیں اور جدید بھی، لیکن اظہار مطالب کے لیے اسلوب بیان جدید ہی ہے، اور جناب مصنف کی یہی بڑی کامیابی ہے کہ وہ علم النفس کے متعلق مغرب کے جدید نظریوں، اصطلاحوں اور تعبیروں کو اس طرح پر کھینچ کر مشرق کی سمت لائے ہیں کہ مغرب کے نظریوں اور اصطلاحوں کی روشنی میں مشرقی مسائل و عقاید کی بھی تعبیر ہوسکی ہے، اگرچہ کتاب میں کہیں کہیں مباحث میں تشنگی باقی رہ گئی ہے، مثلاً جہاں مسئلہ وحدۃ الوجود سے گریز کے بعد مسئلہ توحید کا ذکر آیا ہے، لیکن بہر حال یہ امور لائق اعتنا نہیں، مناسب ہو اگر جناب مصنف اسی اسلوب میں اپنے دوسرے متخیلہ رسالہ "حیات مابعد" کو بھی مرتب کر ڈالیں،

جامع اللغات و السنہ متعلقہ از جناب خواجہ عبد المجید صاحب بی اے، ناشر جامع اللغات کمپنی لاہور،

حجم جلد اول ۶۳۹ صفحے، قیمت عہ روپیہ ہر حصہ ۸۰ صفحے قیمتی ۸؍ تقطیع $\frac{20 \times 26}{4}$، کاغذ عمدہ سپید چکنا، لکھائی چھپائی اچھی،

"جامع اللغات" کا مفصل تذکرہ ان صفحات میں چند ماہ گذرے، آچکا ہے، کارکنان لغت نہایت مستعدی سے اس کے حصے حسب اعلان ۸۰، ۸۰ صفحوں میں نکال رہے ہیں، اب تک اس کے نو حصے ہمیں موصول ہوچکے ہیں، جنمیں جلد اول ۶۳۹ صفحوں پر تمام ہوکر جلد ثانی کے ۵۶ صفحے بھی آگئے ہیں، جلد اول حرف "ب" پر ختم ہوتی ہے، اور دوسری جلد کے ان ۵۶ صفحوں میں حرف "پ" کا آخری لفظ "پرائی" ہے، مؤلف نے انھی حصوں میں کتاب کا مقدمہ، عنوان، اور سرورق بھی پیش کر دیا ہے،

مقدمہ ۸ صفحوں پر مشتمل ہے، جس میں اجمال کے ساتھ اولاً "اردو کیونکر پیدا ہوئی"، کو دکھایا گیا ہے، اسکے بعد اردو زبان کی تدریجی تاریخ بیان کی گئی ہے، اردو زبان کی پیدائش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں صوبہ سرحد

سے مشرقی بہار تک کی زبان ایک ہی تھی، یہ کسی قدر محتاجِ تشریح اور باعثِ غلط فہمی ہے، مصنف نے اردو کی گذشتہ سر میں متداول نظریوں کو قبول کر لیا ہے، مثلاً خالق باری" اردو کی پہلی منظوم تصنیف ہے، اردو کا سب سے پہلا بڑا صاحبِ دیوان شاعر، "ولی دکھنی ہے" فسانۂ آزاد" سرشار کو اردو کا پہلا ناول سمجھنا چاہئے، اندر سبھا امانت" اردو کا پہلا ناٹک ہے، ۱۸۳۶ء میں آغا محمد باقر نے پہلا اردو اخبار دہلی سے نکالا، اور اردو میں لغت کی سب سے پہلی کتاب" خالق باری" تصور کیجا سکتی ہے، آخر میں اردو کے متداول لغات کا تذکرہ اور ان میں موازنہ کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں جامع اللغات کے خصوصیات اور رموز و اشارات ہیں، خدا مصنف کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اردو کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی، توقع ہے کہ یہ لغت اگر پورے طور پر پایۂ استناد حاصل نہ کر سکا، تو کم از کم اردو لغت سے متعلق موجودہ ضروریات کا پورا کرنے والا ضرور ثابت ہوگا،

مثنویات میر، مرتبۂ جناب سید محمد صاحب ایم اے، ناشر مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن تقطیع چھوٹی ۲۳۴ صفحے، قیمت مجلد ۶؍

میر تقی میر کو تمام متاخرین شعراء نے اپنا "میر" تسلیم کیا ہے، دورِ حاضر کے اربابِ ادب نے بھی ان کی قدر کی ان کی متعدد تصنیفات اب تک شائع ہو چکی ہیں، کلام کا انتخاب بھی ایک سے زیادہ نکل چکا ہے، اب مولوی سید محمد صاحب ایم اے، مؤلف" اربابِ نثر اردو" نے "مثنویاتِ میر" کے نام سے میر کی تمام مثنویوں اور مثنوی نما نظموں کو یکجا کر دیا ہے، ابتدا میں ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں میر کے مختصر حالاتِ زندگی، اور ان سے ان کی مثنویوں پر روشنی ڈالی ہے، مثنویوں کی مجموعی تعداد ۳۳ ہے، جنہیں حسن و عشق کی داستانوں کی مثنویاں، ساقی نامے مدحیہ مثنوی، صید نامے، اور ہجویہ نظمیں سب شامل ہیں،

دیوان طباطبائی یعنی صوت تغزل } مجموعۂ کلام نواب حیدر یار جنگ مولنا علی حیدر طباطبائی نظم حجم ۳۲۶، تقطیع چھوٹی، ناشر مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن قیمت:- ۶؍

حضرت نظم طباطبائی، پچھلے دور کی اردو شاعری کی یادگار رہ گئے تھے، جو اگرچہ دیوان غالب کے شارح تھے، مگر خود اپنی غزلگوئی میں لکھنؤ کے طرز کے متبع رہے، ان کا مجموعۂ کلام "دیوان طباطبائی یعنی صوت تغزل" کے نام سے شائع ہوا ہے، حالانکہ اسے "صوت تغزل یعنی دیوان طباطبائی" کے عنوان سے ہونا تھا، اس مجموعہ میں بڑا حصہ اردو غزلوں کا ہے، آخر میں چند فارسی کلام، اردو رباعیاں اور تاریخیں ہیں، ہر غزل میں اس کا وزن بھی درج ہے، کلام کا رنگ لکھنوی طرز کا عاشقانہ ہے، وہی ہجر و وصال، معشوق سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے گھاتیں، لفظی رعاتیں اور صنعتیں، اور وہی گل و بلبل اور شانہ و گیسو کے مضامین ہیں، اگرچہ دس بیس میں ایک دو شعر دوسرے رنگ کے بھی سامنے آجاتے ہیں، لیکن حضرت نظم اردو و فارسی زبان کے قادر الکلام ادیب، اور اسی نقطۂ نظر سے شاعر تھے، ضرورت ہے کہ اس مجموعۂ کلام کا بھی، اسی استفادہ کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے، جیسے ہم اکثر متقدمین شعراء کے دواوین کا مطالعہ کرتے ہیں، مجموعہ کے شروع میں حضرت نظم ہی کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جس میں شعر کے سرقہ کی بحث کی گئی ہے، یہ مقدمہ شاید ناتمام رہ گیا ہے، اور ان کی وفات کے بعد تبرکات کے طور پر شامل دیوان کر دیا گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس مجموعہ میں حضرت نظم کے وہ سوانح حیات بھی درج کر دیئے جاتے جو حیدر آباد کے رسالہ مکتبہ یا کسی دوسرے رسالہ میں تفصیل سے نکل چکے ہیں،

ریاض النسوان

تحفۃ الخلال فی مسائل الاسلام والایمان

از جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب، حجم بہ ترتیب ۱۹۲، ۷۶ صفحے قیمت ہر ایک ۸؍
پتہ:- حافظ عبد العظیم صاحب، مکان عبد الرؤف صاحب قریب بازار جام باغ، حیدر آباد دکن

"ریاض النسوان" فقہ شافعی میں ہے، جس میں ابواب فقہی کی ترتیب پر مسائل لکھے گئے ہیں، عورتوں سے متعلق مسائل بصیغۂ خصوصیت سے ہیں، شاید اسی لئے ریاض النسوان نام رکھا گیا، اس رسالہ میں کتاب الایمان سے کتاب النکاح تک کے ابواب ہیں، دوسرا رسالہ تحفۃ الخلال فی مسائل الاسلام والایمان گویا اسی کا دوسرا حصہ ہے جس کے اس نام کی کوئی وجہ معلوم نہیں، اس میں فقہ کے ابواب بیع و معاملات و فرائض و جنایات وغیرہ کے مسائل درج ہیں، فقہ شافعی پر اردو میں کم کتابیں ملتی ہیں، ابتدائی عربی خوان طلبہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، رسالوں کی زبان قدیم وضع کی ہے اور ان کی ترتیب اور طرز کتابت وغیرہ میں بھی قدیم شان نمایاں ہے۔

"م"